ماہنامہ
کتاب
مکتبہ جامعہ ملیہ نئی دہلی

ماہنامہ
پیام تعلیم
نئی دہلی
بچوں کا پرانا ساتھی ہے۔
۱۹۲۶ء سے نکل رہا ہے۔
یہ انوکھے مضمونوں، مزیدار کہانیوں اور نظموں کے ذریعے
شہریت کے آداب سکھاتا ہے۔
تہذیب واخلاق کی اعلیٰ قدروں سے مانوس کرتا ہے۔
وقت کے تقاضوں کے مطابق نت نئی معلومات فراہم کرتا۔
نئے انتظام میں آفسٹ پر چھپتا ہے۔
باتصویر ہے۔
سالانہ قیمت چھ روپے ہے۔
سالنامہ اور خاص نمبر بھی اسی میں شامل ہیں۔
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی ۶
شاخ
اردو بازار دہلی
شاخ
پرنس بلڈنگ بمبئی

مینجنگ ایڈیٹر: [illegible]لام ربانی تاباں
[illegible]دیر مسئول: مجیب احمد خاں

ماہنامہ کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

فروری ۱۹۶۸ء
جلد ۹
شمارہ ۲

[illegible]ریہ

لیجیے، کتاب نما حاضر ہے۔ انشاءاللہ اب برابر حاضر ہوتا رہے گا۔ یہ نتیجہ ہے قارئین کے [illegible]یر مقدم اور عملی تعاون کا جس کا اظہار جنوری کے شمارے کے بعد سے ہونا شروع ہوا اور [illegible]ئد جاری ہے۔ مشورہ دینے والوں کے علاوہ بھی بہت سے احباب نے شرح چندے میں اضافہ [illegible]د کیا اور نئی شرح سے چندے بھیجنا شروع کر دیے ہیں۔ محل (چتور) کے حکیم محمود بخاری صاحب [illegible] دس خریداروں کا چندہ نئی شرح سے بھیجا ہے۔

ایجنٹ حضرات میں میسور کے ایک صاحب نے — جن کا ذکر ہم نے پچھلے شمارے [illegible] تھا، بڑھی ہوئی قیمت پر بھی ایک سو پرچوں کے اپنے سابقہ آرڈر کو بحال رکھا اور آیندہ [illegible] اضافہ کرتے رہنے کی امید دلائی ہے۔ ہمارے یہ مخلص معاون ہیں۔ پیوپلز بک اسٹال، [illegible]ے اسٹیشن، گلبرگہ جو نہایت خاموشی مگر انہماک کے ساتھ اس علاقے میں اردو اخبارات [illegible]کی توسیع اشاعت کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ اس سے اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ [illegible]اردو کے بہی خواہ عملی طور پر اس کی ترقی کے کوشاں ہیں۔ اگرچہ کانفرنسیں منعقد [illegible] جلوس نکالنا اور جلسے کرنا انھیں نہیں آتا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ خاموش رہ کر اپنے [illegible]اردو کی خدمت اس طرح کرتے ہیں کہ اسے ترقی ہو۔ کاش دہلی، اترپردیش اور بہار [illegible]علاقوں میں بھی جہاں اردو نے جنم لیا اور پروان چڑھی، ایسے ہی مخلص اور سرگرم عمل [illegible]ضرات پیدا ہو سکیں۔

افراد کے چندے جس رفتار سے آ رہے ہیں اس سے [illegible]

ہے کہ ہمارے قارئین اب کتاب نما کو نہ صرف یہ کہ بند نہ ہونے دیں گے بلکہ اسے ترقی دینے کے لیے ہمیں اپنے مفید مشوروں سے بھی نوازیں گے اور اس کی توسیع اشاعت میں بھی حصہ لیں گے۔

پچھلے شمارے میں ریحان احمد صاحب عباسی کا نام نہ پاکر اکثر احباب نے استفسار کیا ہے کہ کتاب نما کا مدیر مسئول اب کون ہوگا؟ نیز یہ کہ ریحان احمد صاحب کہاں چلے گئے؟

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، یہ رسالہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی طرف سے نکلتا ہے۔ عباسی صاحب مکتبے کے ایک رکن کی حیثیت سے اس کی ادارت کے فرائض ادا کرتے تھے۔ اب اُن کے ذمّہ مکتبے کے کچھ اور کام سپرد کردیے گئے ہیں۔ وہ مکتبہ میں ہی ہیں اور کتاب نما سے اب بھی کسی نہ کسی طرح وابستہ ہیں۔ آٹھ سال تک ریحان صاحب نے کتاب نما میں جو دلچسپی لی اس کے لیے ان کا شکریہ نہ ادا کرنا ناقدر شناسی ہوگی۔ راقم الحروف کو یقین ہے کہ وہ اب بھی جب کہ اپنے فرائض مفوضہ میں مصروف ہیں، کتاب نما کو نہ بھولیں گے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے عہدۂ جلیلہ پر پروفیسر ڈاکٹر عبدالعلیم کے تقرر کی خبریں آپ نے اخباروں میں پڑھی ہوں گی۔ ہمارے لیے یہ تقرر کئی اعتبار سے بڑی ہی مسرتوں کا موجب ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ ڈاکٹر صاحب موصوف جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ رہ چکے ہیں جہاں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اُردو اکیڈمی میں "فیلو" کی حیثیت سے کم و بیش چار سال (۲۹ - ۱۹۲۶) کام کیا اور جرمنی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد جامعہ ملیہ میں استاد کی حیثیت سے بھی کام کیا ہے۔ دوئم یہ کہ کئی سال سے آپ مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے ممتاز رکن کی حیثیت سے اپنے مفید مشوروں سے نوازرہے ہیں۔ تیسری اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ عرصے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سربراہی ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہے جو مسلسل سترہ سال سے یونیورسٹی کی زندگی میں رچ بس گیا ہے جو وہاں کے ہر چھوٹے بڑے سے واقف ہے اور وہاں کے مسائل سے اچھی طرح آشنا۔

ہم صدر جمہوریۂ ہند کو اُن کے حُسنِ انتخاب پر اور ڈاکٹر عبدالعلیم کو ان کے اس اعزاز پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ان کے عہد میں یونیورسٹی اپنے کھوئے ہوئے وقار کو جلد سے جلد حاصل کرلے۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین آباد

دوارکا داس شعلہ

غزل

آ گئی اس کو نظر شاید گھٹا چھائی ہوئی
میری توبہ اس لیے پھرتی ہے گھبرائی ہوئی

میکدے میں آکے بھی زاہد کا زاہد ہی رہا
آج میرے شیخ کی کس درجہ رسوائی ہوئی

میری باتوں پر ہنسے مے خوار و زاہد ایک ساتھ
کس قدر تضحیک ساماں میری دانائی ہوئی

ٹوٹ جانے کو ہے شاید رشتۂ امید بھی
ہر تمنا کیوں ہے ورنہ آج مرجھائی ہوئی

ان کی بے باکی کہ تھی ضرب المثل اب کیا ہوئی
آج خلوت میں نہ اٹھی آنکھ شرمائی ہوئی

شیخ صاحب آگئے ہیں اب تو بچنا ہے محال
موت ٹلتی ہے کہیں اے دوستو آئی ہوئی

(شعلہ زار" از دوارکا داس شعلہ۔ صفحات ۳۰۰ سائز ۲۶×۱۷/۸ مجلد قیمت ۶/- حوالہ صفحہ ۱۵۵)

تعارف

رابندر ناتھ ٹیگور کی ذات گرامی اور ان کے ادبی، تہذیبی اور ثقافتی کارنامے نیز حب الوطنی اور عظیم تعلیمی خدمات یقیناً اس قابل ہیں کہ ان سے قوم کے نونہالوں کو اچھی طرح سے واقف کرایا جائے۔ ان کے بارے میں معلومات کی کمی نہیں ہے، ان کی کتابوں اور ان کی سیاسی اور سماجی کوششوں سے اہلِ علم اور بڑی عمر کے پڑھے لکھے لوگ واقف ہیں لیکن اب تک کوئی ایسی مختصر، آسان اور جامع کتاب نہ تھی جس سے بچوں کو ان کے بارے میں صحیح اور مفید باتیں معلوم ہو سکیں۔ خوشی کی بات ہے کہ مکتبہ جامعہ نے اردو میں ایک ایسی کتاب شائع کر دی جس سے تمام ضروری باتوں کا علم ہو جاتا ہے۔ شاعرِ اعظم کی سیرت اور شخصیت کے قریب قریب سب ہی روشن پہلو سامنے آجاتے ہیں۔

زبان اور بیان کے لحاظ سے گو یہ کتاب بچوں کے لیے لکھی گئی ہے لیکن اس میں بہت سی باتیں بڑوں کے کام کی بھی ہیں۔ ۶۲ صفحے کی کتاب میں تیرہ چھوٹے چھوٹے عنوانوں کے تحت گرو دیو کی پوری زندگی سامنے لے آئی گئی ہے۔

کتاب کے شروع، درمیان اور اختتام سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ "بچپن"

"گرو دیو رابندر ناتھ ٹیگور ۷، مئی ۱۸۶۱ء کو بنگال کے ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوئے اُن کے خاندان کی مغل بادشاہوں کے آخری زمانے میں بڑی عزت تھی، انگریزوں کے دور میں بھی ان کی عزت و احترام میں فرق نہیں آیا۔

ٹیگور کے دادا دوارکا ناتھ بہت مالدار لیکن نیک آدمی تھے مصیبت کے وقت ہر ایک کی روپے پیسے سے مدد کرتے تھے۔ ان ہی نیک کاموں کی وجہ سے آج تک بنگال کے چھوٹے بڑے سب ان کا نام عزت سے لیتے ہیں۔

"ٹیگور کے والد دیویندر ناتھ بھی بہت سادہ زندگی گزارتے تھے اور ان کا اکثر وقت پوجا پاٹ میں گزرتا تھا۔ اسی لیے وہ "مہارشی" کہلاتے ہیں۔

رابندر ناتھ ٹیگور کے چودہ بھائی بہن تھے۔ ٹیگور ان سب سے چھوٹے تھے۔ جب یہ پیدا ہوئے ہیں تو ان کے بہت سے بھائیوں اور بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ اور ان کے بھانجے بھتیجے قریب قریب ان ہی کے عمر کے تھے۔

"ٹیگور کا خاندان بہت مال دار تھا لیکن بچوں کی پرورش بہت سادہ طریقے پر کی جاتی تھی۔ ان کے والد کو ٹھاٹ باٹ کی زندگی پسند نہ تھی۔ سارے خاندان کا کھانا پینا اور کپڑے دونوں ہی سادہ تھے۔ بچپن میں جوتے کا ایک سے زیادہ جوڑ نہ ہوتا تھا۔ دس سال کی عمر تک انھوں نے کبھی موزہ نہیں پہنا۔ ٹیگور کو بھی اپنے گھر کی سادہ زندگی بہت پسند تھی۔ لیکن اس سادہ زندگی کے باوجود گھر پر بچوں کی دیکھ بھال کے لیے کئی نوکر رکھے گئے تھے۔ ٹیگور کے بچپن کے ساتھی یہی نوکر چاکر تھے۔ جنھیں وہ بہت چاہتے تھے۔ بچپن میں ان کا زیادہ تر وقت ان ہی نوکروں کے ساتھ کٹتا تھا۔

جب ٹیگور چھوٹے سے تھے تو ایک کام چور نوکر انھیں گھر پر چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے باہر جانا چاہتا تھا تو برآمدے کے ایک کونے میں انھیں کھڑا کر دیتا اور چاک سے ان کے چاروں طرف ایک دائرہ بنا دیتا اور ڈرا کر کہتا کہ اگر اس دائرے سے باہر قدم رکھا تو کوئی نہ کوئی مصیبت آ جائے گی۔ ننھے ٹیگور نوکر کی اس ہوشیاری کو سمجھ نہ پاتے اور خاموش کھڑے سوچتے رہتے کہ کس طرح اس دائرے سے باہر نکل جائیں اور کوئی مصیبت بھی آنے نہ پائے۔ ابھی وہ کوئی ترکیب نکالنے بھی نہ پاتے کہ نوکر اپنے کام سے واپس آ کر اس دائرے کو مٹا دیتا اور ٹیگور کو گود میں اٹھا لیتا۔

"ٹیگور کے بچپن کا زیادہ تر حصہ گھر کی چار دیواری میں بسر ہوا۔ وہ نوکروں اور بھائی بہنوں کے بچوں کے ساتھ کھیلتے رہتے اور جب گھر کے سارے بچے اسکول چلے جاتے تو وہ اکیلے گھر کے برآمدے کے ایک کونے میں بیٹھے باہر کا تماشا دیکھا کرتے۔

گھر کے دوسرے بچے جب اسکول سے واپس آتے تو کبھی کبھی سب بچوں کے ساتھ ٹیگور نوکر کے کمرے میں جاتے جس میں ایک دھیما سا چراغ جلتا رہتا۔ اس زمانے میں بجلی نہیں تھی۔ نوکر انھیں رامائن کے قصے سنایا کرتا اور اکثر شام کے وقت ان کی والدہ "شاردا دیوی"

انھیں پریوں کی کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔
"ننھے ٹیگور گھر کے دوسرے بچوں کو اسکول جاتا دیکھ کر مچل جاتے اور ان کے ساتھ جانے کے لیے ضد کیا کرتے۔ لیکن ابھی وہ بہت چھوٹے تھے، اس لیے انھیں اسکول نہیں بھیجا جاسکتا تھا۔"

جلیان والے باغ کے واقعے سے متاثر ہوکر ان الفاظ کے ساتھ خطاب واپس کرتے ہیں۔

"مجھے اس "سر" کے خطاب کو باقی رکھتے ہوئے شرم آتی ہے جب کہ میرے ہندوستانی بھائیوں پر بغیر کسی قصور کے گولی چلائی جارہی ہے۔ میں اس ظلم کے خلاف اپنے ہندوستانی بھائیوں کا ساتھ دینا چاہتا ہوں، جو مجھے آپ کے "سر" کے خطاب سے کہیں زیادہ عزیز ہیں۔"

آخری زمانہ

جوں جوں ٹیگور کی عمر بڑھتی گئی ان کے گھومنے پھرنے کا شوق بجائے کم ہونے کے بڑھتا ہی گیا وہ گھوم پھر کر ساری دنیا کے لوگوں تک اپنا پیام پہنچانا چاہتے تھے۔ سیاست، نسل، رنگ اور ذات پات کے بندھن توڑ کر مشرق اور مغرب کو گلے ملانا چاہتے تھے۔

ٹیگور کو دنیا میں ہر ایک سے پیار تھا۔ اُن کی قائم کی ہوئی وشوا بھارتی یونیورسٹی، ساری دنیا میں اُن کے پریم کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس کا مقصد ہی ساری دنیا میں میل ملاپ اور بھائی چارہ پیدا کرنا ہے اور جس میں مشرق و مغرب کی ساری اچھی باتیں جمع ہوگئی ہیں۔

ٹیگور بڑے دیش بھگت تھے۔ انھوں نے ہندوستان کی قومی تحریک میں ایسے وقت میں حصّہ لیا جب اس پر کڑے دن آگئے تھے۔ انھوں نے گاؤں سدھار جیسے اچھے کام پر پورا دھیان دیا اور گاؤں کی حالت بہتر بنانے کی بہت کوشش کی۔

گاؤں سُدھار کا ہر کام معمولی آدمی کے لیے تھکا دینے والا ہوتا ہے، مگر ٹیگور ایک غیر معمولی انسان تھے۔ اِن سارے کاموں کو کرتے ہوئے بھی اُنھوں نے ادب کی دنیا میں بڑا کام کیا اور ایک خاص مقام حاصل کیا۔

ٹیگور کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ خدا بڑی قدرت والا ہے، طاقت والا ہے۔ وہ چاہے تو سب لوگوں کو انسانیت کے ایک ہی رشتے میں جوڑ سکتا ہے۔ انھوں نے ایک گیت میں اس کو بہت خوب صورتی سے ظاہر کیا ہے۔

"داتا تو ہمارا پالن ہار ہے
اس بات کے ماننے میں ہماری مدد کر کہ تو ہمارا پالن ہار ہے
تو ہمارا اُجالا ہے۔ ہمارے اندھیرے کو دور کر دے
ہم میں جو بھلا ہے، اسے روشن کر دے۔ تو خوشی ہے، خیر ہے
خوشی اور خیر کے مالک ہم تیری بندگی کرتے ہیں"

اُنھیں یہ دیکھ کر بہت دُکھ ہوتا تھا کہ مذہب کے نام پر لوگ جھگڑے ہوئے ہیں۔ وہ انسانیت کو انسان کا دھرم سمجھتے تھے"
ٹیگور سنہ ۱۹۳۷ء کے بعد سے اکثر بیمار رہنے لگے تھے اور اب تو وہ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ قلم بھی نہ پکڑ سکتے تھے۔ .... جوں جوں دن گزرتے گئے، ٹیگور کی حالت اور خراب ہوتی گئی۔ انھیں اکثر بخار رہنے لگا۔ ان کے شاگردوں اور دوستوں نے ان کو ہر طرح کا آرام پہنچایا۔ بہت سے علاج کیے گئے لیکن ٹیگور کی صحت بگڑتی ہی گئی۔ آخر انھیں علاج کے لیے کلکتے لایا گیا۔ جس وقت ان کی موٹر آہستہ آہستہ اُن کے پیارے گھر شانتی نکیتن سے نکل رہی تھی تو سب کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ سب کے دل رو رہے تھے اور ہر ایک یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ پھر کبھی لوٹ کر اُس شانتی نکیتن کو نہ آسکیں گے، جسے انھوں نے اپنے خون پسینے سے سینچا تھا۔ آشرم کے تمام لوگوں نے آخری مرتبہ شانتی نکیتن کا گیت گایا جسے ٹیگور پھر کبھی نہ سُن سکے۔

"کلکتے میں اُن کا اچھے سے اچھا علاج ہوا۔ اُنھیں موت کے پنجے سے بچانے کی کوشش کوشش کی گئی۔ بڑے بڑے ڈاکٹر بلائے گئے لیکن وہ بھی کچھ نہ کر سکے اور آخر ظالم موت نے ۷ اگست سنہ ۱۹۴۱ء کو ہمارے پیارے گرودیو رابندرناتھ ٹیگور کو ہم سے ہمیشہ کے لیے چھین لیا۔ اس وقت اُن کی عمر ۸۱ سال تھی۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ وہ سکون اور شانتی کے اسی گھر میں دنیا سے اُٹھ گئے جس میں جنم لیا تھا۔"

کتاب کے آخری صفحے پر قومی ترانے کا نہایت صحیح متن اور پھر اس کا ٹرانسلیشن اور شستہ ترجمہ اُردو دانوں کے لیے بڑے کام کی چیز ہے۔

جناب صفدر حسین صاحب اس مفید کتاب کے مؤلف یا مرتب ہیں، $\frac{20 \times 30}{16}$ سائز اور ۶۲ صفحے کی یہ چھوٹی سی خوب صورت کتاب مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی شاخ بمبئی، شاخ دہلی اور صدر دفتر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے ایک روپیہ ۲۵ پیسے میں حاصل کی جاسکتی ہے۔

کتب موصولہ برائے تبصرہ

یادِ اثر	ڈاکٹر محمد اسلام	طرب منزل۔ جوہری محلہ لکھنؤ	۲۰×۳۰/۱۶	۱۰۰	۳/-
کالے کاغذ کی نظمیں		گوشۂ ادب بمبئی	۱۸×۲۲/۸	۱۲۸	۴/۵۰
شعلۂ جاوید		ادارہ نیشنل فرنٹ لدھیانہ	۲۰×۳۰/۱۶	۸۰	۲/-
افکارِ خوشتر	ڈاکٹر مختار احمد خاں خوشتر	مکتبہ دین و ادب لکھنؤ	۱۸×۲۲/۸	۴۴۰	۱۰/۵۰
روپے کی موت	نور پیکار	دلنواز پبلیکیشنز۔ بمبئی	،،	۸۸ ،،	نشنخ نہیں
اردو شاعری میں تاج محل	شجاع خاور	،،	،،	۱۴۰	۱/۷۵
آسان مولود شریف	محمد صابر قلی خاں	علوی پریس۔ بھوپال	،،	۶۴ ،،	-/۷۵
فکرِ گستاخ	سید زوار حسین نقوی	دانش محل۔ لکھنؤ	،،	۱۰۴ ،،	۳/-
گفت و شنید	ظفر ادیب	قصرِ اردو۔ دہلی	،،	۳۰۴ ،،	۶/-
مجاز و حقیقت	نکہت شاہجہاں پوری	رائے صاحب رام دیال اگروال الٰہ آباد	،،	۲۷۲ ،،	۲/۵۰
سلسلہ انتخاب کلام شعرائے بہار ۲					
کلام عطا	عطا کاکوی	عظیم الشان بک ڈپو۔ پٹنہ	،،	۱۶ ،،	-/۳۷
،،	،،	،،	،،	۱۶ ،،	-/۳۷
یاس یگانہ چنگیزی	راہی معصوم رضا	شاہین پبلیکیشنز۔ الٰہ آباد	،،	۳۱۰ ،،	۶/-
رومہ	سرور جہاں	نسیم بک ڈپو۔ لکھنؤ	،،	۲۵۶ ،،	۴/۵۰
روسی انقلاب کی کامیابی	جان کیپ	نیشنل اکاڈمی۔ دہلی	،،	۳۶ ،،	-/۵۰
روس کا انقلاب	ستیہ پرکاش	،،	،،	،،	،،
شہر خموشاں	مظہر الحق علوی	نسیم بک ڈپو۔ لکھنؤ	،،	۲۸۰ ،،	۵/-
عرشیہ	نوشابہ سعید ناز	،،	،،	۱۹۲ ،،	۳/-
داد کی بے داد	عبد المجید سہالوی	،،	،،	۱۶۰ ،،	۲/۲۵
مشاعرہ عالم ارواح	سید مرتضیٰ حسن موسوی	،،	،،	۳۳۶ ،،	۴/-
بیسویں صدی کے کم چند اکابر غزل گو	ڈاکٹر محمد اسلام	،،	،،	۹۶ ،،	۲/-

بنگالی عوام اور بنگالی کے ادیب اور شاعر اُردو والوں کے ساتھ ہیں

حیدرآباد - شری جوتش چندر گھوش نے جو بل ہال میں مکمل بھارتیہ بنگا ساہتیہ سمیلن کے اُردو اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے اُردو زبان اور اس کے ادب کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا اور کہا کہ یہی وہ زبان ہے جو ہندوستان کے طول و عرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہے - بنگال میں بنگالی کے بعد یہ زبان عوام کے ایک بڑے طبقے میں رائج ہے - اور اس زبان نے ہمارے ادب کو متاثر کیا ہے - یہ ایک شیریں اور وسیع زبان ہے جس کے شیدائیوں میں راجہ رام موہن رائے سے گرودیو ٹیگور تک ہزاروں نام لیے جا سکتے ہیں -

انھوں نے اُردو اور ہندی کے سوال پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح ہندی بھی قومی زبان کہلائی جا سکتی ہے لیکن وہ ایک کامیاب رابطہ کی زبان نہیں بن سکتی - انھوں نے بتایا کہ وزیر اعظم نہرو ہندی کو موجودہ موقف دینے کے لیے تیار نہیں تھے - سیٹھ گوبند داس اور ہندی کے دوسرے انتہا پسندوں سے انھوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ہندی کو پورے ملک پر کیسے مسلط کیا جا سکتا ہے جب کہ خود اتر پردیش میں ہندی والوں کی نہیں بلکہ اُردو بولنے والوں کی اکثریت ہے انھوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ ٹنڈن جی اور ہندی کے دوسرے انتہا پسند جب ہم سے ملتے تو یہی کہتے کہ ہم بنگالی یا کسی اور زبان کی خلاف نہیں - ہم تو اُردو کے مخالف ہیں اس لیے ہندی راشٹر بھاشا بنے گی تو اس سے بنگالی یا کسی دوسری زبان کو کوئی نقصان نہیں ہوگا - ہندی والوں کی اُردو سے یہ مخالفت نہ تو اُس وقت ہمارے سمجھ میں آئی تھی اور نہ آج سمجھ میں آتی ہے - انھوں نے موجودہ ہندی کی مخالفت کی اور کہا کہ اس زبان کو کبھی مقبولیت نصیب نہ ہو سکے گی - پنڈت نہرو اس راز کو پا گئے تھے اس لیے وہ کہتے تھے کہ ملک میں صرف اس زبان کا چلن ہو سکتا ہے جس کو گاندھی جی اور گرودیو ٹیگور سمجھ سکتے ہیں، اس سے ان کی مراد اُردو تھی - شری گھوش نے کہا افسوس

کہ ایک ووٹ کی اکثریت سے ہندی بازی لے گئی اور لسانی خلفشار کا بیج بو گئی۔

شری انل برن گنگو اُپادھیائے ایڈیٹر پبلیکیشن ڈویژن دلی نے اردو اور بنگالی کی مشترک قدروں کا تفصیلی جائزہ لیا اور کہا کہ بنگالی میں بیسیوں الفاظ اور استعارے اور محاورے اردو کے موجود ہیں اور ان سے ہم اپنی زبان اور ادب کے حُسن کو نکھارنے کا کام لیتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ بنگالی شاعر غالب، ظفر اور واجد علی شاہ سے بہت متاثر ہیں۔ انھوں نے ٹیگور اور بعض دوسرے ممتاز بنگالی شاعروں کا کلام اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں پیش کیا۔

انھوں نے دلی اور بنگال کے درباروں کے ذریعہ پیدا ہونے والے تہذیبی اور سماجی روابط کی تفصیل بیان کی اور کہا اس کے گہرے اثرات ہماری تہذیب، معاشرت اور زبان میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے قاضی نذر الاسلام کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری کے ذریعہ بھی اُردو اور فارسی کی روایات بنگلہ ادب میں داخل ہوئی ہیں۔

آخر میں انھوں نے بتایا کہ ہمارا سرچشمۂ فیضان ہمارے عوام ہیں ہمارے عوام کا ایک حصّہ اُردو تہذیب کا علمبردار ہے، اس لیے ہم کو یہ زبان اور اس کی تہذیب بھی اتنی ہی عزیز ہے جتنی بنگالی زبان اور اس کی تہذیب عزیز ہے۔

شری دکھنا رنجن بوس نے مغربی بنگال کے ادیبوں اور شاعروں کی طرف سے اُردو زبان اور اس کے ادب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ بنگلہ اور اُردو اس دیس کی دو میٹھی، ترقی یافتہ اور وسیع زبانیں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اُردو کو پاکستانی زبان کہنا انتہائی گمراہ کن ہے اور اگر اردو پاکستان کی زبان ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ بنگالی بھی پاکستان کی زبان ہے کیونکہ بنگالی مشرقی پاکستان میں بولی جاتی ہے اور اس علاقے کی سرکاری زبان ہے۔

ہندی اُردو کے سوال پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے شری بوس نے کہا کہ سیٹھ گووند داس اور ان کے ساتھی ہندی کے لیے تشدد کا راستہ اختیار کر کے لوگوں کے دلوں میں نفرت اور بے زاری کے جذبات پیدا کر رہے ہیں۔ انھوں نے اُردو کے نام پر برپا کیے جانے والے فسادات کی مذمت کی اور رانچی کے فسادات کا خاص طور پر ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ واقعہ ہندوستان کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے۔ انھوں نے یقین دلایا کہ بنگالی عوام اور

بنگال کے ادیب اور شاعر اُردو والوں کے ساتھ ہیں۔

شری دبیس داس نے اُردو زبان کی وسعت اور اس کی اثر انگیزی اور اثر پذیری کو سراہتے ہوئے کہا کہ یہ ایک زندہ اور بیدار زبان ہے اور اس کی جڑیں ہندوستانی سماج میں پیوست ہیں۔ اس زبان نے ایک تاریخی فریضہ انجام دیا ہے اور ہماری رہنمائی کی ہے جس کو کوئی دیسی زبان فراموش نہیں کر سکتی۔ یہی وہ زبان ہے جو پہلی بار اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنی۔ جب بھی جامعہ عثمانیہ کا نام کسی کی زبان پر آتا ہے تو ہمارا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔

انھوں نے اُردو زبان کے آغاز و ارتقا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ وہ زبان ہے جو لشکروں اور بازاروں سے درباروں میں پہنچی اور ہمارے دلوں میں سما گئی جس طرح یہ زبان ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں رائج ہے ویسے ہی بنگال میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہ زبان ہم کو عزیز ہے اس لیے کہ بنگالی زبان کے ذخیرے میں اس سے اضافہ ہوا ہے۔ یہی نہیں اس نے ہم کو نئے محاورے، نئے اسلوب، نئی تشبیہات، نئے استعارے، نئے محاکات دیے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بنگالی زبان دوسرے زبانوں سے بھی متاثر ہوئی ہے لیکن اُردو سے اس کا تعلق بہت گہرا ہے۔

انھوں نے کہا کہ اُردو حب الوطنی کی زبان ہے۔ اس زبان کی حفاظت ہم سب کا فرض ہے۔

اس اجلاس کو ڈاکٹر راج بہادر صاحب گوڑ اور زینت ساجدہ صاحبہ نے بھی مخاطب کیا۔ اجلاس کی صدارت پروفیسر حبیب الرحمٰن نے کی۔

(بشکریہ ترقی اُردو۔ حیدرآباد)

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی زیر طبع کتابیں

شرابِ کہنہ — قلی قطب شاہ تا حالی ۔ ۵۰ شعرا کے حالات مع انتخاب کلام — مرتبہ رشید نعمانی

دلّی کی شام — مشہور انگریزی ناول TWILIGHT IN DELHI کا اُردو ترجمہ
مصنف احمد علی مترجم بلقیس جہاں

شہر آشوب — ۱۸۵۷ء سے پہلے اور ۱۸۵۷ء میں لکھے گئے شہر آشوبوں کا مجموعہ — مرتب نعیم احمد

پریم چند کے خطوط — منشی پریم چند کے ۲۵۰ غیر مطبوعہ خطوں کا مجموعہ — مرتب مدن گوپال

پاکستانی مطبوعات

نام کتاب	مصنف	قیمت
اقبال اور ملا	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم	۱/۵۰
اسلام اور سائنس	محمد رفیع الدین	۲/۵۰
اسلام مشرق میں	مولانا وحید احمد	۴/۵۰
اسلام اور عادل احسان	رئیس احمد جعفری	۶/۵۰
اسلامی معاشرہ	ضیاء الدین کرمانی	۱/۷۵
اشاعت اسلام	مولانا حبیب الرحمٰن	۶/۵۰
ادب اور تنقید	ڈاکٹر سید شاہ علی	۴/۵۰
اسلامی تعلیم	سر محمد یامین خاں	۳/۵۰
اخلاقیات	سی۔ اے۔ قادری	۳/۵۰
انسان کی زندگی	انڈریف	۱/۵۰
آزاد تعلیم اور تہذیب نفس	اے ڈی گرز وولڈ	۳/۵۰
اسلام کیسے شروع ہوا	عبدالواحد سندھی	۳/-
اقبال کا تصور خودی	ڈاکٹر عابد حسین	۱/۵۰
آتش سیال	عارف	۴/-
افضلیت شیخین	شاہ عبدالعزیز دہلوی	۱/۶۲
آداب زندگی	محمد اقبال سلیمان	۴/-
افکار معری	عبدالرحمٰن طاہر سورتی	۲/۵۰
انوار الصفار	محمد خصلت حسین صابری	۴/۵۰
اعجاز حدیث	محمد صادق سیالکوٹی	۲/۵۰

نام کتاب	مصنف کا نام	قیمت
اسلام کا نظریہ جنگ	مولانا ابوالکلام آزاد	۲/۲۵
بیان حال	وقار انبالوی	۳/-
بادشاہ بیگم اودھ	" "	۳/۵۰
بچوں کی نفسیات	ڈاکٹر عبدالرؤف	۴/-
بچوں میں جرائم پسندی	شیلڈن	۴/-
بُستان	خلیل جبران	۲/-
بہترین نظمیں	" "	۲/۵۰
بھولی بسری کہانیاں	ابن حنیف	۵/-
بھائی بہن	اے آر خاتون	۲/-
بابز لبستن	ایڈتھ وارٹن	۴/۲۵
بام رفعت	آختر صہبائی	۳/-
بہترین نظمیں	" "	۱/۵۰
بہو بیگم	عادل رشید	۶/-
بنی آدم	اسٹوارٹ چیس	۱۰/-
برگ خزاں	عبدالعزیز خالد	۴/-
برق و مقناطیس	پروفیسر حمید عسکری	۱۰/-
بچہ پانچ سے دس سال تک	ڈاکٹر آرنلڈ گیسل	۱۵/-
بستان العارفین	امام ابوزکریا محی الدین	۱/۵۰
بستان المحدثین	شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی	۴/-

یہ کتابیں صرف مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی نمبر ۳ سے مل سکتی ہیں۔

جامِ نو

چکبست

۱۸۸۲ — ۱۹۲۶ء

چکبست، کشمیری پنڈتوں کا ایک مشہور اور معزز خاندان ہے، یہ لوگ اپنے آبائی وطن سے آکر لکھنؤ میں آباد ہو گئے تھے۔ پنڈت برج نرائن۔ چک بست، اسی سلسلے کے ایک نامور فرد تھے۔ پیدا تو فیض آباد میں ہوئے۔ لیکن تعلیم و تربیت، ایک قانون داں کی حیثیت سے زندگی کا آغاز، ایک شاعر اور نقاد کی حیثیت سے شہرت یہ سب کچھ لکھنؤ میں رہ کر حاصل کی۔

۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج (لکھنؤ) سے بی اے اور پھر ایل، ایل، بی کی ڈگری لے کر وکالت کرنے لگے۔ اپنی ملنساری، تہذیب و شرافت، ذہانت اور قانونی سوجھ بوجھ کی بدولت جلد ہی کامیاب اور مشہور وکیلوں میں گنے جانے لگے۔

ایک مقدمے کی پیروی میں رائے بریلی (اُتر پردیش) گئے تھے، واپسی میں دماغ پر فالج گرا، جو بالآخر موت کا سبب بن گیا۔ محشر لکھنوی نے کیا خوب تاریخ نکالی ؎

اُن ہی کے مصرع سے تاریخ ہے ہمراہِ عزا   موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

(۱۳۴۴ھ)

ایک وکیل اور ایک شاعر دونوں حیثیتوں سے چک بست قدر و عزت کے مستحق ہیں۔ وکالت کی مصروفیتوں کے باوجود وہ شعر و ادب کی طرف بھی متوجہ رہے اور اس کو فائدہ پہنچاتے رہے۔

شعر و سخن کی طرف شروع ہی سے مائل تھے۔ کہتے ہیں کہ پہلی غزل نو برس کی عمر میں لکھی تھی۔ اساتذہ کے کلام کا بڑا اچھا اور وسیع مطالعہ تھا۔ آتش، غالب اور انیس کے بڑے مدّاح اور قائل تھے۔ کلام میں ان مشاہیر کا اثر اور اتباع موجود ہے۔ چک بست نے نہ اپنا کوئی تخلص رکھا اور نہ کسی کے شاگرد ہوئے۔

عشق و محبت کے مضامین اور معاملات نظم کرنے کے بجائے انھوں نے قوم کو بیدار

کرنے کی کوشش زیادہ ضروری سمجھی۔ چناں چہ ان کے کلام میں حب الوطنی کے احساسات نمایاں ہیں۔ وقت کے بعض مسائل اور سیاسی امور پر بھی کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ ہندوستان کی بعض روایتیں اور چند مخصوص قدریں اُن کو بہت عزیز تھیں۔ مغرب کی تقلید ان کو پسند نہ تھی مناظر کی عکاسی خوب صورتی سے کی ہے۔ دوستوں اور سیاسی رہنماؤں کی موت پر پُرخلوص اور درد انگیز مرثیے لکھے ہیں۔ اسی بنا پر اپنی زبان اور اپنے ملک کے چند قابلِ احترام قومی شاعروں میں ان کا شمار ہے۔

"چکبست" کے کلام کا مجموعہ "صبحِ وطن" اپنی ضخامت کے لحاظ سے کم ہو تو ہو مگر اپنی خصوصیتوں اور بہت سی شاعرانہ خوبیوں کے اعتبار سے کم نہیں۔

انتخاب

تغزّل

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب — موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

اگر دردِ محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا — نہ مرنے کا الم ہوتا، نہ جینے کا مزا ہوتا

یہ رنگِ شفق ہے کہ لہو اہلِ وفا کا — کچھ داغ نظر آتے ہیں دامانِ سحر میں

ختم ہوتا نہیں کیوں ہستیٔ ناشاد کا راگ
پا بہ گِل، جسم سہی، روح تو مجبور نہیں

نظمیں

سیر دہرہ دون

یہیں بہار کا پہلے پہل ہوا تھا شگون — عجیب خطۂ دل کش ہے شہر دہرہ دون
سپرد ابر کے ہے انتظام پانی کا — ہوائے سرد کو ہے حکم باغبانی کا
طلسم حُسن کا ہے بیچ میں یہ گُل دستہ — کھڑے ہیں کوہ و شجر پہلوؤں میں صف بستہ
یہاں جو آکے مسافر قیام کرتے ہیں — یہ سنتری انھیں پہلے سلام کرتے ہیں

نگہ کو دُور سے، پانی ہے یوں نظر آتا — سپیدناگ چلا جارہا ہے بل کھاتا
اثر دکھاتا ہے قدرت کا نغمۂ دلگیر — شجر شجر سے ٹپکتی ہے راگ کی تاثیر

خاکِ ہند

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے — دریائے فیضِ قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل رواں ہے — اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عز و شاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشیدِ پُر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی
اس خاکِ دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری — چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری — چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری
شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیٔ کہن میں

رامائن کا ایک سین

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال — خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال — سکتا سا ہو گیا ہے، یہ ہے شدتِ ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے
رہ کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں — میں جانتی ہوں جس لیے آئے ہو تم۔ یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں — لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں
کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں
پھر عرض کی یہ مادرِ ناشاد کے حضور — مایوس کیوں ہیں آپ الم کا ہے کیوں وفور
صدمہ یہ شاق عالمِ پیری میں ہے ضرور — لیکن نہ دل سے کیجیے صبر و قرار دُور
شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہے پروردگار کی

ان آنسوؤں کی قدر تمھیں کچھ ابھی نہیں
باتوں سے جو بجھے یہ وہ دل کی لگی نہیں
لیکن تمھیں ہو رنج یہ میری خوشی نہیں
جاؤ سدھارو خوش رہو میں روکتی نہیں

دنیا میں بے حیائی سے زندہ رہوں گی میں
پالا ہے میں نے تم کو تو دکھ بھی سہوں گی میں

بن باس پر خوشی سے جو راضی نہ ہوں گا میں
کس طرح منہ دکھانے کے قابل رہوں گا میں
کیوں کر زبانِ غیر کے طعنے سنوں گا میں
دنیا جو یہ کہے گی تو پھر کیا کہوں گا میں

لڑکے نے بے حیائی کو نقشِ جبیں کیا
کیا بے ادب تھا باپ کا کہنا نہیں کیا!

گوپال کرشن گوکھلے

مرثیہ

لرز رہا تھا وطن جس خیال کے ڈر سے
وہ آج خون رلاتا ہے دیدۂ تر سے
صدا یہ آتی ہے پھل، پھول اور پتھر سے
زمیں پہ تاج گرا قومِ ہند کے سر سے

حبیب قوم کا دنیا سے یوں روانہ ہوا
زمیں الٹ گئی کیا منقلب زمانہ ہوا

اجل کے دام میں آنا ہے یوں تو عالم کو
مگر یہ دل نہیں تیار تیرے ماتم کو
پہاڑ کہتے ہیں دنیا میں ایسے ہی غم کو
مٹا کے تجھ کو اجل نے مٹا دیا ہم کو

جنازہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے
سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

کشمیر

پانی میں ہے چشموں کے اثر آب بقا کا
ہر نخل پہ عالم خضر سبز قبا کا
جو پھول ہے گلشن میں وہ ہے نور خدا کا
سائے میں شجر کے ہے اثر ظلِّ ہما کا

مبدا کرم عام کی ہر جوئے رواں ہے
سرچشمۂ فیضِ چمن آرائے جہاں ہے

چھوٹے ہوئے اس باغ کو گزرا ہے زمانہ
تازہ ہے مگر اس کی محبت کا فسانہ
عالم نے شرف جن کی بزرگی کا ہے مانا
اٹھے تھے اسی خاک سے وہ عالم و دانا

تن جن کا ہے پیوند اب اس پاک زمیں کا
رگ رگ میں ہماری ہے رواں خون انھیں کا

جائزے

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

گلشنِ ہند (تذکرہ شعرائے اُردو)

مصنف: سید حیدر بخش حیدری
مرتب: مختار الدین احمد
صفحات: ۳۰۴ سائز $\frac{20\times30}{8}$
قیمت: ۵ روپے
ناشر: علمی مجلس دہلی

فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے منسلک رہ کر جن لوگوں نے اُردو کی ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی ہیں، ان میں حیدری اک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے جو کتابیں تصنیف و تالیف کی تھیں یا جن کا ترجمہ کیا تھا، ان کے نام اور نوعیت سے اہلِ علم واقف ہیں۔

۲۸۹ شاعروں کا (اُردو میں) یہ تذکرہ خواہ "گل دستۂ حیدری" کا ایک ضمیمہ یا ترجمہ ہی کیوں نہ رہا ہو، اُردو کے تذکروں میں ایک نئے تذکرے کی دریافت اور ان کی تعداد میں بہر حال ایک اضافے کا سبب ضرور ہے۔ اس کا پتا چلانا، اس کو حاصل کرنا اور ایک خاص اہتمام اور صحت کے ساتھ پہلی بار اس کو شائع کرنا ان تمام کاموں کا سہرا بلاشبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد کے سر ہے۔

مرزا لطف کا "تذکرہ بھی اسی نام سے موسوم اور مشہور ہے۔ وہ ۱۸۰۱ء میں لکھا گیا تھا اور یہ تذکرہ اس کے سال دو برس بعد کا ہے۔

حیدری نے جس طرح "گلشنِ ہند" کو مرتب کیا تھا اگر اسی طرح اسے شائع کر دیا جاتا تو اس کی — قدامت کے سوا — اور کوئی اہمیت نہ ہوتی۔ کیوں کہ حروفِ تہجی کی ترتیب سے شاعروں کے نام، تخلص، مبہم حالات اور بہت ہی مختصر اور معمولی انتخابِ کلام سے آج کے پڑھنے والے کو تسکین ہوتی نہ فائدہ پہنچتا — مگر اسے مفید اور زمانۂ حال کی ضرورتوں کے مطابق شکل دینے میں ڈاکٹر مختار الدین احمد نے وہی سب کچھ کیا ہے جس کی ایک مبصر اور عالم سے توقع کی جا سکتی تھی۔ تذکرہ نگار اور تذکرے کے بارے میں تمام ضروری معلومات، شعرا کے

بارے میں تشریحی اشارے، ان کی معتبر تاریخہائے وفات اور بعض غلطیوں کی تصحیح وغیرہ کر کے انھوں نے نہ صرف اس تذکرے کی اہمیت و افادیت بڑھادی ہے بلکہ اپنی تحقیقی صلاحیتوں اور فاضلانہ سوجھ بوجھ کا بھی ثبوت دیا ہے — کیا اچھا ہوتا اگر حواشی میں کرکے وفات کے ساتھ ساتھ ولادت کے سنہ بھی درج کر دیے جاتے اور ہجری کے برابر سنہ عیسوی بھی لکھ دیا جاتا —

امید ہے اسی پائے کے صاحبانِ علم و دانش کی بدولت اور علمی مجلس دہلی کی معرفت ایسی ہی اور بھی گوشۂ گم نامی میں پڑی ہوئی کتابیں سامنے آتی رہیں گی۔

رشید نعمانی

ظلِّ ہما

مصنف: الکزنڈر ڈیوما

مترجم: مظہر الحق علوی

صفحات: سائز ۱۸×۲۲/۸ مجلد

قیمت: پندرہ روپے

ناشر: نسیم بک ڈپو لکھنؤ

سنسنی خیز ناولوں کے مصنف کی حیثیت سے الکزنڈر ڈیوما کا نام خاص شہرت کا مالک ہے۔ لیکن شہرت کی مناسبت سے شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس طرح کے ناولوں کے ترجمے پیش کرنے کے سلسلے میں مظہر الحق صاحب علوی کا نام بھی بحیثیت مجموعی کسی مصنف سے کم مشہور نہیں ہے۔ علوی صاحب کے قلم سے مختلف مصنفوں کے قابلِ ذکر شاہ کار ترجمہ ہو کر اپنی مقبولیت کا سکہ جما چکے ہیں۔ ان کے ترجموں کی صاف اور شستہ زبان، عبارت میں روانی اور تسلسل غرض ہر طرح وہ ایک بہترین اور عمدہ ترجمہ کہلائے جانے کے مستحق ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہر ناقد اس کا اعتراف کرتا نظر آتا ہے کہ ان کے ترجمے کہیں سے بھی ترجمہ نہیں معلوم ہوتے بلکہ ان پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔

زیرِ نظر ناول ایک غریب اور سادہ دل ملاح کی کہانی ہے جس کے ساتھ اس کے دوستوں نے صرف حسد کی وجہ سے غداری کی اور پھر ایک سازش کے ذریعے اسے عمر بھر کے لیے ایسی بھیانک کال کوٹھری میں بند کر دیا کہ جہاں ہلکی سی روشنی بھی نہ آسکتی تھی اور جس کے بارے میں سب جانتے تھے کہ جیتے جی کوئی اس

آزاد نہ ہو سکا۔ اس گھناؤنی سازش اور پھر ان چودہ برسوں کی طویل قید کی کہانی جس میں تمام جزئیات کا تفصیلی ذکر ہے، ناول کے بہت کم صفحوں میں آگئی ہے۔ لیکن اس کے بعد جب ناول کا ہیرو کسی طرح اس جیل سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور پھر کسی طرح اس کے پاس بے پناہ دولت بھی آجاتی ہے تو کہانی بالکل ایک نیا موڑ اختیار کر لیتی ہے۔ ناول کے ہیرو نے اپنے دوست نما دشمنوں سے جو جو تکلیفیں اٹھائی ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے عام حالات میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یا تو وہ خود دشمنوں کا گلا گھونٹتا نظر آتا یا پھر اپنی اس دولت کے سہارے فوری طور پر ان سب کو کیفر کردار تک پہنچاتا۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرتا بلکہ بڑے صبر و تحمل کے ساتھ جس طرح مناسب وقت کا انتظار کرتا ہے اور مناسب موقعوں پر سزائیں دیتا ہے تو بے اختیار طبیعت عش عش کر اٹھتی ہے۔ 'ظل ہما' مظہر الحق علوی کے 'سلور جبلی ناول' کی حیثیت سے شائع ہوا ہے۔ اس میں سنسنی خیز حالات اور جہاں گیری کارناموں کے ساتھ ساتھ دوسری دلچسپیوں کا بھی سامان موجود ہے اور مجموعی طور پر ہر طرح اس قابل ہے کہ بجا طور پر اس کی ستائش کی جائے۔

ریحان احمد عباسی

آبگینے (شعری مجموعہ)

مرتب: حسن فرخ
صفحات: ۱۰۰ سائز: ۲۰×۳۰/۸
قیمت: ایک روپیہ
ناشر: ادارۂ مصنفین نو، ۲۸۶۔سی، اعظم پورہ حیدرآباد۔ ۲۴

'آبگینے' جس کوشش اور کاوش کا نتیجہ ہے وہ ہر اعتبار سے لائق ستائش ہے اور اس کی بنیاد کے طور پر جس روش کو اختیار کیا گیا ہے وہ بھی مستحسن ہے، لیکن اچھا ہے اگر ؏

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ضرورت اس بات کی ہے کہ کام کیا جائے اور اسے صاف ستھرا کیا جائے، اس کی ضرورت نہیں کہ اغراض و مقاصد کا اظہار اس انداز سے کیا جائے کہ کہیں ادب کا جمود نقادوں کے

ذہن میں دیکھا جائے اور کہیں اپنی ناآسودگی کو تسکین دینے کے لیے بڑے ادیبوں اور مدیروں سے شکوہ شکایت کا طومار باندھا جائے۔ نئے ادیب ہونے کے مرحلے سے وہ بھی گزرے ہیں، یہ اُن کا پائے استقامت ہی تھا جس نے اُنھیں منزل رسی کا انیاز دیا، اگر وہ خلوص اور لگن سے اپنی تخلیقات کو برابر پیش نہ کرتے رہتے تو اُنھیں پہچانا بھی نہ جاتا۔

'آبگینے' میں ہندوستان کے مختلف حصّوں کے شعرا نے حصّہ لیا ہے اور اسے جس خوبی، خوب صورتی، حسن اور ترتیب سے شائع کیا گیا وہ سب کچھ اسے قابلِ قدر بناتا ہے واقعی اس میں شامل نظموں میں نیا ذہن جھلکتا ہے لیکن اس ذہن سے بے راہ رو ہو جانے کا بھی اندیشہ کیا جا سکتا ہے اس لیے ہر انداز میں اعتدال اور توازن کو ملحوظ خاطر رکھنا ہی مناسب ہوگا۔ کامیابی ہر اس کوشش کو مقدّر ہوتی ہے جو اپنی قوتِ کار کو اِدھر اُدھر ضائع نہ کرے اور مقصد کے حصول میں لگی رہے۔

اس شعری مجموعے میں تیرہ فن کاروں کی کاوشیں شامل ہیں۔ یہ فن کار بہار، حیدر آباد، اورنگ آباد، بمبئی، بنگال، کلکتہ و جمشید پور سے تعلق رکھتے ہیں، ان سے مستقبل میں کتنی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں، وہ ان کی ان منتخب تخلیقات سے ظاہر ہو جاتا ہے، بعض کے بارے میں تو یہ کہا جا سکتا ہے "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" لیکن اِن ہی ہونہاروں کو ابھی بہت کچھ سنورنا اور نکھرنا ہے ظاہر ہے کہ یہ جب ہی ہو سکتا ہے جب وہ کلاسکی قدروں کو بھی پیش نظر رکھیں۔ نئی قدریں بالکل نئی نہیں ہوتیں۔ اُن کی جڑیں پُرانی قدروں میں ہوتی ہیں۔ اس مجموعے کے بعض شعرا کے یہاں اس کا فقدان پایا جاتا ہے اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر آزاد نظم کی روش اپنائی جانی ہی بہتر ہوتی ہے، جیسا کہ غیاث متین، اکمل حیدر آبادی، مسعود عابد اور دوسرے شاعروں نے کیا ہے۔

کچھ لوگوں کے یہاں کہیں کہیں ہیئت اور اسلوب کا حُسن بحال رہا ہے وہاں معنویت عجب بہار دکھاتی ہے اور دل و دماغ کو اپنا گرویدہ کر لیتی ہے، جیسے

اپنے حصّے میں بہاروں کا کوئی پھول بھی ہے
مسکراتے ہوئے موسم کی ادا سے پوچھیں

(پرکاش فکری)

یہی ہے رسم شراب خانہ اسی کو دستورِ عام کہیے
جو داغ چمکے تو چاند کہیے جو زخم چھلکے تو جام کہیے

ہزار شعلہ بدست خاروں نے ہر قدم پر الجھنا چاہا
تمہارے خیابوں کے پیکروں کو رہے مگر پیرہن سلامت

(ممتاز راشد)

دلِ تباہ میں زخموں کی کچھ کمی ہے ابھی
نہیں جو تیغِ ادا، ناوکِ نگاہ چلے

یہ کیا غضب ہے غمِ یار کیا قیامت ہے
سوا ہے تجھ سے بھی احساسِ روزگار ہمیں
(قمر اقبال)

ہم سے کیا پوچھتے ہو دشت نوردی کا مآل
پھول کی آس میں خاروں میں بھٹکتے ہی رہے
(روشن خیال)

گرد کیا چاند کے چہرے پہ پہنچ سکتی ہے
غم تمھارا غمِ ایّام میں ضم کیا ہوگا

تما خیال، تری یاد، تیری دھڑکن لے کر
چلا تو ساتھ مرے ساری کائنات ہوئی
(محمد علی ذکی)

اسی طرح کچھ نظمیں بھی توجہ چاہتی ہیں۔ اور اُن کے خیال و اظہار کی داد دینی پڑتی ہے اگرچہ ایسی نظموں کی تعداد زیادہ نہیں۔

ظفر ادیب

نگارِ فکر

مصنف: کریم اسدی
صفحات: ۱۸۴ سائز: $\frac{20\times30}{16}$
قیمت: ۲ روپے ۵۰ پیسے
ناشر: مجلس اشاعت بھاگل پور

کریم اسدی صاحب بہار کے نئے شعرا میں سے ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے اپنے کلام کا مجموعہ 'نگارِ فکر' کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس میں غزلیں زیادہ اور نظمیں کم ہیں اُن کے کلام سے مشاقی کا احساس ہوتا ہے اشعار، پختگی اور موسیقیت لیے ہوئے ہیں طرزِ فکر قدیم تو نہیں لیکن روایتی ضرور لگتا ہے کہیں کہیں ایسے شعر بھی پڑھنے والے کو مل جاتے ہیں جن میں زندگی کے قرب کا پتا چلتا ہے۔ نظموں میں کوئی خاص قابلِ ذکر پہلو نہیں ملتا۔ لیکن غزلوں کا مطالعہ کرنے سے ایسا لگتا ہے کہ شاعر زندگی کے مشاہدے سے قدرے دور سہی لیکن عاری نہیں ہے۔ غزل میں قدیم رنگ حاوی ہے لیکن نیا پن بھی جھلکتا ہے اور یہ امید بندھتی ہے کہ اگر شاعر توجہ اور ذہنِ بیدار سے کام لے اور انسان سے متعلق بدلتے ہوئے حالات کو دیکھے اور اس کے دکھوں کو محسوس کرے تو اُس کا کلام آنے والے زمانے کو آج کا آئینۂ حالات پیش

کر سکتا ہے۔ کتاب اچھی چھپی ہے، کاغذ بھی بُرا نہیں اور جلد اور ٹائیٹل ایسا ہے جیسا کسی سنجیدہ مجموعۂ کلام کا ہونا ہی چاہیے۔ اہلِ ذوق اس کے مطالعے سے مایوس نہیں ہوں گے بلکہ تشنگی سے قرب محسوس کریں گے۔

تاجور سامری

سرِ اشک

شاعر: زخمی حصاری سائز: $\frac{20 \times 30}{16}$
صفحات: ۱۲۸ قیمت: ۳ روپے ۵۰ پیسے
ناشر: شری این۔ آر نردوش، لوہر روڈ کوٹھی، حصار

اس کتاب میں زخمی صاحب کی تقریباً ۱۰۰ غزلیں، ۸ نظمیں، ۳۰ رباعیاں اور ۴۰ قطعات شامل ہیں۔ کتاب کے شروع میں ابوالفصاحت جناب جوشؔ ملسیانی صاحب کا دعائیہ اور جناب جگرؔ بریلوی صاحب کا اظہارِ رائے شامل ہے۔ زخمی صاحب نے اپنے کلام کی اصلاح پہلے سیمابؔ اکبرآبادی صاحب سے لی اور بعد میں جناب جوشؔ ملسیانی صاحب سے سلسلۂ تلمذ قائم کیا جو اب بھی قائم ہے۔ ظاہر ہے جب ایسے قادر الکلام شاعروں سے فیضیاب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی ہو اور خود شاعر بھی ذوقِ سلیم کا حامل ہو تو پھر اس کے کلام کا کیا پوچھنا یہی وجہ ہے کہ زخمی صاحب کا کلام زبان و بیان کے اعتبار سے پختہ اور معنویت اور شعریت کے لحاظ سے عمدہ کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ جوشؔ صاحب نے اپنے دعائیہ میں ٹھیک ہی کہا ہے کہ "... ان بتدی شاعروں کے مقابلے میں جو زبان اور فن کی پروا نہیں کرتے اور کسی سے مشورہ لینا بھی عار سمجھتے زخمی صاحب کا کلام بدرجہا بہتر اور قابلِ قدر ہے۔" چند شعر ملاحظہ ہوں

سفینہ ہے نہ کوئی ناخدا ہے تلاطم کا سماں ہے اور میں ہوں
نہ منزل ہے نہ خضرِ راہ کوئی غبارِ کارواں ہے اور میں ہوں

شامِ غم کے گزارنے والو شامِ غم کی سحر نہیں ہوتی
کوئی آتا ہے کوئی جاتا ہے زندگی بے سفر نہیں ہوتی

امید ہے اُردو شاعری اور خاص طور سے دیسی شاعری کو پسند کرنے والے جو زندگی اور اس کے محسوسات کو شعروں میں اور قریب دیکھنا پسند کرتے ہوں، یہ کتاب خاصہ کا کام دے گی۔ کتاب اچھی چھپی ہے۔ جلد بھی دیدہ زیب ہے

ریحان احمد عباسی

سالنامہ: پیامِ تعلیم

"آج" بمبئی کی نظر میں

ماہنامہ پیامِ تعلیم کا سالنامہ اپنی صوری و معنوی اعتبار سے بے حد کارآمد اور بچوں کے لیے ایک بیش قیمت معلوماتی تحفہ ہے۔ ایڈیٹر محمد حسین حسان ندوی کی کوشش یقیناً قابلِ ستائش ہے جنھوں نے اتنا ضخیم اور اس قدر شان دار سالنامہ مرتب کرکے بچوں کے لیے معلومات کا خزانہ بڑی فراخ دلی سے بہم پہنچایا ہے ان کے ساتھ ساتھ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی ہمت کی داد دینی چاہیے جس نے کاغذ کے اس بحرانی دور میں انوکھے ٹائیٹل سے لے کر رنگین طباعت، کتابت اور اچھے کاغذ کی فراہمی میں دل کھول کر روپیہ صرف کرکے اردو ادب کی بقا کے لیے ایک اور سنگِ میل قائم کر دیا۔ سنگ برنگی ٹائیٹل اردو کے رسالوں میں نیا تجربہ ہے۔ کئی رنگوں میں شائع کرنے کی قابلِ تعریف جرأت سے کام لیا گیا ہے۔ ایک سو اسی صفحات پر مشتمل مضمونوں کی تصویروں سے مزین بہترین عنوانات کا ذخیرہ اپنے اندر بیسوں خوبیاں اور سیکڑوں دلچسپیاں لیے ہوئے ہے مضمونوں میں اکثر مقبول اور کہنہ مشق ادیب نظر آتے ہیں۔

تاریخ کے معلوماتی مضامین بہت دلچسپ ہیں۔ خاص طور سے شیر شاہ سوری کا مقبرہ" تاریخ کے معلوماتی مضامین بہت دلچسپ ہیں، خاص طور پر کرسٹوفر کولمبس، کیا دیکھا، گنبد سلطان محمد علی قطب شاہ، اور عورتوں کا شہر قابلِ ذکر ہیں۔ جانوروں اور پرندوں کے متعلق شکاری پرندے، زخمی چیتا، گینڈا، اور جانوروں میں شکار کے طریقے بہترین مضامین ہیں جن میں دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ معلومات کو بھی دخل ہے۔ "لکڑی کے لٹھے سے ایٹمی جہاز تک" یہ بھی اچھا معلوماتی مضمون ہے۔ اختر بریلوی کی رباعیات: "بنانے والا"، "سال نو"، "بڑا آدمی"، "ریل کا سفر" اور "مکتب کی سمت دوڑو" یہ نظمیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ لوک کہانیاں اور سائنس کے معلوماتی مضامین قابلِ تعریف ہیں۔ ایسے شان دار معلوماتی ذخیروں والے ماہنامہ پیامِ تعلیم کا سالنامہ اس قابل ہے کہ اسے خرید کر بچوں کو پڑھایا جائے جو معلومات میں اضافہ کا باعث ہے۔

عبدالحمید بیکس

نئی مطبوعات

ٹیگور	صفدر حسین	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی	۱/۲۵
چقماق کی ڈبیا	برکت علی فراق	" " " "	-/۴۰
خبر رسانی کے طریقے	رفیعہ امین	" " "	-/۸۰
فریدہ بیگم	بدر انجم	نسیم بکڈپو لکھنؤ	۴/۵۰
بھائی بہن	اے۔ آر خاتون	" " " "	۱/-
اردو شاعری کی ہندوستانی روح	زرینہ ثانی	" " "	۱/۵۰
نوشابہ	رئیس احمد جعفری	ذوق سلیم	۶/-
سنراج	عادل رشید	الہ آباد	۷/-
اکبر	مترجم رضیہ سجاد ظہیر	نیشنل بک ٹرسٹ	۳/۵۰
۱۹۶۶ء کی منتخب شاعری	مرتبہ راج نرائن راز، کمار پاشی	نازش بک سیلر	۲/-
شاد اُس کی شاعری	پورن کمار ہوش	مجلسِ اشاعت	۳/-
مباحث (دو حصے)	ڈاکٹر عبداللہ	کتب خانہ نذیریہ	۱۵/-
مسلمانوں کے روز و شب	مرتبہ اسد گیلانی	مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی	۳/۲۵
معروف و منکر	جلال الدین عمری	" " " "	۵/-
بدنصیب	مائل خیرآبادی	" " " "	-/۷۰
پیشین گوئیاں	"	" " " "	-/۵۰
بیوقوف کی تلاش	"	" " " "	-/۵۰
بچوں کی تربیت	ڈاکٹر عبدالرؤف	چمن بک ڈپو	۱/۵۰
بچوں کی رہنمائی	"	" " "	۱/۵۰
ضرورت ہے ایک قاتل کی	ہنسری ہالٹ	پنجابی پستک بھنڈار	۶/۵۰
ڈوبتے سائے	عادل رشید	" " "	۲/-
پہلا اور آخری خط	قاضی عبدالستار	مکتبہ افسانہ	۳/۷۵
آگ اور پانی (تمثیل)	طارق جمیلی	جامع مسجد گیٹ پورنیہ بہار	۱/-

ان کتابوں کو اپنی لائبریری کی زینت بنالیئے

کتاب	مصنف	قیمت
آشفتہ بیانی میری	پروفیسر رشید احمد صدیقی	۲/۵۰
خنداں	پروفیسر رشید احمد صدیقی	۵/۲۵
گنہائے گرانمایہ	پروفیسر رشید احمد صدیقی	۴/۵۰
تنقید کیا ہے	پروفیسر آل احمد سرور	۳/۷۵
ذکر غالب	مالک رام	۴/۲۵
بے بات کی بات	سیدہ نسیم چشتی	۴/-
تلامذۂ غالب	مالک رام	۷/۵۰
کربل کتھا	مالک رام	۷/۵۰
اُردو کے مصنفے	مولوی عبدالحق	۷/۵
روحِ اقبال	ڈاکٹر یوسف حسین	۸/-
کاروانِ فکر	ڈاکٹر یوسف حسین	۳/۷۵
حسرت کی شاعری	ڈاکٹر یوسف حسین	۱/-
پردیسی کے خطوط	مجنوں گورکھپوری	۲/۷۵
غزل سرا (اردو)	مجنوں گورکھپوری	۶/-
نقد اقبال	میکش اکبرآبادی	۴/۲۵
باغ وبہار (میرامن)	مرتبہ رشید حسن خاں	۲/-
تذکرۂ جگر	محمود علی خاں	۳/-
اُردو التیبر	ظہیرالدین مدنی	۳/-
اُردو مرثیہ	سفارش حسین	۶/-

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

اُردو بازار دہلی ۶ — پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳

ادبی خبریں

اُردو کی علمی و ادبی انجمنوں سے اپیل اُردو کمیٹی بمبئی ملک بھر میں پھیلی ہوئی اُردو کی علمی ادبی اور تہذیبی انجمنوں اور اداروں کی ایک مکمل فہرست مرتب کرنا چاہتی ہے تاکہ اُردو کی تحریک کو ملک گیر پیمانے پر منظم کرنے میں تمام اداروں اور ادبی انجمنوں کا تعاون حاصل کیا جا سکے اُردو کمیٹی ان اداروں اور انجمنوں کے ذمہ داروں سے یہ درخواست کرتی ہے کہ وہ ہمیں اپنا دستور، عہدہ داروں کے نام اور پتے، مطبوعہ رپورٹیں اور دوسرا ضروری لٹریچر روانہ فرمادیں اور اس کے ساتھ ہی اپنی سابقہ اور حالیہ سرگرمیوں سے مطلع فرمائیں تاکہ فہرست کو زیادہ سے زیادہ مکمل اور جامع بنایا جا سکے۔

اُردو دوستوں اور مخلص کارکنوں سے بھی التماس ہے کہ وہ ایسے اداروں اور انجمنوں کی تفصیلات روانہ کرنے میں مدد دیں۔

(سکریٹری، اُردو کمیٹی ۸۳ ابراہیم رحمت اللہ روڈ، بمبئی ۳) (بی آر)

شاعروں اور ادیبوں کی کانفرنس لکھنؤ میں ۲ اپریل سے ادیبوں اور شاعروں کی ایک کانفرنس شروع ہو رہی ہے جو چار دن تک جاری رہے گی۔ اس میں اس بات پر غور کیا جائے گا کہ جمہوریت میں ادیبوں اور شاعروں کا رول کیا ہونا چاہیے۔ اس میں لکھنے کے نئے رجحانات پر بھی تبادلہ خیالات کیا جائے گا۔ مشہور افسانہ نگار کرشن چندر اس کی صدارت کریں گے اور ڈاکٹر سمپورنانند اس کا افتتاح کریں گے۔ (بشکریہ الجمعیۃ دہلی)

حلقۂ احباب آرا کی ۴۵ ویں نشست ۶ جنوری سنہ ۱۹۶۸ء کو حلقۂ احباب آرا کی ۴۵ ویں ماہانہ گشتی و چوتھی سالانہ انتخابی نشست اور چوتھا عید طرحی مشاعرہ زیرِ طرح ؎ محتاج آفتاب نہیں ماہتاب کا۔ نصرت آروی صاحب کی صدارت میں جناب لطیف صاحب کے دولت کدے پر منعقد ہوئی۔ مشاعرہ کے اختتام کے بعد سالانہ انتخاب عمل میں آیا جس میں:

صدر۔ نصرتؔ آروی

نائب صدر۔ جے چند صاحب جین
معتمد۔ ش۔ م۔ عارف مارہروی
نائب معتمد۔ بدیع الحق صاحب
متفقہ طور پر منتخب ہوئے۔ دستور العمل کے مطابق پروفیسر رئیس امام صاحب، پروفیسر طاہر رضوی صاحب اور وسیم حیدر صاحب کو مجلس انتظامیہ کا رکن نامزد کیا گیا۔

۴۴ ویں نشست جناب برق صاحب کی نشست گاہ ملکی محلہ آمایز زیر طرح ؎
جلوہ بلائے چشم ہے نغمہ بلائے گوش ہے ۔ ۲۰ر فروری سنیچر کی شام کے ۷ بجے حسب دستور گشتی ہوگی۔ اور ۴۵ ویں نشست ۱۵ر فروری کو نائب صدر کے دولت خانے پر یوم غالب (غالب کی ۹۹ ویں برسی) کی صورت میں منعقد ہوگی ۔ حلقہ احباب آرا نے آرا کے سترہ موجودہ شعراء کے مختصر تعارف اور نمونہ کلام پر مشتمل ایک کتاب متاع سخن طبع کرائی ہے جس کی قیمت ایک روپیہ ہے

وسیم حیدر

ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ کے مالک جناب شبیر صاحب کا انتقال پُر ملال

۱۴ر جنوری ۶۸ء کو صبح ۵ بجے کے قریب ایجوکیشنل بک ہاؤس کے مالک جناب شبیر عرف بابومیاں کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم نے اپنی حیات میں سینکڑوں اُردو کی کتابیں شائع کی تھیں۔ اور علی گڑھ کے ایک بڑے ناشر شمار کیے جاتے تھے۔ انتہائی خوش اخلاق اور پرانی قدروں کے نمایندہ تھے خدا مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے ۔

میسور میں سلطان ٹیپو کے عہد حکومت کے قبل کی دو اُردو کتابیں

میسور میں شاہ ابوالحسن صاحب ادیب کے ہاں ایک کتاب ہے جو "تنبیہ الغافلین" نامی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے یہ ساڑھے تین سو سال پہلے کی اُردو نثر کا نمونہ ہے اور ۹۹۷ھ میں ترجمہ ہوئی۔ کاغذ اچھا ہے لیکن کتابت خراب، گمان غالب یہ ہے کہ یہ ریاست میسور کے کسی علاقہ میں لکھی گئی ہے۔ مترجم نے کتاب کی ابتدا اس طرح کی ہے۔۔

"میں ایمان لایا خدای تعالیٰ پر خدای تعالیٰ ایسا ہی تمام عالم کو پیدا کیا ہے اپنے جیو سون کسی کی سطلانی سون نہیں ہوا جملہ عالم کون رزق دینہار ایہو ایمان سون ایمانی کون مار ینہار اسوا دھی تمام عالم کو پیدا کر نہارا ...... الخ

"ہزار مسائل" (۲)

ایک قلمی مخطوطہ مولوی شاہ ابوالحسن صاحب ادیب کے ہاں ہے جس کا نام "ہزار مسائل" ہے مصنف کا نام محمد علی ابن مخدوم صدیقی ہے اس کے اجداد کی قضات قلعہ کوپل میں تھی۔ اس نے قلعہ کوپل میں اس کا کسی فارسی کتاب سے ۱۱۰۵ھ بزبان دکھنی منظوم ترجمہ کیا نمونہ یہ ہے:۔

یہی ہجرتکی تھی سال سنہ یو قرار	ہزار ایک سو پر تھی پنجاہ شمار
کیا اس رسالہ کو خوش انصرام	محمد علی ابن مخدوم نام
نجھل نسل صدیق کی ذات کا	کہیں شیخ یعنے قریشے سچا
لکھیا ترجمہ کر اوس کا تھاؤں	جو ہے قلعہ کوپل لکر جس کا ناؤں

اگر اس کتاب اور قلمی مخطوطہ سے متعلق کچھ سعید صاحب یا فرزندانِ مولوی شاہ ابوالحسن ادیب صاحب "ہماری زبان" میں تحریر فرمائیں تو میں ممنون ہوں گا۔ (نیاز حیدر)

بشکریہ ہماری زبان علی گڑھ

ساہتیہ اکاڈمی کا انعام اُردو دوستوں میں یہ بات بڑی مسرت سے سنی جائے گی کہ امسال ساہتیہ اکاڈمی کا اُردو کا انعام مشہور افسانہ نگار قرۃ العین حیدر کو ان کی کتاب 'پت جھڑ کی آواز' پر ملا ہے قرۃ العین حیدر کے والد سجاد حیدر یلدرم اُردو کے مشہور اور صاحب طرز انشاپرداز تھے۔ ان کی والدہ نذر سجاد حیدر کا بھی خواتین افسانہ نگاروں میں ایک بلند مقام ہے قرۃ العین حیدر اپنے ناولوں "میرے بھی صنم خانے"، "سفینۂ غم دل" اور "آگ کا دریا" کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کر چکی ہیں سنہ ۱۹۶۵ء میں ان کے افسانوں کا نیا مجموعہ "پت جھڑ کی آواز" مکتبہ جامعہ نے شائع کیا تھا۔ یہ مجموعہ ہمارے افسانوی ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے اور اسی پر ساہتیہ اکاڈمی نے انھیں پانچ ہزار کا انعام دیا ہے۔

پت جھڑ کی آواز میں 'جلاوطن' یاد کی ایک دھنک جلے' قلندر' پت جھڑ کی آواز کے علاوہ ہاؤسنگ سوسائٹی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ہاؤسنگ سوسائٹی' اپنے حسنِ تعمیر' فضا' کردار نگاری بےباک حقیقت نگاری اور مدھم شعریت کی وجہ سے اُردو کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ ہم قرۃ العین حیدر کو اس اعزاز پر دلی مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ ہمارے افسانوی ادب کو عالمی معیاروں سے اور قریب لائیں گی۔

(بشکریہ ہماری زبان علی گڑھ)

ماہنامہ
کتاب نما
نئی دہلی ۲۵

مینجنگ ایڈیٹر:۔
غلام ربانی تاباں
مدیر مسئول:۔
مجیب احمد خاں

اپریل ۱۹۶۸ء
جلد ۹ شمارہ ۴
سالانہ چندہ دو روپے
فی پرچہ۔ بیس پیسے

اشاریہ:

مکتبہ کی شاخ علی گڑھ کے قیام کے سلسلے میں ابتدائی مراحل جس تیزی سے طے ہو رہے ہیں اس کے پیش نظر یقین ہے کہ جس وقت یہ شمارہ آپ کے ہاتھ میں ہوگا، اس دوکان کا افتتاح ہو چکا ہوگا اور مکتبے نے یونیورسٹی کے طالب علموں اور باشندگان علی گڑھ کی خدمت شروع کر دی ہوگی۔ ہمیں توقع ہے کہ خدمت کے جس جذبے کے ساتھ مکتبہ جامعہ نے یہ بار اٹھایا ہے، اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی اور اہل شہر کا تعاون ہمیں حاصل رہے گا۔ ہم ہر وقت ایسے مشوروں کو خوش آمدید کہیں گے جن پر عمل کر کے ہمیں اور انھیں دونوں کو سہولت ہو۔

پچھلے مہینے جامعہ کے پرانے طالب علم محترم عبد الباقی صاحب بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

باقی صاحب نے جامعہ سے بی۔اے کرنے کے بعد صحافت یا جرنلزم کے پیشے کو اپنایا تھا اور اسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ شروع شروع میں لاہور کے زمیندار، مساوات وغیرہ اردو روزناموں میں کام کیا پھر ایک بہت اچھے ساتھی صدیق طیب مرحوم کے ساتھ مل کر "روزنامہ آزاد" کے نام سے اپنا اخبار نکالا۔ یہ بہت شان دار کھاری بھر کم اخبار تھا۔ زیادہ دنوں زندہ نہ رہ سکا مگر باقی صاحب کی قابلیت کی دھاک بیٹھ گئی۔

۳۶-۱۹۳۵ء میں جب صوبوں میں قومی یا کانگریسی حکومتیں بنیں تو باقی صاحب نے سرکاری ملازمت کا مزہ بھی چکھا۔ ۱۹۴۷ء میں مرحوم دلی آگئے۔ یہاں سے کئی اخبار نکالے۔ آخر میں کاروان وطن" کے نام سے ایک شاندار ہفتہ وار نکالا۔ اس کا جمہوریہ نمبر مرحوم کا آخری کارنامہ ہے اور اس قابل ہے کہ حفاظت سے رکھا جائے۔ یہ مرحوم کے انتقال سے کچھ ہی دنوں پہلے شائع ہوا ہے۔

باقی صاحب اردو ہی کے نہیں انگریزی کے بھی بہت اچھے جرنلسٹ تھے۔ باہر کے اخبارات سے بھی تعلق تھا۔ معلومات کا یہ حال تھا کہ قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ ہر موضوع پر لکھتے تھے سیر حاصل لکھتے تھے۔ جمہوریت نمبر میں زیادہ تر مضمون انھی کے ہیں۔ حافظ علی بہادر مرحوم کے بعد ہم ایک اور بڑے صحافی سے محروم ہو گئے ہیں، مرحوم کی ایک اہم امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ نیشلسٹ مسلمان تھے اور آخری دم تک نیشلسٹ رہے۔ ذرا نہ ڈگمگائے۔

پچھلے مہینے اخباروں میں اچانک یہ خبر پڑھی کہ لالہ شیام ناتھ اپنے وطن سے دور بمبئی کے ایک اسپتال میں آن جہانی ہو گئے۔ انھیں یرقان ہو گیا تھا۔ یہی جان لیوا ثابت ہوا۔ لالہ شیام ناتھ خاص دلی کے رہنے والے تھے ان کے والد بزرگوار نے حکیم اجمل خاں کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ اُن کی صحبتوں میں رہے تھے۔ لالہ شیام ناتھ بھی دلی کی تہذیب کا نمونہ تھے، نظر میں بلندی، خیالات میں وسعت، مزاج میں نرمی، وقت بے وقت ہر مصیبت زدہ کے کام آ جانا ہندو ہو یا مسلمان سب کے ساتھ یکساں سلوک کرنا۔ بچپن سے کانگریسی تھے مرتے دم تک کانگریسی رہے مدتوں دلی کارپوریشن کے ممبر رہے پھر پارلمنٹ کے ممبر اور نائب وزیر بنے۔ ابھی اور ترقی کرتے۔ کل ۵۲ برس عمر پائی۔ ماں باپ دونوں زندہ ہیں۔ خدا انھیں اور دوسرے عزیزوں کو صبر کی توفیق مرحمت فرمائے آمین۔

---

۲۸ مارچ کو مشہور روسی ادیب میکسم گورکی کی صد سالہ سال گرہ منائی جا رہی ہے۔ روس کے علاوہ یہ ہندوستان اور کئی دوسرے ملکوں میں منائی جا رہی ہے۔ حکومت ہند اس موقع پر خصوصی ڈاک ٹکٹ بھی جاری کر رہی ہے اور ہند سوویت کلچرل سوسائٹی نے یہ سو سالہ جشن ملک بھر میں منانے کا فیصلہ کیا ہے۔

مظہر امام

غزل

آپ ہی کے گیسوؤں کا سلسلہ سمجھا تھا میں
زندگی کو ایک زنجیرِ وفا سمجھا تھا میں

مجھ کو زہرِ طعنۂ احباب بھی پینا پڑا
اُس نگاہِ مہر کو آبِ بقا سمجھا تھا میں

حُسن کی مجبوریاں بھی آخرش کھُل ہی گئیں
بے رخیٔ حُسن کو حُسنِ ادا سمجھا تھا میں

رہ نماؤں نے اسی پر منزلیں تعمیر کیں
جس کو اپنی گمرہی کا نقشِ پا سمجھا تھا میں

وہ بھی اخلاق و شرافت ہی کی نکلی ایک شکل
جس کو اپنی بدمذاقی سے ریا سمجھا تھا میں

شیخ کی غیبت نہ کیجے حضرتِ مظہر امام
نام سے تو آپ کو بھی پارسا سمجھا تھا میں

انتخاب از "زخم تمنا" مجموعہ کلام جناب مظہر امام۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ مجلد صفحات ۱۷۶ قیمت -/۳ "مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ" جامعہ نگر دہلی سے مل سکتا ہے۔

کتب موصولہ برائے تبصرہ

کتاب	مصنف	ناشر	سائز	صفحات	قیمت
اردو شاعری میں تاج محل	شجاع خاور	اردو پبلشرز دہلی	۲۰×۳۰/۱۶	۱۶۰	۱/۷۵
شاد عظیم آبادی	نقی احمد ارشاد	نسیم بکڈپو، لکھنؤ	"	۵۵۶	۸/-
حدیث معرفت	عزیز وارثی	مکتبہ ندائے اتحاد، دہلی	"	۲۵۶	۵/-
مکاتیب احمد سعید	سید ضمیر حسن	دینی بکڈپو، دہلی	"	۱۵۲	۲/۵۰
ادب اور جدید ذہن	دیوندر اسر	مکتبہ شاہراہ، دہلی	"	۲۱۰	۴/۵۰
نقش اوّل	نسیم اللہ گیاوی	—	"	۷۲	۱/-
اردو نثر میں ادب لطیف	ڈاکٹر عبدالودود خاں	نسیم بکڈپو لکھنؤ	"	۵۰۱	۸/-
مجبوری کا دوسرا نام کیا ہے؟	مانک جی شہانی	سنسار پبلشنگ ہاؤس بمبئی	"	۱۱۲	۲/-
مثالی خواتین	یونس نگرامی ندوی	مکتبہ طیبہ، لکھنؤ	"	۴۰	-/۵۰
دختر شب	مظہر الحق علوی	نسیم بکڈپو، لکھنؤ	"	۵۲۰	۹/-

(ایک گذارش)

گذشتہ ۲۰ برسوں کے اندر ہند و پاک میں متعدد فسادوں میں حد درجہ گھناؤنے اور انسانیت سوز واقعات ہوئے۔ ان واقعات کی تقریروں اور تحریروں میں تشہیر ہوئی اور انسانیت کا سر شرم سے جھک گیا۔ لیکن ان انسانیت سوز واقعات کے ساتھ ہی انسانی اخوت و محبت کی کچھ ایسی مثالیں بھی ہیں جہاں انسانوں نے اپنی جان پر کھیل کر انسانیت کی لاج بچائی ہے۔ مگر ایسے واقعات پبلک کے علم میں بہت کم یا بالکل نہیں آئے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کے ان تمام جیالوں کے روشن کارنامے محفوظ کیے جائیں، جنھوں نے انسانیت کی آبرو بچانے یا درندگی اور دیوانگی کا مقابلہ کرنے میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ اس لیے ان تمام ہندوستانی اور پاکستانی بھائیوں سے جنھیں اس طرح کے صحیح واقعات کا علم ہے، ہماری درخواست ہے کہ وہ اسے ہندوستان و پاکستان کی کسی بھی زبان میں لکھ کر ہمارے پاس بھیجنے کی زحمت گوارہ کریں۔

احمد فاطمی: اڈیٹر بھوداں تحریک، راج گھاٹ، وارانسی (یو۔پی)

قرآن مجید کے اہم تراجم

لاطینی مغربی زبانوں میں سب سے پہلے قرآن کریم کا ترجمہ کرنے کا خیال کلونی (فرانس) کے پطرس نرابلس کے دل میں آیا۔ اس نے لاطینی زبان میں ترجمہ شروع کر رکھا تھا کہ سنہ ۱۱۵۵ء میں موت نے آیا جس کی وجہ سے کام مکمل نہ ہو سکا۔ بعد میں اسی ترجمے کو ایک انگریز مسٹر رابرٹ اور ٹینیا اور ایک جرمن ہرمن آور نے سنہ ۱۲۴۲ء میں مکمل کر لیا۔ اس کے بعد بھی یہ ترجمہ تقریباً چار سو سال تک خانقاہ میں بند پڑا رہا۔ حتیٰ کہ سنہ ۱۵۴۳ء میں تھیوڈ دو ربیلی انڈو نے اسے "باسل" (سوئزرلینڈ) سے پہلی بار شائع کیا۔ یہی ترجمہ بعد میں مختلف زبانوں میں مثلاً اطالوی، جرمن، ڈچ میں شائع ہوا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۵۵۰ء میں نکلا۔ اور تیسرا ایڈیشن سنہ ۱۷۲۱ء میں۔ اسی زبان میں دوسرا ترجمہ فادر لیوس مراکشی کا ہے۔ جو مقام پدو (اٹلی) سے سنہ ۱۶۹۸ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ فادر لیوس مراکشی پوپ انوسنٹ یازدہم کا دوست اور رفیق کار تھا۔ تیسرا ترجمہ جسٹس فریڈ ریکس فردریپ نے سنہ ۱۷۶۸ء میں کیا۔

فرانسیسی اس زبان میں سب سے پہلا ترجمہ ایم انڈر لودڈائر نے سنہ ۱۶۴۷ء میں مکمل کر کے پیرس میں چھپوایا۔ جس کے بعد سنہ ۱۶۷۲ء، سنہ ۱۶۵۱ء، سنہ ۱۶۶۹ء کا مطبوعہ لاہائی میں سنہ ۱۶۸۳ء کا مطبوعہ برلن سنہ ۱۹۲۳ء میں طبع ہوئے۔

یونانی یونانی زبان میں قرآن مجید کے صرف ایک ترجمے کا پتا چلتا ہے جو نیٹیا کی نے سنہ ۱۸۸۰ء میں کیا اور ایتھنز سے نکلا۔ بعد میں اس کی سنہ ۱۸۸۶ء اور سنہ ۱۹۲۹ء میں دو اشاعتیں اور بھی ہوئیں۔

عبرانی عبرانی زبان میں قرآن مجید کے صرف تین ترجموں کا پتا چلتا ہے۔ پہلا یعقوب بن اسرائیل کا، دوسرا ہرمن رکنڈ روف کا جو سنہ ۱۹۲۷ء میں لیپہ سے طبع ہوا۔ تیسرا فلین جو سنہ ۱۹۳۲ء میں بیت المقدس میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔

پولینڈ یہاں سنہ ۱۸۵۸ء میں بزتسکینو نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا جو وارسا سے شائع ہوا۔

اطالوی اس زبان میں سب سے پہلا ترجمہ وینس کا ہے۔ یہ ۱۵۴۷ء میں طبع ہوا۔ کلزوکا اطالوی ترجمہ ۱۸۴۷ء میں چھپا تیسرا اہم ترجمہ بنیزری جریہ اوّل بار ۱۸۸۲ء میں طبع ہوا۔ بعد میں اس کی دو اشاعتیں ۱۹۱۲ء میں اور ہوئیں فیولانی مطبوعہ روم ۱۹۱۲ء کا ہے۔ برانیسی نے فرانیسی زبان سے ۱۹۱۳ء میں ایک ترجمہ کیا۔ فراقاسی کا ترجمہ ۱۹۱۶ء میں مکمل ہوا۔ فروجکا ترجمہ ۱۹۲۸ء میں مقام باری سے عالم وجود میں آیا۔ اطالوی میں آٹھواں ترجمہ بوٹلی نے ۱۹۲۹ء میں میلان سے چھپوایا۔

پرتگالی پرتگال میں پہلا ترجمہ فرانیسی سے ۱۸۸۲ء میں طبع ہوا۔

ہسپانوی سورۃ المعراج کا ترجمہ حکیم ابراہیم نے کیا۔ اس زبان میں پہلا باقاعدہ ترجمہ ڈی روس مطبوعہ میڈرڈ کا قرار پایا۔ جو ۱۸۴۴ء میں پہلی بار طبع ہوا۔ آرٹزنے دوسرا ترجمہ ۱۸۷۶ء میں مکمل کرکے بارسلونا سے چھپوایا۔ برجبینڈو کا ترجمہ بھی میڈرڈ سے ۱۸۷۵ء میں منظر عام پر آیا۔ برانو مطبوعہ بارسلونا ۱۹۰۱ء کا ہے۔ پانچواں ترجمہ کاٹونے اوّل بار ۱۹۱۳ء میں طبع کرایا۔ بعد میں اس کے اور دو ایڈیشن ۱۹۱۳ء میں اور ۱۹۳۶ء میں میڈرڈ سے طبع ہوئے۔

سروپائی سرویائی میں صرف ایک ترجمے کا پتہ چلتا ہے جسے میکولو بیرائش نے ۱۸۹۵ء میں لکھ کر بلگریڈ سے طبع کرایا۔

ڈچ اس زبان میں پہلا ترجمہ شوئیگر نے ۱۶۶۱ء میں کیا اور ہمبرگ سے طبع کرایا۔ اس کا نام "عشریش القرآن" رکھا گیا۔ گلاشمارا نے اپنا ترجمہ ۱۶۵۸ء میں لیڈن سے شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۷۹۹ء میں طبع ہوا۔ تیسرا ترجمہ لفن کا مجموعہ باقیات ۱۸۵۹ء کا ہے۔ چوتھا ڈاکٹر کرزنے ۱۸۶۰ء میں ہارم میں چھپوایا بعد میں اس کے تین ایڈیشن ۱۸۷۸ء ۱۹۰۵ء ۱۹۱۶ء میں نکلے۔

البانوی البانوی زبان میں ایک ترجمہ الف میم قاف کا ہے۔ جس کا سن اشاعت معلوم نہیں ہوسکا۔

ڈنمارک یہاں پہلا ترجمہ پیڈرسن مطبوعہ کوپن ہیگن ۱۹۱۹ء اور دوسرا بھی مطبوعہ کوپن ہیگن ۱۹۲۱ء کا بہل کا ہے۔

ارمنی ارمنی زبان میں پہلا ترجمہ امیر خانیانے کیا جو پہلی بار ۱۹۰۹ء میں اور ینہ سے شائع ہوا اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۵ء میں نکلا۔ لازر کا ترجمہ ۱۹۱۱ء میں طبع ہوا تیسرا درجہ کورنہیان کا ہے جو اورینہ سے ۱۹۱۲ء میں طبع ہوا۔

بلغاری اس زبان میں ٹوموف اور سکولف کا مشترکہ ترجمہ صوفیا سے ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔

بوہیمیہ بوہیمیہ زبان میں پہلا ترجمہ فلی کا ہے۔ یہ پراگ سے ۱۹۲۵ء میں طبع ہوا۔ دوسرا نیکل کا ہے یہ بھی پراگ سے ۱۹۳۲ء میں طبع ہوا۔

رومانی الیونکل نے رومانی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ ۱۹۱۲ء میں چھپوایا۔

ہنگری اس زبان میں روڈ مایرن کڈیوں نے ایک ترجمہ ۱۸۵۴ء میں شائع کروایا۔

جاوی جاوی زبان میں پہلا ترجمہ نیادیا کا ہے جو ۱۹۰۳ء میں سماترا سے نکلا۔ دوسرا ترجمہ سمانگ کا ہے یہ ۱۹۱۳ء میں عالم وجود میں آیا۔

روسی روسی زبان میں ۱۷۷۶ء میں ایک ترجمہ سینٹ پیڈز نے کیا۔

ارگونی ارگونی زبان میں ایک مترجم جان انڈرینہ کا نام ملتا ہے۔

انگریزی اس زبان میں سب سے پہلا ترجمہ ۱۶۴۹ء میں فرانسیسی سے لندن میں طبع ہوا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۶۸۸ء میں اور تیسرا ایڈیشن ۱۸۰۶ء میں امریکہ سے نکلا۔

جارج سیل کا اوّل ترجمہ ۱۷۶۳ء میں لندن سے طبع ہوا۔ جو نہایت مقبول ہوا اور اس کے بعد کے بعد دیگرے ۲۶ ایڈیشن شائع ہوئے آخر بار سر ڈالنون روسی کے مقدمے کے ساتھ ۱۹۱۳ء میں طبع ہوا۔ یہ امریکہ میں آٹھ بار طبع ہوا۔ آخری ایڈیشن ۱۹۲۹ء میں نکلا۔ روڈویل کا ترجمہ پہلی مرتبہ لندن میں ۱۸۶۱ء میں نکلا۔ بعد میں اس کے ایڈیشن ۱۸۷۶ء ۱۹۱۱ء ۱۹۱۵ء ۱۹۱۶ء ۱۹۲۱ء میں طبع ہوئے۔ امریکہ میں یہ ۱۹۰۹ء میں طبع ہوا۔ پامر کا ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۸۸۰ء میں طبع ہوا۔ امریکہ میں اس کا ایڈیشن ۱۹۰۹ء میں نکلا۔ ۱۹۰۵ء میں ڈاکٹر محمد عبدالحکیم نے اپنا انگریزی ترجمہ کروایا۔ مرزا ابوالفضل کا ترجمہ ۱۹۱۱ء میں الہ آباد سے مع عربی متن کے ساتھ نکلا اور مقبول ہوا یہاں تک کہ اس کی تعریف متعصب لوگوں نے بھی۔ مرزا حیرت دہلوی ایڈیٹر کرزن گزٹ کا ترجمہ معہ حواشی اور تفسیر کے ساتھ ۱۹۱۹ء میں سلیس انگریزی میں شائع ہوا۔ غلام سرور کا ترجمہ

آکسفورڈ سے ۱۹۳۰ء میں نکلا۔ ۱۹۳۵ء میں علامہ یوسف علی (پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور) نے قرآن کریم کا مکمل ترجمہ مع عربی متن اور مبسوط مقدمہ جس میں تاریخی اور جغرافیائی مواد بہم پہنچانے میں انتہائی کوشش کی ہے لاہور سے طبع کرایا۔

فارسی فارسی میں قرآن مجید کے بہترین متعدد ترجمے موجود ہیں۔ ان میں غالباً سب سے پہلا ترجمہ شیخ سعدی کا ہے اور ہندوستان میں فارسی کا پہلا ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا (فتح الرحمٰن) کے نام سے ہے۔

اُردو اُردو زبان میں بے شمار قرآن مجید کے ترجمے موجود ہیں۔ ان میں سے غالباً سب سے پہلا ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر ابن حضرت شاہ ولی اللہ ۱۷۲۷ء کا ہے باقی تراجم میں سے مولانا رفیع الدین، مولانا نذیر احمد دہلوی، مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا محمود الحسن، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی، مولانا فتح محمد جالندھری، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، سید حکیم یٰسین شاہ۔ کے ترجموں کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

رومن اُردو رومن اُردو میں ڈاکٹر امام الدین نے سب سے پہلے ترجمہ کیا جسے کرسچن پریس الہ آباد نے شائع کیا۔

بنگالی بنگالی زبان میں شاہ رفیع الدین کے ترجمے سے پہلا بنگالی ترجمہ ۱۳۴۹ء میں ہوا۔ ابن محمد عبدالحق نے ۱۹۱۰ء میں ایک اور بنگالی ترجمہ کیا۔ اس سے پہلے دو بنگالی ترجمے مسلمانوں کی مجلس نے ۱۸۸۲ء میں کلکتہ سے اور نعیم الدین کا ترجمہ ۱۸۹۹ء میں طبع ہوا اس کے علاوہ نمولدساک کا ترجمہ جو پہلی بار ۱۹۰۸ء میں جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا، قابلِ ذکر ہے

جاپانی جاپانی زبان میں سکاموٹو کے ترجمے کا نام ملتا ہے۔

چینی چینی زبان میں ۱۹۱۳ء میں ایک ترجمہ ماوین جودھوا جرجز نے چھپوایا۔ دوسرا ترجمہ چن چاک کا ۱۹۳۱ء میں شنگھائی میں طبع ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں ایک اور ترجمہ پاومن چن چنگ نے شائع کیا۔ ۱۹۳۶ء میں نی چنگ نے چھپوایا۔

باطومی اس زبان میں قرآن مجید کے صرف ایک ترجمے کا ذکر ملتا ہے۔

پشتو پشتو میں غالباً پہلا ترجمہ ۱۹۱۳ء میں طبع ہوا۔

پنجابی پنجابی میں پہلا ترجمہ حافظ محمد لکھنوی (مطبوعہ لاہور) ہے۔ فیروز الدین شمس الدین (امرتسر) اور حیات اللہ مطبوعہ لاہور کے ترجمے قابلِ ذکر ہیں۔

سندھی اس زبان کے اہم ترجمے عزیز اللہ مطبوعہ بمبئی ۱۲۹۳ھ اور محمد صدیق و عبد الرحمٰن مطبوعہ بمبئی ۱۳۱۷ھ ہیں۔

عواجدانیہ حافظ عبد الرشید کا مطبوعہ دہلی ۱۳۰۶ھ اور اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۳۱۱ھ میں نکلا۔ دوسرا ترجمہ عبد القادر بن لقمان کا ہے جو ۱۸۷۴ء میں بمبئی سے طبع ہوا۔ محمد اصفہانی کا ترجمہ بھی بمبئی سے ۱۹۰۰ء میں طبع ہوا۔ غلام علی کا ترجمہ ۱۹۰۳ء میں چھپا۔

ترکی اس میں سب سے مکمل ترجمہ "ترجمۃ القرآن" ہے جو ابراہیم علی نے چھپوایا۔

تلنگو تلنگو میں مسٹر نرائن نے مولوی محمد علی کے ترجمے سے مدد لے کر ترجمہ کیا۔

مرہٹی اس میں حکیم صوفی محمد یعقوب نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔

ہندی ہندی میں ریورنڈ ڈاکٹر احمد شاہ نے اصل عربی سے ہندی میں با محاورہ ترجمہ کیا۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم کی کوشش بھی اس سلسلے میں ناقابلِ فراموش ہے نیز ہندی میں تازہ ترین ترجمہ مولانا عبد الحیٔ صاحب نے ادارۂ الحسنات رام پور سے شائع کیا ہے

گورمکھی نومسلم محمد یوسف نے عربی سے اس زبان میں ترجمہ چھپوایا۔

سویڈش اس زبان میں پہلا ترجمہ نسٹو کا ہے جو ۱۸۴۳ء میں اسٹاک ہالم سے شائع ہوا۔ دوسرا ٹوریزرک کا ہے جو ۱۸۴۶ء میں لندن سے طبع ہوا۔ تیسرا ترجمہ زٹرمیٹن کا ہے یہ ۱۹۱۷ء میں اسٹاک ہالم سے منظرِ عام پہ آیا۔

(بشکریہ صبح امید بمبئی)

نئی مطبوعات

شراب کہنہ	رشید نعمانی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	3/25
دوشیزۂ کابل	صادق سردھنوی	اہلوالیہ بکڈپو، دہلی	-/12
خالی ہاتھ	عمر عادل مارہروی	" "	-/4
ایک تھی آشا	ضیا عظیم آبادی	" "	-/4
درد و درماں	عفت موہانی	نسیم بکڈپو، لکھنؤ	5/50
فریدہ بیگم	بدر انجم	" " "	4/50
گھر کا بھیدی	مظہر الحق علوی	" " "	2/50
شاد عارفی فن اور شخصیت	مظفر حنفی	" " "	-/12
سوادِ منزل	نشور واحدی	سنگم کتاب گھر، دہلی	-/3
غزل اور متغزلین	ابواللیث صدیقی	بھارتی پبلشرز دہلی	6/50
عبداللہ بن مسعود اور انکی فقہ	ڈاکٹر حنیفہ رضی	مکتبہ برہان دہلی	-/8
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں	قاضی اطہر مبارکپوری	" " "	-/8
تفسیر مظہری اردو ششم	سید عبدالدائم جلالی	" " "	-/15
ترجمان السنۃ اردو	مولانا بدر عالم	" " "	-/16
سیرطیبہ	قاضی زین العابدین	" " "	5/50
عصمتی دسترخوان	آمنہ نازلی	مٹیا محل دہلی	-/3
غزل انسائیکلوپیڈیا	ذکی کاکوروی	مرکز ادب اردو لکھنؤ	-/5

(زیر طبع کتابیں)

تحصیل الاملا	منشی عبدالقدیر	کتب خانہ انجمن ترقی اردو، دہلی	-/2
کہانی میری زبانی میری (غالب کی آپ بیتی)	مرتبہ: حفیظ عباسی	مجلس اشاعت ادب دہلی	—
سوادِ منزل (شعری مجموعہ)	نشور واحدی	سنگم کتاب گھر، دہلی	-/3
ارمغان حجاز (اردو منظوم ترجمہ)	عبدالرحمن طارق	کتب خانہ نذیریہ، دہلی	-/3
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی	سعید احمد صدیقی	مکتبہ شاہراہ، دہلی	1/50

تعارف

شراب کہنہ

یوں تو قارئین کتاب نما، کے لیے جناب رشید نعمانی صاحب کے تعارف کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیوں کہ اکثر و بیشتر اُن کے "جائزے" وہ پڑھتے رہتے ہیں لیکن اب اِس افشائے راز میں بھی کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ "جام نو" کی ساقی گری بھی آپ ہی کا دستِ کرم کرتا ہے۔ اسی جامِ نو کی پیش رو یہ شراب کہنہ ہے۔ عرضِ مرتب میں جو کچھ مختصراً اُنھوں نے فرمایا ہے اُس سے اس کام کی نوعیت پر بخوبی روشنی پڑتی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

"پانچ سال ہوئے رسالہ کتاب نما کی ماہانہ اشاعتوں میں "شراب کہنہ" کے عنوان سے شاعروں کا تذکرہ شروع کیا گیا تھا۔ اس کے لکھنے میں جن باتوں کا خاص طور پر خیال رکھا گیا وہ یہ ہیں

۱ - حالات مختصر ہوں اور مستند۔

۲ - اشعار عام فہم ہوں اور عام پسند۔

۳ - کلام سے شاعر کے رنگ و رجحان کا بھی اندازہ ہو سکے۔

۴ - ولادت اور وفات دونوں لازمی طور پر سنہ عیسوی میں ہوں۔

بہت سے تذکرے اور تاریخی کتابیں موجود ہیں، کلیات، دواوین اور سوانح عمریوں کی بھی کمی نہیں۔ پھر بھی ایک اوسط درجے کے پڑھے لکھے آدمی کے لیے موجودہ حالات میں اُن سے مستفید ہونے کے امکانات محدود ہیں۔ اس کتاب کو نہ کوئی مکمل تذکرہ سمجھنا چاہیے اور نہ تحقیقی کارنامہ۔ ان اوراق میں اردو کے نمائندہ اور کچھ ممتاز شاعروں سے تعارف کرا دینے کی

کوشش کی گئی ہے۔ اگر پڑھنے والوں کو اس میں دو چار باتیں بھی کام کی نظر آجاتی ہیں تو میں سمجھوں گا کہ میری حقیر کوششیں بے سود نہیں رہیں۔

نظم و نثر کی بہت سی کتابوں، متعدد رسالوں اور متفرق مضامین سے میں نے خاطرخواہ استفادہ کیا ہے۔ اس کا مجھے اعتراف ہے۔ اور ان کا حوالہ نہ دے سکا۔ اس کوتاہی کا اقرار۔ اسی طرح یہ بھی مانتا ہوں کہ جدید ترین تحقیق اور حساب دانی کی رو سے بعض واقعات اور سنہ، ممکن ہے درست نہ ہوں۔ پیدائش اور انتقال کی قابلِ اعتبار تاریخیں قمری مہینوں اور ہجری سن میں لکھی ہوئی ملتی ہیں، سنہ عیسوی سے ان کی مطابقت میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔"

اس بیان میں جس سادگی اور کسر نفسی کی فضا پائی جاتی ہے، اس سے نعمانی صاحب کی طبیعت کے رنگ کی غمازی تو کسی حد تک ضرور ہوتی ہے لیکن "شراب کہنہ" کی حیثیت اور اہمیت کا واجب اظہار کسی طور نہیں ہو پاتا۔ اس طرف جناب مالک رام صاحب نے اپنے پیش لفظ میں خاطرخواہ توجہ مبذول کرائی ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

"کسی زبان کے مطالعے کے لیے اس کے شاعروں اور ادیبوں کے حالات جاننا بہت ضروری ہے۔ دراصل یہ بنیاد ہوتے ہیں اس عمارت کی جو تکمیل کے بعد تاریخ ادب کہلاتی ہے۔ اردو بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ اگر ہم ادب اردو کی تاریخ لکھنا چاہیں، تو لابد ہے کہ ہم اپنے شعرا و ادبا کے حالات معلوم کریں۔

اس وقت تک جو مواد دستیاب ہوا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۷۵۲ء میں اردو شعرا کے حالات میں پہلا تذکرہ میر نے "نکات الشعرا" کے نام سے لکھا۔ اسی زمانے میں دو اور تذکرے لکھے گئے، قائم نے "مخزن نکات" مرتب کیا اور حمید نے "گلشن گفتار"۔ اس کے بعد بیسیوں تذکرے لکھے گئے۔ اچھے بھی۔ برے بھی۔ لیکن قطع نظر ان کے معیار سے، یہ سب تاریخ ادب اردو کے بنیادی ماخذ ہیں۔ اگر یہ نہیں ہوتے تو انسان تصور نہ کر سکتا کہ وہ معلومات جو ان میں ملتی ہیں، اور کہاں سے اور کس طرح دستیاب ہو سکتی تھیں۔

ان سب تذکروں میں بعض باتیں مشترک تھیں۔ حالات بہت کم دو ایک سطر میں نام، باپ کا نام، تلمذ کی طرف اشارہ یا خاندان کا کچھ ذکر اور اس کے بعد انتخاب اشعار۔ اگر شاعر صاحب دیوان ہے، تو انتخاب نسبتہً طویل، ورنہ جتنے شعر مل سکے۔ شاعر کے حالات میں سنین پر زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ مختلف تذکروں کو یکجا کرنے سے بہت سا خام مواد جمع ہو گیا لیکن کچھ کمی کا احساس ہمیشہ رہا۔

ادہر بہت دنوں سے اردو میں کوئی تذکرہ نہیں لکھا گیا اور جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ بھی بڑوں اور اہل علم کے حلقوں کے لیے ہے، جس میں تفصیلات اور جزئیات پر زور دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے عام پڑھنے والا مستفید اور لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ ضرورت ہے کہ ہمارے لکھنے والے اس طبقے کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر، طوالت اور غیر ضروری تفصیل سے اجتناب کرتے ہوئے عام فہم زبان میں پیش کریں۔ اس سے نہ صرف ہمارے متوسط پڑھے لکھے طبقے کا رشتہ ادب سے قائم رہے گا، بلکہ کلاسیکی روایت کا رشتہ بھی نہیں ٹوٹے گا، جس کی حالت ہماری بے توجہی کے باعث بہت نازک ہو رہی ہے۔

رشید نعمانی صاحب نے اس تذکرے میں پچاس شاعروں کے مختصر حالات اور کلام کا انتخاب پیش کیا ہے۔ وہ یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ انھوں نے کوئی نئی بات دریافت کی ہے۔ لیکن یہی کیا کم ہے کہ اتنے سارے اساتذہ کے صحیح حالات اور اچھے کلام ایک جگہ جمع کر دیے گئے ہیں، جس سے انسان کتنی بڑی بڑی کتابوں کی ورق گردانی سے مستغنی ہو جاتا ہے۔ خدا کرے ان کی یہ کوشش اہل علم کے نزدیک مقبول ثابت ہو۔"

مالک رام جیسے ذی علم اور خوش نظر محقق و مصنف کی اس وضاحت اور تصدیق کے بعد، "شراب کہنہ" کی افادیت کے بارے میں مزید کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔ رشید صاحب کے انداز تحریر سے آپ سب واقف ہیں۔ کتاب نما کی ماہانہ اشاعتوں میں "جام نو" کے زیر عنوان، کسی شاعر کا مختصر تذکرہ موجود ہی ہوتا ہے۔ "شراب کہنہ" کے

تذکروں کا انداز بالکل وہی ہے ۔ اشعار کے انتخاب میں وہ نہ صرف شاعر کے رنگ کی کماحقہٗ نمایندگی کرنے کی سعی کرتے ہیں بلکہ صحت متن کا بھی بے حد لحاظ رہتا ہے۔ واقعات کی چھان بین میں بھی کسی طور کسر نہیں چھوڑتے ہیں ۔ اور زبان کے معاملے میں اپنا معیار رکھتے ہیں ۔ اُن کی نثر، آج کل کی چلتی پھرتی زبان سے قطع نظر، اردو والوں کی زبان ہوتی ہے جس میں الفاظ کی صیقل گری کے علاوہ لہجے کی متانت اور تہذیب نفس کی نمود بھی ہوتی ہے۔ اور کیوں نہ ہو؟ وہ اودھ کی فضا میں پلے بڑھے اور تقریباً پچیس سال سے جامعہ میں استاد ہیں ۔ لڑکپن میں بھی متعدد ادیبوں اور شاعروں سے سابقہ رہا اور جامعہ کی زندگی میں بھی ۔

ایسے ادبی کام، رشید صاحب خدمت اور شوق کے جذبے سے سرشار ہو کر کیا کرتے ہیں ۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ! اُن کی پذیرائی تو یہی ہوگی کہ اس کتاب کا پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے ۔ البتہ قارئینِ "کتاب نما" یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں جن کی بدولت یہ نوبت آئی ۔ "کتاب نما" اور اس کے عنوانات سب اُن ہی کے ذوق و شوق سے عبارت ہیں ۔

یہ کتاب ۲۰×۳۰/۱۶ سائز کے ۲۳۲ صفحات پر مشتمل ہے ۔ قیمت تین روپے پچیس پیسے ہے اور مکتبہ جامعہ کے صدر دفتر اور شاخوں سے مل سکتی ہے ۔

جام نو

یگانہ

۱۸۸۴ء — ۱۹۵۶ء

مرزا واجد حسین، نام، پہلا تخلص یاسؔ دوسرا یگانہ، عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے چنگیز خاں کو اپنا مورث اعلیٰ سمجھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم حسرتؔ عظیم آبادی کے مدرسے میں حاصل کی۔ ۱۹۰۳ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا ایک سال بعد کلکتے میں دو شہزادوں کو انگریزی پڑھانے پر مقرر ہوئے، صحت خراب رہنے لگی، وطن واپس آئے اور پھر علاج کی غرض سے لکھنؤ گئے۔ یہ سرزمین ان کو ایسی بھائی کہ وہیں رہنے کا قصد کر لیا۔ شعر و سخن کی بسم اللہ خوانی سید علی بیتابؔ عظیم آبادی نے کرائی، پھر شادؔ عظیم آبادی سے اصلاح لینے لگے، لکھنؤ کے قیام میں پیارے صاحب رشیدؔ سے بھی مشورہ کیا۔

ابتدا میں اتنی فارسی پڑھ لی تھی کہ اس زبان کے مشہور اور مستند اساتذہ کے دیوان اور کلیات کا براہ راست مطالعہ کرتے اور حسب ضرورت ان سے استفادہ بھی۔ اردو میں میر تقی میرؔ اور خواجہ حیدر علی آتشؔ کے علاوہ کسی اور کو خاطر میں نہ لاتے۔

کچھ روز تاجور نجیب آبادی کے ساتھ لاہور میں رہے پھر حیدر آباد میں سب رجسٹرار ہو گئے وہاں سے پچپن سال کی عمر میں رٹائر ہوئے۔

مرزا یگانہ اک نرالی فطرت اور عجیب و غریب مزاج لے کر آئے تھے۔ لکھنؤ جسے انھوں نے اپنا دوسرا وطن بنایا تھا سب سے پہلے وہیں کے سربرآوردہ شاعروں کے کلام پر اعتراضات شروع کیے۔ وہ لوگ بھلا کیوں بخشتے، صفیؔ، محشرؔ، عزیزؔ اور ان کے سیکڑوں شاگرد اور ہمنوا ایک طرف اور یہ اکیلے۔ نہ ان کی مخالفت میں فرق آیا اور نہ اُن لوگوں کی جوابی کارروائیوں میں۔ لکھنوی شعرا کے ساتھ یہ ادبی مناقشے چل ہی رہے تھے کہ یگانہ نے "غالب شکنی" کا بھی ایک نیا محاذ قائم کر لیا، اور ہندوستان بھر کے غالب پسندوں سے لڑائی مول لے لی۔

اختلاف کو انھوں نے اپنا شیوہ اور انحراف کو اپنا وطیرہ بنا رکھا تھا۔ شعر و ادب کے

معاملے میں وہ تنِ تنہا زمانے بھر سے نبردآزما رہے۔ اُن کی سرشت سے واقف ہوجانے کے بعد پھر سنجیدہ قسم کے ادیب اور شعرا ان کی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیتے تھے۔ مگر بعض مذہبی مسائل میں کچھ لوگوں نے نہ اُن کو معاف کیا اور نہ ان کی تحریر کو برداشت کیا۔ عمر کا آخری دور تھا ضعیفی بیماری، ناداری اور تنہائی کا احساس انتہا کو پہنچ چکا تھا اس عالم میں بھی مذہب کے نام پر چند لوگوں کے انتقام کا جذبہ اتنا شدید اور معاصبے کا جوش اتنا بڑھ گیا کہ ایک بہتر سال کے بوڑھے اور بیمار کو جبر و ذلت کے ساتھ گھر سے نکال کر کوچہ و بازار میں رسوا کیا۔ یہ سارے دکھ یگانہ نے خاموشی کے ساتھ جھیل لیے مگر نہ اپنے کیے پر پچھتاوے کا اظہار کیا اور نہ کسی سے مدد اور ہمدردی کے طالب ہوسکے۔ مصلحت سے اتنا بے نیاز اور مفاہمت سے اس قدر دور رہنے والا آدمی ذرا مشکل ہی سے دیکھا گیا ہوگا۔

معتقدات اور مزاجی کیفیت جیسی بھی رہی ہو لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ ایک شاعر کی حیثیت سے یگانہ، کوئی معمولی یا ناقابلِ التفات فرد ہرگز نہ تھے۔ ان کا شاعرانہ بانکپن، فن پر دسترس، طرز میں پختگی، خیالات میں ندرت اور طرفگی —— ان باتوں کے قائل اور معترف ان کی زندگی میں بھی تھے۔ آج بھی ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے —— نجی خطوط اور متفرق مضامین کے علاوہ "غالب شکن" "شہرتِ کاذبہ" اور "چراغِ سخن" نثر میں اور "نشترِ یاس"، "آیاتِ وجدانی"، "گنجینہ" اور "ترانہ" نظم میں ان کی یادگار ہیں۔

انتخاب

چُپ لگی مجھ کو، گناہِ عشق ثابت ہوگیا
رنگ چہرے کا اُڑا، رازِ دلِ مضطر کھلا

میں قفس میں بھی کسی روز نہ خاموش رہا
کش مکش میں بھی طبیعت کا وہی جوش رہا

وہ وحشتِ ہولناک، وہ حبِّ وطن کا جوش
پھر پھر کے دیکھنا، وہ کسی بے دیار کا

ساحل کے پاس، یاس نے ہمت بھی ہار دی
کچھ ہاتھ پاؤں مارتا ظالم تو پار تھا

ہوں ریگ کی مانند شب و روز سفر میں آوارۂ وحشت کوئی منزل نہیں رکھتا

کسی کے ہو رہو، اچھی نہیں یہ آزادی کسی کی زلف سے لازم ہے سلسلہ دل کا

دیکھتے رہ گئے یاسؔ آپ نے اچھا نہ کیا ڈوبتے وقت کسی کو تو پکارا ہوتا !

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

جیت بھی اپنی ہے، پٹ بھی اپنی ہے میں کہاں ہار ماننے والا ہوں

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

پروانے اپنی آگ میں جل کر ہوئے تمام اب کوئی بارِ خاطرِ محفل نہیں رہا

دادِ حشر کچھ نہ پوچھ، دورِ شباب کا مزا شہدِ بہشت تھا مگر، دستِ بخیل کا دیا

آپ اب شمعِ سحر، بڑھ کے گلے ملتی ہے بخت جاگا ہے، بڑی دیر میں پروانے کا

مجھے دل کی خطا پر یاسؔ شرمانا نہیں آتا پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

کون دیتا ہے دادِ ناکامی خونِ فرہاد برسرِ فرہاد

غیرت سے رنگِ نامۂ اعمال اُڑ نہ جائے کیفیتِ نگاہِ گنہگار دیکھ کر

یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں یادش بخیر بیٹھے تھے گل آشیانے میں

داورِ حشر ہوشیار! دونوں میں امتیاز رکھ — بندۂ نا امید اور بندۂ بے نیاز میں

موت مانگی تھی، خدائی تو نہیں مانگی تھی — لے دعا کر چکے، اب ترکِ دعا کرتے ہیں

پچھلا پہر ہے کاتبِ اعمال ہوشیار — آمادۂ گناہ کوئی جاگتا نہ ہو

میزانِ عدل آئی اب ایسوں کے ہاتھ میں — کانٹوں سے تولتے ہیں جو پھولوں کے ہار کو

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا — چال سے تو ظالم کے سادگی برستی ہے

وہ دن گئے کہ دل کو ہوس تھی گناہ کی — یادش بخیر، ذکر اب اُس کا نہ کیجیے

ننگِ محفل مرا زندہ، مرا مردہ بھاری — کون اُٹھاتا ہے مجھے، کون بٹھاتا ہے مجھے

جب تک خلشِ دردِ خداداد رہے گی — دنیا دلِ ناشاد کی آباد رہے گی
شیطان کا شیطان، فرشتے کا فرشتہ — انسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی

ہر شام ہوئی صبح کو اک خوابِ فراموش
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

زہے سہوِ کاتب کہ سارا زمانہ — مجھی کو سراپا خطا جانتا ہے

شبِ امید کٹ گئی لیکن — زندگی میری مختصر نہ ہوئی
ہٹ گئے بالیں سے لوگ روتے ہیں — جیسے بیمار کو خبر نہ ہوئی

نہ خداؤں کا نہ خدا کا ڈر، اسے عیب جانیے یا ہنر — وہی بات آئی زباں پر، جو نظر پہ چڑھ کے ہری رہی

رباعیات

ہاں اے دلِ ایذا طلب آرام نہ لے
بدنام نہ ہو منّت کا الزام نہ لے
ہاتھ آ نہ سکے پھول تو کانٹے ہی سہی
ناکام پلٹنے کا کبھی نام نہ لے

رونا ہے بدا جنھیں وہ جم جم روئیں
جب عیش مہیا ہو، تو ہم کیوں روئیں
فردا معلوم و رازِ فردا معلوم
رات اپنی ہے پھر کیوں نہ مزے سے سوئیں

دیکھے ہیں بہت چمن اُجڑتے بستے
کیا کیا گُل پیرہن لُٹے ہیں سستے
اے زندہ دلانِ باغ! اتنا نہ ہنسو
آنسو بھی نکل آتے ہیں ہنستے ہنستے

ممبر پہ جناب جب کبھی ریز کریں
جو بات کریں مضحکہ انگیز کریں
انگور حلال اور مئے انگور حرام
گڑ کھائیں، گلگلوں سے پرہیز کریں

تازہ ہندوستانی مطبوعات

ادب اور جدید ذہن — دیویندر اِسّر — ۴/۵۰
ایک تھا شاعر شاد عارفی، فن اور شخصیت — مظفر حنفی — ۱۲/۰
زیر مطالعہ کی مفصل ڈائرکٹری — محمد صدیق شبلی — ۲۰/۰
۲۴ نظمیں ایک روایت ایک بغاوت — ڈاکٹر سید محمد عقیل الدین — ۳/۰
ببلوگرافیا اردو ڈراما I — ڈاکٹر محمد عبد العلیم نامی — ۷/۰
ببلوگرافیا اردو ڈراما II — ” ” ” — ۷/۰
تصویر بتاں — عصمت جمیل — ۳/۰
چند بھان برہمن — ڈاکٹر عبد الحمید فاروقی — ۲/۵۰
سخنہائے گفتنی — کلیم الدین احمد — ۸/۰
۱۹۶۷ء کی منتخب شاعری (مرتبہ) بواج نرائن از سکارپا شی — ۲/۰
شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت — احمد جمال پاشا — ۳/۰
شرار سنگ — عرش ملسیانی — ۸/۰
شیخ عبد اللہ کشمیر اور ہم — عتیق صدیقی — ۹/۰
علامہ اقبال بھوپال میں — عبد القوی دسنوی — ۱/۲۵
فنِ لطیفہ گوئی — احمد جمال پاشا — ۳/۰
قدیم اردو اوّل (مرتب) — مسعود حسین خاں — ۱۳/۰
قدیم اردو دوم — ” ” ” — ۱۳/۰
کلیم الدین احمد کی شاعری پر ایک نظر — ڈاکٹر ممتاز احمد — ۳/۵۰
گفت و شنید — ظفر ادیب — ۶/۰
مبادیاتِ تحقیق — عبد الرزاق قریشی — ۴/۵۰
ہجویاتِ میر — احمد جمال پاشا — ۳/۵۰
یاس یگانہ چنگیزی — راہی معصوم رضا — ۶/۰

پاکستانی مطبوعات

انوارِ اقبال — مرتبہ بشیر احمد ڈار — ۱۵/۰
اسلام کا نظریۂ جنگ — مولانا ابو الکلام آزاد — ۲/۲۵
اقبال نامہ جہانگیری — مرزا محمد عرف معتمد خاں — ۵/۷۵
البرامکہ — مولانا عبد الرزاق کانپوری — ۱۵/۰
اردو بحیثیت ذریعہ تعلیم سائنس — ڈاکٹر عبد الحق — ۲/۰
اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ — ” ” — ۱/۰
افعال مرکبہ — تمنا عمادی — ۳/۰
ابتدائی فن تدریس — مفتاح الدین ظفر — ۶/۰
آب حیات کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ — سید سجاد — ۵/۰
بہترین نظمیں — مرتبہ۔ قیوم نظر — ۳/۰
بہارستان ناز — مظہر علی خاں — ۵/۵۰
بیتال پچیسی — — ۵/۰
باغ اردو — میر شیر علی افسوس — ۶/۰
باقیات فانی — فانی بدایونی — ۲/۵۰
بیاض — سلیم احمد — ۴/۵۰
پیتیں زرد — خلیل جبران — ۲/۵۰
پرچھائیں — ” ” — ۲/۵۰
تفسیر حقانی کامل ۸ حصے — مولانا حقانی — ۵۵/۰
تحقیق و تنقید — فرمان فتحپوری — ۴/۵۰
تین شاعر — ڈاکٹر زور — ۴/۵۰
تنقیداتِ طٰہٰ حسین — عبد الصمد صارم — ۵/۵۰
تلخیص الاردو — سید ہاشمی فریدآبادی — ۶/۵۰
تاریخ ادب اردو (مصور) — رام بابو سکسینہ — ۱۸/۰
تاریخ فقہ اردو — شیخ محمد جعفری بک — ۹/۰
توتا کہانی — حیدر بخش حیدری — ۴/۵۰
تاریخ ابن خلدون کامل — حکیم احمد حسین عثمانی — ۹۲/۹۰
تاریخ جمالیات — مجنوں گورکھپوری — ۲/۰
ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح پر تکنیکی تعلیم — یونیسکو — ۳/۵۰
جگر اور انکی شاعری — مرتبہ انور عارف — ۱۸/۰
جدید نظمیں — خاطر غزنوی — ۳/۵۰
حضرت اکبر کے شب و روز — محمد رحیم دہلوی — ۶/۵۰
دیوان روشن — روشن — ۵/۰

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ ابراہیم رحمت اللہ روڈ ۔ بمبئی ۳ بی آر

جائزے

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

اردو میں قصیدہ نگاری

مصنف : ڈاکٹر ابو محمد سحر
صفحات : ۲۷۸
سائز : ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت : ۴/-
سنہ اشاعت : ۱۹۵۵ء
ناشر : نسیم بکڈپو لکھنؤ

قصیدہ ہماری شاعری کی وہ قدیم اور مستحکم صنف سخن ہے، جس پر ایک زمانے تک ہر بڑے اور قابلِ لحاظ شاعر نے طبع آزمائی کی ہے اور فخر بھی۔ بعضوں کے بڑے اور مستند شاعر ہونے کا ایک بڑا سبب یہی قصیدہ گوئی رہی ہے زمانہ بدل گیا ہے، اب نہ اس کی ضرورت باقی رہی نہ قدر۔ مگر اس کی جو اہمیت اور شہرت رہ چکی ہے اس سے آج کے شاعر، ادیب اور نقاد کو واقف ضرور ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر کی اس ادبی کاوش، تاریخی چھان بین اور نقدو نظر کی داد دینا چاہیے کہ انھوں نے ایک مشہور صنف سخن کی ابتدا اور ارتقا کے بارے میں مختصر اور جامع طور پر وہ تمام ضروری باتیں مرتب اور یک جا کر دی ہیں جن کو معلوم کرنے کے لیے نہ جانے کتنی کتابوں کی ورق گردانی کرنا پڑتی، کتنا وقت صرف کرنا پڑتا اور پھر بھی خاطر خواہ معلومات کا فراہم ہو جانا مشکل تھا۔

کتاب کی اہمیت اور افادیت میں اُس وقت بھی کوئی کلام نہ تھا جب یہ ۱۹۵۸ء میں پہلی بار چھپی تھی پھر ۱۹۶۶ء میں ترمیم و اضافے کے ساتھ جب اس کا دوسرا اڈیشن نکلا، تو یہ بات اور بھی ثابت ہو گئی کہ یہ کتاب واقعی بہت ہی مفید ہے اور نہایت کار آمد۔

کتاب میں کل دس باب ہیں اور شروع سے آخر تک موضوع کو ہر مناسب رخ سے دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے، تاریخی ترتیب کا لحاظ رکھ کر متعدد اور مختلف ادوار قائم

کیے گئے ہیں۔ فارسی قصیدوں کے تحت مولانا شبلیؒ اور اردو قصیدہ نگاری کے ضمن میں مولانا محمد حسین آزاد اور مولوی عبدالسلام ندوی (صاحب شعرالہند) کی رائے سے اختلاف بھی کیا گیا ہے۔

دکن کے نامور شعرا قلی قطب شاہ غواصی اور نصرتی، پھر سودا اور ذوق تو اردو کے اوّلین اور مشہور ترین قصیدہ نگار تھے ہی، ان کے علاوہ میر، غالب، مومن، نسیم، قلق، سحر، شہیدی، امیر، منیر، جلال، تسلیم، محسن، قدر اور ظہیر وغیرہ کی قصیدہ گوئی کا ذکر اور اس پر جس انداز سے تبصرہ کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنے والے کا مطالعہ کتنا عمیق اور نظر کتنی وسیع ہے۔

کتابچے کے آخری دو باب، "اردو کا ایک طویل قصیدہ" اور قصیدے کی تاریخی و ادبی حیثیت" اس لحاظ سے قابل مطالعہ ہیں کہ اس زمانے میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو ۱۳۹۶ شعروں کا قصیدہ لکھ سکتے ہیں۔ اس قسم کی کوششیں خواہ سراہی نہ جائیں مگر ان کو معمولی اور آسان بھی نہیں کہا جا سکتا۔ رہ گئی قصیدے کی تاریخی اور ادبی حیثیت، وہ کم تو ہو سکتی ہے مگر مٹ نہیں سکتی۔

قدر افزائیوں کا مستحق ہے وہ ادارہ بھی جہاں سے ایسی کام کی کتابیں نکلیں۔

رشید نعمانی

بیسوی صدی کے چند اکابر غزل گو

مصنف : ڈاکٹر محمد اسلام
صفحات : ۳۳۶
سائز : ۲۰×۳۰/۱۶
سنہ اشاعت : ۱۹۶۶ء
ناشر : نسیم بکڈپو لکھنؤ

ڈاکٹر محمد اسلام نے جگر مرادآبادی پر تحقیقی کام کیا ہے۔ اس کے چند ضمنی نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں۔ "بیسوی صدی کے چند اکابر غزل گو" کتابچے کی بھی یہی حیثیت ہے۔ اس میں اصغر، فانی، حسرت، جگر، اثر، فراق کو شامل کیا گیا ہے۔ ہر ایک کا علٰحدہ علٰحدہ ذکر ہوا ہے۔ پہلے مختصر حالات، پھر کلام پر ان کا ذاتی خیال اور دیگر نقادان سخن کی رائیں شامل

ہیں۔ اس کے بعد مختلف عنوانات کے تحت انتخابِ کلام پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتابچہ، چھے شعرا کے مختصر تعارف کی حیثیت رکھتا ہے اور طلبہ کے لیے کسی قدر مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت سب بالکل معمولی ہے۔ اس اعتبار سے قیمت زائد معلوم ہوتی ہے۔

عبداللہ ولی بخش قادری

مشاعرہ عالمِ ارواح

مصنف : سید مرتضیٰ حسن موسوی
صفحات : ۳۳۶
سائز : $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$
قیمت : ۴/-
سنہ اشاعت : ۱۹۵۵ء
ناشر : نسیم بکڈپو لکھنؤ

یہ بارہ سال پرانی کتاب ہے جس کی طرف ناشر نے توجہ دلانی چاہی ہے۔ اس دوران میں مختلف شعرا کی زندگی پر پورے پورے ڈرامے بھی تصنیف ہوئے ہیں اور اُن سے عالمِ ارواح میں، ادیبوں اور انشاپردازوں نے 'انٹرویو' بھی لیے ہیں۔ پھر بھی سید مرتضیٰ حسین موسوی کی تالیف، اپنی افادیت رکھتی ہے۔

اس تمثیلی مشاعرے میں بیالیس ۴۲ شعرا کو پیش کیا گیا ہے جن کا سلسلہ ولی دکنی سے شروع ہو کر آرزو لکھنوی پر ختم ہوتا ہے۔ اس طور تین سو برس کے مستند شعرا کو اُن کی تاریخ وفات کے اعتبار سے سرگرمِ سخن دکھایا گیا ہے۔ ہر ایک کی گفتگو اپنے عہد کی نمائندگی کرتی ہے اور اسی تہذیب و شائستگی کی غماز ہے۔ آزاد اور شبلی کے ذریعے ان شعرائے کرام کے محاسنِ کلام کی نشاندہی کرائی گئی ہے اور مرزا فرحت اللہ بیگ کو دہلی کی آخری شمع، پیش کرنے کی بنا پر مشیر کار کا اعزاز دیا گیا ہے۔ غزل کے علاوہ دیگر محاسنِ سخن کی نمائندگی بھی ہوتی رہی ہے اور بعد میں نعت، قصیدہ، اور مرثیے کے لیے علٰحدہ علٰحدہ گنجائش نکالی گئی ہے۔ آخر میں چند ضمیمے بھی شامل ہیں جن میں مختلف اصنافِ سخن کی وضاحت، شعرا کی خصوصیاتِ کلام، ان کے تعارف کے لیے اُن ہی کا ایک ایک مقطع موجود ہے۔ اس کے علاوہ مشاعرے میں شعرا کی نشست اور اُن کی پیدائش و وفات کے خاکے بھی شامل

کیے گئے ہیں۔

اس طرح بہت کچھ مفید مواد، دلچسپ پیرائے میں ایک جگہ فراہم کر دیا گیا ہے جس سے مؤلف کی سخن سنجی، اور کاوش کا پتا چلتا ہے۔ اس کتاب کی مدد سے طلبہ، مختلف چھوٹے چھوٹے تمثیلی مشاعروں کا اہتمام کر سکتے ہیں۔ اور اسی انداز پر اکثر دیگر شعرا کا اضافہ کرنے کی ترغیب بھی دلائی جا سکتی ہے۔

عبداللہ ولی بخش قادری

آسان مولود شریف

مصنف : نواب محمد صابر قلی خاں
صفحات : ۶۴
سائز : $\frac{20 \times 30}{16}$
قیمت : ۷۵ پیسے
سنہ اشاعت : ۱۹۶۷ء
ناشر : سید سلیمان پبلشنگ ہاؤس بھوپال

اس دور میں جب کہ دین سے رغبت کم ہوتی جا رہی ہے، کسی والیٔ ریاست کا کوئی مذہبی کتاب تصنیف کرنا واقعی قابل ستائش ہے۔ پیش نظر کتاب ریاست محمد گڑھ (بھوپال) کے فرماں روا نواب صفدر جنگ دلیر جنگ بہادر محمد صابر قلی خاں صاحب کی عقیدت مندانہ اور مستحسن کوشش کا نتیجہ ہے۔ اس سے قبل موصوف کی چند اور کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔

بقولِ مصنف "عام مروجہ میلاد ناموں میں زیادہ تر ضعیف روایتیں اس طرز سے بیان کی گئی ہیں جن سے ہادیٔ اعظم رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ ترین زندگی اور قابلِ تقلید کارناموں سے سننے والوں کو آگاہی نہیں ہوتی۔ اس ذکر پاک سے عام مسلمانوں اور غیر مسلموں کو عام طور پر اور دیہاتی مسلمانوں کو خاص طور پر اپنی زندگیوں کو سنوارنے کے لیے جو بہترین ہدایات اور رہنمائی حاصل ہونا چاہیے وہ ان مروجہ میلاد ناموں سے حاصل نہیں ہوتی یہی احساس تھا جس کے تحت میں نے ...... دیہاتی مسلمانوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کا خیال رکھتے ہوئے اس کو آسان ترین زبان میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔"

آسان مولود شریف جس نیک اور پاک جذبہ کے تحت تصنیف کی گئی ہے وہ

قابلِ داد ہے ۔ فاضل مصنف نے کافی تحقیق و جستجو کے بعد صحیح اور مستند روایات کو دلچسپ اور عام فہم انداز میں بیان کیا ہے اور درمیان میں حسبِ موقع منتخب نعت شریف شامل کی ہیں۔ اس طرح شگفتہ نثر و دلآویز نظم کے مجموعے نے کتاب کو خاصا دلچسپ اور مفید بنا دیا ہے، اور سیرت نبویؐ کا مکمل نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ میلاد شریف کا اصل مقصد یہی ہونا چاہیے کہ سیرت نبویؐ کے مختلف پہلوؤں کو بہتر اور مؤثر انداز میں پیش لیا جائے۔ نیز غیر متعلق اور غیر مستند روایات سے اجتناب کیا جائے تاکہ رسول اللہ کے اسوۂ حسنہ سے خاص و عام حسب توفیق مستفیض ہو سکیں۔ فاضل مصنف اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ کتابت طباعت صاف ستھری ہے اور بچوں اور بڑوں کے لیے یکساں مفید ہے۔

شبنم قادری

سالنامہ پیام تعلیم

"دیر و حرم" سہارنپور کی نظر میں

ڈیٹر: جناب محمد حسین حسان ندوی۔ ناشر: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ جامعہ نگر نئی دہلی۔ قیمت: سالانہ چھ روپے۔ ایک کاپی ۶۰ پیسے۔ قیمت سالنامہ دو روپے۔

"ماہنامہ پیام تعلیم" کا سالنامہ ہمیں تبصرہ کے لیے ملا۔ اس جریدہ کا ٹائیٹل ہی اتنا خوبصورت ہے کہ نظر ہٹائے نہیں ہٹتی۔ ٹائیٹل پر سلک اسکرین پرنٹنگ سے پھولوں پر دو چڑیاں بیٹھی دکھائی ئی ہیں اور بچوں کی نفسیات جاننے والا بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ چڑیاں بچوں کو کس قدر عزیز ہوتی ہیں اور پھر لک رنگ کی چڑیاں بھلا کیسے بچوں کی نگاہوں کا مرکز نہ ہوں گی۔

یوں تو بچوں کے لیے بہت سے سادہ و پرکار جریدے مختلف جگہوں سے شائع ہو رہے ہیں ر بلاشبہ وہ بھی اپنا اپنا جداگانہ مقام رکھتے ہیں مگر "پیام تعلیم" کا اپنا ایک منفرد مقام ہے، پیام تعلیم ن الیسا واحد جریدہ ہے جس کو بچوں کی نفسیات کے ماہر فنکاروں کا تعاون حاصل ہے اس وجہ سے ں جریدہ میں شائع ہونے والا مواد بچوں کے لیے افادیت سے پُر ہوتا ہے جس کو کہ بڑی دلچسپی سے

پڑھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہی ملک میں ایسا واحد ادارہ ہے جس میں بچوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت کا بھی عمدہ انتظام ہے اور "پیام تعلیم" جامعہ ملیہ کا آرگن ہے جو اس کے ماحول کی پوری عکاسی کرتا ہے۔ اس کی ترتیب میں اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا جاتا ہے کہ جو کچھ بھی اس جریدہ میں شائع ہو وہ بچوں کی تربیت میں معاون و مددگار ہو۔ اس اعتبار سے "پیام تعلیم" جہاں بچوں کے لیے دلچسپ معلومات فراہم کرتا ہے وہاں ان کے لیے ایک شفیق اور ماہر استاد کا کام بھی دیتا ہے۔

"پیام تعلیم" کا ذاکر نمبر ماضی قریب میں شائع ہو چکا ہے اب زیر نظر سالنامہ اپنی معنوی اور صوری خوبصورتی کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے جس میں بچوں کے لیے ادبی، علمی، تاریخی، سائنسی اور معلومات سے بھرپور تخلیقات نہایت سلیس زبان اور اچھوتے انداز میں فراہم کی گئی ہیں۔ جو گوناگوں دلچسپی کے ساتھ ساتھ اصلاحی قدروں کی بھی حامل ہیں۔

مجموعی طور پر "پیام تعلیم" کا سالنامہ ایک نہایت سنجیدہ اور خوشنما جریدہ ہے جس کو دلچسپ کہانیوں، ڈراموں، نظموں، مزاحیہ مضامین اور تاریخی جغرافیائی و عام معلوماتی مضامین اور ملکی و غیر ملکی لوک کہانیوں نے حسین سے حسین تر بنا دیا ہے۔

ہم ان تمام والدین جن کے بچے زیر تعلیم ہیں پُرزور سفارش کرتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کے نام "پیام تعلیم" ضرور جاری کرا دیں یہ ان کے بچوں کے لیے یقیناً ایک حسین تحفہ ہوگا۔

سید افتخار حسین زیدی

اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ .... سے آپ کی مدت خریداری ختم ہو جاتی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ آپ کتاب نما کی سرپرستی جاری رکھیں گے اور مبلغ دو روپے زر چندہ بذریعہ منی آرڈر ۱۵ اپریل تک بھیج دیں گے تاکہ یہ سلسلہ قائم رہے۔

آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملی تو ہم سمجھیں گے کہ کتاب نما آپ کی سرپرستی سے محروم ہو گیا مجبوراً پرچہ بند کر دیا جائے گا۔

منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیے گا۔ آپ کا خریداری نمبر ہے

(منیجر)

ادبی خبریں

جشنِ غالب کے سلسلے میں بین اقوامی سیمنار

بنارس: اتر پردیش میں جشنِ غالب کے پروگراموں کے سلسلے میں جن کا سلسلہ سال بھر تک جاری رہے گا سب سے اہم پروگرام غالب پر ایک بین اقوامی سیمنار ہوگا جس میں عراق، ایران، پاکستان، برطانیہ، روس اور امریکہ کی ممتاز ادبی شخصیتوں کی شرکت بھی متوقع ہے۔ (قومی آواز لکھنؤ)

امریکی یونیورسٹیوں میں مرزا غالب کی صد سالہ برسی منائی جائے گی

امریکی یونیورسٹیاں برِ عظیم پاک و ہند کے مشہور اردو اور فارسی کے شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب کی سویں برسی کے موقع پر ایک وسیع پروگرام تیار کر رہی ہیں جس کے مطابق نہ صرف امریکی دانشور اس عظیم شاعر کو خراجِ عقیدت پیش کریں گے بلکہ برصغیر کے نامور نقاد اور دانشور بھی امریکی یونیورسٹیوں میں مرزا غالب کے افکار پر روشنی ڈالیں گے۔ (قائد)

بچوں کے ادب سے متعلق مقابلہ میں انعامات

نئی دہلی: مرکزی وزارت تعلیم نے بچوں کے ادب سے متعلق تیرھویں انعامی مقابلہ میں شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی کے استاد اطہر پرویز کے تصنیف کردہ قلمی نسخے بعنوان "ہمارا ہندوستان" کو ایک ہزار روپے بطور انعام دینے کے لیے منتخب کیا ہے۔ ابراہیم فکری کی کتاب "مور۔ قومی پرندہ" پر ان کو ایک ہزار روپیہ کا انعام دیا گیا ہے۔

نئے پڑھنے والوں کے لیے مسودے

نئی دہلی: مرکزی وزارت تعلیم نے نئے پڑھنے والوں کے لیے مسودوں کی فراہمی کے لیے ایک قومی مقابلے کا اہتمام کیا ہے اور اس سلسلے میں ۱۵ اپریل ۱۹۶۸ء تک مسودے طلب کیے ہیں۔

یہ مقابلہ یونیسکو کے زیر اہتمام منعقد کیا جا رہا ہے اور مختلف ہندوستانی زبانوں کے ہر بہترین مصنف کو ۱۶۵۰ روپے کا انعام دیا جائے گا۔ ہر زبان کے لیے اتنی ہی رقم کے کل ۱۶

انعامات مقرر کیے گئے ہیں تین انعامات ہندی اور ایک ایک انعام آسامی، بنگالی، گجراتی، کنٹر، کشمیری، ملیالم، مراٹھی، اڑیہ، پنجابی کے بہترین مسودوں کے مصنف کو دیا جائے گا۔
یہ مسودے ۴۰ ہزار الفاظ پر مشتمل ہونا چاہئیں۔ کسی ایسے مسودے کو مقابلے میں شامل نہیں کیا جائے گا جسے پہلے کسی مقابلے میں انعام حاصل ہو چکا ہے۔ سندھی، تامل، تلگو اور اردو زبانوں کے مسودے پانچ روپے کی فیس کے ساتھ وزارت تعلیم کے اسسٹنٹ تعلیمی مشیر کو (۲-ای-ایس) نئی دہلی کے پتہ پر بھیجا جا سکتا ہے۔ (سیاست)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری

علی گڑھ۔ امسال جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر مسلم یونیورسٹی سے اردو میں چار طلبہ کو پی، ایچ، ڈی کی ڈگری ملی ان کے نام اور موضوعات درج ذیل ہیں۔

۱۔ جمال شریف : دکنی سے پہلے اردو شاعری کی دکن میں نشو و نما۔
۲۔ اسمار سعیدی : حسرت عظیم آبادی۔ زندگی اور شاعری۔
۳۔ نیر اقبال : اردو قواعد نویسی
۴۔ اسلم رضوی : PHONETICS AND PHONOLOGICAL STRUCTURE OF URDU.

اردو صحافی مولانا عبدالباقی کی وفات

یہ خبر انتہائی رنج و افسوس سے سنی جائے گی کہ مولانا عبدالباقی مالک و مدیر ہفت روزہ "کاروان وطن" دلی۔ ۲۳ فروری کو دلی میں انتقال کر گئے۔ مرحوم کم و بیش ۴۵ سال سے میدان صحافت میں تھے انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کی ابتدا مولانا ظفر علی خاں کے اخبار زمیندار سے لاہور میں کی تھی۔ مرحوم اردو ہی کے نہیں بلکہ انگریزی کے بھی اچھے صحافی تھے ادارہ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

ایک اردو دوست کا انتقال

سابق نائب وزیر مرکزی محکمۂ نشریات و اطلاعات لالہ شیام ناتھ کا ۲ مارچ کو بمبئی میں انتقال ہو گیا۔ لالہ صاحب ہندو مسلم اتحاد کے لیے برابر کوشاں رہتے تھے اور اردو کی خدمت کو اپنا فرض سمجھتے تھے مرحوم ۱۹۵۸ء میں انجمن ترقی اردو کی سالانہ کانفرنس کے خازن بھی رہ چکے تھے۔ ادارہ اس سانحہ پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

ان کتابوں کو اپنی لائبریری کی زینت بنالیئے

کتاب	مصنف	قیمت
واردات	منشی پریم چند	۲/۵۰
آخری تحفہ	" " "	۳/۷۵
سپنوں کا قیدی	کرشن چندر	۳/-
دو ہاتھ	عصمت چغتائی	۳/۵۰
خیالستان	سجاد حیدر یلدرم	۳/۷۵
پت جھڑ کی آواز	قرۃ العین حیدر	۵/۲۵
اپنے دکھ مجھے دیدو	راجندر سنگھ بیدی	۴/-
دانہ و دام	" "	۳/۷۵
کیمیا گر	پروفیسر محمد مجیب	۳/-
نئی بیماری	مہندر ناتھ	۲/۵۰
چراغوں کا سفر	رام لعل	۴/-
کالے صاحب	اپندر ناتھ اشک	۲/۵۰
پرند اور دوسرے افسانے	آصفہ مجیب	۱/۵۰
نروان	جیلانی بانو	۴/۷۵
مٹی کی مورتیں	شری رام ورکش بینی پوری	۱/۵۰
سرکنڈوں کے پیچھے	سعادت حسن منٹو	۳/-
ہندوستان ہمارا	بلونت سنگھ	۳/۵۰
غفور میاں	تخلص بھوپالی	۲/۷۵
نمک پارے	مجتبیٰ حسن	۲/۲۵
زندگی کے کھیل	صالحہ عابد حسین	۳/-

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

اردو بازار، دہلی ۶ ۔ شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ ۔ پرنسس بلڈنگ، بمبئی ۳

پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے جال پریس دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

اشاریہ :-

اردو کو کوئی علاقہ میسر ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، بھارت کی راجدھانی میں اسے ایک گھر تو مل ہی گیا۔ افراتفری کے اس دور میں یہی بہت غنیمت ہے۔ اردو گھر کی موجودگی میں اب ہم یہ تو نہ کہہ سکیں گے کہ ع

دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

دعا ہے کہ اردو گھر کی یہ عمارت جلد پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔

۲۳ مارچ ۶۸ء کو وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ہاتھوں جس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا ہے، اس کے جلد ہی تعمیر ہو جانے سے بھی ہم مایوس نہیں ہیں۔ یہ تقریب بڑی سادہ مگر پرشکوہ طریقے پر منائی گئی، محترمہ اندرا گاندھی کی تقریر اتنی ہی دل خوش کن اور دلفریب تھی جیسی ان کے پیش رو وزرائے اعظم، وزرائے تعلیم، اور ملک کے ذمہ دار نیتا بیس برس سے کرتے آئے ہیں۔ اس لیے ان کے الفاظ میں کوئی دلکشی نہیں محسوس ہوئی۔

پھر خیال آیا کہ ان رہنماؤں نے صرف تقریریں کی تھیں، کوئی ٹھوس چیز نہیں پیش کی تھی محترمہ اندرا گاندھی کے عہد حکومت میں چند گز زمین اردو گھر کے لیے ارزانی ہوئی اور خود محترمہ نے عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔

یہ باتیں عملی اقدام کی پیشین خیمہ سمجھی جا سکتی ہیں۔ اور امید پیدا ہوتی ہے کہ "پدر اگر نہ تواند پسر تمام کند" کے مصداق شاید شریمتی اندرا گاندھی ان وعدوں کو عملی شکل بھی دے سکیں جو یادش بخیر اردو کے لیے ان کے محترم والد نے کیے تھے مگر پورے نہ ہو سکے۔ اور اس طرح اس مظلوم زبان کو اس کا وہ حق مل جائے جس کے لیے بہی خواہان اردو بیس برس سے جدوجہد کر رہے ہیں۔

شریمتی گاندھی نے یہ بالکل بجا فرمایا کہ "بدقسمتی سے اسے سیاست اور فرقہ واریت میں

گھسیٹا گیا ہے" یقیناً یہ اقدام زبان سے زیادہ ملک اور قوم کے حق میں سخت ضرر رساں ثابت ہو رہا ہے۔ مگر ملک کے کچھ کوتاہ نظر افراد اور جماعتیں اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند رکھنا ہی ملک کی سب سے بڑی خدمت سمجھتے ہیں۔ کاش وہ ذیل کی عبارت پڑھنے کی زحمت گوارا کریں جو انجمن ترقی اردو نے اپنے تعارفی کتابچہ میں درج کی ہے "یہ بات کچھ کم فخر کی نہیں ہے کہ ابتدا میں انجمن نے جب چند ہمدرد اور سرپرست ایسے بنائے جنھیں پانچ ہزار سے پانچ سو تک یک مشت چندہ دینا پڑتا تھا تو ایسے چھیاسی اصحاب میں سے ۷۱ انگریز اور ۲۳ ہندو تھے ان میں بھی سرفہرست جن بزرگ کا نام تھا وہ راجا امانت راؤ مہا بلونت جاگیردار ردم کنڈہ کا تھا۔ یہ بھی ایک حسن اتفاق ہے کہ انجمن نے سب سے پہلا انعام جس اردو مصنف کو دیا وہ مترجم منشی نرائن پرشاد ورما تھے اور کتاب "پیغمبران ہند" تھی جس میں سری کرشن جی، گوتم بدھ اور ہندو مذہب کے اصول و عقائد کا تذکرہ تھا یہ آج سے تقریباً چالیس پچاس سال پہلے کی بات ہے درحقیقت انجمن کی یہ سیکولر روش آج کل کے حالات کا نتیجہ نہیں ہے آغاز ہی سے اس کا یہ مزاج رہا ہے" اور انصاف کریں کہ اردو پر فرقہ واریت یا صرف مسلمانوں کی زبان ہونے کا الزام کس حد تک دیانت داری پر مبنی ہے۔

فرقہ واریت کا ذکر آ گیا تو دلی کی "سامپرادائکتا ورودھی کمیٹی" کی یاد بھی آ گئی۔ یہ کمیٹی فرقہ واریت کے خلاف بڑی بے جگری اور تن دہی کے ساتھ نبرد آزما ہے۔ "سیکولر ڈیماکریسی" کے نام سے انگریزی میں ایک ماہوار رسالہ نکالتی ہے انگریزی کے علاوہ اردو اور ہندی میں بہت مفید اور سستے کتابچے بھی شائع کرتی ہے۔ ان کتابچوں کے مطالعے سے فرقہ واریت کی عریاں تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ قلم کار کوآپریٹیو لمیٹڈ، کملا مارکیٹ، آصف علی روڈ نئی دلی سے یہ لٹریچر منگا کر مطالعہ کریں تاکہ فرقہ واریت کے سدباب کے لیے آپ بھی اس کمیٹی کو اپنا تعاون پیش کر سکیں اور کمیٹی زیادہ مؤثر طریقے پر اپنا فرض انجام دے سکے۔

● جناب نقی احمد صاحب ارشاد، ڈپٹی مجسٹریٹ لہریا سرائے۔ دربھنگہ نے اپنے جد مرحوم حضرت شاد عظیم آبادی کی نو مثنویوں کا مجموعہ معہ شرح و حواشی مرتب فرمایا ہے، موصوف اس کی اشاعت کے متمنی ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور

آئینہ خانہ بنے گا جلوۂ صد رنگ کا

یہ نظم ۲۳ مارچ کو نئی دہلی میں اردو گھر کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں پڑھی گئی -

ہم نے کتنے خواب دیکھے، خوابِ آزادی کے ساتھ
بستیاں کتنی بسائیں، دل کی آبادی کے ساتھ
خواب کتنے ہیں مگر شرمندۂ تعبیر ہیں
نقش کتنے ہیں جو حسرت خانہ تعمیر ہیں
یوں تو ساقی مہرباں ہے اور دورِ جام ہے
اپنے میخانے میں پھر بھی تشنہ کامی عام ہے
"گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے"
یہ زباں اپنے چمن میں سبزۂ بیگانہ ہے
یہ ستاروں پر کمندیں ڈالنے والی زباں
وادیٔ گنگ و جمن کی گود کی پالی زباں
یہ محبت کی زباں، حرف و حکایت کی زباں
دین و دانش کی زباں عرفان و حکمت کی زباں
آگہی کی ترجماں، آدابِ مستی کا نشاں
بلبلِ رنگیں نوائے گلشنِ ہندوستاں
اپنے کھیتوں اپنے کھلیانوں کی خوشبو اس میں ہے
اپنے شہروں اپنے بازاروں کا جادو اس میں ہے
کیسی کومل کیسی چنچل کس قدر پیاری زباں
کیسی گُن والی زباں اور کیسی دکھیاری زباں
شوق کی وادی میں پھر خیمہ بپا ہونے کو ہے
یعنی "اردو گھر" کی دہلی میں بنا ہونے کو ہے
نقشِ نو تعمیر ہوگا دانش و فرہنگ کا
آئینہ خانہ بنے گا جلوۂ صد رنگ کا

تعارف

اکبر
لارنس بنین مترجمہ: رضیہ سجاد ظہیر

پنڈت وشنو دگمبر
ڈی۔ آر۔ اٹھاولے مترجمہ: ش۔ ا۔ قدوائی

مرکزی حکومت نے ۱۹۵۷ء میں "نیشنل بک ٹرسٹ - انڈیا" قائم کیا - یہ خود مختار ادارہ، مرکزی وزارتِ تعلیم کے تحت کام کرتا ہے جس کا مقصد معقول قیمت پر معیاری ادب کی ترویج واشاعت ہے - پچھلے دس برس کے اندر اس ٹرسٹ نے انگریزی اور ہندوستان کی مختلف زبانوں میں تقریباً دو سو کتابیں شائع کی ہیں - کتابوں کی اشاعت کا کام، یہ ادارہ خود بھی کرتا ہے، مرکزی وزارتِ اطلاعات سے بھی کراتا ہے اور ناشرین کتب سے بھی -

فی الحال کتابوں کے چھے مختلف سلسلے جاری کیے ہیں - ان میں سے ایک قومی سوانحات کا سلسلہ بھی ہے - انگریزی زبان میں اس سلسلے کی نو کتابیں شائع ہو چکی ہیں - اردو میں "اکبر" اور "پنڈت وشنو دگمبر" پہلی دو کتابیں ہیں -

لارنس بنین کی تصنیف "اکبر" بین الاقوامی شہرت کی مالک ہے - اس میں افسانے کی سی روانی پائی جاتی ہے اور شاعرانہ لذت - ساتھ ہی ساتھ تاریخی حقیقت اور غیر جانبداری بھی نمایاں ہے - رضیہ سجاد ظہیر کے ترجمے میں، اصل کی خوبیاں بدستور قائم ہیں - وہ خود ایک شگفتہ قلم افسانہ نگار خاتون ہیں - انھوں نے بنین کی اس شہرۂ آفاق تصنیف کے ترجمے میں اس کا حق ادا کیا ہے - ذرا ابتدائی دو پیرے گراف ملاحظہ ہوں :

"انسان جب لوگوں کے متعلق سوچتا ہے جن پر شہرت مہربان ہوئی اور شہرت اکثر تقدیر کے مانند حق وناحق نہیں دیکھتی - تو اس کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ خوش اعتقادی سے کام لے - وقت کی رفتار اور زمانہ کے فاصلے سے یہ مشہور ہستیاں اپنے چاروں طرف ایک افسانوی ہالہ بنا لیتی ہیں اور کبھی کبھی دنیا والوں کی خوش فہمیوں کے ساتھ مل کر ایسا فریب نظر تیار

کرتی ہیں کہ مخصوص انفرادی روایتیں تخلیق ہو جاتی ہیں۔ جب اس طرح کوئی ہستی دنیا بھر کے ذہن پر چھا جاتی ہے تو عقل پسندوں کی ساری کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں۔ کسی نپولین کے بارے میں پھیلے ہوئے مبالغوں کو چاہے جتنا غلط ثابت کیا جائے، اس کی عظمت کی داستانوں کی چاہے جتنی پول کھولی جائے پر وہ اس طرح زمانے پر چھایا رہتا ہے جیسے اس کا یہ حق کوئی نہیں چھین سکتا۔

لیکن دنیا کے حکمرانوں اور فاتحوں میں اکبر کی ہستی ضرور ایسی ہے کہ جو خود ہی روایتوں کو رد کر دیتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے مورخوں نے نمک حلالی کے مارے کچھ حقیر کوششیں ضرور کی ہیں کہ اس کے چاروں طرف شان و شوکت کا ایک ایسا محیط بنائیں جو بشریت سے بالاتر ہو۔ کہا جاتا ہے کہ ہونہار برواکے جو آثار ہوتے ہیں وہ شروع سے تھے (مثلاً سات مہینے کی عمر میں اس نے پنگوڑے میں لیٹے لیٹے ہی ایک شاندار تقریر کر ڈالی تھی) لیکن یہ افسانوی تاج اس کے سر پر بیٹھتا نظر نہیں آتا۔ بلکہ ایسا لگتا ہے کہ وہ بیزار ہو کر زنجیروں کو جھٹک دینا چاہتا ہے۔ ویسے یہ نہیں کہ اکبر کو شان و شوکت کی کوئی پیاس نہ رہی ہو۔ دور دور تک بھی ایسا نہیں ہے۔ بات اتنی ہے کہ اکبر کے لیے صرف سچائی، صرف حقیقت کافی تھی۔ اور حقیقت بھی ایسی جسے وہ خود پسند کرے، خود قبول کرے۔"

بنین کی اس کتاب میں کل ۱۵ ابواب ہیں جنھیں کسی طور پر طویل نہیں کہا جا سکتا۔ ساتویں باب کا ایک ٹکڑا غالباً دلچسپی کا باعث ہو جس سے اکبر کے کردار پر بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے۔

"اکبر کا ذہن بھی اس کے جسم کی طرح کبھی نچلا نہ بیٹھتا تھا۔ مذہبی معاملات پر بحث و مناظرے کا اسے خاص طور پر شوق تھا۔ لیکن خیال کی وادیوں میں نکل کر وہ ہمیشہ عارضی فیصلے کرتا تھا، ہچکچاتا تھا۔ پس و پیش میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ کیونکہ یہ میدان اس کے لیے صرف ذوق کی تسکین کا سامان تھا جسے اس کے شوق نے ہوا دی تھی۔ یہ اس کا فطری رجحان نہ تھا۔ لیکن، دوسری طرف عمل کے میدان میں اس کی فطرت، اس کی سرشت اور اس کا خون پھوٹا نکلتا تھا۔ جس طرح کوئی فطری مصور نقش کھینچنے میں کھو جاتا ہے، موسیقی داں سُر اور لَے میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اس طرح اکبر مسرتِ عمل سے مدہوش ہو جاتا تھا۔ وہ جہاں انگلی رکھ دیتا تھا وہ جگہ یقینی ہوتی تھی۔ دل اندھے فوراً پتہ کی بات کہہ دیتا تھا۔

اور وہ لوگ جو عمل کے میدان میں زوردار اور قطعی قدم اٹھانے کے لیے فطرت کی طرف سے شوق اور صلاحیت لے کر پیدا ہوتے ہیں، ان کی صلاحیت اور یہ قوت جب کبھی جلوہ دکھاتی ہے تو ضرور ان کی ٹکر اپنے ہم جنس انسانوں سے ہوتی ہے، کسی نہ کسی طرح دوسروں کو محکوم بنانے اور فتح کر لینے کی خواہش ایسی زبردست ہوتی ہے، کہ وہ خود بھی اسے رد نہیں کر سکتے۔

اکبر کی شخصیت میں دراصل ہمارے غور کرنے کی بات یہ ہے کہ فتوحات کی فطری خواہش پوری کر لینے کے بعد وہ پھر اپنی شخصیت کے دوسرے پہلو پر واپس آجاتا ہے، پھر فیاضی اور انسان دوستی اس کے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔ جن لوگوں کو وہ فتح کرتا تھا، وہ اس کی حکومت کو مان لیتے تھے، اس کی اطاعت کو قبول کر لیتے تھے۔"

ان اقتباسات سے مصنف کے طرز تحریر اور ترجمے کی خوبی دونوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

پنڈت وشنو دگمبر کے دیباچے میں ڈاکٹر بال کرشن کیسکر (سابق وزیر حکومت ہند، چیرمین نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا) فرماتے ہیں کہ:

"ہندوستان کی تاریخ میں انیسویں صدی کا نصف دور کافی اہم تصور کیا جا سکتا ہے۔ اسی صدی میں ۱۸۵۰ء سے ۱۹۰۰ء تک ہندوستان کے افق پر بہت سی ممتاز ہستیاں ابھریں جنھوں نے ہندوستانی قوم کے ہر شعبۂ حیات کو نئی زندگی بخشی۔ مثال کے طور پر مہاراشٹر میں لوکمانیہ تلک، بنگال میں سوامی ویویکانند و شری اروند گھوش، پنجاب میں لالہ لاجپت رائے اور رام تیرتھ، دکھنی ہندوستان میں شری کستوری رنگ آئنگر کچھ ایسے لوگ تھے جنھوں نے ملک میں نئی بیداری کی راہیں روشن کیں۔

دراصل یہ ہندوستان کا تجدیدی دور ہے۔ انگریزی حکومت کی جڑیں مضبوط ہو رہی تھیں اور ملک کا روشن خیال طبقہ نئے طریقۂ تعلیم کی وجہ سے مغربی خیالات سے آشنا ہو رہا تھا۔ نئے خیالات نئے نظریات اور سائنس پر مبنی زاویۂ حیات تعلیم یافتہ طبقے کے ذہنوں میں ایک نئی بیداری کو جنم دے رہے تھے۔ ملک کے لیڈر و مفکر ہندوستان کی قدیم عظمت کو بحال کرنے کے ساتھ ساتھ سماج کو نئے انقلابی رجحانات کے پروردہ خیالات سے بھی متعارف کر رہے تھے۔ جذبۂ قومیت، قدیم ہندوستان کے ورثہ کی نگہداشت کا

کا احساس اور جمہوری طرزِ فکر براہ راست اس نئے اندازِ خیال کی دین ہیں۔

مہاراشٹر میں، قوم کی بے لوث خدمت کرنے والے کارکنوں کا ایک طبقہ آگے بڑھ رہا تھا۔ مہادیو گوبند راناڈے اور وشنو شاستری چپلانکر کی تعلیمات نے نئی نسل میں قومی خدمت کا جذبہ پیدا کیا۔ ان رہنماؤں کی تعلیم سے متاثر ہوکر عوام میں علم کے پرچار کا کام اس پود نے اپنے ذمہ لے لیا۔ لوگوں میں سماجی شعور اور سیاسی بیداری پیدا کرنا اور جمہوری بنیادوں پر سماج کی تشکیل کرنا اُن کے مقاصد تھے۔ اس نظریے کی تکمیل کے لیے تمام مذہبی ذرائع میں تعلیم، ادب، ڈراما اور دوسرے فن وغیرہ شامل ہیں، روبہ کار لانا ضروری تھا۔ اس آدرش نے ہمارے نظریۂ حیات کو مذہبی و اخلاقی پاکیزگی بخشی۔

موسیقی کو ہماری قومی تہذیب کا ایک اہم جز بنانے کی سعی جاری تھی۔ اس فن کی عظمت کو بحال کرنے کی کوششیں بھی کی جا رہی تھیں اُس وقت اس فن کی باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو جاہل تھے اور جن میں قوتِ اختراع نام کو بھی نہ تھی۔ صرف امراء و رؤساء اس فن کے سرپرست تھے اور یہ فن ان کے لیے ہی مخصوص سمجھا جاتا تھا۔ ماضی کو از سرِ نو زندگی بخشنے کی تحریک اور اصلاح نے موسیقی پر اثر ڈالا۔ اس تحریک کے روحِ رواں دو نوجوان وشنو تھے۔ ایک کا نام وشنو نرائن بھاتکنڈے تھا اور جو پنڈت بھاتکنڈے کے نام سے زیادہ مشہور ہیں - دوسرے وشنو دگمبر پلسکر تھے جو پنڈت وشنو دگمبر کہلائے - ان دونوں فنکاروں نے موسیقی کی بہتری کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔

ان دونوں فن کاروں کی زندگی کا مطالعہ اور موسیقی کی دنیا میں ان کے کارہائے نمایاں پر نظر کیے بغیر فنِ موسیقی کا طالبعلم اپنی تعلیم کی ابتدا ہی نہیں کر سکتا۔ باوجودیکہ دونوں ایک دوسرے کے ہم عصر تھے مگر ان کے کام کی نوعیت ایک دوسرے سے بہت مختلف تھی۔ بھاتکنڈے نے قدیم و جدید ہندوستانی موسیقی کا تحقیقی مطالعہ کیا اور ساری زندگی اس میں نظم و ترتیب پیدا کرنے کی کوشش کی۔ پلسکر نے عملی قدم اٹھایا اور موسیقی کو مقبول بنانے کی تدابیر کیں۔ انھوں نے اس فن کو سماج کی نظروں میں بلند و باوقار بنایا۔ اُس وقت موسیقار ایک نیچے طبقے کا فرد تصور کیا جاتا تھا۔ وہ لوگ جو اس فن کے مداح بھی تھے موسیقار کو گری ہوئی نظر سے دیکھتے تھے۔ موجودہ نسل کے لیے یہ تصور کرنا کافی

مشکل ہے کہ موسیقار کا درجہ کتنا گرا ہوا تھا اور فن موسیقی کا کیا حال تھا۔ ان دو دلیر ہستیوں نے فن موسیقی میں اصلاح کی اور فن کاروں کے مرتبہ کو بھی بلند کیا۔ وہ جس دلیری اور ثابت قدمی کے ساتھ ساری زندگی اپنے مقاصد کے لیے کام کرتے رہے وہ ضرب المثل ہے۔ یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ اپنی زندگی ہی میں ان کے مقصد کی کم و بیش تکمیل ہوگی۔"

یہ سوانح شری دی۔ آر۔ اٹھاولے کی تصنیف ہے جس کا ترجمہ ش۔ ا۔ قدوائی صاحب نے فرمایا ہے۔ شری اٹھاولے آل انڈیا ریڈیو بمبئی میں میوزک پروڈیوسر ہیں۔ وہ ایک ماہر گلوکار اور مستند موسیقار ہیں۔ فن موسیقی پر آپ کے متعدد مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ زیر نظر سوانح میں شری اٹھاولے نے ان نامساعد حالات کا ذکر دیا ہے جن میں پنڈت وشنو دگمبر نے فن موسیقی کی آبیاری میں اپنی زندگی صرف کی۔ ان کے بیان میں فن اور روح دونوں کے ساتھ ربط خاص کی نمود ملتی ہے۔ ترجمہ بھی رواں ہے۔

ایک ملک کی تاریخ اپنے اکابرین کی زندگی سے عبارت ہے۔ اس سلسلے کا مقصد یہ ہے کہ ایک عام قاری کو عام فہم اور دلچسپ انداز میں دیس کی نامور ہستیوں کی زندگیوں سے روشناس کرایا جائے اور آہستہ آہستہ مختلف جلدوں کی صورت میں اس کے پاس ناموران وطن کا ایک "قاموس مشاہیر" یا انسائیکلوپیڈیا تیار ہو جائے۔

یہ دونوں کتابیں صاف ستھری چھپی ہیں۔ لیکن قیمت کچھ زائد معلوم ہوتی ہے۔

"نیشنل بک ٹرسٹ۔ انڈیا" نے ابھی تک اردو میں چند ہی کتابیں شائع کی ہیں لیکن اب توقع ہے کہ ٹرسٹ کے موجودہ سکریٹری جناب کرتار سنگھ دگل صاحب جیسے مقبول اردو افسانہ نگار کے عہد میں اردو کے شائقین کو اس آہستہ خرامی کا گلہ باقی نہ رہے گا۔ یہ کتابیں مکتبہ جامعہ سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

نئی مطبوعات

کتاب	مصنف	ناشر	قیمت
لاجونتی	رمیش جین	پنجابی پستک بھنڈار دہلی	۴/۵۰
امیر خسرو	علی عباس حسینی	” ” ”	۳/۷۵
ضرورت ہے ایک قاتل کی	ہنری مثالٹ	” ” ”	۶/۵۰
دوسری سے پہلے	کرشن چندر	نفیس پبلشرز الہ آباد	۵/-
سایۂ شیطان	مظہر الحق علوی	نسیم بکڈپو، لکھنؤ	۱۰/-
ہمزاد	مسعود جاوید	” ” ”	۱۰/۵۰
صبا	سلمیٰ کنول	” ” ”	۸/-
خوفناک گھاٹی	مظہر الحق علوی	” ” ”	۲/۵۰
مرزا رسوا: حیات اور ناول نگاری	ڈاکٹر آدم شیخ	” ” ”	۴/-
مضامین لسان الصدق	عبدالقوی دسنوی		۲/۵۰
ظلم کی شکست	جلیس سہسوانی، جلیل احمد سہسوانی		۲/-
مخدوم ایک مطالعہ	داؤد اشرف	حیدرآباد	۲/۵۰
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی	سعید احمد صدیقی	مکتبہ شاہراہ، دہلی	۱/۵۰
نغمۂ شعور	عبدالمتین نیاز	مرکز ادب بھوپال	
تذکرہ عقد ثریا	غلام ہمدانی مصحفی۔ مترجم: عطا کاکوی	پٹنہ	۲/-
تذکرہ صبح گلشن	سید علی حسن خاں ” ” ”	”	۱/۵۰
تذکرہ نتائج الافکار	قدرت اللہ گوپاموی ” ”	”	۱/۵۰
نوائے سرور	ڈاکٹر حکم چند نیر	بنارس	۴/-
کلیات مصحفی (مجلد)	مرتبہ: ڈاکٹر نورالحسن	مجلس اشاعت ادب دہلی	۱۶/۲۰
جلتے کنول	شمس	لکھنؤ	۳/-
شادیانے	بشارت شکوہ	”	۴/-

ضیائے نور	مرتبہ: سید محمد الٰہی	حیدر آباد	-/۳
خاک کا پتلا	مریم زمانی	سیرت پبلشرز - امروہہ	-/۳۰
آگ کا چمن	" "	" " "	-/۳۰
بیٹے کی قربانی	" "	" " "	-/۳۰
بادشاہ کا خواب	" "	" " "	-/۳۰
مچھلی والے نبی	شبنم قادری	" " "	-/۳۰
آخری نبی ؐ	" "	" " "	-/۵۵
طالوت جالوت	مریم زمانی	" " "	-/۳۰
نبی کا بیٹا	" "	" " "	-/۳۰
خدا کی اونٹنی	" "	" " "	-/۳۰
سبا کی شہزادی	" "	" " "	-/۳۰
جیب کا روزہ	" "	" " "	-/۳۰
لاٹھی کا سانپ	" "	" " "	-/۵۵

عنایت حسین عیدن

ماریشس میں اُردو

جزیرہ مڈگاسکر کے قریب ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جس کا نام ماریشس ہے ، انگریزوں کے قبضے میں تھا ، ۱۲ مارچ ۱۹۶۸ء کو آزاد ہوگیا ۔ اس جزیرے کے اپنے باشندے نہ تھے یہاں اب سے کئی سو سال پہلے دوسرے ملکوں سے لوگ یہاں آکر بس گئے تھے اسی لیے اس جزیرے کے تقریباً سات لاکھ باشندوں میں ، یورپین ، چینی ، افریقی اور ہندوستانی نسل کے لوگ پائے جاتے ہیں ۔ یہاں کی سرکاری زبان انگریزی ہے لیکن فرانسیسی زبان کا انگریزی کے مقابلے میں زیادہ اثر ہے ۔ فرانسیسی زبان عام طور پر بولی جاتی ہے ۔ اخبار بھی اسی زبان میں چھپتے ہیں ۔ ریڈیو کا پروگرام بھی فرانسیسی میں ہوتا ہے البتہ تعلیم انگریزی اور فرانسیسی دونوں زبان میں دی جاتی ہے ۔ فرانسیسی کے ساتھ ایک علاقائی زبان بھی وجود میں آگئی ہے جسے کریول (CREOLE) کہتے ہیں ۔ یہ زبان فرانسیسی کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے جس کو عام لوگ بولتے ہیں ۔ دیہات میں بسنے والے ہندوستانی نسل کے باشندے ایک ہندوستانی بولی بولتے ہیں جو پوربی بولی سے کچھ ملتی جلتی ہے گو کہ اس میں فرانسیسی زبان کے بہت سے الفاظ آگئے ہیں ۔ ان لوگوں میں کم لوگ ایسے ہیں جو اردو یا ہندی پڑھ یا لکھ سکتے ہیں ۔ عام طور پر اردو یا ہندی پڑھنے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جو تبلیغی کام کرتے ہیں ۔ ہندوؤں کے مذہبی رہنما سنسکرت کے ساتھ کچھ کچھ ہندی کی بھی واقفیت رکھتے ہیں ۔ مسلمانوں کے مولوی ہوتے ہیں جو عربی پڑھ تو لیتے ہیں لیکن اُسے سمجھ نہیں سکتے ۔ یہ لوگ عربی کے ساتھ اردو بھی پڑھ سکتے ہیں ۔

ماریشس میں اردو کی تاریخ بہت قدیم نہیں ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے اردو کی ترقی شروع ہوئی ہے ۔ وہاں کی مسجدوں میں امامت کے لیے ہندوستان سے مولوی لوگ بلائے جاتے تھے اور یہاں اردو کا فروغ اُن ہی کا مرہون منت ہے ۔ ان کی صحبت میں بیٹھ کر چند مقامی لوگ بھی اردو سیکھ لیتے تھے اور وہ کسی دوسری جگہ جا کر امامت کرنے کے ساتھ کچھ بچّوں کو اردو بھی سکھاتے تھے ۔ آج بھی مسجدوں میں بعض اوقات اردو پڑھائی

جاتی ہے حالانکہ یہ لوگ زیادہ زور عربی پڑھنے پر دیتے ہیں، ماریشس میں بھی پہلے پہل داستان گوئی ایک بڑا دلچسپ مشغلہ تھا۔ الف لیلیٰ، داستانِ امیر حمزہ، قصۂ حاتم طائی اور باغ و بہار یہاں اکثر گھروں میں پائی جاتی ہیں۔ رفتہ رفتہ اردو سیکھنا اور پڑھنا مقدس کام بن گیا اور دھیرے دھیرے اردو نے ایک اچھی پوزیشن حاصل کرلی۔ یہاں حقیقت یہ تھی کہ صحیح اردو پڑھانے والا کوئی نہ تھا۔ بچوں کو صرف اردو پڑھائی جاتی ہے لیکن وہ ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتے تھے۔ اردو کے صرف و نحو سے بھی واقف نہیں ہوتے تھے۔ بس کسی طرح اردو پڑھ لیتے تھے۔ اردو کو اس حد تک مقدس مانا جاتا تھا کہ جب کسی مسلمان کو کاغذ مل جاتا تھا جس میں اردو لکھی ہوتی تھی تو وہ اسے جلا دیا کرتا تھا یا اسے کسی کونے میں محفوظ کر دیتا تھا تاکہ یہ کاغذ کسی کے پیروں کے نیچے نہ آئے۔ اردو سیکھنے کا مقصد یہ تھا کہ مجلس[1] یا مولود[2] پڑھی جا سکیں۔ اردو کتابیں مشکل سے ملتی تھیں اور جو کتابیں تھیں بھی وہ صرف مذہبی نوعیت کی تھیں۔ ماریشس میں مولانا حکیم عبداللہ رشید نواب رشد مکی کی آمد اردو کے لیے نہایت مفید ثابت ہوئی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ماریشس کے لوگ اردو سے بڑا لگاؤ رکھتے ہیں تو انھوں نے اردو پڑھانے کا بہتر طریقہ اختیار کیا۔ مولانا رشید ماریشس کی جامع مسجد کے امام تھے اور امامت چھوڑ کر انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم کی طرف اپنی بقیہ زندگی گزاری۔ وہ عالم تھے اور شاعر بھی رشد تخلص فرماتے تھے۔ سیماب اکبر آبادی سے ان کی گہری دوستی تھی۔ سیماب کے موحد اعظم کے جواب میں مولانا رشید نے ایک نظم شہاب ثاقب لکھی جو انتظامی پریس حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی ہے۔ اس نظم میں آدم کی تخلیق کے راز اور ابلیس کی حرکات کی حقیقت پر نہایت واضح روشنی ڈالی گئی ہے۔ اُن کی دوسری نظم فلسفۂ زندگی بھی شائع ہوئی۔ مولانا رشید چاہتے تھے کہ اردو مسلمانوں کی قومی زبان ہو۔ پہلے انھوں نے خود اردو پڑھنا شروع کیا اُن کی مدد سے چند نوجوانوں نے اردو اور عربی میں کافی مہارت حاصل کرلی۔ جن میں جناب شوکت علی امام دین بھی ہیں۔ جو اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چلنے کی پوری کوشش کرتے رہتے ہیں۔ آج بھی وہ مسلم ہائی اسکول میں پڑھاتے ہیں۔ یہ وہی اسکول ہے جسے عبداللہ رشید نے قائم کیا تھا اور جو اب تک مسلم ہائی اسکول کے نام سے مشہور ہے۔ اس اسکول میں عربی کے ساتھ ساتھ اردو پر زیادہ

---

[1] "مجلس" تین موقعوں پر پڑھی جاتی ہیں محرم کے مہینے میں ربیع الاوّل اور ربیع الآخر کے مہینے میں ان مجلسوں میں شہدائے کربلا، پیغمبر اسلام اور عبدالقادر جیلانیؒ کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔

[2] مولود میں حضرت محمدؐ کی شان میں نعت پڑھی جاتی ہیں۔

زور دیا جاتا ہے ۔ مولانا نے خود عربی کے لیے چند کتابیں لکھیں اور اردو کے لیے ان کتابوں کو استعمال کرنے لگے جو ان دنوں ہندوستان کے اسکولوں میں رائج تھیں ۔ اردو شاعری پر بھی انھوں نے زور دیا ۔ اُن کے ذریعے ماریشس میں اقبال کی مقبولیت بڑھی ۔ اُن کی یہ حسرت باقی رہ گئی کہ ماریشس میں ایک پریس قائم ہو جائے ۔ ادھر مسلم ہائی اسکول روز بروز ترقی کرتا گیا ۔ اُدھر مولانا کی وجہ سے ماریشس میں جگہ جگہ اسکول کھولے جانے لگے جہاں عربی اردو یکساں طور پر پڑھائی جانے لگی ۔ ہندوستان اور پاکستان کے رسالے اور کتابیں آنے لگے ۔ عوام میں اردو سیکھنے کا ایک جذبہ پیدا ہو گیا جو روز بروز بڑھتا گیا ۔ مولانا صاحب کی کوششوں اور محنت کا پھل تو صحیح معنوں میں اُس وقت ملا جب حکومت نے پرائمری اسکولوں میں اردو کی پڑھائی شروع کی ۔ ۱۹۵۲ء سے اردو اور ہندی کی تعلیم پرائمری اسکولوں میں شروع ہوئی ۔ ہندوستان کے جناب رام پرکاش نے اردو اور ہندی دونوں کی ترقی کے لیے بہت محنت کی ۔ ابتدائی دور میں انھوں نے ایسی درسی کتابیں نصاب میں شامل کیں جو ہندوستان کے اسکولوں کے نصاب میں ہوتی تھیں ۔ کچھ دنوں کے بعد انھوں نے ہندی میں خود کتابیں تیار کیں لیکن اردو کے لیے پاکستانی کتابوں کو نصاب میں شامل کر دیا ۔ اردو کی پڑھائی میں ترقی ہوتی گئی اور آج ماریشس کے ہر اسکول میں اردو پڑھانے کے لیے ایک سرکاری ہے ۔

ریڈیو اور ٹیلیویژن نے بھی اردو سیکھنے کی طرف رجحان پیدا کر دیا ۔ ریڈیو میں ڈیڑھ گھنٹے کا ہندوستانی پروگرام ہوتا تھا جس میں مختلف چیزیں نشر کی جاتی تھیں ۔ پروگرام ہندوستانی زبان میں ہوتا تھا یعنی بعض وقت اردو اور بعض وقت ہندی میں ۔ ہندوستانی فلمی گانے اور ہندوستانی فلموں کے ذریعے لوگ اردو زیادہ سمجھنے لگے ۔ اب ریڈیو کا پروگرام چار گھنٹے کا ہو گیا ہے اور ٹیلی ویژن پر ہفتے میں دو مرتبہ ہندوستانی پروگرام ہوتا ہے ۔

۱۹۵۶ء میں جناب فنڈن بی اے کی مدد سے جامعہ اردو علی گڑھ کا ایک مرکز ماریشس میں قائم کیا گیا ۔ فنڈن صاحب جامعہ اردو کے سپرنٹنڈنٹ ہیں انھوں نے برناندیں دے سیں پئر کے ناول پال اے ویرژینی کا اردو میں ترجمہ کیا ہے ۔ جامعہ اردو کے امتحانات کو حکومت ماریشس نے تسلیم کیا چنانچہ جامعہ اردو کے ابتدائی پاس کرنے والوں کو سرکاری اسکولوں میں جگہ ملنے لگی ۔ اسکول میں معلمی کے فرائض انجام دینے کی خواہش کے سبب لوگ جامعہ اردو کے امتحان کی طرف متوجہ ہوئے ۔ ۱۹۵۶ء میں جامعہ اردو کے امتحان کے لیے تقریباً تیس امیدوار تھے لیکن ہر سال امیدواروں کی تعداد بڑھتی چلی گئی ۔ ابتدائی اور ادیب کے لیے کافی امیدوار ہو گئے ادھر چند برسوں سے ادیب ماہر کے لیے بھی کچھ امیدوار

امتحان دے رہے ہیں ۔ ۱۹۶۷ء میں ابتدائی کے لیے ۱۶۷ ، ادیب کے لیے ۱۰۷ ، ادیب ماہر کے لیے ۲۳ اور ادیب کامل کے لیے ۳ امیدوار تھے۔

کچھ طالب علم سینیر کیمبرج اور جنرل سرٹیفکیٹ آف ایجوکیشن ، لندن کے امتحانات میں بھی اردو کو ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے لے رہے ہیں اور پچھلے آٹھ سال سے ان طلبا کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے ۔ سینیر کیمبرج کے پرچوں میں تین اردو عبارتیں دی جاتی ہیں جن کا ترجمہ اردو سے انگریزی میں کرنا ہوتا ہے ایک چھوٹا ترجمہ انگریزی سے اردو میں بھی ہوتا ہے اور ایک چھوٹا سا مضمون بھی لکھنا پڑتا ہے ۔ موخر الذکر امتحان میں بھی اس سال سے اردو داخل کی گئی ہے ۔ اس امتحان میں اردو سے انگریزی میں ترجمے کرنے ہوں گے اور مضمون بھی لکھنا ہوگا ۔ اس کے علاوہ نذیر احمد کی توبۃ النصوح اور غالب کے خطوط بھی کورس میں ہیں ۔ ان پر جو سوال ہوں گے اسے انگریزی میں بھی حل کیا جا سکتا ہے ۔ ۱۹۶۶ء میں حکومتِ ہند کی طرف سے جناب عظیم الحق جنیدی ماریشس تشریف لے گئے جہاں آن کو اردو سکشن کا نگران بنایا گیا ۔ ماریشس کے باشندے اُن کی خدمات سے بہت متاثر ہوئے ۔ انھوں نے جگہ جگہ اردو کی انجمنیں قائم کیں اور خود بھی اردو کے طلبہ کی مدد کرتے رہے ۔ اردو سے لگاؤ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے ۔ یہاں کا ہر مسلمان اردو سیکھنا اپنا فرض سمجھتا ہے لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ اردو کو اب زیادہ تر مذہبی نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا ۔ اردو ادب کی طرف توجہ دی جا رہی ہے ہندوستان اور پاکستان سے چند رسالے جاتے رہتے ہیں حالانکہ ان رسالوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے اور بعض اوقات پابندی سے بھی نہیں جاتے ۔ شمع ، بیسویں صدی ، بانو ، لیل و نہار ، ماہ نو کی چند کاپیاں جاتی ہیں ۔ یہاں ایک اردو لائبریری کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے ۔ انڈین ہائی کمیشن کی لائبریری میں چند اردو کتابیں ہیں ۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ عوامی مانگ کو پورے طور پر پورا نہیں کر سکتیں ۔ اس کے علاوہ سائنٹفک طریقے سے اردو پڑھانے والے بھی کم ہیں اور پڑھانے والوں کی معلومات بھی معیاری نہیں ہے ۔ ماریشس میں پرائمری اسکول کے لیے ایک نصاب تیار کرنا ضروری ہے جس میں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ ان بچوں کا ماحول کیا ہے اُن کی مادری زبان اور اُن کی تہذیب کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے اردو کا فروغ ہو سکتا ہے لیکن اردو دانوں کی اب بھی کمی ہے اردو پریس کی ضرورت بڑھ رہی ہے یہ چیزیں ماریشس میں اردو کے ایک خوش آئند مستقبل کی نشاندہی کرتی ہیں ۔
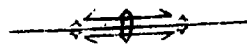
جامِ نو

اصغر

۱۸۸۴ ـــــ ۱۹۳۶ء

اصغر حسین نام، اصغر تخلص، آبائی وطن گورکھپور، ان کے والد منشی تفضل حسین صدر قانون گو کی حیثیت سے بہت دنوں تک گونڈے میں رہے اور یہیں سے پنشن یاب ہوئے۔ عربی اور فارسی میں اچھی استعداد رکھتے تھے۔

اُس وقت کے دستور کے مطابق اصغر کی تعلیم کی ابتدا مکتب سے ہوئی، پہلے انھوں نے عربی، فارسی اور اردو پڑھی اس کے بعد انگریزی تعلیم کے لیے گورنمنٹ اسکول گونڈہ میں داخل کرادیے گئے۔ ۱۹۰۴ء میں مڈل کا امتحان پاس کیا۔ آگے بھی پڑھنا چاہتے تھے مگر باپ کی خواہش اور مشورے کی بنا پر تعلیمی سلسلہ ختم کرکے نوکری کرلی۔ فرصت کے اوقات مطالعے اور بعض دوسری دلچسپیوں میں صرف کرنے لگے۔ ادبی ذوق کی تسکین اور معاش کی خاطر اصغر نے فیض آباد کے دو اخباروں (ہفت روزہ قیصر ہند اور پیغام) میں کام کیا۔ ریلوے محکمے میں ملازم رہے۔ جب اس کو چھوڑا تو چند روز کے لیے بساط خانے کی دوکان کھولی پھر عینک سازی کا کاروبار شروع کیا۔ تھوڑے دنوں تک اردو مرکز لاہور سے بھی وابستہ رہے۔ آخر میں رسالہ "ہندستانی" الٰہ آباد کے اڈیٹر مقرر ہو گئے تھے۔ مختصر یہ کہ وہ جہاں بھی رہے اور جو کام بھی کیا اس میں عزت نفس، خودداری، فرض شناسی اور خوش اخلاقی کے بلند معیار کو ضرور برقرار رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تمام عمر احباب میں وقیع، ماتحتوں میں ہر دل عزیز اور افسروں کی نگاہ میں قابل قدر اور قابل عزت رہے۔

ان کا مطالعہ بڑا عمیق تھا، نظر میں وسعت تھی، رکھ رکھاؤ میں تہذیب اور شرافت پائی جاتی تھی، رہن سہن میں بڑے سلیقے اور نفاست کا خیال رکھتے تھے، غرض صورت اور سیرت ہر لحاظ سے وہ مشرقی محاسن و اقدار کا ایک مکمل اور پرکشش نمونہ تھے۔ ۷-۱۸۹۶ء سے شعر کہنے لگے تھے باقاعدہ طور پر نہ خود کسی کے شاگرد ہوئے اور نہ کسی کو اپنا شاگرد بنایا ابتدائی دور میں منشی خلیل احمد وجد بلگرامی اور منشی امیر اللہ تسلیم کو اپنا کلام دکھایا تھا۔ قاضی عبدالغنی

منگلوری ایک صاحبِ طریقت بزرگ تھے اُن سے گہری عقیدت تھی اور اُن کے مخصوص مریدوں میں تھے۔

اصغر کی مدتِ حیات اور مدتِ شاعری دونوں ان کے اکثر ہم عصروں سے کم رہی، اقبال، حسرت، فانی، جگر اور فراق ان میں سے ہر ایک اپنے رنگ و آہنگ میں ممتاز اور خیالات وافکار کے لحاظ سے منفرد۔ اصغر نہ ان میں سے کسی کے حریف کہے جا سکتے ہیں اور نہ کسی پرانے اسلوب یا نئے طرزِ سخن کے مقلد و موجد۔ انھوں نے جو کچھ کہا ہے اس میں فلسفہ بھی ہے اور تصوف بھی، ان کے تغزل میں بڑی شائستگی اور تخیل میں ایک رفعت اور پاکیزگی محسوس ہوتی ہے۔

پورے کلام کے دو مختصر سے مجموعے ہیں، پہلا مجموعہ "نشاطِ روح" مرزا احسان احمد، اور مولانا اقبال سہیل کے مقدمے اور تبصرے کے ساتھ پہلی بار ۱۹۲۵ء میں طبع ہوا تھا۔ اور دوسرا مجموعہ سرودِ زندگی کے نام سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں سر تیج بہادر سپرو کا مقدمہ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریظ بھی شامل ہے۔

سر سپرو کا یہ خیال کہ "...... حضرت اصغر کا کلام ہمارے دور کا ایک اعلیٰ ترین شاہکار ہے اور اس قابل ہے کہ آج کل کے بہترین دل و دماغ اس سے لطف اندوز ہوں" پھر مولانا آزاد کی رائے "اس کی شاعری کی وقعت، بحث و اثبات کی محتاج نہیں" یہ دونوں باتیں نہ تو بالکل ہی بے بنیاد قرار دی جا سکتی ہیں اور نہ ان کے لکھنے والوں کے بارے میں یہ سوچنا چاہیے کہ انھوں نے بے جا توصیف اور جانب داری سے کام لیا ہوگا۔

انتخاب

"نشاطِ روح"

اگر خموش رہوں میں، تو تو ہی سب کچھ ہے   جو کچھ کہا، تو ترا حسن ہو گیا محدود

کچھ اس طرح ہوئیں عاجز نوازیاں اس کی   کہ میری آہ کو ہے، اب تلاشِ بے اثری

فتنہ سامانیوں کی خُو نہ کرے   مختصر یہ کہ آرزو نہ کرے

زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا   رُخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

ہر حال میں بس پیشِ نظر ہے وہی صورت — میں نے کبھی روئے شبِ ہجراں نہیں دیکھا
روداد قفس سنتا ہوں اس طرح قفس میں — جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

اسیرانِ بلا کی حسرتوں کو آہ کیا کہیے
تڑپ کے ساتھ اونچی ہو گئی دیوار زنداں کی

سنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی — کچھ خواب ہے، کچھ اصل ہے، کچھ طرزِ ادا ہے

تقدیر کس کے خرمنِ ہستی کی کھل گئی — طوفان بجلیوں کا تمھاری نظر میں ہے

ترے جلوؤں کے آگے ہمتِ شرح و بیاں رکھ دی — زبانِ بے نگہ رکھ دی، نگاہِ بے زباں رکھ دی

جو نفس ہے ترا مستی کی ادا ہو جائے — موجِ صہبا ترا ہر لغزشِ مستانہ بنے
رند جو ظرف اٹھا لیں وہی ساغر بن جائے — جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی مے خانہ بنے

شعر میں رنگینیٔ جوشِ تخیل چاہیے
مجھ کو اصغر کم ہے عادت نالہ و فریاد کی

میں اک چراغِ کشتہ ہوں شامِ فراق کا — تو نو بہارِ صبحِ گلستاں لیے ہوئے

کیا مرے حال پہ سچ مچ انھیں غم تھا قاصد — تو نے دیکھا تھا ستارہ سرِ مژگاں کوئی

جینا بھی آ گیا مجھے مرنا بھی آ گیا — پہچاننے لگا ہوں تمھاری نظر کو میں

غزل کیا اک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغر — یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

گزر گئی ترے مستوں پہ وہ بھی تیرہ شبی — نہ کہکشاں نہ ثریا نہ خوشۂ عنبی

مدت ہوئی کہ چشمِ تحیر کو ہے سکوت
اب جنبشِ نظر میں کوئی داستاں نہیں

یہ حسن کی موجیں ہیں یا جوشِ تبسم ہے
اس شوخ کے ہونٹوں پر اک برق سی لہرائی ہے

سرمستیوں میں شیشۂ مے لے کے ہاتھ میں
اتنا اچھال دیں کہ ثریا کہیں جسے

"سرودِ زندگی"

تیری ہزار برتری، تیری ہزار مصلحت
میری ہر اک شکست میں، میرے ہر اک قصور میں

بس لئے یہ ہوا ہنگامۂ دار و رسن برپا
کہ لے آغوش میں آئینہ کیوں مہرِ درخشاں کو
سنا ہے حشر میں شانِ کریمی تاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ داغِ عصیاں کو

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا
وہ شورشیں، نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے
جب مختصر کیا انھیں انساں بنا دیا
ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر
تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

ساقیا! جامِ بکف، پھر ہو ذرا گرمِ نوا
حسنِ یوسفؑ، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا دیکھیں

یہاں تو عمر گزری ہے اسی موج و تلاطم میں
وہ کوئی اور ہوں گے سیرِ ساحل دیکھنے والے

چمن میں چھیڑتی ہے کس مزے سے غنچہ و گل کو
مگر موجِ صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی

یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

یکایک توڑ ڈالا ساغرِ مے ہاتھ میں لے کر
مگر ہم بھی مزاجِ نرگسِ رعنا سمجھتے ہیں

کم سے کم حسنِ تخیل کا تماشا دیکھئے جلوۂ یوسف تو کیا خوابِ زلیخا دیکھئے

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

کیا کیا ہیں دردِ عشق کی فتنہ طرازیاں ہم التفاتِ خاص سے بھی بدگماں رہے
میرے سرشکِ خوں میں ہے رنگینیٔ حیات یارب فضائے حسن ابد تک جواں رہے

ردائے لالہ و گل، پردۂ مہ و انجم جہاں جہاں وہ چھپے ہیں عجیب عالم ہے
یہ ذوقِ سیر، یہ دیدارِ جلوۂ خورشید بلا سے قطرۂ شبنم کی زندگی کم ہے

نالۂ رنگیں میں ہم مستوں کے ہے کیفِ شراب
لڑکھڑائے پائے نازک دیکھئے ہاں دیکھئے
دیدۂ بے خوابِ انجم، سینۂ صد چاکِ گل
حسن بھی ہے مبتلائے دردِ پنہاں دیکھئے

جائزے

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

اردو نثر میں ادبِ لطیف

سنہ اشاعت ۱۹۶۷ء

مصنف: ڈاکٹر عبدالودود خاں
صفحات: ۵۰۱ ، سائز $\frac{20\times30}{16}$
قیمت: -/۸
ناشر: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ لکھنؤ

پیش نظر کتاب اصل میں وہ مقالہ ہے جس پر عبدالودود خاں صاحب نے وکرم یونی ورسٹی (اجین) سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ تحقیق کے لیے ایک اچھوتا اور دل چسپ موضوع انتخاب کیا گیا ہے۔

انیسویں صدی کے آخر سے بیسوی صدی کے وسط تک "ادب لطیف" کا بڑا چرچا اور دور دورہ رہ چکا ہے۔ ہماری زبان کے بہت سے ادیب، افسانہ نگار اور انشا پرداز اس وجہ سے اور بھی مقبول و مشہور ہوئے کہ انھوں نے اس صنفِ خاص کی طرف خصوصی توجہ برتی اور اس کو فروغ دینے کی طرف مائل اور کوشاں رہے۔

فاضل مقالہ نگار نے "ادب لطیف" کی ابتدا، ارتقا، اس کی غرض و غائت، اہمیت و حیثیت، اس کا عروج اور پھر زوال ان تمام باتوں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ موضوع کے ہر رخ اور پہلو کو وسیع النظری کے ساتھ دیکھنے، ادبی دیانت داری سے جانچنے اور پرکھنے اور پھر انصاف پسندی کے ساتھ نتائج اخذ کرنے کی بڑی اچھی کوشش کی ہے۔

کتاب کے پندرہ جامع ابواب میں پہلے تین باب وہ ہیں جن میں ادبِ لطیف کے آغاز، ادب کے مختلف مقاصد، تحریکیں، قدما سے لے کر دورِ حاضر تک کے ادیبوں کے نظریات اور ماہیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے اوّلین علم برداروں سے متعارف کرایا گیا ہے۔ اس کے بعد یلدرم سے آصف علی تک ۲۳، ۲۴ نثر نگاروں کی نگارشات کو سامنے رکھ کر وضاحت کے ساتھ "ادب لطیف" کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور اس کی خوبیوں اور خامیوں پر مبصرانہ نگاہ ڈالی گئی ہے۔ افراد کے علاوہ جو رسالے ان تحریک کے نقیب یا مبلغ رہے ہیں ان کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں شرر، ناصر علی، یلدرم، مہدی، نیاز، مجنوں، سجاد انصاری، اور

ضی عبدالغفار وغیرہ کی بعض مخصوص تحریروں، مضامین اور کتابوں کے حوالے اور مثالوں سے
دبِ لطیف کے معیاری نمونے پیش کیے گئے ہیں - اس فہرست میں بعض ایسے ادیب اور شعرا
بھی ہیں جن کی کوششوں سے ادب لطیف کی خوبیوں میں اضافہ ہوا اور کچھ ایسے بھی ہیں جن
کی وجہ سے اس کا معیار اور اعتبار کم ہوا ، غرض جب تک ادب ، خواص تک مخصوص اور محدود
رہا ، ادبِ لطیف کی ضرورت اور اہمیت قائم رہی ، جب جب اس کا تعلق عوام اور جمہور سے
بڑھتا گیا اس کی خصوصیت اور اہمیت کم اور ختم ہوگئی - بہرحال ادب لطیف کے عروج و
زوال کی داستان سلیقے ، صحت اور ذمے دارانہ اصولوں پر مرتب کی گئی ہے - اور باوجود
اس کے کہ "ادبِ لطیف گزرے ہوئے دور کی یادگار ہے" اس میں کوئی شک نہیں کہ "اردو ادب
پر ان کے بڑے احسانات ہیں" اس "یادگار" کا احساس اور احترام اور اس کے "احسانات"
کا اعتراف جس نوعیت کے ساتھ ڈاکٹر عبدالودود خاں صاحب نے کیا ہے اس کے لیے وہ توصیف
و مبارک باد کے مستحق ہیں -

تعریف کے قابل ہے وہ ادارہ بھی جس کی بدولت ایسی معقول اور مفید کتابیں
سامنے آجاتی ہیں

رشید نعمانی

دُخترِ شب

سنہ اشاعت : اگست ۱۹۶۷ء

مترجم : مظہر الحق علوی
صفحات : ۵۱۸ ، سائز : $\frac{20 \times 30}{16}$
قیمت : -/۹
ناشر : نسیم بک ڈپو ، لاٹوش روڈ ، لکھنو

اس کتاب کے شروع میں لکھا ہے ——— "ایک عجیب و غریب مہماتی ناول" ——— سچ پوچھیے
تو یہی چھوٹی سی عبارت پوری کتاب کا نچوڑ ہے - رائیڈر ہیگرڈ کے دوسرے مشہور مہماتی ناولوں
کی طرح اس ناول کی کہانی بھی افریقہ کے پر اسرار جنگلوں سے ہی متعلق ہے اور افریقہ
کے ایک ایسے دور اُفتادہ علاقے کی داستان ہے ، جہاں کے رہنے والے مہذب دنیا سے
کوئی ناتا نہیں رکھتے - جو تعلیم یافتہ نہ ہوتے ہوئے بھی زبردست نجومی ہیں اور بے پناہ صلاحیتوں
کے مالک - انھیں جانوروں اور موسموں پر اختیار ہے اور وہ اُن سے جب چاہیں اپنی
ضرورت کے مطابق کام لے لیتے ہیں ہزاروں خطرات سے پُر جنگل اور ریگستانوں کے جان
لیوا سفر ، راستے کے حیرت انگیز جادو ٹونے ، افریقی قبائل کے رہن سہن کے عجیب و غریب طور

طریقے، وِچ ڈاکٹروں اور مہنتوں کے ساحرانہ کارنامے، جنگ و جدل، شکار، حسن و عشق، غرض ہر قاری کی دلچسپی کا سامان اس میں موجود ہے۔ پوری کہانی اتنی جاندار اور دلچسپ ہے کہ ایک بار شروع کرنے پر بغیر ختم کیے نہیں رہا جاتا۔ مظہر الحق صاحب قابلِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اتنے اچھے ناول کو اردو دنیا سے روشناس کرایا۔ صاف ستھری چھپائی اور خوبصورت رنگین ٹائیٹل کے لیے نسیم بکڈپو بھی قابلِ ستائش ہے۔ البتہ کتابت کی غلطیاں اور ترک طبیعت پر گراں گزرتے ہیں۔

ریحان احمد عباسی

اُردو شاعری میں تاج محل

سنہ اشاعت ۱۹۶۸ء

مرتب : شجاع خاور
صفحات : ۱۶۰، سائز ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت : ۱.۷۵
ناشر : اردو پبلیکیشنز، دہلی

تاج محل اپنے حسن و رعنائی کی بنا پر ہر خوش مذاق اور صاحبِ نظر کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور رہے گا۔ شاعر ایسی چیزوں سے سب سے زیادہ محظوظ و متاثر ہوتا ہے چنانچہ نظیر اکبر آبادی سے لے کر آج تک اردو زبان کے بہت سے شاعر اس کو مختلف نقطۂ نظر سے دیکھتے اور اس پر طرح طرح سے اظہارِ خیال کرتے آئے ہیں۔ شاعروں کی نظر اور اُن کے اظہار کا طریقہ بہت سی حیثیتوں سے قابلِ قدر ہے اور باعثِ لطف بھی۔

شجاع خاور صاحب کی تلاش اور کوششوں کی داد دینا چاہیے کہ ایک اتنے حسین و جمیل موضوع پر اردو زبان کے قریب قریب ہر معروف اور غیر معروف شاعر کے یہاں سے (موضوع کے متعلق) جو کچھ انھیں ملا اپنے نزدیک اس کا بہترین انتخاب انھوں نے اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ یہ اردو شعر و ادب کی خدمت بھی ہے اور تاج محل سے یک گونہ عقیدت بھی۔

پوری کتاب میں اہم شاعروں کا کلام موجود ہے۔ ہر ایک کا اپنا اپنا انداز ہے اور بات کہنے کا جداگانہ ڈھنگ۔ ضروری نہیں کہ ہر ایک کا انداز سب کے لیے مرغوب اور ہر نظریے سے سب کا اتفاق ہو شاعر کو جو کچھ کہنا تھا کہا اور اپنے طور پر کہا، لیکن مرتب صاحب نے بھی ضروری سمجھا کہ وہ ہر نظم اور شاعر کے بارے میں خود بھی کچھ نہ کچھ ضرور کہیں۔ ایک جامع اور مرتب کی حیثیت سے انھوں نے جو کیا ہے اچھا کیا ہے، مگر نقد و نظر کے معاملے میں اُن کے ارشادات اور قلم کاریاں بحث و اختلاف کا مرکز بن گئی ہیں، میکش،

عرشؔ، اخضرؔ، آزادؔ اور بہت سے دوسرے شعرائے کرام پر تنقید اور گرفت میں توازن اور اعتدال کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔

کتاب اس لحاظ سے دل چسپ اور کار آمد ہے کہ اس میں ایک لطیف موضوع کے بارے میں بہت سا قابل تعریف شعری سرمایہ فراہم اور یک جا ہو گیا ہے۔

رشید نعمانی

یاس یگانہ چنگیزی

مصنف : راہی معصوم رضا
صفحات : ۳۱۰
قیمت : ۶/-
ناشر : شاہین پبلشرز ۴۳۷ حسن منزل الہ آباد ۳

یاس یگانہ چنگیزی نے اپنی زندگی میں نیکنامی کے بجائے بدنامی اٹھائی۔ انھیں کچھ شہرت ضرور ملی مگر مقبولیت ہرگز نہیں۔ اُن کی ذات، مختلف وجوہات کی بنا پر نشانۂ ملامت بنی رہی اور ان کے نقدِ سخن کی پذیرائی نہ ہو سکی۔ وہ کج کلاہ بھی تھے اور خود نگر بھی۔ ان کی شخصیت میں بل پڑ گئے تھے۔ انھیں وسیع النظر اور کشادہ دل، سخن فہم درکار تھے جن کی داد و ستائش سے اُن کے جوہر کھلتے اور انھیں آسودگی نصیب ہوتی لیکن شومئ قسمت سے انھیں محدود مذہبی معتقدات اور روایتی مقامی تعصبات کی آگ میں جلنا نصیب ہوا۔ مرزا واجد حسین عظیم آبادی کی زندگی، ان کے تخلص یاسؔ اور تخلص یگانہؔ دونوں کی حقیقی تفسیر ہے۔ وہ ایک المیہ ہے اور اس کی داستان عبرت آموز۔

یاس یگانہ چنگیزی کی خود ستائی نے اُن سے کہلوایا ہے کہ:

زمانہ لاکھ گم ہو جائے خود اپنے اندھیرے میں
کوئی صاحب نظر اپنی طرف سے بدگماں کیوں ہو

لیکن اُن کا حوصلہ یہ رہا ہے کہ:

زمانہ پر نہ سہی، دل پہ اختیار رہے
دکھا وہ زور کہ دنیا میں یادگار رہے

مگر حقیقت کا بیان یوں ہے کہ:

ٹھوکریں کھلوائیں کیا کیا پائے بے زنجیر نے
گردش تقدیر نے، جولانئ تدبیر نے

ایسی پُرپیچ شخصیت پر راہی معصوم رضا نے قلم اٹھایا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ:

"یگانہ چنگیزی پر مقالہ لکھنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ یگانہ ایک بحث طلب شخصیت ہیں۔ اُن کے بارے میں نہ تو ان کی زندگی میں غیر جانب داری اور ناقدانہ ہمدردی سے سوچا گیا اور نہ اُن کے مرنے کے بعد...... میں نے غیر جانب دار رہنے کی کوشش کی ہے لیکن یگانہ سے اتنی ہمدردی ضرور کی ہے جتنی ہمدردی کا تقاضہ فریضہ نقد کرتا ہے۔"

اس مقالے کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ راہی صاحب اپنے مقصد میں پورے طور پر کامیاب ہیں۔ "شخصیت" اور "منظر و پس منظر" پہلے دو باب اپنے اندر بڑی صداقت اور شرافت رکھتے ہیں اور قاری کو یگانہ سے اتنی ہمدردی یقیناً پیدا کرا دیتے ہیں جتنی وہ چاہتے ہیں۔ دیگر ابواب میں یاس اور یگانہ کی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے اور آخر میں جدید اردو غزل میں یاس یگانہ کی اہمیت کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔

راہی صاحب کے بیان میں شخصیت کی جائزہ اور مناسب پاسداری بھی موجود ہے۔ اس سے سخن سنجی کا مطالبہ بھی پورا ہوتا ہے۔ اگرچہ انھوں نے ایک پرانے اور ایک نئے ناقد و شاعر کو اپنے مقالے میں اُن کی ادبی حیثیت سے زیادہ نمایاں کر دیا ہے تاہم انھوں نے اپنی بات بہت اور مفصل طور پر ہی کہی ہے۔ اُن کا انداز بیان رواں اور شستہ ہے۔ آخر میں انتخاب کلام بھی شامل ہے اور "مصادر" بھی درج ہیں۔

راہی صاحب اپنی تصنیف کے لیے بہر طور مبارکباد کے مستحق ہیں۔ انھوں نے صرف فرض کفایہ ہی ادا نہیں کیا ہے بلکہ واقعی ایک ادبی خدمت انجام دی ہے۔ امید ہے کہ ارباب ذوق، خاطر خواہ داد دیں گے

عبداللہ ولی بخش قادری

سالنامہ پیام تعلیم

ماہنامہ انیس ادب کی نظر میں

اڈیٹر: محمد حسین حسان ندوی، ضخامت ۱۸۴ صفحات، ٹائٹل بہت دیدہ زیب لکھائی چھپائی کاغذ بہتر قیمت دو روپے، ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

پیام تعلیم بچوں کا رسالہ ہے مکتبہ جامعہ سے لگ بھگ ۴۲ سال سے نکل رہا ہے۔ ہر سال جنوری میں اپنا سالنامہ نکالتا ہے۔ ہمارے سامنے اس کا جنوری ۶۸ء کا سالنامہ ہے

اب کے یہ غیر معمولی شان و شوکت سے نکلا ہے۔ سب سے پہلے تو اس کے سرورق (ٹائٹل) پر نظر جاتی ہے۔ بے اختیار منہ سے واہ واہ نکل جاتا ہے۔ سلک اسکرین پر ابھری ہوئی چھپائی۔ بہترین رنگوں کے امتزاج نے عجیب بہار دکھائی ہے۔ اندر دیکھیے تو ایک سجا سجایا باغ نظر آتا ہے۔ اس میں مزے مزے کی کہانیاں بھی ہیں۔ تاریخی مضمون بھی ہیں، سائنسی اور معلوماتی مضمون بھی ہیں۔ بچوں کی دلچسپی کی پیاری پیاری نظمیں، لطیفے اور مزاحیہ مضمون بھی ہیں۔ ایک سے ایک اعلیٰ۔ زبان سب کی سادہ اور دلچسپ پورا رسالہ "عروس جمیل و لباس حریر" کا مصداق ہے۔

بچوں کے پرچے تو اور بھی نکلتے ہیں۔ مگر اس سالنامے کو اور پیام تعلیم کے عام پرچوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ پرچہ ایک خاص مقصد سے نکلتا ہے۔ اور وہ مقصد ہے کہ بچوں میں اچھی اچھی چیزیں پڑھنے اور ترقی کی طرف قدم اٹھانے کا شوق اور ولولہ پیدا کرنا جغرافیہ، تاریخ سائنس کے مضامین کے ذریعے انھیں نئی پرانی باتوں سے باخبر رکھنا ایسی کہانیاں اور پچھلے بزرگوں کے ایسے سچے واقعات شائع کرنا جن سے بچے کے دل میں پرانی یا صحیح اخلاقی قدروں کی اہمیت ہو اور جو اس کی کیرکٹر سازی میں مدد و معاون ہوں۔ نظموں اور گیت کے ذریعے ان میں حب وطن کا اور باہمی میل محبت اور رواداری کا جذبہ پیدا کرنا کتنے نیک مقاصد ہیں یہ بچوں کے ایک ایسے رسالے سے جو جامعہ جیسے ادارے کی سرپرستی اور ماہرین تعلیم کی رہنمائی میں نکلتا ہو توقع بھی یہی کی جا سکتی تھی۔

پیام تعلیم نے اس طویل مدت میں بچوں کے لیے صالح اور مفید ادب ہی نہیں پیدا کیا بہت سے ادیب بھی پیدا کیے پیام تعلیم کا یہ کارنامہ قابل فخر ہے۔

ہماری خواہش ہے کہ بچوں کے اس رسالے کی زیادہ سے زیادہ سرپرستی کی جائے۔ اور دیس میں اردو جاننے والے ہر گھر میں اس کی پذیرائی ہو۔

ادبی خبریں

اردو دوستوں کو مبارک ہو کہ ۲۳ مارچ ۱۹۶۸ء کو وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے انجمن ترقی اردو ہند کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد ۔ ے راؤز ایونیو، نئی دہلی میں رکھا۔ تلک برج کے قریب جو سڑک سین ترسنگ ہوم کی سامنے کی طرف جاتی ہے اس پر تقریباً دو سو قدم چلنے کے بعد داہنی طرف تقریباً بارہ سو گز مربع زمین حکومت نے اس عمارت کے لیے انجمن کو دی ہے۔ اسی جگہ پر ایک شامیانے کے نیچے سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب انجام دی گئی۔ حاضرین میں وزیر اعظم کے علاوہ انجمن کی مجلس عامہ کے اراکین، روسی سفیر، علمی اور ادبی اداروں کے نمائندے، ادیب اور شاعر، جامعہ ملیہ، مکتبہ جامعہ اور جمعیۃ علماء کے سرآوردہ حضرات اور اخباری نمائندے موجود تھے۔

جلسے کی کارروائی جامعہ کے طلبا نے اقبال کی نظم "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" سے شروع کی۔ اس کے بعد صدر انجمن پنڈت کنزرو نے انجمن کی مختصر تاریخ بیان کی اور وزیر اعظم سے دستخط ثبت کی کردہ "اردو گھر" کا سنگ بنیاد رکھیں۔ سنگ موسیٰ پر سنہرے نستعلیق حروف سے مزین سنگ بنیاد کو اپنی جگہ پر قائم کرنے کے بعد وزیر اعظم نے صاف ستھری اردو میں تقریر کی۔ وزیر اعظم کی تقریر کے بعد پروفیسر آل احمد سرور نے ایک نظم پڑھی (سرور صاحب کی یہ نظم اس شمارے میں ملاحظہ فرمایئے) اس کے بعد پنڈت آنند نرائن ملا، اور ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین نے تقریریں کیں۔ آخر میں جن من گن پر یہ یادگار تقریب ختم ہوئی۔

کیمونٹی ڈیولپمنٹ و کوآپریشن ڈیپارٹمنٹ، حکومت ہند کی جانب سے ہندوستان کی مختلف زبانوں کی بارہ کتابوں کو کل ہند بنیادی لٹریچر مقابلے کے لیے منتخب کیا گیا ہے ان میں سے ہر کتاب کے مصنف کو ایک ہزار روپیہ نقد انعام دیا جائے گا۔ اردو انعام کے لیے مسٹر نند کشور بکرم کی تصنیف "کوآپریٹو ڈیری" منتخب کی گئی ہے۔ (الجمعیۃ دہلی)

اردو ہندی سنسکرت مصنفین کو ۰۰۰،۷ ۵ روپے کے انعامات طبع زاد تخلیقات ۱۳ مئی تک طلب، حکومت یوپی کا اعلان۔

حکومت اتر پردیش ۶۹-۱۹۶۸ء کے دوران ہندی ادب فنڈ سے ادب، سائنس، قانون اور اصول قانون، فلسفہ اور تاریخ وغیرہ سے متعلق کتابوں پر ۱۰۰۵۰ روپیہ کے انعامات تقسیم کرے گی۔

اردو کتابوں پر انعامات حسب ذیل ہیں

۱۵۰۰ روپیہ کا غالب پرسکار ۱۲۰۰ روپے کا اکبر الہ آبادی پرسکار اور ۸۰۰ روپے کا رام پرشاد بسمل پرسکار۔ اس کے علاوہ پانچ پانچ سو روپے کے متفرق انعامات دیے جائیں گے۔

انعامات دینے کے لیے صرف یکم جنوری ۱۹۶۷ء اور ۳۱ دسمبر ۱۹۶۷ء کے درمیان شائع شدہ کتابوں پر ہی غور کیا جائے گا اگر کسی خاص موضوع پر کوئی معیاری کتاب موصول نہ ہوگی تو اس موضوع پر کوئی انعام نہیں دیا جائے گا۔

ہر کتاب کے ۸ نسخے سکریٹری یوجنا سمتی ایجوکیشن سی ڈیپارٹمنٹ کونسل ہاؤس لکھنؤ کو ۳۱ مئی ۱۹۶۸ء تک موصول ہونا چاہئیں۔ (الجمعیۃ)

● انجمن ترقی اردو مغربی بنگال نے صد سالہ جشن غالب کے سلسلے میں غالب کے کلام کو بنگلا میں منتقل کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ بنگلا اور اردو کے ادیبوں پر مشتمل ایک بورڈ تشکیل دیا گیا ہے جس نے انتخاب ترجمہ کا کام شروع کر دیا ہے۔ اس ترجمہ میں اصل متن بھی دیا جائے گا اور غالب کے سوانح اور ان کے فکر و فن پر تفصیلی مقدمہ شامل ہوگا۔ ترقی اردو ۱۶ مارچ ۶۸ء

● ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی نئی کتاب "ریڈنگز ان لٹریری اردو پروز" وس کان سن یونیورسٹی، امریکہ سے شائع ہوگئی ہے۔ یہ کتاب اُن طلبہ کے لیے ہے، اردو جن کی مادری زبان نہیں۔ اردو کے کئی سو سالہ نثر کا انتخاب پیش کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ اس کے ذریعے ثانوی سطح پر نہ صرف اردو زبان و ادب کی تمام تعلیم دی جا سکے بلکہ اردو کی پشت پر جو مخصوص تہذیبی تصور ہے اس کے بنیادی عناصر بھی سامنے آجائیں۔ امریکہ سے نستعلیق میں شائع ہونے والی یہ پہلی باضابطہ کتاب ہے اور آفسٹ پر نہایت حسین و جمیل چھپی ہے۔ مغرب میں اردو کے ایک اچھے ثانوی انتخاب کی جو کمی مدت سے محسوس ہو رہی تھی، اس کتاب کی اشاعت سے وہ پوری ہو جائے گی۔

● ٹونک سے اطلاع ملی ہے کہ راجستھان کے مشہور نغز گو شاعر مولانا سید محمود الحسن صاحب صولت نے طویل علالت کے بعد ۸۴ سال کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ صولت صاحب مرحوم قدیم سلسلے کی ایک کڑی اور بڑے قادر الکلام غزل گو شاعر تھے۔ ان کی وفات سے راجستھان کے شعری اور ادبی حلقے میں ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا ہے۔

پاکستانی مطبوعات

کتاب	مصنف	قیمت
اسلامی قانون کی تدوین	مولانا امین احسن اصلاحی	۲/۵۰
اولیائے لاہور	محمد لطیف ملک	۲۵/-
اردو میں سوانح نگاری	ڈاکٹر سید شاہ علی	۸/۷۵
افضل المواعظ	مولوی محمد ابراہیم دہلوی	۴/۲۵
تصوف کی حقیقت اور اس کا فلسفۂ تاریخ	حضرت شاہ ولی اللہ	۵/۰
تعمیر کا عمل	سید عابد علی عابد	۳/۲۵
تزک تیموری	سید ابو الہاشم ندوی	۵/۰
خواب جوانی	ایم اسلم	۵/۰
در توبہ	″ ″	۴/۵۰
رباعیات انیس	عمر فیضی	۲/۰
رقعات عالمگیری	سید اولاد حسین شاداں بلگرامی	۱/۰
علم النفس	جے ایف اسٹوٹ	۵/۵۰
قندیل	سردار محمد عزیز	۱/۷۵
کالا پانی	محمد جعفر تھانیسری	۳/۵۰
میری کہانی	ایم اسلم	۵/۵۰
مارکسی فلسفہ		۱/۵۰
نسوانی امراض اور ان کا سد باب	حکیم محمد اقبال حسین	۲/۵۰
واقعات عالمگیری	عاقل خاں رازی	۲/۰
یہ ہے شمالی افریقہ	جان گنتھر	۳/۰
"اردو" سہ ماہی جنوری	انجمن ترقی اردو کراچی	۵/۰
"اردو" ″ اکتوبر	″ ″	۵/۰
"اردو" ″ جولائی	″ ″	۵/۰
احسن الکلام	احسن مارہروی	۱۰/۰
اسوۂ علیؑ	سید رئیس احمد جعفری	۱۰/۰
حیات کامل شاہ	ولی محمد سنجوانی	۷/۰
سیاست شرعیہ اردو	امام ابن تیمیہ	۱۱/۵۰
سیر عبد الرحمٰن بن عوفؓ	سید فضل ابن احمد	۱۰/۰
احمق الذین	منشی سجاد حسین	۱/۵۰
الہارون	عمر ابو النصر	۳/۰
اختری بیگم	مرزا محمد ہادی رسوا	۲/۲۵
انتخاب مقالات شبلی		۱/۵۰
توبۃ النصوح	مولوی نذیر احمد	۲/۵۰
تذکرہ	ابو الکلام آزاد	۴/۵۰
چھوئی موئی	عصمت چغتائی	۳/۰
چوٹیں	″ ″	۲/۲۵
حضرت ابو ایوب انصاریؓ	طالب ہاشمی	۳/۰
خالد سیف اللہ	ابو زید	۳/۵۰
خطبات اقبال	غلام احمد پرویز	۱/۵۰
دیوان خواجہ میر درد	عبد الباری آسی	۱/۷۵
رابعہ بصری	وداد السکاکینی	۲/۰
زاد راہ	منشی پریم چند	۲/۲۵
شاہد رعنا	قاری سرفراز حسین	۲/۵۰
شیر شیرا شیرا!!!	بشیر احمد چودھری	۳/۷۵
ضدی	عصمت چغتائی	۱/۵۰
عمر فاروق اعظمؓ	محمد حسین ہیکل	۱۵/۰
عمر بن عبد العزیزؒ	احمد زکی صفوت	۱/۷۵
غبار خاطر	ابو الکلام آزاد	۴/۵۰
فسانۂ مبتلا	مولوی نذیر احمد	۳/۲۵
گفتگو اور تقریر کا فن	ڈیل کارنیگی	۴/۵۰
میٹھے بول میں جادو ہے	″ ″	۸/۰
مثنوی گلزار نسیم	دیا شنکر نسیم	۱/۵۰
مقدمہ شعر و شاعری	خواجہ الطاف حسین حالی	۲/۲۵
مریم مجدلانی		۱/۵۰
نیرنگ خیال	محمد حسین آزاد	۳/۵۰
یادگار غالب اول	خواجہ الطاف حسین حالی	۲/۵۰
″ ″ دوم	″ ″	۳/۰

ہندوستانی مطبوعات

(ادب) کنز المطالب / شرح دیوان غالب	مولانا ابو الحسن ناطق گلاؤٹھوی	۱۲/۰
″ غزل اور متغزلین	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	۶/۵۰
″ غالب	ڈاکٹر سید عبد اللطیف	۳/۵۰
″ مرزا رسوا حیات اور ناول نگاری	ڈاکٹر آدم شیخ	۶/۰
(شعری) دیوان غنی	ملا محمد طاہر غنی کاشمیری	۸/۰
″ کلیات میر اول	مرتبہ ظل عباس عباسی	۲۰/۰
″ کلیات مصحفی جلد دوم	نثار احمد فاروقی	۶/۵
″ غزل انسائیکلوپیڈیا (عام ایڈیشن)	مرتبہ ذکی کاکوروی	۵/۰
″ غزل انسائیکلوپیڈیا (خاص ایڈیشن)	″ ″	۶/۰
″ بہزاد نامہ	ساغر نظامی	۱۳/۰
(سوانح) حضرت غوث الاعظم سوانح مبارک و تعلیمات	اکبر آبادی	۳/۰
(ناول) ایک تھی آشا	ضیا عظیم آبادی	۴/۰
″ خالی ہاتھ	عادل مارہروی	۴/۰
″ تصویر بتاں	عصمت جمیل	۳/۰
″ طاہرہ	زبیدہ سلطانہ	۶/۲۵
″ گنوار	تنویر زہرہ بخاری	۸/۰
(ادب) مضامین لسان الصدق (ابوالکلام آزاد)	مرتبہ عبد القوی دسنوی	۲/۵۰
(تعلیم) بچوں کی تربیت	ڈاکٹر عبد الرؤف	۱/۵۰
″ بچوں کی رہنمائی	″ ″	۱/۵۰
(ناول) بساط شیطان	منظہر الحق علوی	۱۰/۰
″ بہزاد	مسعود جاوید	۱۰/۵۰

رباعیات عمر خیام، مصور (ترجمہ اردو، انگریزی) مترجم محشر نقوی ۳/۰

معیاری ادب، ارزاں قیمت (پاکستانی مطبوعات)

اردو کی عشقیہ شاعری	فراق گورکھپوری	۲/۲۵
تاریخ جمالیات	مجنوں گورکھپوری	۲/۰
شبلی نقادوں کی نظر میں	محمد واصل عثمانی	۲/۲۵
فسانۂ عجائب	رجب علی بیگ سرور	۴/۵۰
نکات مجنوں	مجنوں گورکھپوری	۳/۵۰

ملنے کا پتہ:-

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، نزد جے جے ہسپتال، بمبئی ۳ (انڈیا)

Regd. No D. 58 May 1968.

KITAB NUMA

JAMIANAGAR NEW DELHI-25

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے جمال پریس دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا [illegible]

مینجنگ ایڈیٹر:
غلام ربانی تاباں
مدیر مسئول:
مجیب احمد خاں

ماہنامہ کتاب نما
نئی دہلی ۲۵

جون ۱۹۶۸ء
جلد ۹ شمارہ ۶
سالانہ چندہ: دو روپے
فی پرچہ: بیس پیسے

اشاریہ

خیر سے ہندوستان میں سنہ کئی ایک ہیں۔ عیسوی، ہجری فصلی، مالی سال وغیرہ عیسوی سنہ کے آغاز میں ایک دوسرے کو مبارک باد دینا اور نیک خواہشات کا اظہار کرنا ایک رسم بن گئی ہے۔ اس کے خاتمے پر بھی عام طور سے ہم نئے سال کے خوش آیند تصور میں سال بھر کی کلفتوں کو بھول جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور بھول بھی جاتے ہیں۔

مگر مالی سال ہے۔ خدا کی پناہ! اس کی آمد آمد ہی سے دل کانپنے لگتا ہے اور یہ دھڑکا لگنے لگتا ہے کہ دیکھیے ہماری قوت برداشت کا امتحان اب کس طرح لیا جاتا ہے! اور جب یہ آچکتا ہے تو کمر پہ جو پہلے ہی ٹیکسوں کے بوجھ سے دوہری ہوتی ہے، چند گٹھریاں ایسی لاد دیتا ہے جنھیں پورے سال اٹھائے رکھنے پر ہم مجبور ہوتے ہیں۔ گویا ہمارے مالی سال کا آغاز اور اختتام دونوں ہی ہمارے لیے ایک طرح کی مصیبت ہوتے ہیں، عذاب ہوتے ہیں۔

سال رواں کے تحفوں میں ایک خاص تحفہ ڈاک اور تار کے محکمہ نے عطا فرمایا ہے۔ پوسٹ کارڈ اور لفافے کی قیمتوں میں اور ڈاک کے دوسرے محصولوں میں غیر معمولی اضافے نے "سمندِ ناز" پہ ایک اور تازیانہ کا کام کیا ہے۔ ذاتی طور پر ہم سب اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ کاروباری سطح پر اس کا اثر علمی اور ادبی طبقے پر پڑ رہا ہے۔ حکومت کی متضاد پالیسی کا اس سے زیادہ واضح اظہار اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تعلیم کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کی باتیں کی جاتی ہیں، دوسری طرف تعلیم یافتہ طبقے کے پڑھنے

لکھنے کے شوق کا گلا گھونٹا جاتا ہے۔ کتابوں، اخباروں اور رسالوں کے محصول اتنے بڑھا دیے گئے ہیں کہ اگر کوئی شخص ایک روپیہ بچا کر کتاب خریدنا چاہے تو محصول کی شرح کے ساتھ اس کی قیمت کے لیے ایک روپیہ اور بعض حالات میں اس سے بھی زیادہ رقم کی فراہمی اس کے لیے ایک مسئلہ بن جاتی ہے اور اپنے شوق کا گلا خود ہی گھونٹنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اس محصول کے اضافے پر کس کی ہمت ہے جو وزیر خزانہ سے کچھ کہہ سکے خصوصاً ان کی اس دھمکی کے بعد کہ وہ کرسیِ وزارت چھوڑنے کو تیار ہیں لیکن اس محصول میں کمی کرنے پر آمادہ نہیں۔

ایک طرف یہ سب کچھ ہے اور دوسری طرف ہماری جنتا کی سرکار نے کاغذی صنعت کاروں پر ترس کھا کر کاغذ پر سے کنٹرول اٹھا لیا۔ کاغذ والوں نے ۱۵ فیصدی قیمت کے اضافہ کا اعلان کر دیا۔ اس طرح کتابوں کی قیمت میں اضافہ ناگزیر ہو گیا۔

ہم نہیں چاہتے کہ کتابوں کی قیمت میں اضافہ کریں۔

لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب اردو پڑھنے والے کتابیں خرید کر پڑھنے کی عادت کو اپنائیں۔ زیادہ تعداد میں کتابیں شایع ہوں گی تو لاگت کم آئے گی اور قیمت میں اضافہ کی ضرورت نہ پڑے گی۔

یہی کیفیت کتاب نما اور پیام تعلیم کے ساتھ ہے۔ ان رسالوں کی قیمت میں بھی بار بار اضافہ کرتے ہوئے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اسی لیے ان کے لیے بھی یہی اپیل کر سکتے ہیں کہ ہر خریدار اگر زیادہ نہیں، صرف دو نئے خریدار بنانا اپنے ذمہ لے لے تو اس طرح بہت بڑی حد تک ہمارا بار ہلکا ہو جائے۔

افسوس ہے کہ کتاب نما کے ساتھ ہمدردی اور تعاون کا اظہار جس جوش و خروش کے ساتھ شروع ہوا تھا، ایسا لگتا ہے کہ وہ جوش اب دھیرے دھیرے دھیما پڑتا جا رہا ہے اور بے توجہی پھر عام ہونے لگی ہے۔

اردو زبان کے لیے یہ وقت بڑا نازک ہے، بڑی پریشانی کا ہے۔ لیکن اگر پورے خلوص اور لگن سے آپ ہماری مدد فرمائیں تو یہ گھڑی ٹل سکتی ہے، اچھے دن آ سکتے ہیں۔ کاش آپ کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ مادّی غذا کے ساتھ ذہنی غذا بھی ضروری ہے۔

مظفؔر شاہجہانپوری

غزل

ہزار جشنِ چراغاں ہو سر خوشی کے لیے
نگاہ و دِل بھی ضروری ہیں روشنی کے لیے

خُدا بُرا نہیں کرتا کبھی کسی کے لیے
خود آدمی ہی مصیبت ہے آدمی کے لیے

ہے یہ بھی سچ کہ چمن میں بہار رقصاں
ہے یہ بھی سچ کہ ترستے ہیں گُل ہنسی کے لیے

بہار قید ہوئی گھر میں باغبانوں کے
چھُٹے وہاں سے تو ہو عام ہر کسی کے لیے

چمن کو پھُونک رہے ہیں چمن کے رکھوالے
خود اپنے اپنے نشیمن ہیں روشنی کے لیے

لبوں پہ رقصِ تبسّم تو غم سے چوُر ہے دِل
کلیجہ چاہیے میری طرح ہنسی کے لیے

ہیں صُلح دامنِ مظفؔر مجھے عزیز اتنے
کہ دشمنوں سے بھی لڑتا ہوں دوستی کے لیے

فراق گورکھپوری کا ایک انٹرویو

ہندوستان کے لسانی چوکھٹے میں اردو زبان کا مقام

اُردو کے ممتاز شاعر رگھوپتی سہائے نے ، جو عام طور پر فراق گورکھپوری کے نام سے متعارف ہیں اور جنھیں "یوم جمہوریہ" کے موقعہ پر پدم بھوشن کا خطاب عطا کیا گیا ہے ، مسٹر ایس . جی کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ اردو اختلافی قوت کے بجائے اتحاد کی موثر خدمت گزار رہے گی

یوم جمہوریہ کے اعزاز پر مبارک باد دینے کے لئے جب میں نے حال ہی میں ان سے ملاقات کی تو میں نے ان سے پوچھا۔ " ہندوستان کے موجودہ لسانی چوکھٹے میں اردو کا کیا رول ہے ؟"

اس سوال کے تحریری جواب میں اس نامور اردو شاعر نے اردو کی ابتدا ، اس کی مقبولیت ، اور ہندی کے علاوہ دیگر ہندوستانی علاقائی زبانوں کو اُس کی دین کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا :

" اردو زبان اور اردو شاعری جدید ہندوستانی قلب و ذہن کی نمائندگی کرتی ہے ۔"

انھوں نے مزید کہا : " اردو کی جدیدیت ، اس کی شہریت اور ہمہ گیری اور اس کی لچک کو نہ صرف ہندی علاقہ کے بلکہ ہندوستان کے ہر لسانی خطہ کے افراد نے شدت سے محسوس کیا ہے ۔"

" اس کی ایک وجہ جس کی طرف آں جہانی پنڈت بال کرشنا بھٹ نے اشارہ کیا ہے ، یہ کہ ہندی شبدوں کے ساتھ عربی اور فارسی الفاظ ، سنسکرت الفاظ کی نسبت زیادہ آسانی کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہیں ۔ اور یہ ہم آہنگی نظری معلوم ہوتی ہے ۔" فراق نے پُرزور انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ، " سنسکرت الفاظ کے مقابلے میں عربی ، فارسی الفاظ کا تلفظ ہمارے جیسے کئی زبانیں بولنے والوں کے لئے زیادہ آسان ہے ۔ اس لئے اردو کا کام ہماری دیسی زبانوں کو زیادہ لچک دار بنانا اور انھیں ترقی پذیر موڑ دینا رہا ہے اور رہے گا ۔"

پدم بھوشن فراق نے بتایا کہ جدید ہندی میں سنسکرت . کے خلاف بغاوت شروع ہو چکی ہے اور ہندی علاقے کے لوگوں کی یہ مانگ ابھر رہی ہے کہ زبان اور تلفظ پر نظر ثانی

کی جائے۔ یہ مانگ دبائی نہیں جا سکتی ہے۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں پر اس کے اثر کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔

کیا ہم اسے ہندوستانی زبانوں کے میدان میں روشن خیالی اور سیکولرازم کا نام دیں؟ میں نے پوچھا ۔۔ فراقؔ کے مکمل جواب کا متن حسب ذیل ہے:

"ایک صدی کے دو تہائی حصہ تک اردو ہی ملک کے دور دراز حصوں جیسے کھنڈوہ کلکتہ، میسور، بمبئی، حیدرآباد، وادئ کشمیر اور مدراس میں داخل نصاب رہی ہے۔ یہی ثبوت اس حقیقت پر حکم لگانے کے لئے کافی ہے کہ اردو ایک کل ہند زبان ہے۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو موثر ترین اور فطری زبان ہے جو نواح دہلی میں پیدا ہوئی، پلی، بڑھی اور ترقی یافتہ ہوئی۔ دلی جو دنیا کے چند بڑے شہروں میں ایک تھی۔ جو پندرھویں صدی میں ہندوستان کے دارالسلطنت قرار دیے جانے کے بعد سے تین یا چار صدیوں سے ہندوستان کے سب سے بڑے شہر کی حیثیت حاصل کر چکی تھی۔

"دلی کی زبان کا ذخیرۂ الفاظ، قواعد، صرف و نحو، روزمرہ محاورہ اور مترادفات اردو زبان و ادب کے ذریعہ اپنے عروج کو پہنچ گئے۔

"ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ سینکڑوں بلکہ ہزاروں عربی، فارسی الفاظ نہ صرف ہندی بلکہ مختلف ہندوستانی زبانوں جیسے بنگالی، پنجابی، راجستھانی، گجراتی، مرہٹی اور سندھی ذخیرۂ الفاظ کا جاندار جز بن گیے۔ اس طرح عربی، فارسی کے یہ الفاظ متذکرہ بالا ہندوستانی زبانوں کے مابین ربط کا ذریعہ بن گئے ہیں۔

"جہاں تک ہندی علاقہ کا تعلق ہے ان پڑھ کسان سے لے کر آبادی کے اشراف طبقوں تک سو فی صدی عوام کا ذخیرۂ الفاظ ہندی سے عبارت ہے اور اس کے بعد عربی فارسی الفاظ اور محاوروں سے آج کی ہندی جو ہیں ۱۸ کروڑ افراد کی زبان میں ملتی ہے۔ دیسی ہندی اور عربی، فارسی الفاظ سے مل کر بنی ہے۔ ان ۱۸ کروڑ افراد کی زبان میں عددی اعتبار سے سنسکرت الفاظ سب سے کم ہیں۔

"ہندی علاقہ کی بولی اور محاورہ سے قطع نظر اردو شاعری نے اس علاقہ میں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ جدید نام نہاد ہندی شاعری کی کتابوں کی فروخت کے مقابل ناگری رسم الخط میں اردو شاعری کے انتخاب کی بکری سوگنا زیادہ رہی۔

" یہی نہیں بلکہ اردو شاعری کی اصنافِ سخن جیسے غزل، رباعی وغیرہ کو بنگالی گجراتی راجستھانی اور کشمیری شعرانے بڑی حد تک قبول کیا ہے۔ یہ اس لیے ہوا کہ اردو زبان اور شاعری جدید دور کے قلب و ذہن کی نمایندہ ہے۔

" اردو کی جدیدیت، اس کی شہریت، اس کی ہمہ گیری، اور اس کی لچک کو نہ صرف ہندی علاقہ کے عوام نے بلکہ ہندوستان کے ہر لسانی خطہ کے افراد نے شدت سے محسوس کیا ہے۔

" اس کی ایک وجہ، جس کی طرف آں جہانی پنڈت بال کرشنا بھٹ نے اشارہ کیا ہے، یہ ہے کہ ہندی شبدوں کے ساتھ عربی اور فارسی الفاظ، سنسکرت الفاظ کی نسبت زیادہ آسانی سے ہم آہنگ ہوتے ہیں اور یہ ہم آہنگی فطری معلوم ہوتی ہے۔ سنسکرت الفاظ کے مقابلے میں عربی، فارسی کے ان الفاظ کا تلفظ ہمارے جیسے کئی زبانیں بولنے والوں کے لیے زیادہ آسان ہے۔

" اس لئے اردو کا کام ہماری دیسی زبانوں کو زیادہ لچک دار بنانا اور انھیں ترقی پذیر موڑ دینا رہا ہے اور رہے گا۔ ہر زبان کے پیچھے ایک ذہن ہوتا ہے۔ اردو کے اثر سے یہ ذہن یا ذہنیت بوجھل پن، ابہام اور صوبائیت کی لعنتوں سے بچ نکلتا ہے۔ اردو کی بنیاد عوام کی بنیاد پر ہے۔

" جدید ہندی میں جو کہ نام نہاد ہندی کہلانے کی مستحق ہے سنسکرت کے خلاف بغاوت شروع ہو چکی ہے۔ اور ہندی علاقے کے لوگوں کی نہ دبائی جانے والی یہ مانگ ابھر رہی ہے کہ زبان اور تلفظ پر نظرثانی کی جائے۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں پر اس کے اثر کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ کیا ہم اسے ہندوستانی زبانوں کے میدان میں روشن خیالی اور سیکولرزم کا نام نہ دیں۔

" ہندوستان کے لسانی چوکھٹے میں اور ہندوستانی زبانوں میں اردو کا حصہ اختلافی اور مایل بہ انتشار قوت کا نہیں بلکہ متحد کرنے اور جوڑنے والی خدمت گزار قوت کا ہے۔"

(سنڈے اسٹینڈرڈ۔ مترجمہ: منیر احمد خاں)

بشکریہ ترقی اردو۔ حیدرآباد

نئی مطبوعات

کتاب	مصنف	ناشر	قیمت
نیا طبقہ	مترجم جلیس عابدی	نیشنل اکاڈمی دہلی	1/-
حسرتیں	خلش دہلوی		9/-
امجد علی	عذرا جمال		10/-
اسلام اور اشتراکیت	غلام محمد	امر کالونی مارکیٹ	1/50
آخری حصار	نسیم حجازی	نیو لائٹ پبلشر	10/-
شیر دمشق	"	لبرٹی پرنٹرز حیدرآباد	11/75
گلابی موت	اظہار اثر	مکتبہ انوکھا جاسوس	5/-
تبدیل	عزت آرا	"	5/-
رنگین کانٹے	انور نزہت	"	3/50
تخلیق و تحقیق مضامین	نریش کمار شاد	کتب خانہ انجمن	3/25
خلاصہ انارکلی	موہن لال گپتا	"	-/75
تسہیل بلاغت (طبع ثانی)	علامہ اخلاق	"	-/75
تسہیل الاملاء	منشی عبدالقدیر	"	1/50
تلاش و توازن	ڈاکٹر قمر رئیس		6/50
ستم کے سہارے	عفت موہانی	نسیم بک ڈپو لکھنؤ	5/50
آبرو	عارف مارہروی	پنجابی پستک بھنڈار	2/-
ہمیں	اے۔ آر۔ خاتون	نسیم بک ڈپو	-/75
عطیہ	زبیدہ سلطانہ	تاج پبلشنگ ہاؤس	7/50
ناہید	حمیدہ جبین	"	6/50
شاد عظیم آبادی کلام اور شرح	نقی احمد ارشاد	نسیم بک ڈپو	8/-
اصناف ادب کا ارتقا	صفی مرتضیٰ	"	1/50
جنگ اسرائیل	نسیم حجازی	خاتون مشرق	4/-
کٹھ پتلی	عارف مارہروی	پنجابی پستک بھنڈار دہلی	6/-
بھیگی رات کی باہوں میں	خواجہ احمد عباس	"	4/-

دُنیا میں جشنِ غالبؔ کی تیاریاں

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی
(سکریٹری انٹرنیشنل آرگنائزنگ کمیٹی جشن صد سالہ غالبؔ ۱۹۶۹ء)

عالی جناب ڈاکٹر ذاکر حسین نے مجھے جشن غالب کی بین الاقوامی تنظیمی کمیٹی کا معتمد مقرر کیا تھا۔ ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے میں نے یہ اعزاز بخوشی قبول کیا۔ اور جشن غالبؔ کی کمیٹیوں کی تنظیم کی غرض سے مندرجہ ذیل ممالک کا سفر کیا۔

۱۔ انگلستان ۲۔ امریکہ ۳۔ کناڈا ۴۔ فرانس ۵۔ اٹلی ۶ نیدرلینڈ، چیکوسلوکیہ ۸۔ سوویٹ یونین ۹۔ ایران۔

انگلستان۔ انگلستان میں جن عالموں سے میں نے رابطہ قایم کیا اور جنھوں نے میرے ساتھ مکمل تعاون کا وعدہ فرمایا۔ ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

(الف) ۱۔ پروفیسر سی۔ فلپس ڈائرکٹر اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن۔ ۲۔ پروفیسر اے۔ جی آربری۔ کیمرج یونیورسٹی ۳۔ سر روئے میسکلین۔ ممبر پارلیمنٹ ۴۔ پروفیسر پرسیول اسپیئر۔ کیمرج یونیورسٹی ۵۔ مسٹر رالف رسل۔ اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لندن ۶۔ مسٹر کیبرنان۔ ایڈنبرا یونیورسٹی ۷۔ مسٹر ایس سی سٹن لائبریرین انڈیا آفس لائبریری ۹۔ مسٹر سائمن ڈگبی۔ لندن یونیورسٹی۔

(ب) ان حضرات سے صلاح و مشورے سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوئے۔

۱۔ انگلستان میں ایک قومی کمیٹی کی تشکیل ہوئی، جن کے صدر پروفیسر سی فلپس اور سکریٹری رالف رسل صاحب ہیں ۲۔ غالبؔ پر ایک سمینار منعقد کیا جائے گا۔ ۳۔ غالبؔ سے متعلق ایک نمائش ہوگی ۴۔ غالبؔ کی زندگی اور ان کے کارناموں سے متعلق ایک آپرا پیش کیا جائے گا ۵۔ غالبؔ کی اردو تخلیقات کا انگریزی ترجمہ رالف رسل صاحب اور ڈاکٹر خورشید الاسلام نے مشترکہ طور پر کر لیا ہے جس کی اشاعت کا اہتمام یونسکو

کر رہی ہے ۲۔ میں نے برٹش میوزیم، انڈیا آفس لائبریری، ونڈسر پیلیس لائبریری اور انگلستان کے نیشنل آرکائوز میں غالب کے ان تمام غیر مطبوعہ خطوط کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو لندن میں مقیم حکام کے نام لکھے گئے تھے یہ تحقیق ابھی جاری ہے۔

امریکہ: میں دہلی یونیورسٹی کے نمائندے کی حیثیت سے متشرقین کی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے اگست ۱۹۶۷ء میں این آربو (مشی گن امریکہ) گیا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے دنیا کے ممتاز متشرقین اور علمائے اردو سے جشن صد سالہ غالب کے سلسلے میں تبادلہ خیالات کیا۔

یہاں بھی ایک قومی کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی۔ جس کے صدر پروفیسر نارمن براؤن سکریٹری چودھری محمد نعیم اور اراکین میں پروفیسر کینٹ ول اسمتھ، پروفیسر عبدالرحمان بارکر، پروفیسر رابن سن اور پروفیسر داؤد رہبر شامل ہیں۔

امریکہ میں جشن غالب کے سلسلے میں مندرجہ ذیل پروگرام بنایا گیا ہے۔

۱۔ غالب کی ایک ببلوگرافی مرتب کی جائے ۲۔ غالب سے متعلق تنقیدی نگارشات کا ایک انتخاب مرتب کیا جائے ۳۔ ۱۹۶۹ء (سالِ جشن) میں ہندوستان یا پاکستان کے کسی عالم کو اردو ادب پر کام کرنے کے لئے مدعو کیا جائے۔

کناڈا: میں مونٹریل کے ادارہ علوم اسلامیہ میں گیا اور جشنِ غالب کے سلسلے میں ان حضرات کا تعاون حاصل کیا۔

۱۔ پروفیسر عبدالرحمان بارکر، صدر شعبہ علوم اسلامیہ میکگل یونیورسٹی۔ ۲۔ پروفیسر عزیز احمد، یونیورسٹی آف ٹورنٹو۔

فرانس: (الف) پیرس میں، میں نے جن حضرات سے رابطہ قایم کیا انکے نام یہ ہیں

۱۔ پروفیسر آندرے گم برے تیر پروفیسر اردو نیشنل اسکول آف اورینٹل لینگویجز، پیرس ۲۔ کاؤنٹ ہنری ڈی لاباستید ڈھسٹ، پروفیسر آف مغربی سولیزیشن اسکول آف اورینٹل لینگویجز ۳۔ ڈاکٹر ایم لاکومب، ڈائرکٹر آف دی انسٹی ٹیوٹ آف انڈین سویلیزیشن۔ ۴۔ موسیو ایم پے لا ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹیڈیز۔

(ب) پروفیسر اندرے گم برے تیر غالب کی دس غزلوں کا ترجمہ فرانسیسی میں کر رہے ہیں۔ ان کا نام یونسکو نے منظور کر لیا ہے۔

(ج) پروفیسر گم برے تیر جشنِ غالب کی فرانسیسی قومی کمیٹی کے سکریٹری ہوں گے۔
ڈاکٹر لاکوسب پروفیسر جے فیلوزا اس کمیٹی کے صدر ہوں گے۔

۳۔ یونسکو: یونسکو پیرس میں مندرجہ ذیل حضرات سے بہت اہم گفتگو ہوئی۔
۱۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین پارٹی سی پیشن پروگرام ۲۔ مسٹر ایس رونٹال پبلسٹی پروگرام ڈائرکٹر۔ ڈاکٹر آر کے لوائے ۳۔ ڈاکٹر موڈشی نوف سنٹرل ایشین پروگرام ۴۔ مسٹر ملمان ایشیانا ڈویزن ۵۔ جناب معظم حسین ایجوکیشن۔

۴۔ یونسکو کے ارباب حل وعقد سے گفتگو کے دوران مندرجہ ذیل تجاویز پیش کی گئیں۔ اگر یہ ہمارے نیشنل کمیشن کی جانب سے پیش کی جائیں تو یونسکو ان پر ہمدردانہ غور کرے گی۔
۱۔ یونسکو سے درخواست کی جائے کہ جشنِ غالب کی تقریبات کو اپنی منظور شدہ تقریبات کی فہرست میں شامل کرے ۲۔ یونسکو ایک قرارداد کے ذریعہ صدسالہ جشن غالب کو مع اس کے مالی پہلوؤں کے تسلیم کرے ۳۔ یونسکو مندرجہ ذیل امور کے لیے رقم فراہم کرے
(الف) غالب پر ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد کیا جائے جو یونسکو کے پارٹی سی پیشن پروگرام کے تحت ہو۔
(ب) اس جشن میں حصہ لینے کے لیے، امریکہ، انگلستان، سوویت یونین، فرانس، ہالینڈ، ایران، افغانستان، چیکوسلواکیہ، پاکستان وغیرہ سے آنے والے عالموں کو یونسکو سفر خرچ فراہم کرے۔
(ج) یونسکو ان مقالات کو غالب پر ایک یادگار جلد کی شکل میں شائع کرے۔

۵۔ اس قسم کے کام کو ایک مستقل حیثیت دینے کے لیے یونسکو سے درخواست کی جائے کہ وہ کسی ممتاز ہندوستانی محقق کو اردو سے متعلق ماخذ کا تمام نادر ذخیرہ جو ساری دنیا میں بکھرا پڑا ہے اس کا جائزہ لے کر اسے تمام ضروری معلومات کے ساتھ شایع کرے۔ اردو کے ان تمام مخطوطات، نایاب کتابوں، اور قدیم اخبارات و رسایل کی مائکروفلمیں بنائی جائیں جو ہندوستان، پاکستان، مغربی جرمنی، فرانس، وے ٹی کن، انگلستان اور آئرلینڈ کے ذاتی اور پبلک کتب خانوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان مآخذ و مصادر سے ان تمام عالموں کی مدد ہوگی جو ہندوستان کی تاریخ یا ارتقا کے کسی شعبہ پر بھی تحقیق کر رہے ہوں گے۔ ایشیا کے اس تہذیبی سرمایے کو جو آہستہ آہستہ ضایع ہوتا جا رہا ہے محفوظ کرنے کے سلسلے میں

یہ ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔

اس یونسکو سمینار نے بھی جو کابل میں ۳۱ر جولائی تا ۴ر اگست ۱۹۶۷ء منعقد ہوا تھا ان نوادر کے تحفظ کی فوری اہمیت پر زور دیا تھا۔

۶۔ یونسکو کے ماہرین کے ایک جلسہ نے جو کہ پیرس میں ۲۴ تا ۲۸ر اپریل ۱۹۶۷ء کو وسط ایشیائی تہذیبوں کے مطالعے کی غرض سے ہوا تھا یہ تجویز کیا تھا کہ ۱۷ ویں اور ۱۹ ویں صدی کے درمیان وسط ایشیائی ادبیات کے مطالعے کا کام جس کی طرف ابھی تک توجہ نہیں کی گئی ہے جلد شروع ہونا چاہئے۔ یہ بات متفقہ طور پر مان لی گئی تھی کہ اس عہد کا مطالعہ ۷۰۔۱۹۶۹ء میں ہونے والے پروجیکٹ کے لئے تجویز کیا جائے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ غالب جن کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا تھا، وسط ایشیائی جمہوریتوں ہندوستان، پاکستان، افغانستان اور ایران کے درمیان تعاون اور باہمی ربط و تعلق کا بہترین ذریعہ بن سکتے ہیں کیوں کہ غالب نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھا تھا اور ان کے آبا و اجداد سمرقند سے ہندوستان آئے تھے۔

ان باتوں کے پیش نظر یونسکو سے درخواست کی جائے کہ وہ دو فیلوشپ منظور کرے جو دنیا کے دو ممتاز عالموں کو دیے جائیں تاکہ وہ یورپ کی اہم زبانوں میں غالب کی تخلیقات کا ترجمہ کر سکیں۔

۷۔ یونسکو ایک "غالب البم" کی اشاعت میں، جو ان کی تحریروں اور تصویروں کے عکس پر مشتمل ہوگا، امداد کرے۔

۸۔ یونسکو ایک ایسی کتاب کی تیاری کے لیے امداد دے جس میں دو سو صفحات کے اندر غالب کی زندگی اور ان کے کلام کا جائزہ ہو۔ یہ کتاب عام پڑھنے والوں کے لیے ہوگی اور دنیا کی تمام اہم زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوگا۔

۹۔ یونسکو غالب اور ان کے عہد سے متعلق ایک ادبی میوزیم کے قیام کے لیے مدد کرے جس میں کتابوں کے عکس، مائکروفلم، مخطوطات، لباس، قلمی تصویریں، اصلی خطوط اور غالب اور ان کے معاصرین کی تخلیقات کے پہلے ایڈیشن رکھے جائیں۔

۴۔ لی آن: میں مندرجہ ذیل حضرات سے ملاقات ہوئی۔ جنھیں میرے اعزاز میں ایک لنچ پر خاص طور سے مدعو کیا گیا تھا۔

۱۔ پروفیسر چین ٹے بر ڈاٹ۔ رجسٹرار آف ہائر ایجوکیشن وڈین فیکلٹی آف لیٹرز یونیورسٹی آف لی آن ۲۔ پروفیسر دیریاس... پروفیسر انگریزی ۳۔ ڈاکٹر مانڈری... پروفیسر سنسکرت ۴۔ ڈاکٹر وبار ہیر... پروفیسر چینی زبان ۵۔ ڈاکٹر اجین... پروفیسر فارسی ۶۔ ڈاکٹر ای سیف... پروفیسر مسلم تہذیب و تمدن ۷۔ ڈاکٹر اسے لیر... پروفیسر جاپانی زبان ۸۔ مسٹر سولار کیر ڈکی... کابینہ کے صدر۔

یہ طے پایا کہ یونیورسٹی آف لی آن میں صد سالہ جشن غالب کمیٹی زیر صدارت ڈاکٹر ٹیلر ڈاٹ تشکیل کی جائے۔

بشکریہ ترقی اردو حیدرآباد

جامِ نو

اقبال سہیل

۱۸۸۴ ۱۹۵۵

اقبال احمد خاں نام، سہیل تخلص، ان کے مورث اعلیٰ حسین خاں ریاست سوات چترال سے ہندوستان آئے تھے، اپنی غیر معمولی بہادری اور "شیر افگنی" کی بنا پر حاکم جون پور کی طرف سے اُن کو بڑی عزت اور جاگیر حاصل ہوئی تھی، اسی خاندان کے بعض جرأت مند اور غیور افراد نے ۱۸۵۷ء میں اپنی فوجی خدمات اور شاہانہ مراعات سے الگ ہو کر جنگ آزادی میں کئی حیثیتوں سے حصہ لیا۔

سہیل برہرہ ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے تھے، مولانا شفیع (بانی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر) جیسے ذی علم اور دین دار بزرگ سے تعلیم کی ابتدا کی۔ والدہ سے گلستاں بوستاں پڑھی۔ والد کی خواہش اور کوشش کے مطابق بارہ ہی سال کی عمر سے وہ اچھی خاصی فارسی لکھنے اور بولنے لگے تھے۔ مولانا شبلی سے عربی پڑھی اور انھیں کے فیض صحبت سے شعر و ادب کا ذوق پروان چڑھا، سیاسی شعور بیدار ہوا اور اس میں استقلال اور پختگی پیدا ہوئی۔ مشرقی علوم کی تحصیل و تکمیل میں مولانا شفیع اور مولانا شبلی کے علاوہ مولانا حمید الدین فراہی بھی سہیل کے قابل ذکر استادوں میں سے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں جب مولانا فراہی علی گڑھ بلائے گئے تو یہ بھی ان کے ساتھ رہے، تفسیر و حدیث، سبعۂ معلقہ اور دیوان متنبی وغیرہ اُن سے پڑھتے رہے۔ ۱۹۰۹ء میں عربی کا سلسلہ ختم کر کے انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے، ۱۹۱۳ء میں انٹرمیجیٹ پاس کر کے ۱۹۱۴ء میں پھر علی گڑھ آئے اور وہاں سے ۱۹۱۸ء میں ایم اے ایل ایل بی کی ڈگری لے کر اعظم گڑھ واپس آ گئے اور وکالت کرنے لگے۔

مولانا اقبال سہیل کی لیاقت، ذہانت اور سیاسی بصیرت کے جوہر علی گڑھ میں طالب علمی ہی کے زمانے سے کھلنا شروع ہو گئے تھے۔ جن دنوں وہ مولانا فراہی کے ساتھ مقیم تھے مولانا حسرت موہانی کے مشہور رسالہ اردوئے معلیٰ، مصطفیٰ کامل نمبر میں انگریزوں کے خلاف جو

مضمون شائع ہوا تھا اور جس کی پاداش میں حسرت کو قید فرنگ برداشت کرنا پڑی تھی اُس کے لکھنے بلکہ عربی سے ترجمہ کرنے والے یہی اقبال سہیل تھے۔

اُس کے بعد جب یہ باقاعدہ ایم اے او کالج علی گڑھ کے طالب علم ہوئے اُس وقت ان کی عربی فارسی کی قابلیت، وہاں کے بعض استادوں سے بھی بہتر اور زیادہ تھی۔ باہر سے آنے والے مہمانوں کے خیر مقدم کے سلسلے میں اتنے برجستہ معیاری اور فی البدیہہ قصیدے لکھ دیا کرتے تھے کہ خود اہل زبان ان پر بے ساختہ آفرین و مرحبا کہہ اٹھتے تھے۔ کیسا ہی علمی ادبی یا سیاسی مسئلہ ہو اس پر بحث اور ہر موضوع پر بلا تکلف تقریر کر سکتے تھے۔ یونین کے الکشن میں یہ جس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں اس کی کامیابی یقینی اور جس کے مخالف ہوں اس کا ناطقہ بند کر دیتے تھے۔ حافظے کا یہ عالم کہ جو چیز ایک بار نظر سے گزر گئی پھر وہ بھولتے نہ تھے۔ لباس، رہن سہن اور ظاہری باتوں میں کسی اہتمام یا تکلف سے ہمیشہ بے نیاز اور لاپروا رہے۔ شعر و ادب کے سلسلے میں زبان سے بہت کچھ کہا مگر قلم سے بہت کم لکھا۔ ہم عصر شعرا میں اصغر کے بڑے مدّاح تھے۔ آزادیٔ وطن کے شروع ہی سے خواہاں اور کانگریس کے زندگی بھر حامی رہے، ملک جب آزاد ہوا تو بجز کونسل کی ممبری کے نہ کسی عہدے کی خواہش کی اور نہ کسی صلے کے طالب ہوئے۔

خلاف توقع حالات، عوارض، افکار اور بعض سانحات کی بنا پر عمر کے آخری دور میں خاصے افسردہ اور مضمحل رہنے لگے تھے۔

طباعی، ذہانت اور وسیع مطالعے کی بدولت شعر و شاعری سے بچپن ہی سے شغف اور واسطہ رہا مگر اپنے آپ کو نہ بحیثیت شاعر کے مشہور کیا اور نہ شاعروں کی سی خو بو اور زندگی اختیار کی۔ جو کچھ کہا کبھی اُسے محفوظ رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ جوش و خروش یا عقیدت و احترام کے جذبات جب ابھرتے تو قصیدہ کہنے لگتے باقی اور تصورات اور تاثرات جب غالب آتے تو ان کو رمز و کنایوں کی شکل دے کر غزل کے پیراہن میں ملبوس کر دیتے۔ سیاسی رنگ میں اور لوگوں نے بھی شاعری کی ہے مگر بقول آثر لکھنوی "نشتریت" جو سہیل کے سیاسی تغزل میں پائی جاتی ہے وہ اور کہیں نہیں ملتی۔ پروفیسر سرور کی رائے ہے کہ "مولانا سہیل نے تغزل کے پیرائے میں ہماری سیاسی کشمکش کے سارے پہلو بڑی خوبی سے بیان کر دیے ہیں۔" اور حبیب احمد صدیقی صاحب کے نزدیک اُن کی شاعری کا معتد بہ حصہ تصوّف اور فلسفے پر مشتمل ہے۔" محمد حسن کالج میگزین جون پور اور "تابش سہیل" کے ذریعے مولانا کا بیشتر کلام سامنے آ چکا ہے۔

انتخاب

قصیدۂ نعتیہ

کرے تارِ شعاعی لاکھ اپنی سعیٔ امکانی　　رفو ہوتا نہیں ہے صبح کا چاکِ گریبانی
وہی سمجھیں گے جو واقف ہیں اسرارِ محبت سے　　کہ یکساں جاں گسل ہے ذوقِ وصل و دردِ ہجرانی
صبا کے گدگدانے سے اِدھر کلیوں کو ہنسی آ گیا　　اُدھر شبنم سے پھولوں کی عرق آلودہ پیشانی

کمالِ عاشقی ہے آپ مرنا اپنے جلووں پر
مرے مذہب میں خود بینی کو کہتے ہیں خدا دانی

محمدؐ وہ کتابِ کون کا طغرائے پیشانی　　محمد وہ حریمِ قدس کا شمعِ شبستانی
وہ جامع جس نے یکجا کر دئے بکھرے ہوئے دانے　　مٹا دی آ کے جس نے باہمی تفریقِ انسانی

خرد عاجز، نظر خیرہ، زباں کج مج، بیاں قاصر　　زمینِ نعت میں کیا دیجیے دادِ سخن دانی

گاندھی

وہ حدیثِ روحِ پیامِ جاں جسے ہم نے سن کے بھلا دیا　　وہ حریمِ غیب کا ارمغاں جسے پا کے ہم نے گنوا دیا
وہی ملک و ملّتِ جاں طلب جسے اس نے آب بقا دیا　　اسی ناسپاس نے ہائے اب اسے جامِ مرگ پلا دیا

ہمیں جس نے فتح دلائی تھی اسے خاک و خوں میں ملا دیا　　ہمیں جس نے راہ دکھائی تھی اسے راستے سے ہٹا دیا
تجھے مندروں نے صدائیں دیں کہ ترے کرم سے اماں ملی　　تجھے مسجدوں نے دعائیں دیں کہ تباہیوں سے بچا دیا
ہمہ روشنی تری ذات تھی ہمہ سوز تیری حیات تھی　　تری روح شمع تھی گل ہوئی ترے تن کو پھول بنا دیا

غزلیات

دوستی کیا نبھائیں گے جن سے　　دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا

پہنچی وہاں بھی شیخ و برہمن کی کشمکش　　اب مے کدہ بھی سیر کے قابل نہیں رہا

نہیں ہے خوفِ اسیری سے ہمتِ پرواز | ہمیں تو کنجِ قفس ہے یہ آشیاں اپنا
مجھے بھی اذنِ فغاں مل سکے تو مرغِ اسیر | ترے قفس سے بدل لوں میں آشیاں اپنا
دل خطا وارِ اشتیاق سہی | لب گنہگارِ التجا نہ ہوا

قفس میں دیتے ہو کیا طعنِ سُستِ پروازی | فضا کھلی ہوئی ملتی تو امتحاں ہوتا

رُخِ جاناں پہ دیکھی کشمکش شرم و ستم کی | قیامت تھا نگاہِ آرزو کا گُد گُدا دینا

اٹھی تھی موجِ حسن سے اک معراجِ بے قرار | فطرت نے اس کو پیکرِ انساں بنا دیا
وارفتگانِ شوق کو کیا دیر کیا حرم | جس در پہ دی صدا درِ جاناں بنا دیا

وہ شبنم کا سکوں ہو یا کہ پروانے کی بے تابی | اگر اُڑنے کی دُھن ہو گی تو ہو گی بال و پر پیدا
مذاقِ سربلندی ہو تو پھر دیر و حرم کیسے | جبیں سائی کی فطرت نے کیے ہیں سنگِ در پیدا

صیاد نے اس طرح سجایا ہے قفس کو | آتی نہیں اب مجھ کو نشیمن کی فضا یاد

نہیں اب کارگر کوئی فریبِ حسن کا افسوں | مدار اک رہ گیا ہے فتنۂ شیخ و برہمن پر

ردّ و قبولِ خلق سے شاعر کو کیا غرض | سودا نہیں سجائیں جو بازار دیکھ کر

اس فصل میں بھی جا نہ سکے شاخسار تک | زنداں نصیب کاش نہ جیتے بہار تک
اے جاں نوازیٔ غمِ جاں ترے نثار | تو نے بھلا دیا ہے غمِ روزگار تک

مرا صبر حد سے گزرا، اگر اے ہوسِ اب بھی
وہ زباں نکال پھینکوں جو طلب کرے ترحّم

ہم نشیمن کو کبھی روئیں تو خطا ہوتی ہے — پھونک ڈالیں وہ چمن بھی تو ہنر کرتے ہیں

تقسیمِ گل پہ بحث عنادل میں چھڑ گئی — گلزار لُٹ رہا ہے، کچھ اس کی خبر نہیں

ذرّے جو کل اڑے تھے مری گردِ راہ میں — روشن ہیں اب وہ انجمنِ مہر و ماہ میں

قیدِ غلامیِ حیات، ننگ ہے ننگِ کائنات — لعنت بندگی کے ساتھ صورتِ زندگی نہ دیکھ

یا تو نسیم کی طرح، دامنِ دل بچا کے رکھ — ورنہ ریاضِ حسن میں جا کے کلی کلی نہ دیکھ

خدا سمجھے بتِ سحر آفریں سے — گریباں کو لڑایا آستیں سے

صیاد! مژدہ باد، عنادل میں چل گئی — اس کشمکش میں فکر کسے آشیاں کی ہے

انجامِ وفا بھی دیکھ لیا اب کس لیے سرخم ہوتا ہے — نازک ہے مزاجِ حسن بہت سجدے سے برہم ہوتا ہے

تاراجِ نشیمن کھیل سہی صیاد! اگر اتنا سن لے — جب عشق کی دنیا لٹتی ہے خود حسن کا ماتم ہوتا ہے

بجلیاں آئیں جو بام سے وہ رخصت بھی ہوئیں — شعلہ افگن ہے مگر برقِ چمن زاد ابھی

فکرِ تعمیرِ نشیمن ہو یہاں کس کو سہیل — ہوش گم کردہ ہیں، مرغانِ نوآزاد ابھی

شبنم ناتواں سہی لیکن — اس گلستاں میں ہے نمو مجھ سے

چشمک کرے مجھی سے یہ ایسی کہاں کی ہے — بجلی تو خانہ زاد مرے آشیاں کی ہے

صدا فریاد کی آئے کہیں سے

وہ ظالم بدگماں ہوگا ہمیں سے

یہ آگ دہکتی ہے جتنی اتنا ہی دھواں کم دیتی ہے احساسِ ستم بڑھ جاتا ہے تو شورِ فغاں کم ہوتا ہے

وہ چشمِ فتنہ گر ہے ساقئ مے خانہ برسوں سے کہ باہم لڑ رہے ہیں شیشہ و پیمانہ برسوں سے
حرم والوں میں شایانِ کرم شاید کوئی نہیں کہ برقِ امتحاں لرزاں ہے بے تابانہ برسوں سے

ساقی سُبو بدوش ہے اے ذوقِ تشنہ کام دستِ طلب میں جرأتِ رندانہ چاہیے

بس اتنی کائنات ہے حیاتِ مستعار کی
شباب ہے حباب کا، بہار ہے شرار کی

تازہ ہندوستانی مطبوعات

ادبی	ریاست	ڈاکٹر ذاکر حسین	۱۲/۵۰
"	تکلف برطرف	مجتبیٰ حسین	۳/۰
"	مخدوم - ایک مطالعہ	داؤد اشرف	۲/۵۰
"	نثر و غزلدستہ شاد عارفی کے مضامین اور جدید کلام	مرتبہ۔ مظفر حنفی	۸/۰
"	تلاش و توازن	ڈاکٹر قمر رئیس	۲/۵۰
"	بہادر شاہ ظفر فن اور شخصیت	پروفیسر خواجہ تہور حسین	۵/۷۵
"	اصناف ادب کا ارتقاء	سید صفی مرتضیٰ	۱/۵۰
شعری	شراب کہنہ	رشید نعمانی	۴/۲۵
"	جلتے کنول	شمس فرخ آبادی	۲/۰
"	حسرتیں	گلشن دہلوی	۵/۰
رسالہ	شاعر - افسانہ و ڈرامہ نمبر	مرتبہ۔ اعجاز صدیقی	۳/۰
لغات	مہذب اللغات جلد پنجم	مرتبہ۔ مہذب لکھنوی	۲۲/۵۰
ناول	ستم کے سہارے	عفت موہانی	۵/۵۰
بچوں کے لئے	سیپیں	اے۔ آر۔ خاتون	۰/۷۵

پاکستانی مطبوعات

ادیب	ڈاکٹر طٰہٰ حسین	۵/۰
ادب اور تنقید	ڈاکٹر سید شاہ علی	۶/۰
افادات مہدی	مرتبہ بیگم مہدی	۷/۵۰
اسوۂ علی رض	رئیس احمد جعفری	۸/۷۵
افعال مرکبہ	تمنا عمادی	۳/۰
احسن الکلام	احسن مارہروی	۸/۷۵
انوار اقبال	مرتبہ بشیر احمد ڈار	۱۵/۰
انگلش اردو ڈکشنری	فیروز سنز	۱۶/۰
اصول فقہ اسلام	سر عبدالرحیم	۱۰/۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	عبدالقادر سروری	۳/۵۰
اردو کی عشقیہ شاعری	فراق گورکھپوری	۲/۲۵
برق و مقناطیس	پروفیسر جمشید عسکری	۱۲/۰
بستان المحدثین	شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی	۶/۵۰
بستان العارفین	امام ابو زکریا محی الدین	۶/۰
پاکستان میں اردو	محمد طاہر فاروقی	۲۰/۰
تفسیر حقانی کامل (۸ حصے)	مولانا حقانی	۵۵/۰
تاریخ عہد بنی امیہ	ابوالحسن علی بن الحسین	۶/۷۵
جنسی معلومات	ارمان سرحدی	۳/۷۵
خواہ مخواہ	شوکت تھانوی	۶/۵۰
رباعیات انیس	مرتبہ۔ عمر فیضی	۳/۷۵
سیاست شرعیہ	امام ابن تیمیہ	۱۰/۵۰
سیرت عبدالرحمٰن بن عوف	سید فضل ابن احمد	۷/۷۵
شعر فارسی معاصر	محمد حسن قرشی	۳/۷۵
شاہ عبدالعزیز اور انکی تعلیمات	[illegible]	۲/۰
شبلی نقادوں کی نظر میں	مرتبہ۔ محمد اصل عثمانی	۲/۲۵
صراط مستقیم	شاہ سید احمد شہید	۸/۰
غزل اور مطالعۂ غزل	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۱۳/۰
فتاویٰ نبوی	امام ابن قیم	۳/۷۵
فسانۂ عجائب	رجب علی بیگ سرور	۴/۵۰
قانونی لغت	تنزیل الرحمٰن	۱۰/۰
منہاج العابدین	امام غزالی	۹/۰
منافع الاعضاء	سید ظفر الدین احمد	۷/۵۰
میر و سودا کا دور	ثناء الحق صدیقی	۱۵/۰
نکات مجنوں	مجنوں گورکھپوری	۳/۵۰
نئی قدریں (شاعر نمبر)	مرتبہ۔ اختر انصاری	۹/۰
اوراق۔ سالنامہ	" وزیر آغا	۴/۵۰
افکار۔ سالنامہ	" صہبا لکھنوی	۵/۵۰
فنون	" احمد ندیم قاسمی	۷/۵۰
ہم اور ہماری نفسیات	مرتضیٰ شفیع	۴/۰

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

شاد عظیم آبادی، کلام اور شرح کلام   شارح و مرتب: نقی احمد ارشاد

صفحات: ۵۵۴   سائز: ۲۰×۳۰/۱۶

قیمت: آٹھ روپے

ناشر: نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ

شہر عظیم آباد (پٹنہ بہار) کا نام روشن کرنے والوں میں سید علی محمد شاد (۱۸۴۶-۱۹۲۷) ایک نمایاں اور قابلِ لحاظ حیثیت رکھتے ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ سے دور رہ کر بھی انہوں نے اپنے کلام میں کچھ ایسی دل کشی اور تازگی پیدا کر لی تھی کہ شعر و ادب کا مذاق رکھنے والے ان کو اکثر یاد کرتے رہیں گے۔ مرحوم بڑے پُرگو شاعر تھے، متعدد اصنافِ سخن میں ان کا بڑی مقدار میں کلام موجود ہے۔ نثر میں بھی ان کا قلم رواں تھا، چنانچہ نظم و نثر میں چھوٹی بڑی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ سب ملا کر ان کی تصانیف کی تعداد قریب ساٹھ تک بتائی جاتی ہے۔ شاد کی مقبولیت اور شہرت کا بڑا سبب ان کی غزلیں ہیں اور ان کے وہ اشعار جو اپنی معنویت، لطافت اور حسنِ ادا کی بنا پر ضرب المثل بن گئے ہیں۔ مختلف اوقات میں اور مختلف ناموں سے ان کے متعدد مجموعے چھپتے رہے ہیں پھر بھی بہت سی غزلیں اور غزلوں کے شعر غیر مطبوعہ رہ گئے تھے جو نقی احمد ارشاد صاحب کی کوششوں سے اس مجموعے میں شامل ہیں۔

کلامِ شاد کو ان کے شارح نے چھے حصّوں میں تقسیم کیا ہے، رومانی، عرفانی، علم الکلام، فلسفیانہ شاعری، اخلاقی سماجی اور سیاسی شاعری،

رومانی کلام حضرت شاد کی جوانی کی یادگار ہے جسے وہ بعد کو بھی اصلاحیں دے دے کر چُست کرتے رہے۔ شباب کے ختم ہوتے ہی ان کی عرفانی شاعری کا دور شروع ہو جاتا ہے اور اس زمانے میں انھوں نے اپنے مذہبی عقاید اور معلومات کے تحت قرآن اور حدیث کے مضامین اور موضوع کی طرف خاص طور سے توجہ دی ہے۔ نہ صرف مضامین اور موضوع بلکہ کہیں کہیں

ان متبرک کتابوں کی آیتوں یا خاص خاص ٹکڑوں کو لے کر نظم کر دیا ہے۔ شاؔد نے اکابر فارسی شعرا کی جا بجا اور حافظؔ کی تو خصوصیت کے ساتھ پیروی کی ہے۔

شارح نے واقعی یہ ایک بڑا اور ضروری کام انجام دے دیا ہے کہ کلام شاؔد میں جہاں کہیں آیات، احادیث، مذہبی تلمیحات، فارسی شعرا کا تتبع یا کسی اور مسئلے کی طرف اشارہ ہے ان کی پوری پوری وضاحت، تشریح اور ترجمہ کر دیا ہے۔ اس سے نہ صرف اُن کی قابلیت اور علمی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ شاؔد کے کلام کی عظمت و وقعت میں لطف وافادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

جناب ارشاؔد ایک شارح اور مرتب کے علاوہ مصور بھی ہیں اور ان کے قلم کی دو تصویریں بھی کتاب میں موجود ہیں۔ سوانح عمری کے تحت قریب قریب تمام ضروری باتوں سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔ "فہرست غزلیات" کے ضمن میں جو اختیار اور تنوع برتا گیا ہے اس سے غزلوں کو تلاش کرنے میں سہولت بالکل نہیں ہوتی۔

غاؔلب اور موؔمن کے بعد حضرت شاؔد عظیم آبادی اس دور کے وہ قادر الکلام اور خوش نصیب شاعر ہیں جن کا کلام شرح و تفسیر کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

۵۸۶ غزلوں، تیرہ متفرق اشعار اور بارہ منتخب قطعات کا یہ مجموعہ بہرطور اس قابل ہے کہ اہلِ علم کے طبقے میں ان کی پذیرائی ہو اور سخن وہ نیز سخن سنج حضرات اس سے مستفید ہوں۔

رشید نعمانی

مثالی خواتین

مصنف: یونس نگرامی ندوی
ناشر: مکتبہ طیبہ سی ۲۰۷/۲۸ ڈیوڑھی آغا میر، لکھنؤ
قیمت: ۵۰ پیسے صفحات: ۴۰

اس مجموعے میں اُن خواتین کا تذکرہ ہے جنھوں نے دنیائے اسلام میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ شروع زمانۂ اسلام نے ایسی بہت سی عورتوں کو جنم دیا جو دینی اور اخلاقی حیثیت سے کسی طرح مردوں سے پیچھے نہیں رہیں بلکہ بعض حالات میں وہ اُن کے مقابل ہی نظر آتی ہیں۔ اس "صنفِ نازک" نے اسلام کی راہ میں شدید ظلم و ستم کا مقابلہ جس جواں مردی کے ساتھ کیا وہ اپنی نظیر آپ ہے اور اس "کمزور" اور "ناقص العقل" جنس نے جو بار گراں

اُٹھاتے ہیں اُن کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اُن کی بلند ہمتی اور استقامتِ دین نہ صرف عورتوں کے لیے بلکہ اِس دور کے مردوں کے لیے بھی باعثِ رشک اور قابلِ تقلید ہیں۔

انسان کی پہلی اور بڑی معلمہ ماں ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ اور با مُرادہیں وہ ہستیاں جنھیں ایسی ماؤں کی گودیں ملیں جو دوسروں کے لیے بھی مثالی خواتین ثابت ہوئیں اور جن کے تاریخی حالات نے پڑھنے والوں کی رگ و پے میں خونِ گرم دوڑا دیا۔

تاریخی قصے کہانیوں اور واقعات کا انسان کی زندگی پر جو گہرا اثر پڑتا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ کتاب کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کو یقیناً اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی ہے اس لیے کہ کتاب کا مطالعہ قاری پر گہرے نقوش چھوڑ جاتا ہے۔

شبنم قادری

تلخیص سراپا سخن

مصنف: سید محسن علی موسوی

مرتبہ: ڈاکٹر سید سلیمان حسین

صفحات ۲۳۱، سائز $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$

قیمت: چار روپے

ملنے کے پتے: نایاب بک ڈپو، نادان محل، لکھنؤ

صدیق بک ڈپو امین آباد، لکھنؤ

شہنشاہ بائنڈنگ، نخاس لکھنؤ

تذکروں کی اہمیت مسلّم ہے، شعرا کے حالات اور ان کے رنگِ سخن کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا یہ ایک آسان ذریعہ ہیں۔ میرؔ اور حمیدؔ اورنگ آبادی نے یہ کام شروع کیا تھا۔ بعد کے لوگوں نے اس کو اور آگے بڑھایا ہے۔ پچھلے تیس پینتیس برس سے پرانے تذکرے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے جا رہے ہیں اور ان کو آج کل کی ضرورتوں کے پیشِ نظر اور جدید مذاق کے مطابق مطبوعہ شکل میں سامنے لایا جا رہا ہے۔

"سراپا سخن" اور اس کی تلخیص بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے ۱۸۵۰ء میں یہ تذکرہ مرتب ہوا تھا اور ۱۸۶۱ء میں پہلی بار طبع ہوا۔ ترتیب و تالیف کے اغراض و مقاصد خود صاحبِ تذکرہ نے قلم بند کر دیے ہیں۔ اس کے علاوہ جو ضروری باتیں ہو سکتی تھیں وہ مرتب نے

اپنے مقدمے میں ظاہر کر دی ہیں۔

۳۳ شاعروں کا اس تذکرے میں ذکر ہے، حالات اور انتخاب میں اجمال اور اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ پھر بھی کئی حیثیتوں سے یہ تذکرہ ایک خصوصیت اور ایک اہمیت رکھتا ہے۔ خصوصیت یہ ہے کہ ہر معروف اور غیر معروف شاعر کے وہ شعر انتخاب کئے گیے ہیں جن میں ممدوح یا محبوب کے سر، آنکھ، کان، ناک، ہاتھ پاؤں وغیرہ بلکہ دل اور روح تک کا نام یا ذکر آگیا ہے۔ اور اہمیت اس بنا پر ہے کہ براہ راست اردو میں جو تذکرے لکھے گیے ہیں اُن میں اُس کا پانچواں نمبر ہے اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک نئی اور مخصوص کوشش بھی۔ بایں ہمہ تدوین و ترتیب میں چونکہ بعض ضروری باتوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور متعدد نام اور باتوں کی تکرار ہوگئی ہے اس وجہ سے بقول مولانا عرشی اس سے "استفادہ بڑا دشوار تھا" خوشی کی بات ہے کہ اس دشواری کو حل کرنے اور اس کو آسان یا مفید تر بنانے کی طرف ڈاکٹر سید سلیمان حسین نے پیش قدمی کی۔

آج کل کسی پرانی اور نایاب کتاب کا طبع کرا دینا ہی کون سا آسان یا معمولی کام ہے نہ کہ اس کو ایک ایسے اہتمام اور التزام کے ساتھ شائع کرنا کہ اس کی سابقہ کمیاں دور ہو جائیں اور استفادے کی دشواریاں باقی نہ رہیں۔

بہر حال یہ کام ستایش اور ہمت افزائی کا مستحق ہے۔ پیش نظر کتاب میں نہ طوالت باقی رہی اور نہ تکرار۔ شعرا کے تخلص کو لے کر ان کو حروف تہجی کے مطابق درج کر دیا گیا ہے۔

اور اچھا ہوتا اگر کتاب میں ایک ایسا انڈکس بھی موجود ہوتا جس سے یہ یک نظر یہ اندازہ کیا جا سکتا کہ "سراپا" سے متعلق کتنی مشترک اور مختلف چیزوں پر شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔

رشید نعمانی

حدیثِ معرفت

منتخب کلام

مرتب: عزیز وارثی

ناشر: مکتبہ ندائے اتحاد، ۱۲۳۹، لال کنواں دہلی ۶

صفحات ۲۵۶ اشاعت ۱۹۶۷ء

قیمت: پانچ روپے

صوفیائے کرام اگر ایک طرف آسمانِ ولایت سے تارے توڑ کر لائے ہیں تو دوسری

طرف انھوں نے دنیائے علم وادب میں اپنی شاعری اور علمی تخلیق سے اس ارضِ خاک کو بقعۂ نور بنادیا ہے۔ مختلف دور کی تاریخ ہمیں اس بات کا ثبوت دیتی رہی ہے۔ "حدیثِ معرفت" اس بیسویں صدی کا زندہ ثبوت ہے۔ یہ مجموعہ وارثیہ سلسلے کے ممتاز شعرا حضرت اوگھٹ شاہ وارثی بچھرایونی ؒ، حضرت بیدم شاہ وارثی ؒ اور حضرت باباحسن رضا وارثی ؒ کے منتخب کلام پر مشتمل ہے۔ اس سلسلے کے مشہور پیشوا حاجی سید وارث علی شاہ صاحب ؒ (وصال دیوہ شریف ۱۳۲۳ھ) ہیں جنھوں نے دراصل قادریہ اور چشتیہ سلسلے کے سنگم کی بنیاد "وارثیہ" سلسلے کے نام سے ڈالی۔ دربارِ وارثی کے مخصوص شعرا جن میں سے بیشتر بہت مشہور ہیں۔ مثلاً اکبر وارثی میرٹھی۔ جن کا "میلادِ اکبر" گھر گھر پڑھا جاتا ہے۔ مضطر خیرآبادی، مولانا سیماب اکبرآبادی، بے نظیر شاہ وارثی، منظفر وارثی اور اس کتاب کے فاضل مرتب عزیز وارثی وغیرہ۔

(۱) دل کی لگی اکثر شعر کا قالب اختیار کرلیتی ہے۔ اوگھٹ شاہ صاحب ؒ کی شاعری کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ وہ اپنے مرشد حاجی وارث علی شاہ ؒ صاحب کو صوفیائے کرام کے منتخب اشعار اکثر سنایا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ خود بھی کہنے لگے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

اوگھٹ جوگی بن کے نکلا احمد نام کی سُمرن جپنا ۔۔۔ لکھنا اپنی لوحِ جبیں پر صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ

جس کی گنجایش نہ ہو کونین میں ۔۔۔ اُس کے رہنے کا مکاں یہ دل ہوا

رہا نہ ہوش کیا عشق میں یہ کیا ہم نے ۔۔۔ بتوں کو سجدہ کیا جان کر خدا ہم نے

ہمیں لفظ ہیں اور ہمیں اُس کے معنی ۔۔۔ زباں بھی ہمیں ہیں بیاں بھی ہمیں ہیں

ہوک اُٹھی سُن بانسریا کلپت ہوں دن رین ۔۔۔ موہن تَرے درس بنا ہردے پڑے نہ چین

رام رَمن کا لیکھا سُن لے ہاتھ گرو کا تھام ۔۔۔ جگ کی ممتا من سے چھوٹے ملیں گے اوگھٹ رام

(۲) حضرت بیدم شاہ (سراج الدین) نے بھی اپنے مرشد کی توجّہ مبذول کرانے کے لیے اپنے جذبات کو شعر کا جامہ پہنایا۔ اُن دنوں آتش کے شاگرد وحید مانک پوری کے جانشین نثار اکبرآبادی کا آگرہ میں طوطی بول رہا تھا۔ بیدم شاہ کو شوق آگرے لے گیا۔ نثار اکبرآبادی کے زمرہ میں شامل ہوگیے اور بیدم تخلص اختیار کیا۔ حاجی صاحب سے بیعت ہونے کے بعد بیدم شاہ ہوگیے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

ہم سب کا رخ سوئے کعبہ سوئے محمد رُخِ کعبہ ۔۔۔ کعبے کا کعبہ کوئے محمد صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ

شگفتہ گلشنِ زہراؓ کا ہر گُلِ تر ہے ۔۔۔ کسی میں بوئے علیؓ اور کسی میں بوئے رسولؐ

اب آدمی کچھ اور ہماری نظر میں ہے — جب سے سُنا ہے یار لباسِ بشر میں ہے
ہتھیلی پر لیے سر عشق کے دربار میں آیا — میں جس سرکار کا بندہ تھا اُس سرکار میں آیا

(۳) بابا حسن رضاؒ کا پہلا انتخاب آپ کے جانشین مرحوم وزیر علی شاہ صاحب نے رضا دار فی پریم کٹی مشن کلکتہ سے ۱۹۶۵ء میں شایع کیا تھا۔ حدیثِ معرفت میں زیادہ معیاری انتخاب شایع کیا گیا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

جو داغ ہیں عصیاں کے وہ بن جائیں نگینے — چمکے مری اُمّت کا ستارہ شبِ معراج
آپ ہی مندر آپ ہی مسجد آپ بنا گئو شالا — اپنی پوجا آپ کرت ہے آپ جپت ہے مالا
ہنسی آتی ہے اے قاتل مجھے تیری مروت پر — جو چھوٹا سایہ خنجر گردنِ بسمل سے ملتا ہے
کیا آئے ہو کیا جاتے ہو ٹھہرو تو سُنو تو — بیٹھو بھی ذرا پاس ہو دو چار گھڑی بات

الغرض دربارِ وارثیہ نے جہاں میدانِ تصوّف میں اچھے شہباز پیدا کیے وہاں قادر الکلام شعرا بھی پیدا کیے۔ کتاب میں تینوں بزرگوں کی رنگین تصاویر بھی شامل ہیں۔ کتابت طباعت صاف ستھری، عمدہ کاغذ اور ٹائٹل دیدہ زیب ہے۔ لائق مرتب کی کوشش قابلِ مبارکباد ہے۔

شبنم قادری

مکاتیب احمد سعید

مرتبہ: سید ضمیر حسن دہلوی
صفحات ۱۵۲، سائز ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت: دو روپے پچاس پیسے
پبلشر دینی بک ڈپو، اردو بازار، دہلی

مولانا احمد سعید ایک وضع دار اور خوش خلق انسان تھے، وہ ایک خوش بیان واعظ یا مقرر کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں۔ مذہبی اور سیاسی معاملات میں جو روش ایک بار انھوں نے اختیار کرلی آخر دم تک خوش اسلوبی اور استقلال کے ساتھ اُس پر قائم رہے۔ اس وضع قطع اور اس مشرب و مسلک کے لوگ اب شائد ہی نظر آئیں۔ ان کے سیاسی مجاہدوں اور مذہبی اعمال و افکار میں علمائے سلف کی سی خوبیاں اور خصوصیتیں موجود تھیں اور ان کی تقریر و تحریر میں دہلی کی ٹکسالی زبان کا لطف اور بولی ٹھولی کا مزا ملتا تھا۔

باقی صفحہ ۲۷ پر

جنت کی کنجی اور دوزخ کا کھٹکا ان کی مشہور کتابیں ہیں اس کے علاوہ قرآن پاک کا (غیر مطبوعہ) ترجمہ۔ ان میں موعظت اور ایمان کو تازہ رکھنے کا سامان ہے۔

اب سامنے آتے ہیں ان کے خطوط۔ جو سید ضمیر دہلوی کی محنت اور کوششوں کی بدولت ضروری اور معتبر مقدمے کے ساتھ مطبوعہ شکل میں آگیے۔ ان میں مولانا کی سیرت و شخصیت، زبان دانی اور میل جول کے بعض لطیف پہلو اور خوش گوار جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

یہ سارے خط ایک لحاظ سے نجی ہیں اور صرف اُن لوگوں کے نام جن سے مرحوم کو ایک خاص تعلق اور یگانگت تھی۔ بیشتر خطوط ملا واحدی کے نام ہیں جو اُس وقت کے ہیں جب واحدی صاحب دہلی چھوڑ کر کراچی چلے گئے۔ چند بہت مختصر اقتباسات ملاحظہ ہوں ذکرِ احباب"... کچھ موت کی نذر ہو گیے اور کچھ پاکستان کی بھینٹ چڑھ گیے" (ص۵۵) اعتراف و اعتماد"... ساری زندگی خوش طبعی میں گزری، انشاء اللہ خوش طبعی کے ساتھ موت بھی آئے گی" (ص۶۲) عجز و انکسار"... سوائے اسلام کے اور ٹوٹی پھوٹی نمازوں کے اور ہاں پڑے بلکہ دراڑیں پڑے روزوں کے اپنے پاس اور کیا رکھا ہے۔" (ص۱۱) زندگی و ظرافت"... دانت ایک نہیں رہا، نہ کسی کو پیار کر سکتا ہوں، نہ کوئی چیز آسانی سے چبا سکتا ہوں" (ص۲۵) ایک دل چسپ محاورہ"... گھری کا ایک گھر بگھری کے ستر گھر" (ص۸۵) اوقات گزاری"... شادی والے نکاح پڑھانے کے لیے لے جاتے ہیں، غمی والے جنازے کی نماز پڑھانے کے لیے گھسیٹتے ہیں۔"

ملا واحدی کے علاوہ کوئی ۴۸ خط، سات آدمیوں کے نام اور بھی ہیں اور وہ بھی لکھنے والے کی کیفیت و کردار کے آئینہ دار ہیں۔

اُردو کے نام لیوا اور اُس کے قدر شناس تو ان مکاتیب کے مطالعے سے خوش ہوں گے ہی۔ اس کے علاوہ ادب اور بے ادبی کی باہمی بحث و کشمکش دور کرنے میں بھی ایسی کتابوں سے مدد اور سند حاصل کی جا سکتی ہے۔

رشید نعمانی

ادبی خبریں

آگرہ میں غالب کی یادگار

لکھنؤ: غالب کی صدسالہ تقریبات سے متعلق یوپی کی کمیٹی نے اس بات کی سخت مخالفت کی ہے کہ غالب کا وہ گھر جہاں وہ آگرہ میں پیدا ہوئے تھے گرایا جائے۔ اس سلسلے میں بطور احتجاج ایک وفد جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملاقات کرے گا اور استدعا کرے گا کہ اس گھر کو غالب کی یادگار کے طور پر محفوظ کرلیا جائے۔ (الجمعیۃ)

میونخ میں اقبال کی یادگار

میونخ: ۲۳ راپریل مشہور شاعر اور فلاسفر ڈاکٹر سر محمد اقبال کی یاد میں جن کا انتقال تقریباً ۳۰ برس پہلے ہوا تھا یہاں پر ایک یادگار تعمیر کی گئی ہے جس کی نقاب کشائی کی رسم ۲۲ راپریل کو ادا کی گئی یہ یادگار دو میٹر بلند ہے، اور اس پر لکھا ہے "پاکستان کے فلاسفر اور قومی شاعر سر محمد اقبال، پیدائش ۱۸۷۳ء انتقال ۱۹۳۸ء جنھوں نے میونخ یونی ورسٹی سے ۱۸۹۷ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی" (الجمعیۃ)

ذوق کا مزار کس مپرسی میں

خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے اتالیق اور اردو کے عظیم شاعر شیخ ابراہیم ذوق دہلوی کو دلی سے جو محبت تھی وہ ڈھکی چھپی بات نہیں چنانچہ ان کے اشعار میں اکثر اس کا اظہار ملتا ہے۔ لیکن جس دلی سے اس عظیم شاعر نے اتنی محبت اور دار افتگی کا اظہار کیا اس دہلی نے اس سے اتنا ہی بے محابا سلوک کیا اور آج اس عظیم ہستی کے مزار تک کا بھی نشان نہیں ملتا۔ تقسیم ہند نے جہاں متعدد بد نما داغ چھوڑے ہیں وہیں ایک یہ بھی کہ قلعۂ معلیٰ کے آخری رہنمائے علم وادب کا مرقد آج پبلک پاخانہ سیتا پوری میں دہلی میونسپل کارپوریشن نے حال میں ہی بنایا ہے۔ اس علاقے میں گائے بھینسیں بندھتی ہیں اور پورے علاقے میں ڈیریوں کا جال بچھا ہوا ہے جہاں ہر طرف غلاظت کے ڈھیر دیکھنے میں آتے ہیں۔ دہلی کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی اس پر جتنا بھی ماتم کرے کم ہے۔ (انڈین اکسپریس)

انیس آفور

"مکتوب لندن"

مانچسٹر میں یوم اقبال نسیم احمد باجرہ کی اطلاع کے مطابق ۲۸ را پریل بروز اتوار چار بجے سہ پہر کورولی ہال، مانچسٹر ۱۳ میں یوم اقبال منایا جائے گا۔ جس میں مقررین علامہ اقبال کی شاعری اور سیاسی فلسفہ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور چند گلوکار کلام اقبال ترنم سے پیش کریں گے۔ اس یادگار تقریب میں شرکت کے لئے مانچسٹر اور اطراف کے اردو نواز حضرات کو مدعو کیا گیا ہے۔ (ہماری زبان)

"بیکانیر میں جشنِ خلیل کا انعقاد" بیکانیر ۱۶ را پریل (ڈاک سے) کل رات ۹ بجے بزمِ خلیل کے زیرِ اہتمام عظیم الشان پیمانے پر جشنِ خلیل منایا گیا۔ صدارت کے فرائض عالی جناب این۔ سی۔ دتہ صاحب ڈی آئی جی پولیس بیکانیر نے انجام دیے۔ نیز عالی جناب انل بورڈیا صاحب ایڈیشنل ڈایریکٹر محکمۂ تعلیمات حکومتِ راجستھان نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔ جشنِ خلیل کا پہلا دور تقاریر اور مقالات پر مشتمل تھا۔ بزمِ مقالات کے بعد خلیل حمدانی صاحب کے مجموعۂ کلام بنام "گلزارِ خلیل" کی اہم اجرا عمل میں آئی اور صدرِ محترم نے گلزارِ خلیل کی پہلی جلد اپنے دستِ مبارک سے خلیل صاحب کو پیش کی۔ تبدہ موصوف نے اس اعزاز پر دلی شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد کل راجستھان طرحی مشاعرہ ہوا۔ جس میں مقامی شعراء کے علاوہ راجستھان کے نمائندہ شعرائے کرام نے شرکت فرمائی۔ آخر میں قراردادِ شکریہ کے بعد "جشنِ خلیل" کی تقریبات اختتام پذیر ہوئیں (طفیل احمد تابش حمدانی)

پرویز شاہدی کا انتقال کلکتہ ۵ مئی۔ اردو کے ترقی پسند شاعر اور کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے انچارج پروفیسر پرویز شاہدی کا کل شام سات بجے ان کی رہائش گاہ واقع نمبر ۲ لوئر رینج میں انتقال ہوگیا۔ وہ کئی سال سے دمہ کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ پسماندگان میں ان کی والدہ بیوی اور ۲ بچی شامل ہیں۔ پروفیسر مرحوم کا آبائی وطن پٹنہ تھا اور وہیں انھوں نے ابتدائی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ عمر کا زیادہ حصہ کلکتہ اور مغربی بنگال میں گزرا۔ تعلیم کے بعد عملی اور ادبی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ وہ عرصہ تک مدناپور کے ایک کالج سے منسلک رہے۔ لیکن دل چسپی کی وجہ سے انھیں ملازمت چھوڑنا پڑی۔ کمیونسٹ تحریک سے وابستگی کی وجہ سے کچھ عرصہ نظر بند رہنا پڑا۔ رہائی کے بعد مکمل کلکتہ میں قیام کیا۔ کلکتہ یونیورسٹی میں اردو کی توسیع ہوئی تو ان کا تقرر سینیر پروفیسر کی حیثیت سے ہوگیا

[illegible]

Regd. No D.58 June 1968

KITABNUMA

JAMIANAGAR NEW DELHI-25

۹(7)

ماہنامہ

جولائی ۶۸ء

کتاب

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

تازہ ہندوستانی مطبوعات

رسالہ	گفتگو (چوتھا شمارہ)	مرتبہ سردار جعفری	۶/۰	ادب	اقبال کا تصور خودی	مرتبہ ڈاکٹر غلام عمر خاں	۳/۰
شعری	سوز حیات	یحییٰ بھائی اے جبلپوری	۱۲/۰	"	ربع اسلام اقبال کی نظر میں	" " "	[illegible]
"	دیوان شاہ نیاز بریلوی	مرتبہ ڈاکٹر انوار الحسن	۱۲/۲۵	"	لیلیٰ مجنوں	" " "	۶/۰
"	دیوان امیر خسرو	" " "	۲۸/۰	مذہبی	سیرت طیبہ	قاضی زین العابدین سجاد	۵/۵۰
"	سواد منزل	" نشور واحدی	۲/۰	تاریخ	ہندوستان میں عربوں کی حکومت	قاضی اطہر مبارکپوری	۹/۰
"	آتش پارے	" سرفراز افسر	۰/۵۰				
"	نغمۂ فردوس	" شکیل بدایونی	۱/۷۵	سوانح	حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ	ڈاکٹر حنیفہ رضی	۸/۰
ادب	اردو کے چاند تارے	" امیر حسن نورانی	۵/۰	قاعدہ	دس دن میں اردو	حیات اللہ انصاری	۰/۷۵
"	مرزا غالب کے لطیفے	" واکی آسی محمد صدیقی	۲/۵۰	تاریخ	واقعات دار الحکومت دہلی کامل	بشیر الدین احمد دہلوی	۵۰/۰

پاکستانی مطبوعات

الہساردن	عمر ابو النصر	۴/۰	تذکرہ علمائے ہند	مرتبہ رحمان علی	۴۰/۰
ابوبکر صدیق اکبر	محمد حسین ہیکل	۹/۰	حضرت ابوذر غفاریؓ	عبدالحمید جودۃ السحار	۳/۰
امیر تیمور	ترجمہ محمد عنایت اللہ دہلوی	۱۲/۰	سوچئے اور دولت کمائیے	نپولین ہل	۷/۰
المنتقی	ابن تیمیہ	۱۲/۰	عمر فاروق اعظم	محمد حسین ہیکل	۱۵/۰
آپ بھی خوش رہیے	برٹرینڈ رسل	۶/۵۰	علاء الدین خلجی	رئیس احمد جعفری	۱۴/۰
اسلامی مذاہب	ابو زہرہ مصری	۱۱/۵۰	عہد لارڈ ماؤنٹ بیٹن	ترجمہ یونس احمر	۱۵/۰
اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد	غلام رسول مہر	۷/۵۰	قوت ارادی	محمد عبدالوہاب ظہوری	۴/۵۰
بابر	وحشتی محمود آبادی	۱۴/۰	گفتگو اور تقریر کا فن	ڈیل کارنیگی	۴/۵۰
تذکرہ	مولانا ابوالکلام آزاد	۹/۰	میٹھے بول میں جادو ہے	" "	۸/۰

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

پرنسس بلڈنگ نزد جے جے ہسپتال

بمبئی نمبر ۳ (بی آر)

منیجنگ ایڈیٹر:
غلام ربانی تاباں
مدیر مسئول:
مجیب احمد خاں

جولائی ۱۹۶۸ء
جلد ۹ شمارہ ۷، ۵
سالانہ چندہ دو ۲ روپے
فی پرچہ بیس پیسے

اشاریہ

تعلیمی ادارے گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد کھلنے شروع ہوگئے ہیں، بلکہ بعض صوبوں میں تو پڑھائی بھی ہونے لگی ہے اور اساتذہ اور طلبا، نئے حوصلوں اور نئی لگن کے ساتھ درس و تدریس کے کاموں میں لگ چکے ہیں۔ مکتبہ جامعہ بھی جس کی مختلف درسی کتابیں ہندوستان کے بیشتر صوبوں میں داخل نصاب ہیں، آج کل انہی کی تیاری اور روانگی میں مصروف ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ قوم کے نونہالوں کو مکتبہ جامعہ کی تیار کردہ کتابیں ہر سال کی طرح اس سال بھی وقت پر مل رہی ہیں اور کم از کم مکتبہ جامعہ سے کتابوں کی کمی یا تاخیر کی ابھی تک شکایت نہیں ہوئی ہے۔

درسی کتابوں کی مصروفیت کے باوجود مکتبہ جامعہ میں ادبی کتابوں کی اشاعت کا کام بھی برابر جاری ہے۔ کئی قابلِ ذکر پرانی کتابوں کے نئے اڈیشن چھاپنے کے علاوہ، اس دوران جن چار نئی کتابوں کی تیاری کا کام ہوا ہے وہ اپنی افادیت اور ادبی حیثیت کے اعتبار سے ہر طرح قابلِ ذکر اور قابلِ توصیف ہے

پہلی کتاب ہے "پریم چند کے خطوط"۔ خطوط کا یہ بیش بہا مجموعہ جسے مدن گوپال صاحب نے مرتب فرمایا ہے، اردو میں پہلی بار شائع کیا گیا ہے۔ ان خطوط کے ذریعے نہ صرف یہ کہ پریم چند کی زندگی اور ان کی سیرت و شخصیت پر مختلف زاویوں سے روشنی پڑے گی بلکہ ان کے پرستاروں اور نقادوں کو کچھ ایسی چونکا دینے والی باتیں بھی معلوم ہوں گی جو اس سے پہلے کبھی نہیں سنی گئی تھیں۔

دوسری کتاب ہے پروفیسر احمد علی کے انگریزی ناول، 'TWILIGHT in DELHI' کا ترجمہ، جسے اردو میں "دلی کی شام" کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ اس ناول کے بارے میں اس وقت اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ یہ پہلے پہل انگلینڈ میں شائع ہوا اور اتنا زیادہ پسند کیا گیا کہ اس کے اب تک دسیوں اڈیشن انگلینڈ کے علاوہ دوسرے مغربی ممالک میں بھی شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

تیسری کتاب ہے "فسانۂ عجائب کا تنقیدی مطالعہ" سید ضمیر حسن صاحب دہلوی کی یہ تصنیف

جس میں اردو کی مشہور داستان "فسانۂ عجائب" پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے، اپنی ادبی حیثیت کی وجہ سے منفرد اور خاص اہمیت کی حامل ہے اور اس نے وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔

چوتھی کتاب ہے "شہر آشوب" یہ اردو نظم کی اس صنفِ خاص پر واحد اور غالباً پہلا مستند تذکرہ ہے جو بلاشبہ ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ یہ تذکرہ ڈاکٹر نعیم احمد نے مرتب فرمایا ہے۔

مکتبہ جامعہ کی یہ چاروں کتابیں طباعت کی منزلوں سے گزر چکی ہیں اور امید ہے اس ماہ کے آخر تک شائقین ادب کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں گی۔

ہم مشکور ہیں جودھپور کے جناب محمد شرف احمد عثمانی صاحب کے جنھوں نے کتاب نما کے سات خریدار دیے ہیں

ہمیں افسوس ہے کہ بعض انتظامی خرابیوں کے باعث، ۲۔ ۳ ماہ سے کتاب نما کی اشاعت میں تاخیر ہو رہی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب ان حالات پر قابو پا لیا گیا ہے۔

امید ہے کہ اس ماہ کے بعد رسالہ بروقت شایع ہو کر اپنے قارئین کے ہاتھوں میں ہر ماہ کی پہلی، دوسری تاریخ تک ضرور پہنچ جایا کرے گا۔

اس درمیان میں جو زحمتِ انتظار قارئین کرام کو اٹھانی پڑی اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔

(بقیہ جام نو)

جب آہ اُن احباب کو — میں یاد کر اٹھتا ہوں جو
یوں مجھ سے پہلے اٹھ گئے — جس طرح طائر باغ کے
یا جیسے پھول اور پتیاں — گر جائیں سب قبل از خزاں
اور خشک رہ جائے شجر

فراق گورکھپوری

غزل

نگاہِ ناز نے پردے اٹھائے ہیں کیا کیا　　حجاب اہلِ محبت کو آئے ہیں کیا کیا
جہاں میں تھی بس اک افواہ تیرے جلووں کی　　چراغ دیر و حرم جھلملائے ہیں کیا کیا
دو چار برقِ تجلّی سے رہنے والوں نے　　فریب نرم نگاہی کے کھائے ہیں کیا کیا
نثار نرگسِ میگوں کہ آج پیمانے　　لبوں تک آئے ہوئے تھرتھرائے ہیں کیا کیا
وہ اک ذراسی جھلک برقِ کم نگاہی کی　　جگر کے زخم نہاں مسکرائے ہیں کیا کیا
چراغِ طور جلے آئینہ در آئینہ　　حجاب برقِ ادا نے اٹھائے ہیں کیا کیا
بقدرِ ذوقِ نظر دیدِ حسن کیا ہو مگر　　نگاہِ شوق میں جلوے سمائے ہیں کیا کیا
کہیں چراغ کہیں گُل، کہیں دلِ برباد　　خرامِ ناز نے فتنے اٹھائے ہیں کیا کیا
تغافل اور بڑھا اس غزالِ رعنا کا　　فسونِ غم نے بھی جادو جگائے ہیں کیا کیا
ہزار فتنۂ بیدار خوابِ رنگیں ہیں　　چمن میں غنچۂ گل رنگ لائے ہیں کیا کیا
نظر بچا کے ترے عشوہ ہائے پنہاں نے　　دلوں میں دردِ محبت اٹھائے ہیں کیا کیا
پیامِ حسن، پیامِ جنوں، پیامِ فنا　　تری نگاہ نے فسانے سنائے ہیں کیا کیا
تمام حسن کے جلوے تمام محرومی　　بھرم نگاہ نے اپنے گنوائے ہیں کیا کیا

فراق راہِ وفا میں سبک روی تیری
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

نریش کمار شاد

اُردو کے انگریز شاعر

اُردو کے یورپین شاعروں کا کلام اگرچہ کسی ادبی قدر و قیمت کا حامل نہیں ہے اور ان کے زیادہ تر اشعار اساتذہ کے شعروں کی بھدّی سی بازگشت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بھدّی بھی اس لیے کہ زبان و بیان پر ان کی دسترس نمایاں طور پر کمزور معلوم ہوتی ہے تاہم ان کے اشعار اس حقیقت کے چہرے سے نقاب ضرور اٹھاتے ہیں کہ اُردو زبان کی لطافت و نفاست کا جادو بھی انھیں مسحور کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اُردو کی جاذبیت و مقبولیت سے تو ملکہ وکٹوریہ بھی اس حد تک متاثر ہوئیں کہ ان کے دل میں بھی اپنے اس غلام ملک کی پیربسلی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا چنانچہ آگرہ کے مولوی برکت اللہ خاص طور پر اس مقصد کے لیے لندن بھیجے گئے کہ ملکہ کو اُردو سکھا سکیں اور ملکہ نے بھی تھوڑی ہی مدّت کے بعد اتنا ملکہ پیدا کرلیا کہ وہ اپنا روزنامچہ اُردو میں لکھنے لگیں۔ انگریزوں نے اُردو زبان و ادب کی تاریخ اور لغت مرتب کرنے میں جو ناقابلِ فراموش خدمت سرانجام دی ہے وہ محتاجِ تعارف ہے ہی نہیں لیکن اپنی بساط کے مطابق انھوں نے جیسی شاعری کی ہے اس کی بھی تاریخی اہمیت ہے اور اسے بھی یکسر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے قیام کے بعد بہت سے انگریز اُردو پڑھنے کی طرف راغب ہوئے اور بعد میں یہ رغبت اس حد تک پہنچی کہ ان میں سے بعض نے مشقِ سخن بھی جاری کر دی جن میں کئی ایک کی خدمات قابلِ ذکر ضرور ہیں۔ ان قابلِ ذکر اصحاب میں الکزینڈر ہیڈرلی کا نام سرِفہرست ہے۔ الکزینڈر ہیڈلی ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے۔ شاعری شروع کی تو آزاد تخلص کرنے لگے۔ آزاد کی پرورش اور تربیت بہت حد تک اسلامی معاشرت کے زیرِ اثر ہی ہوئی۔ غدر کے بعد انھوں نے خود بھی مذہب اسلام قبول کرلیا تھا اور اپنا نام جان محمد رکھ لیا تھا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں آزاد باقاعدگی سے اُردو شعر کہنے لگے۔ کچھ مدت تک خط و کتابت کے ذریعے مرزا غالب سے اصلاح لی۔ بعد ازاں زین العابدین عارف سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ انھوں نے اپنے استاد عارف کی تعریف میں ایک قصیدہ اور ان کی وفات کے بعد ایک نوحہ مع تاریخ وفات بھی لکھا ہے۔ آزاد

طبابت میں بھی خاصی مہارت رکھتے تھے۔ ریاست الور کے توپ خانے میں کپتان بھی رہے لیکن ملازمت اختیار کرنے کے ایک سال بعد ہی ۲۷ر جولائی ۱۸۶۱ء کو بتیس برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اپنی بعض ابتدائی غزلوں میں انھوں نے اپنے نام کا مخفف مالک بھی تخلص کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کی موت کے بعد ان کے بڑے بھائی تھامس ہیڈرلی نے جو ریاست بھرت پور کے ڈپٹی تھے میر شوکت علی فتح پوری کے تعاون سے ان کا کلیات مرتب کیا جو ۱۸۶۳ء میں کتابی صورت میں منظر عام پر آیا۔

آزاد کے شعروں میں دوسرے یورپین شاعروں کی بہ نسبت زبان و بیان کا زیادہ رکھ رکھاؤ پایا جاتا ہے جیسے ؎

میری صورت سب کہے دیتی ہے میرا رازِ دل　　میرے تیور دیکھ کے وہ مجھ سے بدظن ہوگیا

بزم میں اٹھتے ہی ان کے روئے روشن سے نقاب　　جام مے سورج بنا مہتاب مینا بن گیا

عیاں ہے سب میں کہاں کا مخفی کب اس کا جلوہ نقاب میں ہے　　قصور اپنی نگاہ کا ہے وگرنہ کب وہ حجاب میں ہے

نویدائے دل! کہ رفتہ رفتہ گیا ہے اس کا حجاب آدھا　　ہزار مشکل سے بارے رخ پر سے اس نے الٹا نقاب آدھا

بعض شعر مرزا غالب کی زمینوں میں بھی کہے ہیں ؎

نہ دے جو بوسہ گیا ہونہ دے جواب تو دے　　بلا سے جو تجھے دینا ہو دے شتاب تو دے

پھرتا ہوں تنگنائے جہاں میں چھپا چھپ　　طالع سے رستخیز کی طاقت نہیں مجھے
کیا خاک اشتہا ہو کہ جینے سے سیر ہوں　　بے وجہ فکرِ ترکِ معیشت نہیں مجھے

۱　رابرٹ گارڈنر اسبق بھی خاصے خوش خیال شاعر تھے۔ ۱۸۴۷ء میں قصبہ ہرچی ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں انھوں نے نسیم، شمیم، شعاع کی تخلص اختیار کیے۔ ۱۹۳۰ء میں وفات پائی۔ ان کے مرنے دار کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

جو طالبِ حق ہے اسے حیراں نہیں دیکھا — ناحق کی کسی چیز کا خواہاں نہیں دیکھا

پھر بہار آتے ہی زخمِ دل ہرا ہو جائے گا — ہو گی پھر وحشت نئی سودا نیا ہو جائے گا

جان اک پردہ نشیں کے عشق سے مشکل میں ہے — لا نہیں سکتے زباں پر جو ہمارے دل میں ہے

جب کہا میں نے قسم کھاؤ تو بولے ہنس کے وہ — گر قسم ہے چیز کھانے کی تو کھالی جائے گی

اسبق کے بھائی برنہا لمیو گارڈنر بھی شعر کہتے تھے، اور صبر تخلص کرتے تھے۔ امیر مینائی سے ان کا رشتۂ تلمذ تھا۔ صبر کا ایک شعر ہے ؎

ولولے تھے وہ سب جوانی کے — اب وہ سودا ہمارے سر میں نہیں

نصیر الدین عرف کلو کے ایک انگریز شاگرد تھے اسٹیفن اسٹان جو ۱۸۰۲ء تک زندہ تھے اور خوب چند ذکا کے خاص دوستوں میں تھے۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

خط کا یہ جواب آیا لکھا جو کبھی پھر خط — کر ڈالوں گا اک دم میں تری آن کے ٹکڑے

بلتھزر آبیر۔ شاہ نصیر دہلوی کے نامی شاگرد تھے جن کی پختہ مشقی ان دو شعروں سے ظاہر ہے ؎

شمع فانوس میں در پردہ جلی ہے دیکھو — شعلۂ آہ نکلے ہے جگر سے باہر

ہم اس آئینہ رو کے ہجر میں یوں زیست بسر کرتے ہیں — کہ سکتے کی سی حالت ہے نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

شاہ نصیر کے ایک اور انگریز شاگرد بھی تھے، جن کا نام تھا جان تھامس طوماس ٹھو جو خاں صاحب کے نام سے مشہور تھے، ان کا ایک شعر ہے ؎

سودائے زلفِ یوسفِ ثانی کا اس قدر — رووے ہیں ہم کھڑے سر بازار بےاختیار

ریاض خیرآبادی کے بھی ایک انگریز شاگرد جیک ڈبرن نامی تھے جو گورکھپور ہی میں رہا کرتے تھے، ان کے دو شعر ہیں ؎

یہ کیا چپکے چپکے شکایت ہے اے دل — خبر دار کس کا گلہ ہو رہا ہے

ستم ایسا نہ کر اے باغباں فصلِ بہاری میں — گرائیں بجلیاں ایسا نہ ہو آہیں عنادل کی

ڈانیال گارڈنر ہوش لکھنوی کے شاگرد تھے، ان کا تخلص شکر تھا۔ ۱۹۰۷ء میں ۵۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

ہوا گردش سے ثابت بعدِ تحقیق — زمیں کہتے ہیں جس کو آسماں ہے

آگسٹن ڈی سلویرا پرتگیزی تھے اور جن کا قیام آگرہ میں تھا عنایت علی بیگ ماہ کے شاگرد تھے۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

عجب تیرے کشتوں کا دیوانہ پن ہے — نہ ثابت لحد ہے نہ تارِ کفن ہے

جوزف برہرٹ ولیم منشی دیا کرشن ریحان کے شاگرد تھے اور صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ان کا ایک شعر ہے۔ ؎

بت بنے بیٹھے ہیں کچھ کہتے نہیں سنتے ہیں سب — یہ نہیں کھلتا زباں ان کے دہن میں کیوں نہیں

نلاڈیس بیکسٹر صمد لکھنوی کے شاگرد تھے۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

وہ گل یہ چاہتا ہے رہے اب بھی میری یاد — ڈالے ہیں لے کے تھوڑے سے اندر کفن کے پھول

ای۔ ڈی ماسٹرز مضطر آئرلینڈ کے رہنے والے تھے اور مرزا داغ دہلوی کے شاگرد رشید تھے، دس سال دہلی میں رہے اور یہیں اردو سیکھی۔ اُن کی غزل کا ایک شعر ہے ؎

ستارے جن کو کہتے ہیں اٹھا لایا فلک ان کو — گرے تھے پھول جو میرے چراغ داغ روشن سے

اپنے استاد محترم داغ کی وفات پر مضطر نے جو طویل مرثیہ لکھا ہے اس کے بعض اشعار اپنے معمولی اور کمزور اسلوب اور تسامحات زبان کے باوجود اثر انگیز ہیں ؎

صبر و شکیب طاقتِ ضبطِ فغاں نہیں
کہنا پڑا کہ درد کہاں ہے کہاں نہیں
غم خوار۔ یار۔ مونس و ہمدم یہاں نہیں
کس کو سنائیں حال کوئی مہرباں نہیں
اک داغ تھا سو وہ بھی تہِ آسماں نہیں

ملکِ سخن میں داغ تو ہر دل عزیز تھا
مانے حریف اس کو نہ مانے تو اس سے کیا
جو کچھ کہیں گے اس کے لیے ہے وہ سب بجا
مضطر زبانِ خلق ہے، نقارۂ خدا
باقی اگرچہ ہند میں اس کا نشاں نہیں

رام پور کے ایک یوروپین افسر استھ جو کمشنر کے عہدے پر فائز تھے، شعر و شاعری کا اچھا مذاق رکھتے تھے اور جن کے شعروں سے بالعموم ان کے فوجی مشاغل کا انکشاف ہوتا تھا جیسے ؎

جنوں کی فوج کی سُن آمد آمد — خرد کا پاؤں کچھ چل سا رہا ہے
غنیمت جان استھ آ گیا ہے — کہ دشمن سر سے اب ٹل سا رہا ہے

ایک انگریز شاعر جلیم کارڈنر اور کیس بھی تھے جن کا ایک شعر ہے ؎

کیا تصور نے نکالی ہے ترے راہ نئی — آنکھ تک آیا نہیں دل میں کہاں آ پہنچا

ڈی کاسٹا جو کلکتے میں رہتے تھے اور جہاں کے ڈیوٹن کالج سے ان کا تعلق تھا، شعر کہتے ہیں ؎

مرضِ ہجر کا جز وصل جو چارا ہوتا — مانگتے تم سے دعا ہم نہ کبھی اے پیارے

یوروپین اُردو شعرا میں شائق تخلص کے دو شاعر گذرے ہیں۔ ایک جارج فانتوم اور

دوسرے جارج فانتم - اول الذکر نے ۱۸۸۰ء میں انتقال کیا اور ان کا ایک شعر ہے ؎

گر نہ پہنو ماتم عشق میں پوشاک سیاہ　　　نرگسیں آنکھوں سے دو آنسو بہانا چاہیے

اور مؤخر الذکر شائق ایک فوجی آدمی تھے ان کا شعر ہے ؎

جور رقیب منت درباں و طنز غیر　　　کیا کیا جفائیں ہم نے ترے واسطے سہیں

صاحب تخلص کے تین انگریز شاعر ایڈیسن رین ہارڈٹ، مسٹر جو ہانس اور جارج فانتوم بھی قابل ذکر ہیں اور تینوں کا ایک ایک شعر بالترتیب حسب ذیل ہے ؎

ہے زلف حلقہ زن خط دلبر کے آس پاس　　　یا اژدہا ہے فوج سکندر کے آس پاس

دیکھنا توڑ کے وحشت میں نکل جاؤں گا　　　مجھ کو پہناتے ہو زنجیر یہ زنجیر عبث

یہ آرزو ہے ترے آنے کی مجھے اے شوخ　　　کہ جھوٹے وعدوں پہ بھی انتظار باقی ہے

اور ایک فرانسیسی کپتان کے صاحب زادے جوزف عاشق کا شعر ہے ؎

شاید ہمارے جذبۂ دل کا ہے یہ اثر　　　آئے ہیں راہ بھول کے صاحب کدھر سے آپ

ایک صاحب لیس بٹلر عابد تھے، جو عموماً رباعیاں ہی کہا کرتے تھے اُن کی ایک رباعی ہے ؎

آزاد ہوں مجھ کو حاجت پند نہیں　　　سودا ہے تیری زباں بند نہیں

مت کہہ مجھے رندانہ روش کرنے کو ترک　　　عابد میں تیری شرع کا پابند نہیں

جارج پرنس شور یورپین شعرائے اُردو میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ شور ۱۸۲۳ء میں علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ وہیں نشو و نما پائی اور تعلیم حاصل کی۔ حصول تعلیم کے بعد پولیس کے محکمے میں ملازم ہو گئے۔ شور کافی زود گو اور پُر گو سخن ور تھے۔ اُردو میں ان کی پانچ دواوین اور دو مثنویاں ہیں۔ ایک فارسی دیوان "گلشن فرنگ" ہے۔ اُردو میں عموماً داغ کی غزلوں پر غزلیں کہا کرتے تھے۔ انھوں نے ۱۸۹۴ء میں وفات پائی - ان کا ایک شعر ہے ؎

غیر کے ساتھ عیادت کو وہ دلبر آیا　　　تو مسیحا ملک الموت کو لے کر آیا

ان کے علاوہ کلکتے کے آنزک عبری، خیراتی لال دل سوز کے شاگرد کوئیس ٹینیس فراسو اور مرزا مہدی حسین حنا کے شاگرد بنجمن جانستن افلاطون اور نابینا انگریز فلیکس گارڈنر فلک المعروف قلی صاحب بھی اردو میں شعر کہتے تھے لیکن ان میں نمایاں اہمیت صوفی منش مرزا سلیمان شکوہ گارڈنر عرف منا صاحب المتخلص فنا صاحب کی تھی۔ جو شعر کہنے کے علاوہ خطاطی میں بھی مہارت رکھتے تھے اور ۱۹۰۲ء میں اکیس سال کی عمر میں ہی جن کا انتقال ہو گیا۔ فنا کے دو شعر ہیں ؎

پوچھا جب دل سے کہ کیا وصل کا ساماں ہوگا بولا جس روز کفن میں تنِ عریاں ہوگا
آج تو شوق سے پی خونِ جگر اے غمِ یار ناشتہ کل کو کبابِ دلِ بریاں ہوگا

یورپین شعرائے اردو میں خواتین کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ مرزا سلیمان شکوہ گارڈنر کی چھوٹی بہن ایلن کرسچیانہ عرف رقیہ بیگم بھی شاعرہ تھیں اور یہ شعر انھیں کا ؎

حشر کے روز جو خورشید نمایاں ہوگا ہے یقیں دل کو وہ عکسِ رُخِ جاناں ہوگا

آگرہ کے میجر جسٹن کی اہلیہ مسز آر جسٹن بھی شعر کہتی تھیں۔ تخلص تھا جمیعت۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

مقسوم کی خوبی ہے یہ قسمت کا ہے احساں رہتا ہے خفا مجھ سے جو دلبر کئی دن سے

اور یہ مشہور شعر بیگ صاحب بہادر کی صاحب زادی خفی کا ہے ؎

جن سے ہم آشنائی کرتے ہیں ہم سے وہ بے وفائی کرتے ہیں

کلکتہ میں پولیس سپرنٹنڈنٹ مسٹر ٹربلد جن کی دختر نیک اختر اینی ملکہ بھی شعر کہتی تھیں اور عبدالغفار نساخ کی شاگردہ تھیں۔ آخر میں مشرف با سلام بھی ہو گئی تھیں۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

آہ و زاری نہیں سنتے بُتِ مغرور کو
اس صنم کو ملکہ ہی نے مگر رام کیا

اروند گوکھلے

(مراٹھی کہانی)

اپا جی کے یکایک بے ہوش ہو جانے کی اطلاع صبح اخبار دے چکا تھا۔ اس کے بعد گاؤں کے دو ایک نیتاؤں نے بھی یہی خبر سنائی۔ شاید ریڈیو پر بھی ہزاروں لوگوں نے اس خبر کو سنا ہوگا۔ میں کچھ مصروف رہا۔ اس لیے ریڈیو کا براڈ کاسٹ میرے کانوں تک نہ پہنچ سکا۔ اپنے روزانہ کاموں اور دوسری مصروفیات کو پس پشت ڈال کر میں ان سے ملاقات کے لیے روانہ ہوگیا۔ سچ کہا جائے تو اپا جی اس سے قبل بھی اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے تھے۔ لیکن موت کے گہرے سمندر تک جا کر واپس آگئے تھے۔ اخبار والوں نے اس بار پھر لکھا تھا کہ "فکر کی کوئی بات نہیں" لیکن نہ جانے کیوں میرے دل کی دھڑکن اپا جی کی موت کی خبر دے رہی تھی، وہ اب چند لمحوں کے مہمان ہیں۔ اس کے بعد زندگی کی ساری دوڑ دھوپ ایک نقطہ پر آکر جم جائے گی، اور اس کے بعد پھر کبھی ان کی خلوص بھری آواز سنائی نہیں دے گی۔

ان کے آخری درشن کے لیے میں تڑپ اٹھا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ سماج کے کرتا دھرتا تھے ایک بڑے نیتا تھے، بلکہ اس لیے کہ میرا اور ان کا خون کا رشتہ تھا۔ میری بیوی بھی حد درجہ اداس ہوگئی تھی۔ مگر اپا جی کے گاؤں جانے کی رائے سے متفق نہیں تھی، چھوٹی بچی کی طبیعت قدرے ناساز تھی اور بڑے لڑکے کا امتحان قریب تھا، اس کے باوجود بھی ان کے گھر نہ جانے کی وجہ کچھ اور ہی تھی، پچھلی بار جب اپا جی بستر مرگ پر تھے، اس وقت وہ میرے ساتھ اُن کے گھر آئی تھی۔ اپا جی بے حد مخلص انسان ہیں۔ انھیں اپنے سارے رشتہ دار عزیز ہیں، ان کے نزدیک رشتہ میں کوئی فرق نہیں۔ چاہے رشتہ قریب کا ہو چاہے دور کا۔ مگر وہاں پر اُن کے اپنے لوگوں کو اُن سے دور رکھا گیا تھا اور اُن تک رسائی ان لوگوں کی تھی۔ جن کے ساتھ اپا جی کا دور دور تک کوئی تعلق نہیں تھا۔ چھوڑیے میری اور میری بیوی کی بات، ان کی اپنی بیوی اور بچوں کو کہاں ان سے قریب رہنے کی اجازت تھی۔ انھیں اکیلے میں کبھی رہنے کا موقع نہیں دیا جاتا تھا۔ مصروفیت بے لاگ مصروفیت، دورے، چرچے، سبھائیں، بھاشن، افتتاح اور نہ جانے کیا کیا! بیوی کی اپا جی کے گھر نہ جانے کی رائے سے ایک حد تک میں بھی متفق تھا مگر زندگی

کی وہ دھنذ کی الجھنیں الگ اور موت کی آخری الجھنیں الگ۔ اس لیے میں نے سارے وسوسوں کو پرے رکھ کر ان کے گھر کا راستہ لیا۔ میں نے سوچا اس وقت اپا جی کے آخری لمحات میں ان کے دونوں بیٹے ان کے قریب ہوں گے۔ ان کی بیوی زار و قطار رو رہی ہو گی۔ بچّوں کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گالوں پر بہہ رہے ہوں گے۔ اور اپا جی پوچھ رہے ہوں گے:

"کیا میرا سوتیلا بھائی ابھی تک نہیں آیا؟ کون کون آیا ہے؟ کہاں ہے وہ سارے میرے اپنے ملے آؤ انھیں، میرے قریب لے آؤ..."

مگر چھوڑنے سے قبل میری بیوی نے کہا تھا: "تم وہاں جا کر کیا کرو گے؟ ان کے اپنے ڈاکٹر ہیں، ہاتھ بٹانے کے لیے دوسرے نیتا ہیں۔ ان کے ساتھ کام کرنے والے اور کتنے لوگ ہوں گے، اتنی بھیڑ میں تمھیں کون پوچھتا پھرے گا؟"

واقعی میں وہاں جا کر کیا کر سکوں گا؟ مگر نہیں مجھے وہاں جانا چاہیے۔ ان کے آخری درشن کے لیے، ان کے بچوں کو دلاسہ دینے کے لیے، ماں جی کے آنسو پونچھنے کے لیے، رات کے اندھیارے میں جب گاڑی پوری رفتار سے چلنے لگے گی تو مجھے پرانی باتوں کو دہرانا تھا۔ بیتی یادوں کو سمیٹ کر کچھ دیر کے لیے کھو جانا تھا۔ مگر اسی وقت میرے گاؤں کے دو نیتا دکھائی دیے اور انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا:

"فون آیا تھا، بچنے کی کوئی امید نہیں۔"

غم کا ایک طوفان میرے اوپر سے گزر گیا۔ میں نے مسافروں کے ہجوم میں اپنے لیے جوں توں جگہ بنالی۔ مگر سامنے بیٹھا ہوا وہ بڑی توند والا نیتا بے حد کھٹک رہا تھا، ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔ دوسرا جو ابھی ابھی اپا جی کے گروپ میں شامل ہو گیا تھا۔ بڑی بھیانک نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے اپا جی کے بے ہوش ہونے کی خبر صبح کے اخبار میں پڑھی تھی اور ان دونوں کو فون پر اطلاع دی گئی تھی۔ حالانکہ ان کا اپا جی سے دور دور تک کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اسٹیشن پر اترتے ہی انھیں لے جانے کے لیے گاڑی آنے والی تھی۔ اسی وقت پھر ایک بار بیوی کے جملے کانوں میں گونج اٹھے "کیا کرو گے تم وہاں جا کر؟ کون پوچھتا پھرے گا تمھیں؟"

ان کا ہاتھ بٹانے والے گروپ کے لوگ... نیتا کرتا رہتا ادھر ادھر سے ڈھیرے بھاری ہو رہا تھا اور محسوس ہو رہا تھا کہ آج کی اس شب بیداری کو بھی میں برداشت نہیں کر سکوں گا۔

صبح ہو گئی اور گاڑی اسٹیشن پر پہنچنے سے قبل ہی کسی نے بتایا کہ اپا جی چل بسے مجھے ایسا لگا کہ ساری دنیا ایک نقطے پر آکر رک گئی ہو اور چاروں طرف سے آنے والی بھانت بھانت کی آوازیں،

ڈوب گئی ہیں۔ ہمارے خاندان کا ایک روشن چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔ ان کے آخری درشن کے لیے ہزاروں لوگ اپنے اترے ہوئے چہرے لیے ان کے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے۔

دونوں نیتا آگے چلے گئے۔ انھیں لینے کے لیے وقت مقررہ پر گاڑی پہنچ چکی تھی۔ مجھے گاڑی جلدی نہ مل سکی۔ اپا جی کے دونوں بیٹے میری نظروں کے سامنے کھڑے دکھائی دیتے تھے۔ نہ جانے وہ مجھے دیکھتے ہی کیا کہہ اٹھیں گے؛ وہ ادھ کھلی کلیاں ایک ایک کرکے سبھی میری نظروں کے سامنے آتے اور پھر غائب ہو جاتے۔

اپا جی کے گھر کے سامنے ہزاروں لوگ جمع تھے۔ پولیس اور ان کے ساتھ کام کرنے والے دوسرے لیڈر اور ان کے گروپ کے سارے آدمی۔ کندھے سے کندھا چھلتا تھا۔ میں نے اپنے لیے راستہ بنا لیا۔ مگر جب گھر میں قدم رکھا تو بہت سارے لوگوں نے مجھے آگھیرا؛

"تمھارا اپا جی سے کیا رشتہ ہے؟ کون لگتے تھے وہ تمھارے؟ کہاں رہتے ہو تم؟"

ان بے تکے سوالات کی بھرمار سے میں بھنّا گیا۔ آخر کار میں گھر میں داخل ہو گیا۔ اندر جانے کی خوشی ضرور تھی مگر دوسرے لمحے محسوس ہوا جیسے میری روح کوئی دھیرے دھیرے قبض کر رہا ہو۔ دیوان خانے میں گیتا کا پاٹھ ہو رہا تھا۔ لوگ ہلکے قدموں سے آ رہے تھے، کچھ جا رہے تھے۔ ان آنے جانے والوں میں اکثر نیتا، یا اخبار کے ایڈیٹر، فوٹو گرافر آخری سفر کی تفصیلات حاصل کرنے والے نامہ نگار تھے۔ اس کے بعد آخری درشن کے لیے ان کی لاش کو سامنے کی طرف لاکر رکھ دیا گیا۔

اپا جی کے آخری درشن کر لیے اور میں نے ان کی راہ چھوڑ کر ایک الگ راستہ اختیار کر لیا۔ میں نے سوچا تھا ماں جی، اپا جی کا سر اپنے زانو پر رکھے بین کر رہی ہوں گی۔ بھو زار و قطار رو رہی ہو گی اور دونوں بچے .... لیکن یہ سب کچھ کہاں تھا؟ اپا جی اکیلے ہی، ایک اکیلے ... میں ان سے اور قریب ہو گیا۔ اپا جی کا ایک شاگرد ان کے سرہانے بیٹھا تھا۔ ان کی جگہ سنبھالنے والا نیا نیتا دھیرے دھیرے پاٹھ کر رہا تھا اور مالا جپ رہا تھا۔ ان کے چاروں اور جتنے بھی چہرے تھے، سارے کے سارے نئے تھے اور بالکل اجنبی! اور جن کا اپا جی سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ میں نے لمحہ بھر کے لیے اپنا سر جھکایا اور پیچھے کی جانب مڑ گیا۔ زینہ طے کر کے دالان کا راستہ لیا۔ دالان میں اپا جی کے سوتیلے بھائی سے مڈبھیڑ ہوئی۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا:

"کب آئے؟"

"ابھی ابھی آرہا ہوں"

"اور تم؟"

"کل ہی صبح کی گاڑی سے"

"اور ماں جی؟"

انھوں نے دیوگھر (پوجاکاکرہ) کی طرف اشارہ کیا۔ میں پوجاگھر کی جانب مڑگیا۔ سوتیلے بھائی، مگر کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ یہ دونوں سوتیلے بھائی ہوں گے۔ کبھی ایک نے دوسرے کی شہرت کا فائدہ نہیں اٹھایا۔ دونوں ہی اپنے اپنے کاموں میں مگن۔ دیوگھر کے کونے میں اپا جی کی بہو اپنی بیٹی کو سینے سے لگائے خاموش نظروں سے دیوگھر کا جائزہ لے رہی تھی۔ میں نے اس کے پیر چھوئے، اس نے میری طرف بالکل نہیں دیکھا اور پہچاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ وہ اپنے ہی غم میں ڈوب گئی تھی۔ خاموش نظروں سے خلاء میں گھور رہی تھی۔ غم کا اتھاہ سمندر! اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ ساری کائنات یکایک بدل گئی ہے۔ ماں جی جلدی لگائے دیوگھر کی جانب آرہی تھیں۔ انھوں نے اپا جی کے لیے سب کچھ برداشت کرلیا تھا۔ جدائی، بھوک، طرح طرح کی افواہیں ذمہ داریاں اور نہ جانے کیا کیا۔ البتہ انھوں نے اپا جی کو سب کچھ دے دیا۔ کبھی سکھ ان کی جھولی میں ڈال دیے اور خود ساری عمر اپا جی کا پیچھا کرتی رہیں۔ ان کے پیچھے دوڑتی رہیں۔ اور رنے کے بعد اپنے شوہر کی لاش کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رونے کا موقع بھی میسر نہیں ہوا۔ وہ ایک بڑے نیتا کی پتنی تھیں اس لیے وہ سب سے الگ ایک کونے میں ماتم کر رہی تھیں۔ درمیانی دالان میں دونوں بیٹے سسکتے ہوئے چہرے کر ٹپ ٹپ آنسو بہار ہے تھے۔ سارے رشتہ دار اندر کی جانب جمع ہوکر اپا جی کی موت پر آنسو بہار ہے تھے۔

اور باہر لوگوں کا ہجوم بڑھ رہا تھا۔ ماتم کرنے والوں کی صفیں کھچی جاتی تھیں۔ ان کا ہر دل عزیز نیتا آج ان سے جدا ہوگیا تھا۔ انھوں نے لاش کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ پھولوں اور آنسوؤں کا نذرانہ دیا جا رہا تھا۔ جنتا کی سیوا کے لیے جس نے اپنا ایک ایک عضو ضائع کر دیا تھا۔ آج بالکل ہی ختم ہو جانے کے بعد ان کی لاش پر بھی ان کی بیوی اور بچوں اور رشتہ داروں کا کوئی حق نہیں تھا۔ میں نے باہر کی جانب نظریں دوڑائیں اور مجھے محسوس ہوا جیسے اپا جی بہت سالوں پہلے ہم سے دور جا چکے تھے۔ ان کی بیوی ان کے لیے کب کی مر چکی تھی۔ سارے رشتے ناطے ٹوٹے ہوئے۔ ایک طویل عرصہ گذر چکا تھا۔

پھر ہم ان کے لیے ایک الگ طریقہ سے، ایک خاص سلیقے سے کیوں ماتم کرتے پھریں؟ کیوں اپنے غموں کا اظہار کرتے پھریں؟ اپا جی کی لاش کو اٹھایا گیا۔ لوگ دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہے تھے۔ اور میرے دل کی گہرائیوں کے اندر کوئی بین کر رہا تھا، دھیرے دھیرے آنسو بہلا رہا تھا۔ ماتم کر رہا تھا!!!

(بشکریہ "کتاب" لکھنؤ)

جامِ نو

نادر کاکوروی

۱۸۵۷ء ــــــــ ۱۹۱۲ء

شیخ نادر علی نادر۔ کاکوری (ضلع لکھنؤ) کی مردم خیز سرزمین میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں کے ایک معزز اور علم دوست خاندان "عباسی" سے ان کا تعلق تھا۔ اعزا اور متعلقین میں بہت سے افراد اور شخصیتیں آج بھی ہندوستان اور پاکستان میں موجود ہیں۔ اس زمانے میں اردو شعرا کے جو تذکرے اور تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں نادر کا نام ضرور ملتا ہے اور انھوں نے جس نوعیت کی شاعری کی ہے، اس کی تعریفیں بھی کی گئی ہیں۔ مگر جہاں تک ان کے ابتدائی حالات اور تعلیم و تربیت کا سوال ہے اس کے بارے میں کہیں سے بھی خاطر خواہ معلومات نہیں حاصل ہوتی ہے۔

نادر کا کلام دیکھنے کے بعد آسانی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ اُردو اور فارسی میں بہت اچھی لیاقت رکھتے تھے شعر گوئی کا سلیقہ تھا۔ روایت اور تقلید کے مقابلے میں جدت طرازی اور تنوع کی طرف زیادہ مائل تھے۔ انصاف پسندی اور حب الوطنی ان کی سیرت کا ایک نمایاں جزو تھی۔

انگریزی سے بھی اس حد تک واقف تھے کہ اس زبان کی شاعری ان کے رموز اور محاسن تک ان کی نگاہ پہنچ جاتی تھی۔ اس کی خوبیوں اور لطافتوں سے لطف اٹھا کر پھر انھیں افکار و تاثرات کو بڑی بے ساختگی اور دل کشی کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل کر دیتے تھے۔

اُردو سے ان کو عشق تھا، حالی اور آزاد کی بتائی ہوئی باتوں پر انھوں نے بڑی سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ دھیان دیا، جو راہ ان بزرگوں نے دکھائی تھی اور چاہتے تھے کہ ان کے ہم عصر اور آنے والی نسلیں ان پر گامزن ہوں۔ نادر اس وقت کے ان ذی حوصلہ اور جرارت مند لوگوں میں سے تھے جو بڑے اعتماد اور استقلال کے ساتھ اُس راستے پر چلے اور جلد ہی کامیابی کی منزلوں تک جا پہنچے۔

ٹے نی سن۔ بائرن اور ٹامس مور (خصوصیت کے ساتھ) ان کے پسندیدہ شاعروں میں سے تھے۔ مور کی مشہور اور آخری طویل نظم "لائٹ آف دی حرم" کا منظوم ترجمہ "مثنوی لالہ رخ" نادر کی شاعرانہ مہارت کا ایک مسلم ثبوت ہے۔ ان شعرا کی اور بھی متعدد نظموں کے انھوں نے بڑے کامیاب اور جان دار

ترجمے کئے ہیں۔ انگریزی زبان کے مستند شعرا کا انداز فکر اور طرز سخن ان کو اتنا مرغوب تھا کہ اُن کی بعض طبع زاد نظموں پر بھی اخذ و ترجمے کا شبہ ہونے لگتا ہے۔

دل گداز، مخزن، خدنگ نظر، الناظر، زمانہ اور ادیب یہ اُس زمانے کے اردو کے مشہور و مقبول رسالوں میں تھے۔ ان سب میں نادر کا کلام بڑے اہتمام سے چھپتا تھا اور اسے ہر صاحب علم اور با ذوق لطف و شوق کے ساتھ پڑھتا تھا۔ علامہ اقبال، مرزا رسوا، مولانا شرر، عزیز مرزا اور صفیر کاکوروی جیسے مفکر، مبصر ادیب اور سخن پرور، نادر کے بڑے ہی مدّاح معترف اور قدر دانوں میں تھے۔

وہ معدودے چند بزرگ جن کی بدولت اردو شاعری، جدید طرز کے خیالات و افکار اور انداز و اسلوب سے آشنا اور مالامال ہوئی، اس میں نادر کی کوششوں اور کاوشوں کا بھی کچھ کم یا معمولی دخل اور حصہ نہیں رہا ہے۔

۴۵ سال کی مختصر مدتِ حیات میں بھی نادر کے آخری ایام زندگی حزن و ملال میں بسر ہوئے جس کا اظہار کہیں کہیں ان کے اشعار میں ہو گیا ہے۔ کلام کا مجموعہ "جذباتِ نادر" دو حصوں میں (حصہ اول سنہ اشاعت نامعلوم، حصہ دوم مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۰ء) ان کی زندگی میں چھپا تھا۔ پھر اسے مکمل صورت میں اردو اکیڈمی سندھ کراچی، نے بڑے اہتمام اور خوش نمائی کے ساتھ ۱۹۶۱ء میں شائع کیا ہے۔

انتخاب

نوا سنجی کو کیا کچھ بلبلیں اس باغ میں کم تھیں	مجھے تکلیف دی ناحق چمن پیرائے عالم نے

نظم۔

مرحومہ کی یاد میں

LRISH MELODIES

رات کے پچھلے پہر روتی ہیں جب چشم نجوم	الفتِ دیرینہ کی وادی میں اٹھاتا ہوں میں
اور اس وادی میں مرحومہ جو یاد آتی ہو تم	محو ہو جاتا ہوں کچھ ایسا مزا پاتا ہوں میں

وہ مکاں، وہ قصر، وہ تم، وہ تمھاری حسرتیں	وہ گلے، وہ عذر وہ گزری ہوئی دلچسپیاں
دیر تک کرتا ہوں میں یاد، آہ اُن ایام کو	ہائے وہ راتیں کہاں، وہ دن کہاں، وہ تم کہاں

س سکوت، اس محویت میں پھر یہ آتا ہے خیال
روحیں منڈلاتی ہیں گرہوج فضائے عرش پر

ور چھپ کر آتی ہیں اس خاکدانِ عشق میں
تاکہ دیرینہ علایق دیکھ لیں پھر اک نظر

شاید آجائے تمھاری روح بھی اور یہ کہے
کیا بتاؤں جنت الماویٰ میں میں کیسی رہی

اس جدائی میں رہا، میرا تمھارا ایک حال
تم یہاں روتے رہے اور میں وہاں روتی رہی

پھر سراپا شوق ہو کر وہ غزل گاتا ہوں میں
تم جو تنہائی میں چپکے چپکے گاتی تھیں کبھی

گونج کر جب نغمہ ٹکراتا ہے تو کہتا ہوں میں
یہ تمھاری روحِ مضطر آتی ہے گاتی ہوئی

یہ لب و لہجہ وہی ہے یہ سُریلا پن وہی
لیکن اب اس میں تو کچھ کچھ ضعف کا انداز ہے

اور پھر کچھ سوچ کر پہچان کر کہتا ہوں میں
یہ وہی آواز ہے، بے شک وہی آواز ہے

گھنٹا نہیں بجے گا

(ROSE HARTUK THORPE)

اک ہونے والا دولہا، اک نازنین منگیتر
اک ہونے والی بیوہ، اک مرنے والا شوہر

وہ سست نیم جاں سا گردن جھکائے اپنی
یہ غم زدہ بھیانک صورت بنائے اپنی

اُس پر تو حکم پھانسی کا ہوچکا تھا لیکن
بے موت مر رہی تھی یہ نازنین کم سن

دیوانہ وار بکتی نکلی سشن جج سے
"گھنٹے کو آج بجنا ہی چاہیے نہیں ہے"

یہ کہتی گھنٹا گھر کو دوڑی گئی وہ مضطر
اور دھم سے گر پڑی وہ گھڑیالی کے قدم پر

"او نیک، او مقدس گھڑیالی! تو بچا دے
اُس نوجوان مجرم کو اور مجھے جلا دے"

گھڑیالی نے یہ سن کر کانوں پہ ہاتھ رکھا
اور بولا، "یہ تو بیٹی مجھ سے نہ ہو سکے گا"

'پہلی صدا پہ گھنٹے کی آج شب کو پھانسی'
یہ حکم یاد آتے ہی وہ زمیں سے اٹھی

اور دل میں ٹھان کر اک منصوبہ بولی اچھا
یہ ہے تو آج کی شب گھنٹا نہیں بجے گا

بانگ درا یہ جب ہے موقوف جان اس کی
ان ہاتھوں سے پکڑ لوں گی میں زبان اس کی

اس خوف سے تڑپ کر اوپر لپک گئی وہ
اور گھنٹے کا پکڑ کر لٹکن لٹک گئی وہ

موت اور نجات کا وہ ناشاد منتظر تھا — گھنٹے کی پہلی ٹن کا جلاد منتظر تھا
لو ہل رہا ہے لیکن، اُس پر صدآفریں ہے — آج اُس میں اُس کی خونی آواز ہی نہیں ہے
گھڑیالی نے بقوّت ہرچند اُسے جھنجھوڑا — پھر کھینچا اور چھوڑا، پھر کھینچا اور چھوڑا
اور لگ گئیں نگاہیں سب کی کرامول پر — کیا حکم دے وہ دیکھیں گھنٹے کے اس خلل پر
اک بار ہاتھ اُس نے خاموشی سے اٹھایا! — اور لفظ "بس" کا لب پر وہ حاکمانہ لایا
اور گرتی پڑتی پہنچی خوش خوش وہ اُس جبل پر — جاتے ہی گر پڑی وہ پائے کرامول پر
سب سرگزشت اپنی رو رو کے کہہ سنائی — گھڑیالی کی خوشامد، مینار کی چڑھائی
وہ انگلیاں دکھائیں جو رستے کی رگڑ سے — چھل چھل گئی تھیں بالکل کٹ کٹ گئی تھیں جڑ سے
دیکھا کرامول نے یہ حالِ زار اس کا — اور رحم نے کیا دل بے اختیار اس کا
بولا کہ "جرم ثابت ہے گو ضرور اس کا — لیکن معاف کرتے ہیں ہم قصور اس کا

جا نیک بخت، شوہر زندہ ترا رہے گا
اور آج گھنٹا گھر کا، گھنٹا نہیں بجے گا"

"گزرے زمانے کی یاد"

THE LIGHT OF OTHER DAYS

اکثر شبِ تنہائی میں — کچھ دیر پہلے نیند سے
گزری ہوئی دلچسپیاں — بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمعِ زندگی — اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دلِ صد چاک پر

وہ بچپن اور وہ سادگی — وہ رونا وہ ہنسنا کبھی
پھر وہ جوانی کے مزے — وہ دل لگی وہ قہقہے
دل کا کنول جو روز و شب — رہتا شگفتہ تھا سو اب
اس کا یہ ابتر حال ہے — اک سبزۂ پامال ہے
روندا پڑا ہے خاک پر

(باقی صفحہ ۲ پر)

نئی مطبوعات

		صفحات		
تذکرہ	مرتبہ مالک رام	۵۴۲	ساہتیہ اکیڈمی نئی دہلی	۱۵/-
نذر ذاکر	مرتبہ مجلس ذاکر	۶۷۰	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۴۰/-
سوز حیات	یحییٰ بھائی جسدن والا	۳۰۸	" "	۱۲/۵۰
منشورات کیفی	مرتبہ گوپی چند نارنگ	۲۰۵	انجمن ترقی اردو دہلی	۶/-
صہبا	مسرور جہاں	۲۱۲	خاتون پبلشرز	۵/-
ہمسفر	چندن بھارتی	۲۰۸	چندر بھون ٹونک	۲/۲۵
دیوان شاکر ناجی	مرتبہ فضل الحق	۳۳۵	ادارہ صبح ادب دہلی	۷/-
کہانی میری زبانی میری	حفیظ عباسی		ادارہ اشاعت ادب	۴/۵۰
تذکرہ بے نظیر	تلخیص	عطا کاکوی	عظیم الشان بکڈپو	۱/۵۰
" مسرت افزا	"	"	" "	۳/-
وحشی	رضیہ بٹ		ادبی دنیا دہلی	۷/۵۰
خوفناک گھاٹی	مظہر الحق علوی		نسیم بکڈپو لکھنؤ	۲/۵۰
محبت نام ہے غم کا	عفت موہانی		" "	۵/۵۰
خزاں کے بعد	زبیدہ خاتون		" "	۵/۵۰
طوفان حوادث	پروین سرور		سامان پبلیکیشن لکھنؤ	۳/-
بمبئی رات کی بانہوں میں	خواجہ احمد عباس		پنجابی پستک بھنڈار	۴/۵۰
گفت گوئے	سردار جعفری		۲۰ کھیتان بھون بمبئی	۶/-
ماہنامہ صبح کا جواہر لال نمبر			انجمن ترقی اردو دہلی	۲/۰۵

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی

جائزے

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

غزل انسائکلوپیڈیا

مرتبہ ذکی کاکوروی

صفحات ۳۰۲، سائز ۳۰ × ۲۰ / ۱۶

سنہ اشاعت ۱۹۶۸ء

قیمت ڈی لکس لائبریری اڈیشن، ۶ روپے،

عام اڈیشن، ۵ روپے،

ملنے کا پتا: مرکز ادب اردو، انیس منزل ۱۳۷/۳، شاہ گنج، لکھنؤ

غزل اور اردو غزل گو شعرا کے بکثرت مجموعے شائع ہو چکے ہیں، پھر بھی نہ اس مقبول صنفِ سخن کی وسعت و گیرائی کا احاطہ ہو سکا ہے اور نہ اس کے ذخیروں اور سرمائے کا اندازہ۔ اس بحرِ ذخار سے آئے دن گوہر آب دار نکلتے رہتے ہیں۔ شناوری اور درِ مقصود کی حصول یابی کا یہ سلسلہ مدتوں سے چلا آرہا ہے اور رہتی دنیا تک جاری رہے گا۔

سالِ رواں میں جو بھی چھوٹے بڑے شعری انتخابات اب تک سامنے آئے ہیں ان میں ذکی کاکوروی صاحب کا یہ انتخاب کئی حیثیتوں سے ممتاز اور قابلِ لحاظ ہے۔ ملا وجہی سے لے کر اپنے آپ تک معلوم اور نامعلوم سب ملا کر ۹۶ ۳ شاعروں کا مختصر اور طویل انتخاب انھوں نے یک جا کر دیا ہے۔ پرانے شعرا کے مقابلے میں نئے اور دورِ حاضر کے شاعروں پر خصوصی توجہ برتی گئی ہے۔

بعض بعض شاعر تو ایسے ہیں جو بہتوں کے لیے بالکل ہی نئے اور غیر متعارف ہوں گے۔ تعارف اور سوانحِ حیات نہ لکھ کر ایسے نو وارِدوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے۔

انتخاب کی جمع و ترتیب کے بیان میں مرتب نے جو محنت کی ہے اس کا ذکر نامناسب نہیں کہا جا سکتا ہے مگر جہاں انھوں نے اس قسم کے کام کرنے والوں سے اپنے انتخاب کا موازنہ کیا ہے اور ان کی خامیوں یا کمیوں کے مقابلے میں اپنی خوبیوں اور بالغ نظری کی طرف اشارے کیے ہیں اس میں وہ اعتدال و توازن سے متجاوز کر گئے ہیں۔ پسندیدگی پر کوئی پابندی نہیں عاید کی جا سکتی ہے۔ مگر "الہامیات" کے تحت ریاض اور شکیل بدایونی کے جو شعر درج کیے گئے ہیں۔ ان پر حیرت ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ انتخاب ایک بہت ہی عریض و طویل دور پر مشتمل ہے اور ہر دور کے قریب قریب تمام معروف اور نمائندہ شاعروں کے اچھے اچھے شعر چن لیے گئے ہیں۔ کم وقت میں غزل کے بارے میں اس کتاب سے بہت ہی مفید اور پر لطف معلومات حاصل کی جا سکتی ہے۔ اور تغزل کی لطافتوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس زمانے کے بہت سے ایسے شعراء ہیں جن کی تاریخ ولادت بہت تھوڑی سی کوشش سے معلوم کر کے لکھی جا سکتی تھی۔ ص ۱۲۹ اور ص ۱۸۴ پر ایک ہی شعر جو اصل میں آرزو لکھنوی مرحوم کا ہے ساغر نظامی کے نام سے بھی درج ہو گیا ہے، اسی طرح بعض سنوں اور شعروں پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

کتاب بہت صاف ستھری چھپی ہے۔ نام رکھنے میں اتنے زیادہ حسن ظن سے کام نہ لیا جاتا تو کچھ حرج نہ ہوتا۔

رشید نعمانی

دکن میں ریختی کا ارتقا

مصنف: بدیع حسینی
صفحات: ۳۹۲
قیمت: چھ روپے
ناشر: انجمن ترقی اردو، حیدرآباد

بدیع حسینی نے بڑی محنت، تلاش اور پرکھ کے بعد اپنی تصنیف کو پیش کیا ہے۔ اس میں معلوماتی مواد کے ساتھ تنقیدی تجزیہ بھی ملتا ہے۔ مصنف نے لفظ ریختی کی تحقیق، اس کی ایجاد، موجد اور ریختی کے عناصر پر بحث کرتے ہوئے دکن میں ریختی کا تاریخی اور سماجی پس منظر پیش کیا ہے اور اسی کے ساتھ ریختی کی تہذیبی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ ریختی کے بیان میں چند ضروری اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً

غزل کی طرح ریختی کا بنیادی موضوع حسن و عشق ہے۔ ریختی میں بھی محبوب کی صنف متعین نہیں ہے۔ دکن میں غزل اور ریختی دونوں کا آغاز ساتھ ساتھ ہوا۔ دکن کی ریختی اور شمال کی ریختی میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ وغیرہ

لیکن غزل کی تعریف میں مصنف سے اختلاف کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:
ص ۱۳۴ "غزل کے معنی ہیں عورتوں سے باتیں کرنا" ہمارے نزدیک غزل کے معنی ہیں

عورتوں کی باتیں کرنا۔

مصنف نے مختلف تحریروں کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ ہاشمی بیجاپوری دکن کا پہلا شاعر ہے جس نے مستقل طور سے اس صنف کو اپنایا۔ رنگین اور انشا سے پہلے دکن میں ریختی کا رواج تھا۔ قلی اور وجہی کے علاوہ ان سے پہلے لطفی، ریختی گو شاعر گزرا ہے۔ یہ سلسلہ ٹوٹا نہیں اور رنگین کے ہم عصر محمد صدیق قیس حیدر آبادی کو "اردوئے بیگمات" کا شاعر کہا جاتا ہے۔ قیس نے ریختی میں بہت سے نئے الفاظ کا اضافہ کیا۔ مثلاً توتو، ٹھیکری، دھرن، فلانی وغیرہ۔ تنقید کے سلسلے میں عندلیب شادانی کے معیارِ ریختی پر گفتگو کی گئی ہے۔

آخر میں فرہنگ بھی شامل ہے جس سے ریختی کلام کے سمجھنے میں سہولت بہم پہنچتی ہے۔ مصنف نے معیاری ادبی رسائل کے علاوہ ۸۱ کتابوں، تذکروں اور ۲ مخطوطات کا مطالعہ کر کے اپنا مقالہ مرتب کیا تھا۔ جو کتابی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اس تصنیف کی جامعیت اور افادیت سے انکار ممکن نہیں۔

کتاب کا سرورق ادبی شان کو ظاہر کرتا ہے۔ کاغذ، لکھائی، چھپائی سب میں سلیقے کو دخل ہے اردو ادب کا باقاعدگی سے مطالعہ کرنے والے افراد اور لائبریریوں کو یہ کتاب ضرور حاصل کرنا چاہیے۔

سیفی پریمی،
۱۰ اپریل ۱۹۶۸ء

گلزارِ خلیل

مصنف : خلیل صمدانی
مرتب : طفیل احمد تابش بیکانیری ایم اے علیگ
موضوع : شعر و سخن
صفحات : ۱۹۲ ، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ۔ مجلد
قیمت : تین روپے
ملنے کا پتہ : آزاد منزل بیکانیر راجستھان

گلزارِ خلیل ایک ایسے شاعر کا مجموعۂ کلام ہے جن کو عام طور سے کم ہی لوگ جانتے ہیں۔ ان کا تعلقِ تلمذ جانشینِ داغ حضرت بیخود دہلوی مرحوم سے ہے۔ اسی لیے ان کے کلام میں فن اور زبان

کی چمک دکھائی دیتی ہے۔ موضوع تو جدت سے محروم ہے لیکن بعض اشعار بہت اچھے ہیں۔ عشقیہ غزلیں کم اور نعتیہ زیادہ ہیں لیکن ان میں خلوص بھی ہے اور اثر بھی اس لیے اہل ذوق خاص طور سے نعتیہ کلام کے شائق اسے پسند کریں گے۔

شروع میں مختلف اہل ادب کی تحریریں ہیں۔ جو شاعر اور اس کے فن پر سرسری نظر ڈالتی ہیں ان سے کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ کتابت طباعت بلکہ جلد بھی اچھی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاید بیکانیر میں اس سے بہتر کام کے مواقع میسر نہ آ سکے ہوں گے۔

ٹائٹل رنگین اور پرکشش ہے۔ کہنا پڑتا ہے کہ ظاہر میں حسن کی کمی کے باوجود باطنی حسن اس کتاب کا پرکشش ہے جو پڑھنے والوں کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ امید کرنی چاہیے کہ دوسرا ایڈیشن اس سے بہتر ہوگا۔

ناجور سامری

شاہکار۔ الہ آباد "ناولٹ نمبر"

(۱۳۴ بخشی بازار، الہ آباد)

خیر سے ان دنوں اردو میں بہت سارے ڈائجسٹ نکلنے لگے ہیں۔ ان میں بڑی آن بان ہوتی ہے، صوری خوب صورتی کے لحاظ سے انھیں یقیناً ترقی یافتہ زبانوں کے اہم رسالوں کے پہلو بہ پہلو رکھا جا سکتا ہے لیکن ان کی ادبی حیثیت کمزور ہی نہیں خاصی کمزور ہے۔ اس کے قطعی برعکس شاہکار جو ہندستان میں غالباً اردو کا قدیم ترین ڈائجسٹ ہے۔ اپنی سادگی کے باوجود بے انتہا جاذبیت رکھتا ہے جس میں اردو کے اہلِ ذوق اس کے صفحات کی "بے رنگی" اور سادگی میں بھی اپنی تسکین کا سامان ڈھونڈ لیتے ہیں بلا شمار علم کے ساتھ ساتھ شاہکار کبھی کبھی خصوصی نمبر بھی قارئین کی نذر کرتا ہے۔ چنانچہ پچھلے دنوں اس کا فراق نمبر شایع ہو کر خاصی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ فراق نمبر کے بعد حال ہی میں شاہکار کا ایک اور ضخیم نمبر نکلا ہے۔ یہ ہے ناولٹ نمبر۔

اس نمبر میں چار جانے پہچانے ادیبوں کا ایک ایک ناول شامل کیا گیا ہے۔ شروع میں ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک طویل مقالہ بھی ہے جس میں مختصر افسانہ، ناول اور ناولٹ کا حدود اربعہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کافی پڑھے لکھے آدمی ہیں، ان کا مطالعہ بھی وسیع ہے اور ماں میں سوجھ بوجھ

بھی خامی ہے لیکن صاف بینی جو ایک نقاد کی اہم ترین خصوصیت ہے، اب تک ان کے ہاتھ نہ آپائی، نتیجۃً ان کے اکثر مضامین ممتاز حسین کی طرح شرح کے طالب ہوتے ہیں۔ ان سے توقع تو یہ تھی کہ جس طرح مختصر افسانہ اور ناول کا فرق واضح کیا ہے اسی طرح ناول اور ناولٹ کا فرق بھی واضح کرتے۔ مگر اس سلسلہ میں مایوسی کے علاوہ ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔

ناولٹ کے انتخاب میں شاہکار کے ایڈیٹر محمود واحد سہزنے خوش ذوقی کا ثبوت دیا ہے۔ چاروں ہی فن پارے بے حد جاندار ہیں،

سب سے پہلے شوکت صدیقی کا ناولٹ 'کمین گاہ' سامنے آتا ہے۔ اس کے ناول 'خدا کی بستی' کی طرح یہ کہانی بھی جرائم کی دنیا سے تعلق ہے۔ اس کا خاص کردار رام لی ہے، جسے حالات نے ایک نسلا نے کا 'دادا' بنا دیا ہے۔ شوکت صدیقی نے بڑی چابک دستی کے ساتھ اس کردار کے ارتقائی مدارج واضح کیے ہیں۔ وہ ان سب منزلوں سے گزرتا ہے جو ایک دادا کے لیے ضروری ہیں۔ لیکن رام لی بنیادی طور پر انسان ہے، اور یہ انسانیت ابتدا سے لے کر انتہا تک اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے، اور جب بھی موقع ملتا ہے، اس کی شخصیت پر چھا جاتی ہے۔ شوکت صدیقی کے فن کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنی کہانیوں میں سماج اور فرد، ماحول اور انسان کے اٹوٹ رشتوں کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے،

دوسرا ناولٹ آغا بابر نیین کا "داغ تہہ داماں" ہے۔ یہ ایک اعلیٰ درجے کی "کال گرل" کی کہانی ہے، جو باننا رومال ہونے کے باوجود ایک ماں بھی ہے۔ اور پورے ناولٹ میں یہ ماں، کال گرل کے بطن سے بار بار اٹھتی ہے' ہمارے سامنے آتی ہے اپنی ساری رنگینیوں، دلکشیوں، محرومیوں اور مسرتوں کے ساتھ اور پھر زندگی کی شاہراہ سے ہنستے کھیلتے یوں گذر جاتی ہے جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ رہا ہو لیکن مرتے مرتے قاری کے ذہن کو ایک سوالیہ نشان دے جاتی ہے، یہ دوسری بات ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ اس سوالیہ نشان پر نظر ڈالنے کی ہمت ہم میں نہ ہوا

جیلانی بانو کا 'کیمیائے دل' اور جمیلہ ہاشمی کا 'آتش رفتہ' دونوں ہی اپنے اپنے مصنفوں کے مخصوص اسٹائل کی نمائندگی کرتے ہیں، رومانی کیفیت، محرومیت پسندی، اور الف لیلوی انداز' ماضی اور حال کی کہانی جسے سسکیاں لے لے کر لکھا گیا ہے۔ اور اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے، کہ قارئین بھی پڑھتے ہوئے سسکیاں لینے پر مجبور ہو جائیں۔

کیمیائے دل حیدر آباد کے ماحول کی نمائندگی کرتا ہے اور آتش رفتہ میں پنجاب کا دیہی ماحول ہمارے سامنے آتا ہے۔

ان لوگوں کے لیے جو جیلانی بانو اور جمیلہ ہاشمی کے اسالیب پسند کرتے ہیں، یہ دونوں ہی ناولٹ مطالعے کی چیز ہیں کیونکہ ان دونوں کہانی نگاروں نے اپنے اسالیب اور انداز یا یوں کہا جائے کہ اپنے مجموعی رنگ کا ان میں بھرپور اظہار کیا ہے۔

۳۶۸ صفحات کے اس ضخیم نمبر کی قیمت صرف تین۳ روپے ہے جو بہت مناسب ہے۔

(ڈاکٹر) اجمل اجملی

ادبی خبریں

صدسالہ جشنِ غالب کی جھلکیاں

نئی دہلی۔ مرزا غالب کا صدسالہ جشن منانے کے لیے وزیرِ اعظم کی صدارت میں کل ہند پیمانہ کی جو کمیٹی بنائی گئی ہے اس کے زیرِ اہتمام غالب کی تمام تخلیقات کے تنقیدی اڈیشن شایع کیے جائیں گے، مرزا کی زندگی پر ایک دستاویزی فلم تیار ہوگی اور اس موقعہ پر ایک اعلیٰ پیمانہ کے مشاعرہ کا بندوبست بھی کیا جائے گا۔ دہلی انتظامیہ نے عظیم شاعر کی یادگار کے طور پر ایک ہال اور ایک میوزیم بنانے کے لیے آراضی کا ایک وسیع قطعہ کمیٹی کی تحویل میں دے دیا ہے۔ یو۔پی حکومت سے بھی کہا گیا ہے کہ وہ آگرہ کے اس مکان کو حاصل کرلے جہاں غالب کی ولادت ہوئی تھی۔ اسی طرح سے اس مکان کو حاصل کرنے کی جہاں مرزا نے اپنی زندگی کا خاصا حصہ گزارا تھا، درخواست دہلی انتظامیہ سے کی گئی ہے۔ ان دونوں مکانوں کو قومی یادگار میں بدل دیا جائے گا۔ سرکاری پریس نوٹ کے مطابق کمیٹی نے مختلف یونیورسٹیوں کو لکھا ہے کہ وہ اپنے یہاں "غالب شعبہ" قائم کرکے اس عظیم شاعر کی زندگی اور فن پر تحقیقی کام کا آغاز کریں۔ (قومی آواز)

اُردو مرہٹی ڈکشنری

بمبئی۔ ۱۷ مئی سینٹ زیویر کالج کے شعبۂ اردو فارسی اور اسلامی کلچر کے انچارج پروفیسر نظام الدین گوریکر نے اُردو حروفِ تہجی کو مراٹھی میں ترجمہ کرنے کا ایک پروگرام بنایا ہے۔ ترجمہ کی تکمیل کے بعد آپ اردو مراٹھی ڈکشنری کی ترتیب کا کام شروع کریں گے یہ ڈکشنری مہاراشٹر اسٹیٹ بورڈ فار لٹریچر اینڈ کلچر کی طرف سے شایع کی جائے گی۔

برطانیہ میں اُردو کتب کی اشاعت

حال ہی میں یہاں ایک اشاعتی ادارہ نے اردو کی ابتدائی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے اور اب بازار میں کچھ کتابیں فروخت ہو رہی ہیں۔ جن کتابوں کی اشاعت عمل میں آئی ہے ان میں اردو کا قاعدہ، اردو کی پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی، پانچویں، چھٹی، ساتویں اور آٹھویں کتاب قابلِ ذکر ہے۔ ان کے علاوہ عوام کے لیے اُردو

خط و کتابت، بھی شایع ہو چکی ہے۔ ان کتابوں کی اشاعت سے اس ملک میں آئے ہوئے اردو داں بچے اپنی مادری زبان کی تعلیم بآسانی حاصل کر سکیں گے۔ کیونکہ یہ کتابیں ہندوستان و پاکستان کی مروجہ ابتدائی کتابوں کی طرز پر تحریر کی گئی ہیں۔

ریڈیو شیفیلڈ سے پہلا اردو پروگرام

ریڈیو شیفیلڈ کی ہوم سروس نے ہفتہ وار اردو پروگرام ۱۸ رمئی سے شروع کر دیا ہے۔ اب یہ پروگرام ہر سنیچر کی شام کو ساڑھے چھ سے ساڑھے چھ بجے تک سنا جا سکے گا۔ ۱۸ رمئی کے افتتاحی پروگرام میں شیفیلڈ کے لارڈ میئر اور پاکستانی ہائی کمشنر دہلوی صاحب کے پیغامات نشر کئے گئے۔ اس کے ساتھ اس اردو پروگرام کے مقاصد کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ بعد ازاں دو فلمی گیت پیش کئے گئے اور اخیر میں خبریں سنائی گئیں۔

آئندہ ہفتہ دوسرے پروگرام میں مس ممتاز بٹ کا انٹرویو نشر ہوگا جس میں نسلی تعلقات پر روشنی ڈالی جائے گی۔ یہ پروگرام ۱۰۶ء۸ میٹر پر نشر ہو رہا ہے

فاروق دیوانہ کا انتقال

علی گڑھ۔ یہ خبر نہایت رنج سے سنی جائے گی کہ ۱۳ رمئی کو گورکھپور میں مجنوں گورکھپوری کے والد جناب فاروق دیوانہ کا انتقال ہو گیا۔ فالج کے حملہ کے باعث عرصہ سے علیل تھے۔ ریاضی کے علاوہ عربی فارسی اور اردو ادب پر گہری نگاہ تھی۔ مولانا محمد علی جوہر کے اخبار ہمدرد میں کام کرنے کے علاوہ ایم اے او کالج میں ریاضی کے استاد بھی رہ چکے تھے۔

مظفر شاہ صاحب بھی چل بسے

۲۹ رجون کی صبح کو اردو کے نوجوان ادیب اور صحافی اچانک اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بیماری دل کی۔ مرحوم پبلکشن ڈویژن میں گزیٹڈ آفیسر تھے۔ ایک عرصہ تک ریڈیو میں کام کیا اس کے بعد آج کل ایڈیٹوریل اسٹاف میں شریک رہے۔ کچھ دنوں کے لیے امریکا بھی گئے تھے۔ بہت سلجھے ہوئے۔ مرنجاں مرنج اور شریف آدمی تھے۔ کل ۴۵ سال کی عمر تھی ان کے گھر والوں، عزیزوں، دوستوں کو اس اچانک موت سے جتنا بھی صدمہ پہنچا ہو کم ہے۔
خدا مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان کے عزیزوں کو صبر کی توفیق عطا ہو۔ آمین!

گلستانِ گوہر کا انعامی تحریری مقابلہ

"گلستانِ گوہر" نے ایک تحریری مقابلہ کا اعلان کیا ہے۔ ہر اردو نواز دوست بلا امتیاز مذہب و ملت اس مقابلے میں حصہ لے سکتا ہے۔ پہلا انعام بیس روپے کی کتابیں۔ دوسرا: پندرہ روپے کی کتابیں۔ تیسرا: دس روپے کی کتابیں۔

انعامات گلستانِ گوہر کی سالانہ تقریب میں تقسیم کیے جائیں گے۔ مضامین روانہ کرنے کی آخری تاریخ پندرہ اگست ۶۸ء ہے۔

عنوانات یہ ہیں:-

(۱) عرش آواز دیتا ہے۔

(۲) یہ کس کی مسجد ٹوٹی ہے مندر یہ کس کا گرا ہے۔

(۳) بھنڈی بازار کا ناکہ۔ (مزاحیہ)

(۴) سفید شیطان (طنزیہ)

مضامین اس پتہ پر روانہ کیے جائیں گے:-

گلستانِ گوہر تحریری مقابلہ

۳۹ ربلیویڈیر روڈ، قادر ملّا ہاؤس۔ مجگاؤں۔ بمبئی ۱۰

اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ ...... سے آپ کی مدت خریداری ختم ہو جاتی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ آپ کتاب نما کی سرپرستی جاری رکھیں گے اور مبلغ ۲ روپے زر چندہ منی آرڈر ۱۵ جولائی تک بھیج دیں گے تاکہ یہ سلسلہ قائم رہے۔

آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملی تو ہم سمجھیں گے کہ کتاب نما آپ کی سرپرستی سے محروم ہو گیا مجبوراً پرچہ بند کر دیا جائے گا

منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیے گا۔ آپ کا خریداری نمبر ــــ ہے۔

(منیجر)

KITAB NUMA
JAMIANAGAR NEW DELHI.25

قاعدہ

یَسَّرْنَا الْقُرْآن

یہ قاعدہ مکتبہ جامعہ نے تعلیمی اصولوں کے پیشِ نظر نئی ترتیب کے ساتھ نئے سرے سے مرتب کیا ہے۔ غیر ضروری چیزیں کم کی گئی ہیں سبقوں اور مشقوں میں مفید اضافے کیے گئے ہیں۔

ہر سبق کے شروع میں پڑھانے والوں کے لیے آسان اور مختصر ہدایتیں دی گئی ہیں جن کی مدد سے معمولی اردو جاننے والے والدین بھی اپنے بچوں کو آسانی کے ساتھ بہت کم مدت میں قرآن مجید پڑھا سکتے ہیں۔

ان خوبیوں کی وجہ سے اس قاعدے کی افادیت بازار میں ملنے والے عام قاعدوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔

سفید گلیز کاغذ .... آفسٹ کی چھپائی

پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے [illegible] پریس دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے
جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا

9(8)

ماہنامہ

کتاب

اگست ۱۹۶۸ء

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

ماہنامہ **پیامِ تعلیم** نئی دہلی

بچوں کا پُرانا ساتھی ہے۔

۱۹۲۶ء سے نکل رہا ہے۔

یہ اُن کے مضمونوں، مزیدار کہانیوں اور نظموں کے ذریعے

شہریت کے آداب سکھاتا ہے۔

تہذیب و اخلاق کی اعلیٰ قدروں سے مانوس کرتا ہے۔

وقت کے تقاضوں کے مطابق نت نئی معلومات فراہم کرتا ہے۔

نئے انتظام میں آفسٹ پر چھپتا ہے۔

باتصویر ہے۔

سالانہ قیمت [illegible] روپے ہے۔

سالنامہ اور خاص نمبر بھی اسی میں شامل ہیں۔

مکتبہ [illegible]

شاخ اردو بازار دہلی — شاخ پرنسس بلڈنگ بمبئی

مینجنگ ایڈیٹر: غلام ربانی تاباں
مدیر مسئول: مجیب احمد خاں

اگست ۱۹۶۸ء
جلد ۹ شمارہ ۸
سالانہ چندہ دو روپے
فی پرچہ بیس پیسے

اشاریہ:

معاصر "قومی آواز" لکھنؤ کے حوالے سے "ہماری زبان" علی گڑھ کے تازہ ترین شمارے میں یہ خبر پڑھی:

"حکومتِ نیپال نے اردو کو نصاب تعلیم میں شامل کر لیا ہے"

اس موقع پر بے ساختہ ہمیں کسی پرانے شاعر کے اس بہت مشہور شعر کی صداقت کا ایک بار پھر قائل ہو جانا پڑا، ع

عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا
وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا

غریب اردو پر، جو اپنے وطن سے نکالی جا رہی ہے، ایک ایسی حکومت کی نظرِ التفات جو "سیکولر" نہیں ہے، 'ہندو' کہلاتی ہے، ایک معجزہ نہیں تو کرامت ضرور ہے۔

شاہ مہندر کی حکومت کا یہ اقدام جس نے اپنی رعایا کے ایک فی صدی سے بھی کم اقلیت کی زبان اور کلچر کا اتنا خیال رکھا، لائقِ صد تحسین ہے تو وہاں کے اردو دوستوں کی مساعی بھی کچھ کم قابلِ تقلید نہیں کہ انھوں نے صحیح خطوط پر اپنے مطالبات مرتب کیے اور ان کی مقبولیت کا یقین دلایا اور حکومت سے انھیں تسلیم کرا لیا۔

اس چھوٹے سے ملک کے ایک معمولی سے اقدام میں اگر دیکھا جائے تو ہمارے لیے بہت سے سبق پوشیدہ ہیں۔ ہمارے یہاں جہاں تک مطالبہ کرنے والوں کا تعلق ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک وہ صرف گفتار کے غازی ہیں۔ بڑی بڑی کانفرنسیں کرتے ہیں۔ بڑی بڑی قراردادیں پاس کرتے ہیں اور بڑے بڑے وفود کی صورت میں بڑے بڑے لوگوں سے ملتے ہیں۔ اور وہاں سے جھوٹی تسلیوں پر مطمئن ہو کر واپس چلے آتے ہیں۔

جہاں تک اس مطالبے کے ماننے والوں کا تعلق ہے وہ بھی بڑے بڑے وعدوں کے کھلونے دیکر بہلانے کے فن میں کافی مہارت رکھتے ہیں۔ کون سا بڑے سے بڑا رہنما بشمول وزرائے اعظم اور وزیر تعلیم، ایسا ہے جس نے اردو کی بیچارگی پر آنسو نہ بہائے ہوں اور کون سا وہ وعدہ ہے جو اردو کی بقا اور ترقی کے لیے کیا گیا ہو اور شرمندۂ تکمیل ہوا ہو؟

ارباب وطن نے اردو کو مٹانے کے لیے کیا کیا نہیں کیا اور کیا کچھ نہیں کر رہے ہیں ابھی تک آندھرا پردیش میں اردو پر دست شفقت پھیرا جا رہا تھا۔ اب خبریں آ رہی ہیں کہ وہاں بھی اردو کو مٹانے کی کوششیں شروع ہو گئی ہیں۔

مگر اردو کی سخت جانی بھی اپنی جگہ پر ہے۔ وہ مرنے کے لیے کسی طرح تیار نہیں۔ مرے گی نہیں زندہ رہے گی لیکن اپنے بے عمل ہمدردوں کے رویہ کے باعث سسک سسک کر جیے گی!

اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ .... سے آپ کی مدت خریداری ختم ہو جاتی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ آپ کتاب نما کی سرپرستی جاری رکھیں گے اور مبلغ دو روپے زر چندہ منی آرڈر ۱۵ر اگست تک بھیج دیں گے تاکہ یہ سلسلہ قائم رہے۔

آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملی تو ہم سمجھیں گے کہ کتاب نما آپ کی سرپرستی سے محروم ہو گیا، مجبوراً پرچہ بند کر دیا جائے گا۔

منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیے گا

آپ کا خریداری نمبر ہے ــــــ (مینیجر)

نیاز فتحپوری

چالیس (۴۰) کا عدد

دُنیا میں کوئی قوم یا مذہب ایسا نہیں جس میں چالیس (۴۰) کے عدد کو خاص اہمیت حاصل نہ ہو۔ مثلاً مرنے کے بعد چہلم (چالیسواں) کی رسم، ریاضت و عبادت میں چلّہ کشی یعنی چالیس دن کا اعتکاف، سورۂ احقاف میں اربعین (۴۰ سال) کو پختگی عمر کا زمانہ ظاہر کرنا۔

یہودیوں کے مذہبی لٹریچر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عدد ان کے یہاں بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بنی اسرائیل چالیس سال تک خانماں برباد پھرا کیے۔ ایلیا نبی کو چالیس دن تک کوؤں نے غذا پہنچائی۔ طوفانِ نوحؑ بھی چالیس دن تک قائم رہا اور مصر قدیم میں بھی لاش کی مومیائی کے لیے چالیس دن مقرر تھے۔

انگلستان کے عہدِ وسطیٰ میں قتل انسان کے جرمانہ کی ادائیگی کے چالیس دن مقرر تھے۔ جنگ کے دوران فریقین کو آرام لینے کے لیے بھی چالیس دن کا وقفہ ملتا تھا۔ دار العلوم کے التوا کے بعد ممبر پارلیمنٹ کو جو مہلت ملتی تھی وہ بھی چالیس دن کی ہوتی تھی۔

چالیس کی اہمیت مسلمانوں اور یہودیوں کی طرح زردشتیوں، ہندوؤں اور عیسائیوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ سب سے پہلے توریت کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ طوفانِ نوحؑ چالیس دن تک قائم رہا اس کے بعد پہاڑ کی چوٹی نظر آئی۔

یعقوبؑ کی لاش کو حنوط کرنے کے لیے ۴۰ دن درکار ہوئے۔ موسیٰؑ چالیس دن تک پہاڑوں میں بھوکے پیاسے پھرتے رہے، چالیس چالیس دن کے روزے انھوں نے رکھے۔ یہودا کے چالیس سالہ گناہ کی یاد میں ایلیا چالیس دن تک داہنی کروٹ سے لیٹے رہے۔ گولیتھ نے اسرائیلی فوجوں کا چالیس دن مقابلہ کیا۔

اہلِ نینوا کو توبہ کے لیے ۴۰ دن کی مہلت دی گئی۔ بنی اسرائیل چالیس دن تک جنگلوں میں پھرتے رہے۔ اہلِ فلسطین نے چالیس سال تک بنی اسرائیل کو پریشان رکھا۔ سلیمانؑ، داؤدؑ، یوشعؑ نے ۴۰ سال تک حکومت کی۔ زردشت نے ۴۰ سال کے بعد تبلیغ شروع کی۔

پارسیوں میں، ۴۰ دن تک مسلسل ہور آمزدا کے اسمار کا ورد کیا جاتا ہے اور مذہبی رہنما بننے کے لیے بھی چالیس دن کی ریاضت ضروری ہے۔

ہندوؤں کے یہاں عورت کے ایام زچگی ۴۰ دن مقرر ہیں۔ ویدک طریق علاج میں کایا پلٹ کے لیے ۴۰ دن درکار ہوتے ہیں۔ عیسوی روایات میں بھی ۴۰ کا ذکر بہ کثرت پایا جاتا ہے۔ مسیح کی ولادت کے ۴۰ دن بعد حضرت مریمؑ نے مسیح کو معبد میں پیش کیا۔ مسیح نے چالیس دن کا روزہ رکھا مصلوب ہونے کے بعد چالیس گھنٹے مقید رہے۔ احیائے ثانی کے بعد چالیسویں دن آسمان پر لے جائے گئے۔

رسول مقبول حضرت محمدؐ کو چالیس سال کی عمر میں نبوت ملی۔ الغرض تمام اقوام عالم میں ۴۰ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن کیوں؟

ان تمام روایات سے یہ بات تو یقینی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ کسی زمانے میں پوری جماعت انسانی اکٹھا ایک ہی حصۂ زمین میں مقیم تھا اور اس کے تمام افراد ایک ہی سی ذہنیت رکھتے تھے۔ اور ان کے تاثرات بھی یکساں تھے۔ بعد میں جب وہ منتشر ہو کر مشرق و مغرب میں پھیلے تو اپنی بعض روایات کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ اس لیے اب اصل سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نسل انسانی کے افراد کس حصۂ زمین سے ادھر ادھر منتقل ہوئے اور ۴۰ کے عدد کو ان کی روائتی زندگی میں کیوں اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ وہ اسے کیوں نہیں بھولے۔

انسان سب سے پہلے کرۂ زمین کے کس حصہ میں رونما ہوا؟ اس کے متعلق ماہرین علم الانسان نے آخر کار متفقہ طور پر یہ تسلیم کر لیا کہ عہدِ قبل تاریخ میں انسان کا سب سے پہلا مسکن، وہ حصہ ہے جسے قطب کا منطقہ بارد کہتے ہیں۔ ہر چند یہ نظریہ بہت عجب سا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ برف سے ڈھکے ہوئے منجمد علاقہ میں کسی کا زندہ رہنا ممکن نہیں۔ لیکن علمار طبقات الارض کی جدید تحقیقات سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ اس منطقہ کا برفانی یا انجمادی دور کوئی مستقل چیز نہ تھی۔ معلوم نہیں کتنی بار یہ دور آیا اور گزر گیا۔ لیکن اس کا آخری برفانی دور مسیح سے ۴۰ ہزار اور بیس ہزار سال کے درمیان پایا جاتا تھا۔ لیکن اس عہد میں بھی صدیاں ایسی گزر جاتی تھیں کہ موسم گرما ہو جاتا تھا۔ اور یہ منطقہ آبادی کا اہل بن جاتا تھا۔

اس کا سب سے بڑا ثبوت اس منطقہ کے گرم ہونے کا یہ بھی ہے کہ وہاں کوئلے کی بڑی زبردست کانیں حال ہی میں دریافت ہوئی ہیں۔ بہر حال یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ چکا ہے کہ منطقہ

بارہ ہمیشہ برفانی نہیں رہا ہے اور اس پر گرمی کے دور بارہا گزر چکے ہیں۔ یہیں سب سے پہلے انسانی آبادی کا آغاز ہوا۔ اور بعد میں برفانی دور آنے کی وجہ سے وہ ادھر اُدھر منتقل ہوتی رہی۔ لیکن چالیس کے عدد سے اس کا کیا تعلق ہے اس کی داستان اور زیادہ دل چسپ ہے۔

اس سے غالباً ہر شخص واقف ہے کہ آفتاب کے طلوع و غروب کی جو صورت گرم ممالک میں پائی جاتی ہے وہ منطقۂ بارہ سے بالکل مختلف ہے۔ ۸۶½ خط عرض البلد پر (جو قطب شمالی کے نیچے سے گزرتا ہے) شب و روز کے ظہور کی کیفیت گردش زمین کی بنا پر یہ ہے کہ وہاں چوبیس دن کو تو بالکل تاریکی رہتی ہے، اس کے بعد چوبیس دن تک صبح صادق کی سی کیفیت رہتی ہے۔ پچیسویں دن آفتاب کا ایک گوشہ نظر آتا ہے اور چند منٹ میں غائب ہو جاتا ہے اس کے بعد پندرہ دن تک آفتاب تدریجاً زیادہ بلند ہو کر غائب ہوتا رہتا ہے اور سولہویں دن پورے چوبیس گھنٹوں تک نمودار رہتا ہے۔ اس کے بعد روشنی کا وقفہ کم ہوتے ہوتے سولہویں دن پھر تاریکی ہو جاتی ہے۔ لیکن جب آفتاب ایک بار پوری طرح نکل آتا ہے تو پھر چھ مہینے تک غروب نہیں ہوتا اور سروں پر چکر لگایا کرتا ہے۔ اس چھ ماہ کے طویل عرصہ کے بعد چوبیس دن ایسے گزرتے ہیں جیسے شفق پھولی ہو اور پھر چوبیس دن باری باری طلوع آفتاب اور طلوع شفق کے گزرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ آفتاب بالکل غائب ہو جاتا ہے اور ۶۸ دن کی طویل رات شروع ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس حصۂ زمین میں رات اتنی طویل ہو وہاں طلوع آفتاب کا انتظار کس بے صبری کے ساتھ کیا جاتا ہو گا اور کیا کیا خوشیاں رات کے ختم ہونے پر نہ منائی جاتی ہوں گی۔

جنھوں نے قدیم اقوام کی تہذیب کا، مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان سب میں آفتاب پرستی کا رواج تھا۔ اڈونس، اتیس، تموز، مردوک اور اندر سب سورج دیوتا ہی کے مختلف نام تھے۔ قدیم یونان و روم میں اتیس کا احیا ثانی یا ظہور ۲۵ دسمبر کو منایا جاتا تھا۔ یہی تاریخ بعد میں عیسائیوں نے مسیح کے دوبارہ جنم لینے کی اختیار کی۔

اب اس پچیس کا راز بھی سن لیجیے۔ وہ یہ ہے کہ قطب کے منطقہ میں (جیسا کہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں) آفتاب پچیسویں دن پوری طرح طلوع ہوتا ہے اور اس دن کی خوشی میں قدیم اقوام نوروز منایا کرتی تھیں۔

اب رہا سوال چالیس دن کی اہمیت کا سو اس کا حساب یہ بیٹھتا ہے کہ آفتاب اپنے

اولین طلوع کے بعد سولہ دن تو وہ یوں ہی عارضی طور پر نکلتا چھپتا رہتا تھا لیکن جب یہ زمانہ ختم ہو جاتا تھا تو اس کے پورے چوبیس دن کے بعد وہ حقیقی دن شروع ہوتا تھا جو ۶۵ دنوں تک قایم رہتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ (۱۶ + ۲۴) یعنی پورے چالیس دن کے انتظار کے بعد ان کا یوم عید شروع ہوتا تھا اور اس طرح سب سے پہلے قطب کے منطقہ بارد میں چالیس دن کی اہمیت شروع ہوئی اور جب بعد میں یہاں کی آبادی دنیا کے مختلف حصوں میں پہنچی تو وہ اس روایت کو بھی اپنے ساتھ لے گئی۔

چوں کہ حقیقی دن کے طلوع کے لیے انتظار کے پورے ۴۰ دن بڑی دشواری سے بسر ہوتے تھے اور یہ زمانہ غیر معمولی طویل محسوس ہوتا ہے۔ اس لیے بعد میں ہر صعب طویل زمانہ کے لیے چالیس دن کی اصطلاح قایم ہو گئی۔

(بشکریہ جرس علی گڑھ)

سرورؔ جہاں آبادی

فضائے برشگال

اٹھا وہ جھوم کے ساقی چمن میں ابرِ بہار — چٹک رہے ہیں شگوفے برس رہی ہے پھوار
سہی قدوں کا ہے جمگھٹ کنارِ آبِ رواں — کہ برج میں لبِ جمنا ہے گوپیوں کی قطار
ترانہ ریز ہے یوں شاخِ سرو پر قمری — کہ جیسے گاتی ہو مدھ بن میں کوئی سندر نار
کلی کلی نے نکالا ہے روپ یوں جیسے — کسی کے سینے پہ کم کم شباب کا ہو ابھار
حنائی پنجہ ہے یوں شاخ شاخ لالہ و گل — نئی دلہن کی ہوں جیسے ہتھیلیاں گلنار
ہے موتیوں کی لڑی یا قطار بگلوں کی — ہوا میں اُڑتے ہیں جگنو کہ چھوٹتے ہیں شرار
عجب نشاط ہے بادہ کشو چلو تو سہی — پیامِ عیش ہے لایا چمن میں ابرِ بہار
پلا شراب کہ ہیں مغتنم یہ دن ساقی — کہاں یہ سبزہ و گل، پھر کہاں یہ صحبتِ یار

بہار آئی شگفتہ ہو اے گلِ پنجاب
چہک چہک کہ بہار آئی بلبلِ پنجاب

ترانہ، لبِ شیریں نوا کے دن آئے — غزل سرا ہو کہ تیری صدا کے دن آئے
عروسِ نظم نے کاجل لگایا آنکھوں میں — فسونِ عشوہ و ناز و ادا کے دن آئے
ادھر بھی کوئی ایاغِ مئے سخن ساقی! — اٹھے وہ جھوم کے بادل گھٹا کے دن آئے
شباب جوش پہ آیا پری جمالوں کا — بڑھی نگاہ میں تمکیں حیا کے دن آئے
بتوں نے ہاتھوں میں مہندی لگائی ساون کی — شہید چونک اٹھے خوں بہا کے دن آئے
نسیم جھوم کے کہتی ہے منہ شگوفوں کا — مئے نشاطِ تبسم فزا کے دن آئے
چلو شراب کی بوتل کوئی بھرا لائیں — سرورؔ! دعوتِ آب و ہوا کے دن آئے
ترانہ سنج ہو اے بلبلِ ریاضِ سخن! — کہاں ہے تو؟ کہ چمن میں فضا کے دن آئے

ترے بغیر ہیں مرغانِ نغمہ زن خاموش
ترے بغیر ہے یاروں کی انجمن خاموش

(نوائے سرورؔ، مرتبہ ڈاکٹر حکم چند نیر، سائز ۱۸×۲۲/۸، صفحات ۱۹۲، قیمت ۶/، حوالہ صفحہ ۱۴)

چار نئی کتابیں

(مکتبہ جامعہ کو ان کتابوں کی سول ایجنسی حاصل ہے)

نذرِ ذاکر

مجلسِ نذرِ ذاکر کا مرتب کردہ مجموعہ مضامین جو صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی خدمت میں ان کی ۷۱ ویں سالگرہ پر پیش کیا گیا۔ بہترین سفید کاغذ اعلیٰ کتابت طباعت، خوشنما جلد اردو اڈیشن سائز ۱۸×۲۲ صفحات ۵۶۰ قیمت ۴/-

انگریزی " " " ۵۱۲ " ۴/-

اکبر

سائز ۱۸×۲۲ صفحات ۱۰۸

مصنف: لارنس بنین مترجم: رضیہ سجاد ظہیر

اس کتاب میں اکبر کو ایک انسان کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اکبر کی شخصیت تاریخی حقیقت کی روشنی میں نہایت سچائی اور غیر جانبداری کے ساتھ بیان کی گئی ہے جو اور کتابوں میں نہیں ملتی قیمت ۳/۵۰

پنڈت وشنو دگمبر

مصنف: وی آر اٹھاولے مترجم: ش۔ا۔ فدائی

موسیقی ہماری قومی تہذیب کا ایک اہم جزو سمجھی جاتی رہی ہے اور اس فن کی عظمت کو بحال رکھنے کی کوشش میں پنڈت وشنو دگمبر نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ قابل ستائش ہیں۔ اس کتاب میں بڑے اچھے انداز میں ان کی زندگی کے حالات پیش کیے گئے ہیں۔

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۷۲ قیمت ۲/۲۵

کبیر

مصنف: ڈاکٹر پارس ناتھ تیواری مترجم: ایم۔ کے۔ ورانی

کبیر کی تخلیقات کی طرح ان کی زندگی کے بارے میں بھی لوگوں کو پوری معلومات حاصل نہیں ہیں۔ ڈاکٹر تیواری نے گہرے مطالعے اور تحقیق کے بعد تاریخی شواہد اور مروجہ حکایات کی بنیاد پر آسان اور دلچسپ انداز میں یہ سوانح حیات پیش کی ہے جو قابل تعریف ہے۔

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۳۶ قیمت ۲/۵۰

یہ کتابیں مکتبہ جامعہ کے چاروں دفاتر سے مل سکتی ہیں

پرنامی پنتھ

ھندوستان کا ایک فرقہ

جو سولھویں صدی میں اسلام سے متاثر ہوا

صبح کا وقت تھا صحن میں دھوپ پھیل چکی تھی کہ ایک نوجوان شخص کمرے میں داخل ہوئے۔ چہرے پر ہنسی خوشی کے آثار تھے ہاتھ میں بھرے کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی ضخیم کتاب تھی انھوں نے کتاب کے بعض مقامات پڑھ کر سنائے۔ گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ پرنامی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ کتاب جس کے کچھ اقتباسات انھوں نے پیش کیے وہ ان کا خاص دھارمک گرنتھ (مذہبی کتاب) قلزم سروپ ہے۔

قلزم سروپ کی وجہ تسمیہ پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جس طرح بحر قلزم کو پار کرکے حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور اس کے لشکر سے نجات حاصل کی تھی ٹھیک اسی طرح اس قلزم کے کلام روپی دریا سے گزرنے پر انسان ان خباثتوں اور دجالوں سے نجات پا سکتا ہے جو آدمی کے دلوں میں بیٹھ کر اسے صحیح راستے سے بھٹکاتے رہتے ہیں۔ ان کا نام شیام بہاری ہے، انھوں نے قلزم سروپ کی کئی ایک ایسی چوپائیاں پڑھ کر سنائیں جس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ لوگ خدا کے رسول حضرت محمدؐ اور قرآن پر ایمان لائیں اور دینِ اسلام کو سچا دین سمجھیں اس کے بغیر نہ کوئی حقیقت کو پا سکتا ہے اور نہ اسے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

میرے لیے یہ ایک نیا انکشاف تھا کہ کبھی ہندو طبقے میں اس طرح کی تحریک اٹھی ہے اور ایسا کوئی مصلح اور ہادی اٹھا ہے جس نے لوگوں کو واضح انداز میں قرآن اور اسلام کی طرف دعوت دی ہو۔ میری دلچسپی بڑھتی گئی میں نے اپنے مہمان سے کہا کہ آپ باہر سے آئے ہیں کیوں نہ آپ یہیں ٹھہریے تاکہ اطمینان سے بات چیت ہو سکے۔ اس کے بعد ان سے بہت ہی دوستانہ فضا میں باتیں ہوئیں، ان کی زبانی پرنامی فرقے کی تاریخ معلوم ہوئی اس کا خلاصہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

"پرنامی" فرقے کے اصل بانی شری مہراج ٹھاکر تھے ان کے باپ کا نام کیسو ٹھاکر تھا، جو جام نگر (گجرات) کے رہنے والے تھے۔ شری مہراج ٹھاکر ۱۶۱۸ء میں جام نگر میں پیدا ہوئے ان کے گرو شری دیو چندر امرکوٹ (گجرات) میں ۱۵۸۱ء میں پیدا ہوئے، دیو چندر جی کو ۴۰ سال کی ریاضت کے بعد

"اپھراتیت" (حق) کا دیدار ہوا، انھوں نے غیبی اشارے پر پرمھ آتماؤں کو جنھیں پرمھ شی یا پرمھ سرشٹی یا عرش عظیم سے اتری ہوئی روحیں کہتے ہیں جگانے کا کام شروع کر دیا۔ اسی زمانہ میں جام نگر میں ان کی ملاقات مہراج ٹھاکر سے ہوئی انھیں حق کا دیدار یا حق کی معرفت بھی جام نگر میں ہی حاصل ہوئی تھی انھوں نے مہراج ٹھاکر کو دیکھتے ہی پہچان لیا کہ وہ عرش عظیم کی روحوں میں سے ہیں انھوں نے مہراج ٹھاکر کو یہ خدمت انجام دینے کے لیے کہا کہ وہ روحوں کو جگائیں یعنی ان کی غفلت کو دور کر کے انھیں عرش عظیم کی طرف متوجہ کریں تاکہ وہ جھوٹے خداؤں کو ترک کر کے پرمھ (خدائے برتر) کی طرف جھکیں، دیوچندر جی نے یہ بھی کہا کہ عرش عظیم کی روحیں (سعید روحیں) مسلمانوں میں بھی ملیں گی اور قرآن میں بھی۔ "پرم دھام" (عرش عظیم) کی باتیں درج ہیں۔

دیوچندر کے انتقال کے بعد مہراج ٹھاکر کا دور شروع ہوا۔ یہ ۱۶۵۸ء کا زمانہ ہے مہراج ٹھاکر "بھرمن" (سیاحت) کرتے ہوئے جام نگر سے دیپ بندر، پوربندر پہنچے پھر سورت گئے جب وہ سورت پہنچے تو وہ تمام روحیں جن کو انھوں نے جگایا تھا اور انھیں عرش عظیم سدھ دلائی (یاد دلائی) تھی اپنا گھربار چھوڑ کر ان کے ساتھ ہو گئیں، یہ وہ وقت تھا جب مہراج ٹھاکر کی باطنی نگاہ کھل چکی تھی اور بہت سی باتیں انھیں الہام ہو چکی تھیں ان کو چار کتابوں میں جمع کیا گیا جن کے نام یہ ہیں:

راس پرکاش کھٹ رتو کرجی میرتا کلس۔

سورت سے جب مہراج ٹھاکر جی میرتا کے مقام پر پہنچے تو وہاں راستہ میں اذان کی آواز سنی

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه اور اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰه کے

الفاظ ان کے کان میں پڑے تو وہ پکار اٹھے کہ توحید اور رسالت کی شہادت دینے والے (یعنی حضرت محمدؐ) تو عرش عظیم کی عظیم روح ہیں اور ہم روحوں کے لیے پیغام لائے ہیں، اس کے بعد انھوں نے قرآن کا مطالعہ کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ اس میں عرش عظیم سے اتری ہوئی باتیں ہی درج ہیں۔ اس کے بعد خود مہراج ٹھاکر پر جو الہام ہوا وہ بھی محمدؐ کے علم سے پُر تھا اس میں قرآن و حدیث کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مومنوں کو (پیروؤں کو) فانی دنیا کی طرف سے عرش عظیم کی طرف متوجہ کیا جائے اور ہندو مسلمانوں کے درمیان اتحاد پیدا کیا جائے اور انسانی سماج میں ایک سچے دین اسلام کو قائم کیا جائے۔ مہراج ٹھاکر نے اپنے دین کا اصل نام اسلام ہی بتایا۔ اس کو شری دیوچندر جی کے علم کے مطابق "نجانند سمپر دائے" بھی کہا گیا۔ نجانند سے مراد اسلام ہے، شری مہراج ٹھاکر کے ماننے والے آج "پرنامی" (یعنی پرم پرمھ کے پوجنے والے) کہلاتے ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خود مہراج ٹھاکر کے زمانے میں لاکھوں

ہندوان کے پیرو ہو گئے تھے۔ انھوں نے خود ایک جگہ کہا ہے " لاکھوں لوگ ہندوؤں کے ان کو کر نے دیا یقین ۔"

شری مہراج ٹھاکر نے اپنے زمانے کے حکمران اورنگ زیب کو عرش سے اتری ہوئی روح (یعنی سعید اور پاکیزہ) بتایا اور اورنگ زیب کے پاس اپنے بہت سے شاگردوں کو بھیجا اور ان کے ذریعے انھیں اسلام کی معرفت کا پیغام دیا تھا کر مہراج نے اپنے ہادی اور امام مہدی ہونے کا اعلان کیا مخالفتوں کی وجہ سے ان کی بات واضح انداز میں تفصیل کے ساتھ اورنگ زیب تک نہ پہنچ سکی۔

اس کے بعد انھوں نے اورنگ آباد کے راجہ بھوسنگھ کو دعوت دی وہ ان کا شاگرد ہو گیا، اب تک سیکڑوں مسلمان بھی مہراج ٹھاکر کے شاگرد ہو چکے تھے، اس کے بعد مندسور اجین (مدھیہ پردیش) ہوتے ہوئے بندیل کھنڈ کے علاقہ پنا میں پہنچے۔ یہ ۱۶۸۲ء کا آخری زمانہ تھا انھوں نے پنا کے راجہ چھتر سال کو دعوت دی راجہ چھتر سال مع اپنی رعایا کے ان کا پیرو ہو گیا یہاں پر بہت کچھ خدائی علم ان پر اترا جسے کئی کتابوں کی شکل میں جمع کیا گیا ان کی کل کتابیں چودہ ہوتی ہیں انھیں کے مجموعے کا نام قلزم سروپ ہے، پرنامی اسے الہامی کتاب کہتے ہیں۔

شری مہراج ٹھاکر اب شری پران ناتھ دروحوں کے خاوند کے نام سے پکارے جانے لگے، ان کی زندگی کے آخری گیارہ سال پنا ہی میں گزرے یہیں انھوں نے اپنے جسم فانی کو الوداع کہا، یہاں ان کی درگاہ پر سالانہ میلہ لگتا ہے، پرنامیوں کے مندر بھی مختلف مقامات پر پائے جاتے ہیں، ان مندروں میں مورت پوجا نہیں ہوتی، بلکہ ان میں قلزم سروپ پر پھول مالائیں چڑھاتے ہیں، قلزم سروپ کو سجدہ کرتے ہیں، قلزم سروپ کی پوجا کے وقت " ماتم منتر " کا جاپ کرتے ہیں اس منتر میں " اچھا ماتیت " (حق جس کا ایک روپ کرشن کو بھی مانا ہے) کی پہچان کرائی گئی ہے اور روحوں کے جگانے کا مہراج ٹھاکر نے سنکلپ (عہد) کیا ہے۔

صبح اور رات میں پرنامیوں کی ایک مجلس بیٹھتی ہے جس میں قلزم سروپ کا درس ہوتا ہے۔ قلزم میں خدا اور اس کی تجلیات کا جو مختلف روپوں میں ظاہر ہوئیں ذکر کیا گیا ہے، عقائد عبادات اور دین و شریعت کے باطنی پہلوؤں کی مخصوص انداز میں توضیح کی گئی ہے اور دین کے باطنی اور معنوی پہلو پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے۔

قلزم میں حضرت محمدؐ کی فضیلت سب سے بڑھ کر بتائی گئی ہے، قلزم کی چند چوپائیاں یہاں نقل کی جا رہی ہیں :

پاک نہ ہوئے ان پائیاں چاہیے عرش کا جل
نہائیے حق کے جمال میں تب ہوئیے مزمل

پاک ہو نان جمی آئے نا کوئی اور اُپائے
لیجیے راہ رسولؐ عشقے تب رسول دیں پہنچائے

(صفحہ ۱۲۹۷)

ترجمہ : اس زمین میں پاک ہونے کی اور کوئی تدبیر نہیں ہے محبت رسول کا راستہ اختیار کیجیے وہ مقصود تک پہنچا دیں گے۔

پاک پانی سے نہ ہوئے نا کوئی اور اُپائے
ہوئے پاک مدد توحید کی حقیں لکھ بھیجا بنائے

صفحہ ۱۲۹۱

یہ مغز کھولیا قرآن سنو ہندو یا مسلمان
جو اٹھو کھڑا ہوسی سادچیت صاحب تائے بزرگی دیت

صفحہ ۱۲۸۴

ترجمہ : قرآن نے یہ حقیقت واضح کردی ہے اے ہندو اور مسلم سنو! جو کوئی باخبر ہو (خدا کے آگے) کھڑا ہوگا صاحب (خدا) اسے بزرگی عطا کرے گا۔

اپنے پرنامی مہمان سے دیر تک گفتگو رہی ان کے نتیجہ میں تصوف اور ایک خاص طرح کے صوفیانہ خیالات ونظریات کا غلبہ نظر آیا

وہ قلزم سروپ اور مہاراج کی سوانح حیات دے گئے انھیں ہندی ترجمہ قرآن اسلام پروشیکا اور پوتر قرآن تحفۃً دیا گیا انھوں نے بڑی خوشی سے ان کتابوں کو لیا۔ اور مطالعہ کا وعدہ کیا انھوں نے کہا کہ اصل قرآن پڑھنے پر جس کے بعد ہی قلزم کے مطالعہ میں بھی مزہ آسکتا ہے۔

رخصت ہوتے وقت کہا کہ میں جلدی پھر آؤں گا، آپ لوگ ہمیشہ یاد رہیں گے، یہاں مجھے بہت آنند ملا اور کھل کر دل کی باتیں کہنے کا موقعہ ملا۔ رخصت ہوتے وقت چرن اسپرشس (قدم بوسی کے لیے جھکے لیکن میں نے انھیں اس سے روک دیا۔

(الجمعیتہ ہفتہ وار)

جامِ نو

عظمتُ اللہ خاں

۱۸۸۷ ــــــ ۱۹۲۷

دہلی میں پیدا ہوئے، نانہالی بزرگ شاہانِ مغلیہ کے "مقربانِ خاص" میں سے تھے، "خان" کا اعزاز اور خاندانی لقب مغل فرماں رواؤں کے دربار سے عطا ہوا تھا۔ دادھیالی سلسلے کے لوگوں نے جے پور اور الور کی ریاستوں میں معزز عہدوں پر رہ کر بڑی بڑی خدمتیں انجام دی تھیں۔ ریاست حیدرآباد میں بھی اس خاندان کے افراد نے اپنی علمی لیاقت، انتظامی صلاحیت اور مختلف کارگزاریوں کے سلسلے میں بڑا نام اور رسوخ پیدا کیا تھا۔ سرسالار جنگ اوّل سے لے کر سر رچرڈ ٹمپل (ریزیڈنٹ) تک ان لوگوں کے مدّاح اور قائل تھے۔

کلامِ مجید اور فارسی کی چند کتابیں گھر پر پڑھنے کے بعد کم سنی ہی میں عظمت اللہ خاں اپنے والد کے ساتھ حیدرآباد آگئے، مڈل تک ریزیڈنسی اسکول میں پڑھے پھر گورنمنٹ (مدرسۂ عالیہ؟) اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ اسی سال ان کے والد انتقال کر گئے۔ ہونہار طالب اور معزز عہدے دار کے فرزند ہونے کی بنا پر ریاست سے ان کو مزید تعلیم کے لیے وظیفہ مل گیا۔ اجمیر سے ایف۔ اے (انٹرمیجیٹ) اور پھر آنرز کے ساتھ بی۔ اے کیا۔

اردو فارسی کے علاوہ انگریزی زبان اور اس کے شعر و ادب سے عظمت اللہ خاں کو بڑا شغف تھا۔ نویں دسویں جماعت سے انھوں نے شیکسپیر، ٹے نی سن، بائرن اور ورڈز ورتھ کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ "ابو بن ادہم" کا منظوم ترجمہ اسی زمانے کی یادگار ہے، ایف اے اور بی اے تک پہنچتے پہنچتے وہ بلا تکلف انگریزی نثر و نظم میں اپنے خیالات کا برجستگی اور اعتماد کے ساتھ اظہار کرنے لگے تھے، اپنے لکھے ہوئے مضامین اور سانیٹ کی داد و تحسین، انھوں نے متعدد موقعوں پر اپنے انگریز پرنسپل اور وائس پرنسپل سے حاصل کی تھی۔ ان کے پرنسپل کہتے تھے کہ اس شخص کو تو یورپ میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ ہندوستان کی خوش قسمتی ہے کہ یہاں پیدا ہو گیا، ان کی دلی خواہش تھی کہ ان کو انگلستان جانے کا موقع ملے مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی بی اے کے بعد اور نوکری سے پہلے انھوں نے بقدر شوق و ضرورت ہندی اور سنسکرت بھی

پڑھ لی تھی۔

حیدرآباد میں پہلے وہ ایک اسکول میں ملازم ہوئے پھر مددگار ناظم تعلیمات ہوگئے، منصبی فرائض پورے کرلینے کے بعد وہ اپنا تمام وقت پڑھنے پڑھانے اور شعروادب کی خدمت میں صرف کرتے تھے۔ ادب اور سائنس کا شاید ہی کوئی ایسا موضوع یا مضمون رہا ہو جس کا انھوں نے مطالعہ نہ کیا ہو اور اس کے بارے میں اچھی خاصی معلومات نہ رکھتے رہے ہوں۔ صورت و سیرت کے لحاظ سے بھی عظمت اللہ خاں بڑے وجیہہ، شان دار اور باغ و بہار آدمی تھے۔

پنگل کا استعمال، غنائی شاعری کی طرف توجہ، گیتوں کو رواج دینے کی کوشش، آج کل کوئی نئی اور غیر معمولی بات نہیں ہے۔ مگر اب سے چالیس پینتالیس برس پہلے ایسی جرات مندی اور ترقی پسندی آسان نہ تھی۔ اس جرات و جسارت کی تہ میں دراصل ایک مخلصانہ جذبہ کارفرما تھا اور وہ جذبہ یہ تھا کہ اردو شاعری بھی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی شاعری سے کم یا پیچھے نہ رہے۔

مختصر یہ کہ روایات سے ہٹ کر جن لوگوں نے نئی راہیں تلاش کی تھی اور آج کے نئے شاعروں کے لیے زمین ہموار کر گئے ہیں ان میں عظمت اللہ خاں کے نام اور کام دونوں کو بعضوں کے خیال میں اوّلیت ورنہ اک فوقیت اور خصوصیت تو بہرحال حاصل ہے۔

نظموں کا مجموعہ "سریلے بول" ۱۹۴۲ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا تھا۔

انتخاب

برکھا رُت کا پہلا مینھ

آئے بادل کالے کالے جھومتے ہاتھی متوالے   اڈے پھیلے تلتے جھکتے
ایک اندھیری دے کر چھائے ڈیرے چار طرف ڈالے   پَون کے گھوڑے سہمے ٹھٹکے

بجلی چمکی انگاراسی آگ کی ناگن لہرائی   لہریا کاڑھا بیل بنائی
بھاپ کے دریا میں قدرت نے نور کی مچھلی تیرائی   ادھر کو ادھر تڑپی تڑپائی

نیلا امبر ہنستا سورج رنگ میں ڈوبے ہوئے بادل   کھُلی پھننگوں پر ہلکی دھوپ
دھوئی نہائی بسوڑی سُندر سر پہ سنہری سا آنچل   قدرت کا ایک سُہانا روپ

مرے حُسن کے لیے کیوں مرے؟

نہ بھلے کی تھی نہ برے کی تھی مجھے کچھ جہاں کی خبر نہ تھی
تمھیں عیش کا ہی جو دھیان تھا تمھیں میری چاہ اگر نہ تھی
مرے حُسن کے لیے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے

مری چاہ تھی بڑی قیمتی، میں غریب تھی پہ امیر تھی
تھے امیر تم، پہ نہ چاہ تھی، میں امیر تھی پہ فقیر تھی
مرے حسن کے لیے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے

تمھیں چاہ اور کی جب ہوئی، مری وہ بہشت تو جا چکی
مگر آرزو یہ ضرور تھی، تمھیں دیکھ لیتی کبھی کبھی
مرے حسن کے لیے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے

مرا پاش پاش یہ دل ہوا، مری چاہ کا وہ دیا بجھا
مرے دل کو تم نے یہ کیا کیا، نہیں اب بھی وہ کسی اور کا
مرے حسن کے لیے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے

مرے دل سے ہوگا یہ کب بھلا تمھیں دے سکوں کوئی بد دعا
وہ ہوا جو ماتھے پہ تھا لکھا، مرے دل سے آئے گی یہ صدا
مرے حسن کے لیے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے

مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا

مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا　　مرے جی کو یہ آگ لگا سی گئی
مجھے عیش یہاں کوئی پل نہ ملا　　مرے تن کو یہ آگ جلا سی گئی

مرے تایا کے پوتے تھے تم سبھی ہم رہے ایک جگہ پلے ایک ہی ساتھ
مرے باپ نے عمر، جو پائی تھی کم انھیں چھین کے لے گیا موت کا ہاتھ

تھے تو بالے ہی تم، پہ تھا تم کو بڑا مرادھیان، کسی کی مجال نہ تھی
مجھے ٹیڑھی نظر سے کبھی دیکھے ذرا مجھے کھیل میں بھی تو کیا نہ دُکھی

اسی بات کے گھر میں جو چرچے ہوئے سبھی کہتے تھے مجھ کو تمھاری دلھن
مجھے تم نے بھی اپنے لگا کے گلے کئی بار کہا "مری پیاری دُلھن"

تمھیں پڑھنے کو دور جو بھیجا گیا بڑے شوق سے خوب ہی کام کیا
کوئی تم نے دقیقہ اٹھا نہ رکھا بڑی محنتیں کیں، بڑا نام کیا

مرے تایا بڑے، تھے زمانہ شناس بڑے اونچے گھرانے میں ٹھہرا پیام
گیا ٹوٹ سا جی، گئی ٹوٹ وہ آس مری چاہ کا ہوگیا کام تمام

بڑی دھوم سے آئی تمھاری دلھن میں بھی کام میں بیاہ کے ایسی جُتی
کوئی اور تھی گو "میری پیاری دلھن" کہا سب نے بڑی ہے بہن کو خوشی

مرا ایک جگہ جو پیام لگا مرے دل سے تڑپ کے یہ نکلی دُعا
نہیں چاہ ہی دل میں تو بیاہ وہ کیا تو خدایا! یونہیں مجھے جگ سے اٹھا

مجھے جیتے جی پیت کا پھل یہ ملا مرے جی کو یہ آگ لگا ہی گئی
مجھے پیار کی ریت کا پھل یہ ملا مرے تن کو یہ آگ جلا ہی گئی

تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

تھے پڑوسی ہم، پہ یہ حال تھا　　کہ گھروں میں کھڑکی بنائی تھی
تھے عزیز ہم، یہ خیال تھا　　کوئی شے نہ ہم میں پرائی تھی

تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ لڑائیاں بھی کبھی کبھی　　کبھی روٹھنا کبھی من گئے
ابھی کُٹیاں، تو ملاپ ابھی　　ابھی چٹکیاں ابھی قہقہے

تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ تمھاری گڑیا کی شادیاں　　وہ مرا برات کا انتظام
مرا باجا ٹین کی سیٹیاں　　بڑا شور و غل بڑی دھوم دھام

تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

یونہیں کھیل کھیل میں جب کبھی　　کوئی دولھا بنتا دلھن کوئی
مری تم ہمیشہ بنیں بنی　　بہت اس پہ اڑتی تھی گو ہنسی

تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہمیں کیا خبر تھی بسنت کی　　گئے دن وہ اور پڑوس بھی
تھا پڑھائی سے نہ نچنت جی　　پڑی یادِ طفلی پہ اوس سی

تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کتب موصولہ (برائے تبصرہ)

تلاش و توازن	قمر رئیس	خوام پبلیکیشنز
ریت کے پھول	آدم نصرت	نقش کوکن پبلی کیشنز ٹرسٹ۔ بمبئی
شبینے	ابراحسنی۔ گنوری	
دیوانِ شاکر ناجی	مرتبہ ڈاکٹر فضل الحق	ادارہ صبح ادب دہلی
خطوط بہادر یار جنگ	″ مولوی نذیر احمد	ادبی ٹرسٹ حیدرآباد
یونین کانووکیشن ۱۹۶۷ء / ۱۹۶۸ء		علی گڑھ مسلم یونیورسٹی یونین

جائزے

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

رومہ
(ناول)

مصنف: مسرور جہاں
سنہ اشاعت ۱۹۶۷ء سائز $\frac{20 \times 30}{16}$
قیمت: ۴ روپے پچاس پیسے۔ صفحات ۲۵۵
ملنے کا پتہ: نسیم بک ڈپو لکھنؤ

'رومہ' نے اپنے معمر باپ اور کم عمر بہنوں کی خاطر معمولی ملازمت کی۔ ایک بزرگ رئیس، ایک کم سن بچّی اور ایک بگڑے ہوئے رئیس نادے کی زندگیوں کو تازگی بخشی۔ مگر اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی، جسے "غیر معمولی" کہا جا سکے۔ پھر بھی اُسے ایک عام لڑکی کہنا دشوار ہے۔ کیوں؟ یہ بات، ناول پڑھنے سے پتہ لگتی ہے۔

مسرور جہاں کا اندازِ بیان سلجھا ہوا اور رواں ہے۔ یہاں پلاٹ کی کوئی پیچیدگی نہیں ہے، زبان کا ابہام نہیں ہے۔ الفاظ کی گھن گرج بھی نہیں ہے اور نہ حادثات و واقعات کا طومار۔ غرضیکہ بلند آہنگی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ مگر لہجے کا دھیما پن اور حسنِ سادہ کی نمود، اپنی دل کشی رکھتے ہیں۔ اس ناول کو سیاسی اور سماجی مسائل سے بھی کوئی ایسا تعلق نہیں ہے تاہم اس میں وہ زندگی ملتی ہے جسے یقیناً "سچی" کہا جا سکتا ہے جس میں خیال آرائی کے طلسم کے بجائے حقیقت کی آئینہ داری ہے۔ زبان، اتنی آسان ہے ایک معمولی اردو داں بھی بخوبی لطف اٹھا سکتا ہے۔

عبداللہ ولی بخش قادری

مجبوری کا دوسرا نام کیا ہے؟

مصنف: مانک جی شاہانی
صفحات: ۱۱۲ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$
قیمت: دو روپے ناشر: سنسار پبلشنگ ہاؤس، موتی شاہ جین روڈ۔ بمبئی ۲۷

[illegible]

دل کی دھڑکن پر موت و زیست کا دار و مدار ہوتا ہے لیکن دماغ اُسے جینے کے طریقے بتاتا ہے بلکہ یوں کہیے کہ اُسے جانوروں کے زمرے سے الگ کر کے آدمی بناتا ہے۔ اگر دماغ نہ ہو تو آدمی اور ۔۔ سب برابر۔

لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ دماغ ملنے کے بعد وہ آدمی بن گیا لیکن اُسے کیسا دماغ ملا؟ اور وہ کیسا آدمی بنا؟ یہی سب تو دیکھنے کی بات ہے۔

ہندوستان کا دماغ 'بمبئی' ایک نہیں ہزاروں لاکھوں دماغوں کا مجموعہ ہے۔ اور وہاں کا ہر دماغ کچھ اس طرح نئے انداز سے سوچتا اور اس پر عمل کرتا ہے کہ بس کچھ نہ پوچھیے۔ بڑوں کی تو بڑی باتیں لیکن وہاں کا چھوٹا بھی کبھی کبھی ایسی دور کی کوڑی لاتا ہے کہ بڑوں بڑوں کا دماغ چل جائے۔

مانک جی شاپانی نے اپنی کتاب "مجبوری کا دوسرا نام کیا ہے" میں بمبئی کے مشہور ڈاکٹر" ناجائز شراب کشید کرنے والے" "طوائف" "فلم ایکٹریس" اور "بمبئی کے ٹھگوں" کے ایسے ہی اعلیٰ دماغوں کے کارناموں سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے جنھیں پڑھ کر ہی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور اگر خدا نہ کرے ان سے سابقہ ہی پڑ جائے تو نہ جانے کیا ہو جائے۔

شاپانی صاحب کی یہ طنزیہ کہانیاں جو سب کی سب صیغۂ متکلم کے ذریعے بیان کی گئی ہیں، سماج کے گھناؤنے سیاہ کارناموں اور مجرمانہ حرکتوں کی سچی داستانیں ہیں، جن پر مختلف انداز اور مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہ مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک آزمانے کے قائل ہیں، اور ہلکا سا اشارہ کر کے اُسے سمجھنے اور سنبھلنے کا موقع دینا ہی مناسب سمجھتے ہیں۔ یوں تو ان کا انداز بیان تلخ بھی ہے اور طنز سے بھرپور بھی لیکن کسی بھی حالت میں وہ سطحی نہیں ہے۔ اس لیے ان کی یہ طنزیہ کہانیاں اوروں سے یقیناً مختلف کہی جا سکتی ہیں جن میں ندرت بھی ہے اور سچائی بھی۔

خواجہ احمد عباس صاحب نے اپنے تعارف میں ٹھیک ہی فرمایا ہے کہ:

"..... ان کو پڑھ کر عام پڑھنے والوں کو تو مزا آئے گا ہی لیکن بمبئی والوں کو اس آئینے میں اپنے شہر کے اور اپنے خد و خال کا مضحکہ خیز اور عبرت انگیز عکس نظر آئے گا۔"

ریحان احمد عباسی

ادب اور جدید ذہن

از: دیویندر اسّر
صفحات: ۲۱۰ سائز ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت: چار روپے پچاس پیسے
سنہ اشاعت: ۱۹۶۸ء
ناشر: مکتبہ شاہراہ، دہلی ۶

جدید استدلالی ذہن کے بے شمار مسئلے ہیں۔ وہ ذرا سی بات کو شدت سے محسوس کرتا اور بڑھا چڑھا کر پیش کر دیتا ہے۔ وہ انفرادیت کا شیدائی اور فرد کے اختیارِ کلّی کا علمبردار ہے۔ وہ ایک ردّ عمل ہے اور ایک دوسرے ردِّ عمل کا پیش خیمہ بھی۔

"ادب اور جدید ذہن" میں بیٹس اور اینگری ینگ مین کی سرگرانی ہے، سارتر کی وجودیت اینٹی ہیرو، اینٹی تھیٹر کے تصورات، جوزف ہیلر اور آر ویل کے ناولوں اور تمثیلی قصوں کا تذکرہ ہے۔ ساتھ ہی وجودیت پر ولسن کی سخت نکتہ چینی کا عملی روپ "بی آنڈ دی آؤٹ سائڈر" کا بیان بھی ہے۔ فرد کو جس تحفظِ ذاتی کا خیال ہو چلا ہے اس کے مختلف مظاہر ہیں۔ نطشے کے اقوال بھی اور آلڈس ہکسلے کے جوابی ارشادات بھی اور ان کے ہمہ گیر اثرات بھی جن کا سلسلہ دراز ہوتے ہوتے اردو ادب تک آ پہونچا ہے۔ منٹو کے افسانے اور قرۃ العین کے "آگ کے دریا" سے مثالیں دی گئی ہیں جو درست نہیں۔ جدید ذہن کے سچے ترجمان اردو کی نئی شاعری اور جدید افسانے ہیں انھیں سے چند در چند اقتباسات دینے تھے۔

فرائڈ کے زیرِ اثر پروان چڑھنے والی نسلیں مرکھپ چکیں۔ آج فرائڈ کی آواز خود اس کے حلقوں میں صدا برخاست ہے۔ جدید ذہن کی سیماب وشی اور تلوّن مزاجی نے مارکس، ژونگ اور ایڈلر کو منزلوں پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ مفکروں کے درمیان اقدارِ حیات کی زبردست کشمکش ہے کوئی معیاری اقدار نہیں۔ اس لیے کہ اوپر کسی بالادست ہستی کا تصوّر نہیں۔ سارتر نے جھنجلا کر کہا تھا "کوئی خدا نہیں، کوئی ازلی گناہ نہیں ۔۔۔۔" ہکسلے اپنے ایک کردار مانڈجان سے کہلواتا ہے "میں خدا چاہتا ہوں ۔۔۔ میں ثواب چاہتا ہوں، میں گناہ چاہتا ہوں"۔

غرض دیویندر اسر کی یہ چھوٹی سی کتاب جو ایک ہلکا سا جائزہ ہے کوئی بھرپور تنقید نہیں۔ جدید ذہن کی مختلف پیچیدگیوں کو اپنے اندر لپیٹے ہوئے ہے۔ نظریات کی گوناگونی نے خود مصنف کے سکون کو ہلا کے رکھ دیا ہے اور نہ جانے کتنے دلِ دردآشنا گھل کے اپنی شخصیت کا حسن

کھو بیٹھے ہیں۔

الفاظ کا بے محل استعمال اور کلام کی بے ربطی بُری طرح کھٹکتی ہے۔ اس پہلو پر بھی نگاہ رہتی تو کتاب کی اثر آفرینی میں اضافہ ہوتا۔ اس خامی کے باوجود زیر نظر کتاب اپنے موضوع و مواد کے لحاظ سے اردو زبان میں ایک قابل قدر اضافہ ضرور ہے۔

امیر اللہ خاں شاہین
ریسرچ اسکالر دلی یونی ورسٹی دلی

ادبی و تہذیبی خبریں

نیپال میں اُردو
اب نیپال نے بھی اردو کو نصاب میں شامل کر لیا ہے۔ میٹریکولیشن کے نصاب میں اردو کی جو کتاب منظور ہوئی ہے اس کا نام "انتخاب نثر و نظم" ہے جس کے مولف ایس۔ ایس صالح ہیں۔ یہ کتاب ہندوستان میں ہی شائع ہوئی ہے۔

برطانیہ میں اردو اور ہندی پوسٹر
برمنگھم۔ مختلف تفریحوں اور تماشوں کا اہتمام کرنے والی ایک جماعت نے ہندوستانی اور پاکستانی باشندوں کو متوجہ کرنے کے لیے اب اردو۔ ہندی اور بنگالی زبانوں میں بھی پوسٹر چھاپنا شروع کر دیے ہیں تاکہ ہندوستانی اور پاکستانی باشندوں کو ان میں دل چسپی پیدا ہو اور وہ ان میں شرکت کے لیے کسی قسم کی جھجک نہ محسوس کریں۔

اُردو کتابوں پر انعام — میرا وارڈ
آل انڈیا میر اکاڈمی نے ۱۹۶۶ء کی حسب ذیل مطبوعات پر میر اوارڈ دیا ہے

محمد ابرار حسین فاروقی گوپاموی کی کتاب "ماثر دلاوری" پر ساڑھے سات سو روپے

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کی کتاب "دبستانِ دبیر" پر پانچ سو روپے

ڈاکٹر محمد اسلام کی کتاب جگر مرادآبادی "حیات اور شاعری" پر پانچ سو روپے

ڈاکٹر سعید العلیم نامی پرنسپل اورینٹل کالج بمبئی کی کتاب "ببلوگرافیا اردو ڈراما" جلد اول پر خصوصی انعام ڈھائی سو روپے۔

۱۹۶۷ء کی بہترین علمی، ادبی، تاریخی اور تنقیدی اردو کتب اور شعری مطبوعات پر میر ایوارڈ ساڑھے بارہ سو روپے پیش کیا جائے گا۔ ہر کتاب کی پانچ جلدیں ۱۵ر اکتوبر ۱۹۶۸ء تک جنرل سکریٹری آل انڈیا میر اکاڈمی، لاری ہاؤس، لکھنؤ کے پتے پر پہنچ جانی چاہئیں۔

اکاڈمی کی طرف سے ۶۷-۱۹۶۶ء کے لیے تین سو ساٹھ روپے کے چھے ادبی وظیفے

بھی جاری کیے گئے ہیں جو تصدق حسین ایڈوکیٹ لکھنؤ، کاشی رام چاولا لدھیانہ، ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ کلکتہ، شمیم کرہانی دہلی، جرم محمد آبادی کلکتہ، نذیر بنارسی وارانسی کو دیے گئے ہیں۔ سنہ ۶۹-۱۹۶۸ء کے لیے ایسے شاعروں اور ادیبوں کے نام بھیجے جا سکتے ہیں جنھوں نے اردو کی خدمت کی ہے اور جن کے قلم نے قومی یک جہتی کو تقویت پہنچائی ہے۔

آل انڈیا میر اکاڈمی، لکھنؤ		سکریٹری

۱۵ر جولائی سنہ ۱۹۶۸ء		نشر و اشاعت

اردو کے تعلق سے آندھرا پردیش میں ناانصافی کی جارہی ہے

حیدرآباد۔ ریاستی چیف منسٹر مسٹر کاسو برہمانند ریڈی سے اسمبلی چیمبر میں انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی جانب سے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ سابق رکن پارلیمان نے ملاقات کر کے انھیں ایک یادداشت حوالے کی اور بتایا کہ اردو کے ساتھ آندھرا پردیش میں ناانصافی کی جارہی ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے چیف منسٹر پر زور دیا کہ وائس چانسلرز اور چیف منسٹر کی کانفرنس میں جو قرارداد منظور کی گئی تھی اس پر عمل کیا جائے۔

عثمانیہ یونیورسٹی نے ان فیصلوں کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے یہ بھی بتایا کہ ریاست میں اردو کے ساتھ کی جانے والی ناانصافی اور اردو کو قانونی موقف دینے اور یونیورسٹی سطح پر اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے سلسلہ میں ایک نمایندہ وفد عنقریب منسٹر سے ملاقات کر کے انھیں صورت حال سے واقف کرائے گا۔ (سیاست)

ہندی کی ٹیلیفون ڈائرکٹریاں بیکار پڑی ہیں

لکھنؤ۔ ٹیلیفون کی ہندی ڈائرکٹریاں عوام میں زیادہ قبول نہیں ہوئی ہیں۔ پوسٹ ماسٹر جنرل نے بتایا کہ گزشتہ سال آٹھ ہزار ہندی کی کاپیاں چھاپی گئی تھیں۔ لیکن ان کی بہت کم مانگ ہوئی۔ ٹیلیفون ڈائرکٹریاں چھاپنے میں جو ہندی اور انگریزی میں سال میں دو مرتبہ چھاپی جاتی ہیں، ۹۰ ہزار روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے اگرچہ اشتہارات بھی کافی ملتے ہیں، لیکن اس کے باوجود نقصان ہوتا ہے مگر چونکہ ڈائرکٹریاں تجارتی اصول پر نہیں چھاپی جاتیں اس لیے اس نقصان کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

امسال بارہ ہزار ہندی کی ڈائریکٹریاں چھاپی گئی ہیں۔ اس میں حکومت اتر پردیش نے مختلف محکموں کے واسطے چار ہزار کاپیاں لی ہیں۔

بینائی بحال کرنے کا نیا طریقہ

آنکھوں سے متعلق تحقیقات کے ادارہ ماسکو نے قرنیہ (آنکھ کے ڈھیلے کا بیرونی پردہ) کے بجائے مصنوعی عدسے لگانے کے کئی تجربے کیے ہیں۔ سرجنوں کو ان چھوٹے عدسوں کی وضع اور سائز کا تعین کرنے کے لیے بڑے پیچیدہ حسابی سوال حل کرنے پڑتے ہیں۔ ایسے کئی آپریشن کیے گئے ہیں اور مریضوں کی بینائی بحال کی گئی ہے۔ ایسا پہلا آپریشن پروفیسر ایم۔ کراسنوف نے کیا ہے۔ (اے۔ پی۔ این)

ایکسرے کا نئی وضع کا آلہ

ماسکو کے انجینیری اور طبعیات کے اداروں نے ایکسرے تصاویر حاصل کرنے کا ایک نیا آلہ تیار کیا ہے۔ اس نئے آلے میں لاشعوری (ایکسرے) ٹرانسفارمر کے اسپارک چیمبر میں سے گذرتی ہیں اور اس چیمبر کی گیس کے ذرات کو برقاتی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایکسرے کے عام آلات سے جیسی تصاویر حاصل ہوتی ہیں ان سے کہیں زیادہ بہتر تصاویر حاصل ہوتی ہیں۔

ریڈیالوجسٹ اس آلہ کو مختلف طریقوں سے چلا کر اپنے حسب خواہش جیسی تصاویر چاہیں حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ آلہ اندھیرے میں ہی نہیں بلکہ نیم تاریک کمرہ میں بھی کام کر سکتا ہے۔ لیکن اس آلہ کا یہی ایک فایدہ نہیں ہے۔ ایکسرے آلہ پر کام کرنے والے' رونٹجن کے ۰،۵ کے مساوی اشعاعے ساڑھے چار گھنٹوں میں حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ آلہ اشعاع کو، ایک فی صد بھی گھٹا سکتا ہے۔ اس آلہ پر کام کرنے والوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔
(اے۔ پی۔ این)

امام بخاری کا مزار

از: سی گالوف

سمرقند سے بیس کلومیٹر دور کشلک (ازبک گاؤں کشلک کہلاتے ہیں) اسمٰعیل بخاری واقع ہے۔ اپنے ظاہری خدوخال میں یہ دوسرے ازبک دیہاتوں سے قطعاً مختلف نہیں۔ نئی سڑکوں کی سیدھی قطاریں ہیں جن کے کنارے آرام دہ مکانات ایستادہ ہیں۔ ہر جگہ بجلی کی روشنی، پانی کے پائپ، کلب، چائے خانے اور سینما گھر نظر آتے ہیں۔

لیکن کشلک اسمٰعیل بخاری کی شہرت ساری دُنیا کے مسلمانوں میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں عظیم محدث امام اسمٰعیل بخاری نے رحلت فرمائی تھی۔ یہیں ان کا روضہ ہے۔ اور ایک بڑی مسجد ہے۔ وسطِ ایشیا کی تمام جمہوریتوں سے زائرین کی کثیر تعداد اس عظیم اسلامی مفکر کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے یہاں آتی ہے۔ غیر ممالک سے مسلمان علمائے دین کے نمائندے بھی یہاں آچکے ہیں۔ شمالی لبنان کے مفتی، اور شام، پاکستان، مراکش، ہندوستان، تیونس، ٹوگو، مالی اور دوسرے ممالک سے مسلمانوں کے وفود یہاں آچکے ہیں۔

عظیم محدث امام اسمٰعیل بخاری نے صدیوں پہلے رحلت فرمائی تھی اور وقت نے ان کے روضے پر اپنے تباہ کن اثرات مرتب کیے۔ ۱۹۶۲ء میں وسطِ ایشیا اور قزاخستان کے مذہبی بورڈ نے یہ فیصلہ کیا کہ اس روضے کی مرمت کی جائے۔ اس وقت مرمت کا کام مکمل ہو چکا تھا اور ہم نے اس روضے کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔

یہ روضہ کئی عمارتوں پر مشتمل ہے جو اینٹوں سے بنی ہوئی ایک قوی الجثہ دیوار کے عقب میں ایستادہ ہیں۔ چنار کے چھ سایہ دار درختوں نے اس کشادہ ایوان پر سایہ کر رکھا ہے، جہاں معتقدین آرام کرتے ہیں۔ چاروں طرف پھولوں اور پھلوں کے درخت ہیں اور انگور کی بیلیں۔ مسجد "خانقاہ" ہے۔

اس کے عقب میں ایک سفید دیوار ہے۔ شیخ عباداللہ مقسوم بابا یا روف چھوٹا دروازہ کھول کر ہمیں صحن میں لے گئے جس کا فرش سیمنٹ سے بنایا گیا ہے۔ یہاں کی ہر چیز انتہائی سادہ اور تقریباً زاہدانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ صحن میں نہ تو پھول ہیں اور نہ ہی درخت۔

صحن کے وسط میں روضے کی عمارت ہے۔ مقبرہ نیچے سے اوپر تک سنگِ مرمر سے بنایا گیا ہے۔ ایک لوح پر جسے منارے کی شکل میں تراشا گیا ہے۔ ایک عبارت کندہ ہے جو اسمٰعیل بخاری کے اہم واقعات اور اسلام کی عظمت میں اضافے کے لیے ان کی سرگرمیوں کے متعلق معلومات فراہم کرتی ہے۔

زائرین زیارت خانے میں ایک دل کش جالی سے گذر کر داخل ہوتے ہیں جہاں وہ رسومِ عبادت انجام دینے سے پہلے آفتاب کی روشنی میں نہلاتے ہوئے روضے کو

دیکھتے ہیں۔ عبادت کرنے کے بعد سب ایوان میں داخل ہوتے ہیں جہاں روایتی ازبک اشیائے خورد و نوش چُنی ہوتی ہیں۔ کشتیوں میں انگور، میٹھی خوشبو والے خربوزے، شفتالو، چپٹے ازبک کیک اور مٹھائیاں رکھی ہوتی ہیں۔ انھیں چائے کے پیالے پیش کیے جاتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ ہی سنجیدہ و متین گفتگو کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ روضے کے شیخ جناب عباداللہ مقسوم اس عظیم محدث کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہیں جن کا نام ساری اسلامی دنیا میں روشن ہے۔ شیخ کہتے ہیں :

"اُن دنوں میں جب کہ اسمٰعیل بخاری مدرسے کے ایک طالب علم تھے انھیں اپنے علم کے باعث اور حدیث کے مطالعے میں دل چسپی کے باعث امتیازی مقام حاصل تھا۔ اس سلسلے میں ان کے والد ابو حسن اسمٰعیل کا بڑا حصّہ ہے جو بخارا کے ایک ممتاز مدرّس تھے۔ جب اسمٰعیل بخاری سولہ سال کے تھے تو انھوں نے حدیث پر وہ تمام کتابیں پڑھ لی تھیں، جو بخارا کے مصنفوں نے لکھی تھیں۔ لیکن ان کتابوں سے ان کی تسلی نہ ہوئی اور اپنے علم میں اضافہ کرنے کے لیے اُنھوں نے اس دور کے اسلامی ثقافت کے اہم مراکز کا سفر کیا۔ وہ بغداد، بصرہ، کوفہ، دمشق، قاہرہ، مکّہ، مدینہ اور دوسرے مقامات کو گئے۔ جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے کہ اس وقت اُنھوں نے ایک ہزار محدثوں سے تعلیم حاصل کی۔ ان کی عقل و دانش اور علم کا چرچا بہت سے اسلامی ممالک میں پھیل گیا۔ اُنھوں نے کئی کتابیں لکھیں جن میں سے سب سے اہم اور قابلِ قدر کتاب "صحیح بخاری" ہے۔ اس کتاب کو تمام اسلامی تعلیمی اداروں میں حدیث کی اہم نصابی کتاب قرار دیا گیا۔ اپنی زندگی کے آخری ایّام میں وہ بخارا میں رہتے تھے اور حدیث کی تعلیم دیتے تھے؛ مقامی ملّاؤں کی سازش کے زیرِ اثر ملک کے حکمراں نے اُنھیں مجبور کیا کہ وہ بخارا چھوڑ دیں۔ اس پر محمد اسمٰعیل سمرقند چلے گئے۔ لیکن راستے میں وہ بیمار ہو گئے۔ ۳۰ رمضان ۲۵۶ھ کو انھوں نے ہرتانگ کے گاؤں میں وفات پائی۔"

سوویت ازبکستان کے مسلمان اس عظیم اسلامی مفکّر کے مقبرے کی بڑی محنت کے ساتھ دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ہرتانگ کا نام بدل کر اسمٰعیل بخاری رکھا گیا۔ اس روضے کی مسجد میں ہمیشہ لوگوں کا انبوہِ کثیر نظر آتا ہے۔ اس مفکّر کی کتابیں مذہبی بورڈ کی زیرِ حفاظت ہیں۔ یہ کتابیں بخارا کے مدرسہ "میرِ عرب" میں نصابی کتابوں کے طور پر پڑھائی جاتی ہیں جہاں اسلام کے مستقبل کے علما کو تربیت دی جاتی ہے۔

تازہ ہندوستانی مطبوعات

صنف	کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
ادبی	نذر ذاکر	مرتبہ مجلس نذر ذاکر	۴۰/۰
"	مباحث	ڈاکٹر سید عبد اللہ	۱۵/۰
"	نشورات	برجموہن دتاتریہ کیفی	۷/۰
"	ایران صدیوں کے آئینے میں	ڈاکٹر امرت لال عشرت	۱۳/۰
"	ریت کے پھول	آدم نصرت	۲/۵۰
شعری	نہرونامہ	ساغر نظامی	۱۳/۰
"	غزال	کرشن موہن	۷/۰
شعری	دیوان شاکر ناجی	مرتبہ ڈاکٹر فضل الحق	/۰
"	دست گل کامل تین حصے		/۰
ناول	صہبا	نکہت عمر	/۰
"	حسین انزا	فاطمہ انیس	/۰
"	کٹھ پتلی	عارف مارہروی	/۰
"	محبت نام ہے غم کا	عفت موہانی	/۵۰
"	خزاں کے بعد	زبیدہ خاتون صدیقی	/۵۰
ادبی	داستانے چند	راز چاندپوری	/۰

پاکستانی مطبوعات

کتاب	مصنف	قیمت
انسان کامل	سید عبد الکریم	۱۲/۰
امام مالک رح	محمد ابو زہرہ	۱۵/۰
اصول فقہ اسلام	سر عبد الرحیم	۱۰/۰
اسلام کا نظریہ جنگ	مولانا ابو الکلام آزاد	۲/۲۵
انگلش اردو ڈکشنری	فیروز سنز	۲۴/۰
اردو کی عشقیہ شاعری	فراق گورکھپوری	۲/۲۵
اردو غزل کا ارتقار	عبد القادر سروری	۳/۵۰
ادب و آگہی	مجتبیٰ حسین	۸/۰
ارضی دیوتا	خلیل جبران	۲/۰
برگ خزاں	عبد العزیز خالد	۶/۵۰
برق و مقناطیس	پروفیسر حمید عسکری	۱۲/۰
بستان المحدثین	شاہ عبد العزیز محدث دہلوی	۶/۵۰
تفسیر حقانی کامل ۸ حصے	مولانا حقانی	۵۵/۰
تنقیدی نقوش	ڈاکٹر عبد القیوم	۴/۰
تاریخ عہد بنی امیہ	ابو الحسن علی بن الحسین	۶/۷۵
تاریخ اندلس	عبد القوی ضیاد	۱۲/۵۰
تاریخ ابن خلدون کامل	حکیم احمد حسین عثمانی	۲/۹۰
تاریخ جمالیات	مجنوں گورکھپوری	/۰
تین شاعر	ڈاکٹر زور	/۵۰
تخلیق کائنات	ابن حنیف	/۵۰
ثانوی مدارس میں استعاریوں کی تعلیم	یونیسکو	/۵۰
چہرے	شورش کاشمیری	/۵۰
چند علمائے جراثیم	ڈاکٹر پال ڈی کرائف	/۰
حیات امام احمد حنبل رح	محمد ابو زہرہ	۲/۰
حیات امام ابن قیم رح	عبد العظیم	۵/۰
حیات امام ابن حزم رح	محمد ابو زہرہ	/۰
حضرت امام ابو حنیفہ رح کی سیاسی زندگی	مناظر احسن گیلانی	۵/۰
حضرت ابوبکر رض اور فاروق اعظم رض	ڈاکٹر طہ حسین	/۵۰
حضرت عثمان رض اور حضرت علی رض	"	۸/۰
حضرت ابو ذر غفاری رض	مناظر احسن گیلانی	۵/۰
حیات مجدد	بدر الدین شیخ احمد	/۵۰
حیات حافظ رحمت خاں	سید الطاف علی بریلوی	۲/۰

مکتبہ جامعہ کی شائع کردہ ہندی کتابیں

سبق آموز کہانیاں، ڈرامے

- بونے کی کھیتی — حامد علی خاں — ۱/-
- پرم پیا — حبیب تنویر — ۶۲/-
- ٹیپو سلطان — 〃 — ۵۰/-
- چاندی کا چمچہ — 〃 — ۲۵/-
- چمپا کالال — حامد علی خاں — ۲۵/-
- چور لڑکا — عبدالغفار مدہولی — ۵۰/-
- سائنس کے پھول — عبدالواسع عصری — ۵۰/-
- کیمپ فائر کی نقلیں (اول) — عبدالغفار مدہولی — ۸۷/-
- 〃 〃 (دوم) — 〃 〃 — ۷۵/-
- گلستاں کی کہانیاں (مرتبہ) — محمد حفیظ الدین — ۵۰/-
- مولانا روم — 〃 〃 — ۵۰/-
- موسموں کا کھیل — مرزا فرحت اللہ بیگ — ۶۲/-

مذہب

(ان کتابوں کا صرف رسم الخط ہندی ہے۔ لیکن زبان آسان اردو استعمال کی گئی ہے۔)

- حضرت محمدؐ — الیاس احمد مجیبی — ۶۰/-
- ہمارے نبیؐ — سید طالب علی رضوی — ۳۰/-

معلومات

- ایورسٹ کی کہانی — پروفیسر آل احمد سرور — ۵۰/-
- امریکہ — ۵۰/-
- اپنا گھر — ۵۰/-
- بجلی کی کہانی — علی احمد خاں — ۵۰/-
- چیونٹی — بیگم قدسیہ زیدی — ۶۲/-
- دلّی — ۵۰/-
- سمندر کے کنارے — آصف فیضی — ۱/۲۵
- گاندھی بابا — بیگم قدسیہ زیدی — ۲/-
- مدھو مکھی — 〃 〃 — ۶۲/-
- منور محنت اور کام — ۵۰/-
- ہمارا راج — مدن موہن گپت — ۴۲/-

نظمیں۔ پہیلیاں

- ڈھول بھرے / ہیرے — اشوک بی۔ اے — ۳۰/-
- منور کی پہیلیاں — سید طالب علی رضوی — ۷۵/-

طریقہ تعلیم

- جامعہ ودھی — عبدالغفار مدہولی — ۲/۷۵
- کھیل دوارا شکشا اوّل، دوم — 〃 — ۳/-
- ہندی پڑھانے کا طریقہ — ۱/۷۵

ان ناولوں کو اپنی لائبریری کی زینت بنائیے

کتاب	مصنف	قیمت
گئودان	منشی پریم چند	۸/-
میدان عمل	" "	۶/۵۰
بیوہ	" "	۲/۷۵
سات سال	ملک راج آنند	۵/۲۵
ایک تھی انیتا	امرتیا پریتم۔ مترجمہ: ظفر ادیب	۳/۲۵
راہِ عمل	صالحہ عابد حسین	۷/۵۰
یادوں کے چراغ	" "	۸/-
عروس نیل	سلطانہ آصف فیضی	۳/۲۵
دَل دَل	بھبھانی بھٹاچاریہ۔ مترجمہ: رضیہ سجاد ظہیر	۴/۵۰
باپ بیٹے	ترگنیف۔ ترجمہ: انور عظیم	۵/-
ماں کی کھیتی	چنگیز اعتماددف۔ ترجمہ قرۃ العین حیدر	۲/-
یودوکیہ	ویرا پانووا ترجمہ: " "	۱/۷۵
آدمی کا مقدر	میخائیل شولوخوف۔ ترجمہ: " "	۱/-
شکستِ ناتمام	جان اسٹین بیک ترجمہ: زہرہ سیدین	۲/-
ڈنگو	آرفریمین۔ ترجمہ: قرۃ العین حیدر	۲/۲۵
رنگ محل	حمیدہ سلطان	۶/-
صفیہ	سلمیٰ محبوب	۴/-
کاندید	والتیر۔ ترجمہ: سجاد ظہیر	۲/-
سانچ کو آنچ	شوکت تھانوی	۳/۵۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

اردو بازار دہلی ۶ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

REGD No. D58 AUGUST 1968

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI 25

پرنٹر پبلشر سید احمد دہلوی نے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کیلئے جامعہ نگر دہلی سے شائع کیا

۹ (۹)

ماہنامہ

ستمبر ۱۹۶۸ء

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

ماہنامہ **پیامِ تعلیم** نئی دہلی

بچوں کا پرانا ساتھی ہے۔

۱۹۲۶ء سے نکل رہا ہے۔

یہ اپنے مضمونوں۔ مزیدار کہانیوں اور نظموں کے ذریعے

شہریت کے آداب سکھاتا ہے۔

تہذیب و اخلاق کی اعلیٰ قدروں سے مانوس کرتا ہے۔

وقت کے تقاضوں کے مطابق نت نئی معلومات فراہم کرتا ہے

نئے انتظام میں آفسٹ پر چھپتا ہے۔

باتصویر ہے۔

سالانہ قیمت چھ روپے ہے۔

سالنامہ اور خاص نمبر بھی اسی میں شامل ہیں۔

ماهنامہ
کتاب نما
نئی دہلی ۲۵

منیجنگ ایڈیٹر
غلام ربانی تاباںؔ
مدیر مسئول:
مجیب احمد خاں

ستمبر ۱۹۶۸ء
جلد ۹ شمارہ ۹
سالانہ چندہ دو روپے
فی پرچہ - بیس پیسے

اشاریہ

دہلی، اتر پردیش، بہار اور آندھرا پردیش میں اردو کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ مہاراشٹر کی ریاست اُردو کے معاملے میں بڑی فراخ دل واقع ہوئی ہے۔ یہاں سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری اُردو اسکول کی تعداد کسی ایک ریاست کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب وہاں بھی اس کے قتل کے سامان ہونے لگے ہیں۔

ہمارے اس خدشہ کی بنیاد معاصر ہندوستان بمبئی کے ۲ اگست ۱۹۶۸ء کے شمارے سے ہوتی ہے جس میں وضاحت کے ساتھ ایسے خدشات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

جی نہیں چاہتا کہ اس خبر کو من وعن درست سمجھ لیا جائے کہ انجمن اسلام بمبئی جیسا وقیع ادارہ اپنے بیسیوں اسکولوں سے اُردو کو خارج کر دے گا۔ خدا کرے کہ یہ ہوائی کسی دشمن کی اڑائی ہوئی ثابت ہو۔ لیکن اگر خدانخواستہ یہ صحیح ہے کہ انجمن اسلام اپنے اسکولوں میں اُردو کے بجائے مراٹھی کو ذریعہ تعلیم قرار دینے والی ہے تو یقیناً یہ بڑا المیہ ہوگا اور مہاراشٹر سے اُردو کا نام ونشان مٹا دینے کی ایک نامبارک سعی ہوگی۔ اس لیے کہ ثانوی جماعتوں میں اگر ذریعہ تعلیم اُردو نہ رہی تو پھر سرکاری اور نیم سرکاری اُردو کے ابتدائی مدارس کا وجود ہی بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔

ہمیں یقین ہے کہ مہاراشٹر کے اُردو دوست حضرات ایک بار پھر میدان میں آئیں گے اور اب سے دس سال قبل کی "قاضی رپورٹ" کی طرح اس مہینہ تجویز

کو بھی عملی جامہ نہ پہننے دیں گے۔

اس شمارے میں انجمن ترقی اردو کی زیر تعمیر عمارت "اردو گھر" کے لیے چندہ کی اپیل شائع ہو رہی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ یہ اپیل صدا بہ صحرا ثابت ہوگی اور اردو گھر کے لیے اتنا سرمایہ فراہم ہو جائے گا کہ عمارت جلد سے جلد پایۂ تکمیل کو پہنچ سکے اور انجمن کا دفتر دہلی آ کر زیادہ مفید اور موثر طریقہ پر اردو کی ترویج، اشاعت، ترقی اور بقا کے لیے کام کر سکے۔

تعارف

پریم چند کے خطوط

منشی پریم چند کی کتابِ زندگی کا ہر ورق اپنی جگہ صداقت کا آئینہ اور اخلاص و سادگی کا گنجینہ ہے انھوں نے ایک بہت معمولی مگر انتہائی بے لوث اور ایمان دار آدمی کی طرح اپنی زندگی شروع کی تھی، ناگزیر حالات، جدّوجہد اور طرح طرح کی دماغی الجھنوں اور جسمانی مشقتوں سے ان کو اکثر و بیشتر سابقہ رہا۔ خوشی کے عارضی لمحے میسّر آئے ہوں یا رنج و محن سے مقابلہ کرنا پڑا ہو ہر حال میں وہ اپنی روش پر قائم رہے اور اپنے فن سے وابستگی اور اس پر دست رس حاصل کرتے رہے اور اس کو بلند سے بلند تر بنانے میں نہ کہیں فروگزاشت کی اور نہ اس کی حرمت اور اقدار میں اپنے بس بھر کسی وقت کوئی فرق آنے دیا۔

یہی وجہ ہے کہ آج ان کے کردار، استقلال اور مسلسل ادبی کاوشوں کا ہر شخص معترف اور مدّاح ہے۔ ایثار، حب الوطنی، کنبہ پروری، اعزا نوازی اور شفقت و محبت کی جہاں ان کو کوئی جھلک بھی دکھائی دے گئی فوراً اس سے انھوں نے اپنے افسانے کا پلاٹ بنا لیا یا ناول کا موضوع قرار دے دیا اور اس انداز سے اسے وہ اپنے قلم کی گرفت میں لے آئے کہ پڑھنے والے کو ان کی قلم کاری کی داد دینا پڑی اور جس کو انھوں نے ہیرو بنا کر پیش کیا اس کی ہیروشپ واقعی مسلّم ہو گئی۔

فن کو زندہ اور پائندہ بنا دینے میں فن کار کی سیرت اور شخصیت کا عکس بھی بڑی مدد کرتا ہے، کسی چیز کی تعلیم یا تبلیغ اُس وقت اور زیادہ موثّر اور موثّر ہو جاتی ہے اگر اُس کا پرچار کرنے والا بھی دل سے اس کا قائل اور خود اپنی زندگی اور اُس کے مسائل و معاملات میں انھیں نظریات پر کاربند اور مشاغل افکار میں ان پر عامل رہا ہو۔ پریم چند کے قول اور عمل میں تضاد یا تصنع کہیں نظر نہیں آتا۔ سردست

ہم ان کے فن (جس کے وقیع اور قابلِ احترام ہونے میں شک نہیں) سے قطع نظر کرکے اُن کی سیرت اور زندگی کے بعض معمولات اور پہلوؤں پر غور کرتے ہیں تو وہ ہم کو واقعی ایک بہت مخلص اور بے ریا انسان نظر آتے ہیں۔ ان کی کہانیاں اور ناول، ان کے دوست احباب کے مشاہدے اور تجربے، ان کے نیازمندوں، معاصروں، مدّاحوں اور ناقدوں میں سے کوئی ایسا نہیں ملے گا جو کہہ سکے کہ انھوں نے کسی حالت میں بھی انسانی قدروں کا پاس اور لحاظ نہیں کیا، بیماری، بے کاری اور سخت سے سخت مالی مشکلوں کے باوجود انھوں نے اپنے نظریات میں تبدیلی گوارا نہیں کی۔ وہ قلم کے سپاہی اور قلم کے مزدور زندگی بھر رہے مگر قلم کی بے حرمتی یا اُس کے تاجرانہ اور غلط کارانہ استعمال کی کہیں کوئی مثال نہ مل سکے گی۔ اور ان باتوں کا سب سے زیادہ معتبر اور نہایت واضح ثبوت ہیں ان کے یہ نجی اور کاروباری طویل اور مختصر خطوط جو پہلی بار اتنی بڑی تعداد میں مرتّب ہوکر سامنے آئے ہیں۔ پریم چند کو سمجھنے سمجھانے کے سلسلے میں ان میں سے بہت سے خطوط سے ان کے سیرت نگاروں اور قدرشناسوں نے کام لیا ہے۔ پھر بھی ان کی سیرت اور شخصیت کے بعض رُخ ایسے بھی ہیں جو اس سے پہلے عام نظروں سے اوجھل تھے اور اب وہ اپنی اصلی صورت میں ہمارے سامنے آگئے ہیں۔ ان سے عصرِ حاضر اور مستقبل کے معترف اور قدرشناس دونوں بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اور پا سکتے ہیں۔ یہ بیش قیمت اور ہر زمانے کی لیے قابلِ قدر سرمایہ ہرگز اس انداز سے فراہم اور یک جا نہ ہوتا اگر مدن گوپال صاحب کی غیر معمولی سعی و کاوش اس میں شامل اور کارفرما نہ ہوتی۔ یہ ایک ایسے شخص کا مزید کارنامہ ہے جس نے اب سے پہلے بھی متعدد موقعوں اور حیثیتوں سے پریم چند کو مقبول اور متعارف کرانے کی بڑی قابلِ قدر اور لائقِ تحسین کوششیں کی ہیں۔ انھوں نے پریم چند کی سیرت و کردار سے آگاہی حاصل کرنے کا وہ سب سے بڑا اور مستند ترین وسیلہ اور سرمایہ فراہم کر دیا ہے جس کے بعد پھر کسی دوسرے وسیلے اور سراغ اور ثبوت کی کوئی ضرورت نہیں رہتی ہے۔

ان خطوط کی فراہمی کے بارے میں مرتّب نے جو کچھ لکھا ہے اس سے اس کی پریم چند کے ساتھ عقیدت اور اُن کے قلم سے ہر نکلی ہوئی چیز کو محفوظ کر دینے کی لگن کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے اس کے علاوہ جن مشکلوں پر انھوں نے قابو پایا ہے اور جیسے جیسے ہمت شکن

موقعوں پر انھوں نے اپنے ارادے میں تزلزل نہیں پیدا ہونے دیا اس کی اجمالی داستان بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک فردِ واحد کی اتنی دماغی الجھنیں، جسمانی محنت اور دشوار تر مالی مصارف گوارا کرتے رہنا کوئی معمولی بات ہے اور نہ آسان۔ ماننا پڑتا ہے کہ کسی کام کے پیچھے جب تک آدمی اسی طرح تن من دھن سے نہ لگ جائے وہ کام خاطر خواہ حد تک نہ تو پورا ہوتا ہے اور نہ اسے کوئی فوقیت یا اہمیت دی جاتی ہے۔

خطوں کی فراہمی اور ترتیب کے ساتھ اسی ضمن میں پریم چند کی مختصر اور جامع سوانح حیات سے بھی پڑھنے والا آگاہ اور آشنا ہو جاتا ہے۔

اس مجموعے میں پریم چند کے ۲۴۳ خطوط ہیں جو ۳۰ جنوری ۱۹۰۵ء سے شروع ہوتے ہیں اور ۱۳ ستمبر ۱۹۳۶ء کو ختم ہو جاتے ہیں بیشتر خطوط منشی دیانرائن نگم اڈیٹر رسالہ "زمانہ" کان پور اور سید امتیاز علی تاج کے نام اردو میں ہیں، ان کے علاوہ بہت سے خط محترمہ شورانی دیوی، بنارسی داس چترویدی، جینندر کمار اور اسی طرح کے متعلق اور غیر متعلق لوگوں کے نام نجی تعلق یا کاروباری غرض سے ہندی (رسم خط کو اردو میں بدل کر) ہیں، تھوڑے سے خط انگریزی کے بھی ہیں مگر اردو ترجمے کے ساتھ۔ غرض مرتب کو جہاں جہاں سے جو خط بھی ملا اُس کو انھوں نے تاریخی ترتیب سے درج کر دیا ہے۔ پریم چند کی زندگی کے یہ تینتیس اکتیس سال بہت سی حیثیتوں سے پڑھنے اور ان سے بہت کچھ سیکھنے کے قابل ہیں۔

ان خطوں میں ادب و انشا کے رموز اور رنگینیاں نہ تلاش کرنا چاہیے۔ ان میں نہ انشا پردازی کے نمونے ملیں گے اور نہ کسی مخصوص طرزِ نگارش یا اسلوب مکتوب نویسی کی نشان دہی۔ یہ ایک سیدھے سادے کہانی کار اور ناول نگار کے وہ خیالات و افکار ہیں جن کو وہ بغیر کسی اہتمام کے وقتاً فوقتاً اظہار کرتا رہا ہے، اس میں اُس کا خلوص، بے ساختگی، تعلقِ خاطر، کہیں دلی جذبات اور کبھی ضرورت کے تحت کچھ عرض معروض (جس میں خود شکنی اور خود غرضی کا کوئی شائبہ نہیں) کبھی بے تکلفی کی باتیں تو کبھی اپنے عزائم اور منصوبوں کا تذکرہ۔ غرض اپنی داستانِ حیات کا ہر ضروری جزو، پریم چند اپنے ان سیدھے سادے اُردو، ہندی اور انگریزی کے خطوط میں قلم بند کر گئے ہیں۔ انھوں نے اپنی بیوی یا بعض قریب کے لوگوں کو ہندی میں جو

خطوط لکھے ہیں کاش ان کی سادگی اور عام فہمی آل انڈیا ریڈیو اور دوسرے ہندی نوازوں کو کچھ متوجہ اور متاثر کر سکتی۔

بہر حال ہر بڑے ادیب اور قابلِ لحاظ آدمی کی طرح پریم چند کے خطوط بھی شائع ہو گئے، اُن کو سمجھنے اور اُن کی قدر و عزت کرنے کا یہی ایک ذریعہ رہ گیا تھا وہ بھی بحسن و خوبی پورا ہو گیا۔ ان منتشر اور بہت سے ناقابلِ حصول خطوں کو مرتب اور فراہم کر کے مدن گوپال صاحب نے پریم چند کے اُردو اور ہندی دونوں قسم کے قدر دانوں اور پریمیوں پر یکساں احسان کیا ہے۔

اس کی طباعت و اشاعت پر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کو اگر فخر ہو تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کے صدر دفتر نیز تینوں شاخوں میں سے کہیں سے بھی یہ کتاب ۶/۵۰ میں حاصل کی جا سکتی ہے۔

(بقیہ صلہ)

دل کی بات نہ سمجھ گئے ہوں۔ میں اور زیادہ ضد کرنے لگا ہوں۔ نہیں۔ اس بار آپ کا انکار نہیں چلے گا۔ ہر بار آپ ٹال جاتے ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ چلیے تو!

مگر چچا نے سردی کا بہانہ کر کے انکار کر دیا ہے۔

اور میں دل ہی دل میں سوچتا ہوں چچا کا یہ ایک اور احسان ہے مجھ پر۔ بچپن میں مجھے اپنے ہاتھوں سے کپڑے پہنائے ہیں۔ اور ہمیشہ میری پردہ پوشی کی ہے اور آج بھی انھوں نے مجھے عریاں ہونے سے بچا لیا ہے — (بشکریہ شاعر بمبئی)

◯ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ . . . . . . سے آپ کی مدت خریداری ختم ہو جاتی ہے

ہمیں امید ہے کہ آپ کتاب نما کی سرپرستی جاری رکھیں گے اور مبلغ دو روپے زرِ چندہ منی آرڈر ۱۰ ستمبر تک بھیج دیں گے تاکہ یہ سلسلہ قائم رہے۔ آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملی تو ہم سمجھیں گے کہ کتاب نما آپ کی سرپرستی سے محروم ہو گیا، مجبوراً پرچہ بند کر دیا جائے گا۔

منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیے کا آپ کا خریداری نمبر ہے . . . . . . منیجر

عمر انصاری

اُردو کی کہانی اُردو کی زبانی

عجب ہے زمانہ عجب زندگانی　　بڑی روح فرسا ہے میری کہانی
کروڑوں ہیں کہنے کو دلدار میرے　　مگر وقت کے یار ہیں یار میرے
بڑے اِن کے دم خم بڑے حوصلے ہیں　　اُٹھا کر مجھے بیچنے لے چلے ہیں
نگینے مِرے نام میں جڑ رہے ہیں　　مِرے نام پر آج رن پڑ رہے ہیں
میں گزری ہوئی ایک ایسی صدی ہوں　　وطن میں ہوں اپنے ہی اور اجنبی ہوں
دیا میں نے طوفاں میں جن کو سہارا　　وہی کرتے جاتے ہیں مجھ سے کنارا
انھیں کی نگاہوں کے رخ دیکھتی ہوں　　زباں بن کے جن کے دہن میں رہی ہوں
مقید مجھے کرنے والے چمن کے　　پنہائیں تو خوشبو کی زنجیر پہلے
مِرے جام میں جامِ خسرو کی مے ہے　　مِرا روپ، میرا کے گیتوں کی لے ہے
میں بیٹی ہوں کس کی ہمالہ سے پوچھو　　بہن کس کی ہوں برج بھاشا سے پوچھو
مجھے لوگ کہتے ہیں کیا جانتی ہوں　　میں خوب آپ اپنے کو پہچانتی ہوں
مجھے کیا بھلا دین و مذہب سے نسبت　　مِرا کوئی مذہب نہیں، جز محبت
زمانے میں ہے عام میرا اُجالا　　یہ مسجد ہے میری، وہ میرا شوالا
روانی، یہ گنگا کو مجھ سے ملی ہے　　مِرے ساتھ مل جل کے جمنا بہی ہے
کسی سے کہیں، میں گریزاں نہیں ہوں　　زباں ہوں میں، کم ظرف انساں نہیں ہوں
چہیتی زباں ہوں میں شاہِ جہاں کی　　ہوں بیٹی اسی ارضِ ہندوستاں کی
پلی ہوں میں کھیتوں کی ہریالیوں میں　　میں جھولی ہوں جھولا انھیں ڈالیوں میں
دلی نے مجھے گودیوں میں کھلایا　　کلی تھی میں اک پھول اس نے بنایا
نگاہوں میں ہیں میری گلیاں دکن کی　　ابھی یاد ہیں رنگ رلیاں دکن کی
ہر اک سمت لے کر نئے خواب پہنچی　　دکن سے چلی اور پنجاب پہنچی
چلی، اور اسی طرح چلتی گئی میں　　یونہی پھولتی اور پھلتی گئی میں

ترانے مرے میر و غالب نے گائے　　جلی ایک دنیا مرے سائے سائے
چمن در چمن رنگ بھرتی گئی ہیں　　جہاں سایہ دیکھا وہیں سو رہی ہیں
نہ چین ارضِ دلی کا جب راس آیا　　مرا دل مجھے لکھنؤ لے کے آیا!
نگاہوں سے برسا ہوا رس تھی میں ہی　　بنارس کی صبح بنارس تھی میں ہی
خبر کس کو کیا شے بہ نام اودھ تھی　　سنواری ہوئی کس کی شامِ اودھ تھی
انیس اور ناسخ کی ممنون ہوں میں　　نسیم اور چکبست کا خون ہوں میں
جگر اور آتش کو نہ خاطر میں لاؤ　　فراق اور ملّا ہیں کس کے بتاؤ
خبر کون لے آج مجھ بے خبر کی　　کبھی تھی میں تلوار شاہِ ظفر کی
سراج اور حیدر علی بن کے جی میں!　　رفاقت میں ٹیپو کے برسوں رہی میں
روہیلوں کی زرہوں کی جھنکار میں تھی　　وہ یوسف تھے میرے خریدار میں تھی
نہ سمجھے کوئی مجھ کو ہرجائی ہوں میں　　کہ اس دور کی لکشمی بائی ہوں میں
تمھیں یاد ہوگی ابھی وہ کہانی　　ستم کی تھی چاروں طرف حکمرانی
پڑا تھا بڑے ہی اندھیروں سے پالا　　مرے آنسوؤں نے کیا پھر اُجالا
ہر اک سمت لے کر پھری روشنی میں　　دیا بن کے دار و رسن پر جلی میں
لہو دے کے سینچے گلستاں ہزاروں　　کیے میں نے آباد زنداں ہزاروں
نظر میں ہیں چہرے گلابی گلابی!　　مرے سورما وہ، مرے انقلابی
اہنسا کے بھگتوں کا کردار میں تھی　　نہتوں کے ہاتھوں کی تلوار میں تھی
کوئی کیا کرے گا کلام آ کے مجھ سے　　صبا سیکھتی ہے خرام آ کے مجھ سے
گھٹا میرے دم سے بنی زلف والی　　شفق میں گھلی میرے ہونٹوں کی لالی
لویں کتنی روشن ہوئیں میری لو سے　　عبارت ہوں میں ایک تہذیبِ نو سے
سحر میرا اترا ہوا پیرہن ہے　　جو شب ہے میری زندگی کی تھکن ہے
بتاؤں کسے اپنا نام و نشاں میں!　　چمن میں چمن کی بہار و خزاں میں
سند میری مانا، نہیں مانتے ہو　　حمید اور عثمان کو جانتے ہو
ہے پیارا ایماں کا مجھے "تارا تارا"　　کہ ہوں میں دھڑکتے دلوں کا سہارا
پریم اور الفت کا ماحول ہوں میں　　کہ گاندھی کا ہارا ہوا قول ہوں میں

(بشکریہ پریم سندیش دہلی)

بادشاہ حسین

کچھ کھلی آوازیں

میں شہر کی پرشور سڑکوں اور گلیوں میں دیر تک بھٹکتے رہنے کے بعد محلے کے گھٹیا، دھواں آلود چائے خانے میں آکر بیٹھ جاتا ہوں۔ لوگ کسی بحث میں اُلجھے ہوئے ہیں یہ لوگ صبح سویرے سے لے کر رات میں دیر تک چائے خانے بند ہونے کے بعد بھی یہاں جمے رہتے ہیں، جیسے انھیں اس لنگڑی میز اور ٹوٹی ہوئی تپائی سے اُنس ہوگیا ہے۔ مہینے کے آخری دنوں میں عموماً ایسے ہی ہوٹلوں میں بھنبھناتی مکھیوں، فحش اور گھٹیا مذاق والوں کے بیچ تھوڑی دیر بیٹھ کر چائے پی لیتا ہوں۔ کیتلی دہکتی ہوئی آگ پر رکھی ہوئی ہے۔ پانی گرم ہونے میں دیر ہے اس لیے کچھ رُک کر انتظار کرتا ہوں۔ مجبوراً ان کی باتوں کو سنتا ہوں۔ کیونکہ وہ بول رہے ہیں۔

چائے ختم کر کے وہاں سے اُٹھتا ہوں۔ اپنے کمرے میں آکر چارپائی پر پڑ جاتا ہوں بغل کی میز سے کتاب اٹھا کر دیر تک الٹا پلٹتا ہوں۔ دل بڑا اُچاٹ اُچاٹ سا ہے۔ اکتا کر کتاب بند کر دیتا ہوں۔ ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھ دیتا ہوں۔ لیمپ کی تیز روشنی میں چاروں طرف اجنبیت سے دیکھتا ہوں۔ کمرے میں جا بجا مکڑی نے جالے تن ڈالے ہیں فریم کی ہوئی میری پرانی تصویر پر اتنی گرد جم گئی ہے کہ وہ بڑی دھندلی نظر آرہی ہے۔ اُتارے ہوئے کپڑوں کی گٹھری ایک کونے میں فرش پر بکھری پڑی ہے۔ ایک کونے میں پڑے ہوئے ٹین کے بکس پر ڈھیر سی گرد جم گئی ہے۔ جا بجا بکھرے ہوئے سامان کی طرف حسرت سے دیکھ کر اُداس ہو جاتا ہوں۔

سوچتا ہوں جلد سو جانا چاہیے۔ طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ صبح پھر دفتر جانا ہوگا۔ ساتھ ہی خیال آتا ہے پرسوں سے آفس میں تین دن کی چھٹی ہے ـــــ وقت کیسے کٹے گا؟ یہ بھی ایک بہت بڑا سوال ہے۔ آفس میں رہو تو دل نہیں لگتا۔ بار بار نظریں دیوار پر لگی ہوئی

گھڑی کی جانب اُٹھ کر لوٹ آتی ہیں۔ وقت کیسے ختم ہو سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا کروں ــــ کہاں جاؤں ــــ ؟ اور اب اکٹھے تین دن کاٹنے تو اور مشکل ہوں گے ــــ گھر ہی چلا جاؤں گا اور پھر یاد آتا ہے گھر گئے ہوئے کئی مہینے ہو گئے۔ اتنے نزدیک ہوتے ہوئے مہینے میں کم از کم ایک بار تو جانا ہی چاہیے۔ سبھی لوگ میرے لیے پریشان ہوں گے عجیب حالت ہو گئی ہے۔ ادھر گھر سے کئی خطوط آچکے ہیں مجھے بلانے کے لیے۔

ابھی حال کے آئے ہوئے ایک پوسٹ کارڈ کے حرفوں پر نظر دوڑاتا ہوں۔ ان خاموش لفظوں نے میرے اندر گہرائی میں اُتر کر ایک عجیب سی بے چینی اور ہلچل پیدا کر دی ہے ــ " بچا صاحب بہت بیمار ہیں " ــــ اور مجھے لگ رہا ہے کہ ایک افسردہ سی ڈوبتی آواز پکار رہی ہے۔ درد سے بے چین دو آنکھیں پچکے سوکھے گالوں کے گڑھے میں گہری دھنسی ہوئی میری طرف دیکھ رہی ہیں۔ میں حیرت میں ہوں کہ ان آنکھوں میں آج بھی اپنے درد سے گزر کر دوسرے کو پناہ دینے کا جذبہ، صبر، بے قراری اور ضبط ایک ساتھ مچل رہا ہے۔ میں کچھ گھبرا سا اٹھتا ہوں۔ ان آنکھوں کا سامنا کرنے کی تاب مجھ میں نہیں ہے۔

حال سے بہت دُور، بہت دُور ماضی کی آغوش میں اپنے منھ کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ایک ساتھ بہت سی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں۔ اور آوازیں گونجتی ہیں۔

" دیکھنا یہ لڑکا ایک دن کلکٹر بنے گا۔ ہائی اسکول کے امتحان میں اس سال اوّل آیا ہے۔"

اپنے اسکول میں سب سے زیادہ نمبر اسی کے ہیں " لڑکے کے چہرے پر مسرت جھلک رہی ہے۔ لیکن اُس ادھیڑ آدمی کی دو پُر نور آنکھیں ہیں مسرت سے زیادہ کچھ اور بھی ہے بہت کچھ۔ امید۔ پیار۔ جذبات اور حوصلوں کا اُمنڈتا ہوا طوفان ــــ

میں پیچھے ہی مُڑتا جا رہا ہوں ــــ ایک دوسری طویل طویل گزری ہوئی مدّت کی دُھند سے نمایاں ہوتی ہے۔ ایک پانچ چھ سال کا لڑکا ــــ کندھوں پر سوار میلے کی سیر کر رہا ہے۔ ہر طرف لوگوں کا ہجوم۔ شور و غل۔ طرح طرح کی سجی ہوئی دکانیں۔ بڑا مزا آ رہا ہے۔ لڑکا زمین پر اُتر کر پیدل میلے میں گھومنا چاہتا ہے " نہیں بیٹے! بہت بھیڑ ہے تم دب جاؤ گے۔ بولو کیا لو گے ــــ ؟ مٹھائی ؟

"نہیں۔ وہ جو موٹر ہے، اُسے"
اور موٹر کا کھلونا بچے کے ہاتھ میں آگیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اور اُس دن اس لڑکے کے لیے کلکٹر کا خواب دیکھنے والے اُس بزرگوار کے خوابوں کی دنیا میں ضرور ایک موٹر کی تصویر بھی اُبھری ہو گی جس پر اس کا لاڈلا سیر کر رہا ہو گا۔

کمرے میں ایک طرف دیوار کے سہارے کھڑی ٹوٹی سائیکل پر اچانک نظر پڑ جاتی ہے اور ایک پھیکی سی مسکراہٹ پتا نہیں کس چوٹ اور کسک میں ڈوب کر زندگی کو جھیلنے کا احساس تازہ کر جاتی ہے۔

زندگی میں یہ کتنی عجیب سی بات ہے کہ اکثر کچھ کرنے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی جب کچھ نہ کر سکو تو خود اپنی مجبوری پر کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ میرا "میں" جو یہی کوشش کرتا ہے کہ سبھوں کا ہو کر رہے، اِس میں وہ اپنا بھی نہیں ہو پاتا۔

رات بھیگ چلی ہے۔ میں اب بھی آنکھیں بند کیے پڑا ہوں۔
ایک بے نام سی خلش، چبھن محسوس کرتا ہوں۔ ایسے میں لگتا ہے یہ اپنا وجود بھی بے کار سا ہے۔

اس طرح جینے سے فائدہ؟ ـــــ کتنے حسین خواب دیکھے تھے اس زندگی میں۔ اور ان جلتے خوابوں کی تعبیر ـــ؟ ـــ اپنی حالت ایک ایسے گھائل طائر بے بال و پر کی طرح ہے جو بیچ راستے میں بیٹھا سہمی سہمی نظروں سے کبھی دور تک پھیلے ہوئے ٹیڑھے میڑھے راستے کو حسرت سے دیکھتا ہے اور پھر اپنے بچے کھچے پروں کی طرف دیکھ کر اُداس ہو جاتا ہے۔

جلتے ہوئے لیمپ کی روشنی مدھم ہوتی جا رہی ہے۔ کمرے کے باہر گھنا اندھیرا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہ کمرہ بھی اندھیروں میں ڈوب جائے گا۔ مجھے اس وقت خیال آتا ہے یہ زندگی بھی ایک جلتی ہوئی موم بتی ہے۔ موم بتی کا کیا ہے، وہ پگھلتی ہے، پگھلتی رہے گی اور پگھلتے پگھلتے ختم ہو جائے گی۔ اب اس سے اُجالا کتنی دور تک پھیلا۔ کتنا اندھیرا دور ہو سکا وہ کیا جانے؟ یہ پورا اندھیرا اکیلی ایک شمع چاہے بھی تو دور نہیں کر سکتی۔

سبھی لوگ مجھے ہمیشہ بڑی رحم بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں ـــ اور بات بھی ایسی ہی ہے۔ سبھوں سے ہمیشہ میں کچھ نہ کچھ لیتا ہی رہا ہوں کسی سے محبت، کسی کی

دعائیں اور کسی کا پیار۔ اور پھر بھی — ؟

میرا "میں" ابھی میرے حالات سے مطمئن نہیں ہے۔ وہ الگ سوچتا ہے۔ اگر موجودہ حالات ایسے نہ ہوتے تو تعلیم چھوڑ کر مجھے نوکری نہ کرنی پڑتی۔ ابھی اور پڑھتا۔ اس سے کہیں اور اچھی جگہ پر ہوتا۔ ساتھ ہی "چچا" اور اُن کی وہ تمام آرزوئیں بھی یاد آتی ہیں۔ دیر تک خیالات کی رہ گزاروں میں دھول اُڑاتے اُڑاتے — گھر جانے کا مکمل ارادہ کر کے سو جاتا ہوں۔

میں بس میں سوار ہوں۔ یوں تو تمام لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوں۔ مگر میرے ذہن کے کینوس پر میرا گھر اُبھر آیا ہے۔ دو گھنٹے بعد اپنے قصبے کا اسٹاپ آتے ہی اُتر جاتا ہوں۔

رات کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔ سردیوں کی یخ بستہ رات سامنے کھڑی ہانپ رہی ہے۔ پورے گاؤں پر موت کا سکوت طاری ہے۔ اپنے پہلے سے بنائے ہوئے پروگرام کے مطابق مجھے سیدھے چچا صاحب کے پاس جانا چاہیے مزاج پرسی کے لیے۔ میں بیچ سڑک پر ہاتھ میں اٹیچی سنبھالے کھڑا ہوں۔ بس مجھے اکیلا چھوڑ کر آگے نکل گئی ہے سڑک کی پوربی سمت میرا اپنا مکان ہے اور پچھم کی طرف تین فرلانگ کی دوری پر چچا صاحب کا — کچھ دیر تک کھڑا ہو کر سوچتا ہوں اور دل میں کہتا ہوں' چلو گھر چلیں۔ کھا پی کر، کپڑے تبدیل کر کے چچا کو دیکھنے چلیں گے۔

گھر پہنچ کر میں نے سبھوں کو چونکا دیا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں ہر فرد میری آمد سے خوش ہے۔ جلدی جلدی سبھوں کو آداب کرتا ہوں۔ میرا چھوٹا بچہ جو اب میرے قریب آکر مجھے دیکھ رہا ہے' اسے گود میں اٹھا لیتا ہوں۔ یہ سب کچھ آپ ہی آپ ہو گیا ہے۔ میری بیوی نے ایک کونے سے مسکرا کر اپنی خوشی کا پیغام مجھ تک پہنچایا ہے۔

برآمدے میں الاؤ جل رہا ہے۔ میں بھی آگ تاپ رہا ہوں۔ سبھی لوگ اپنی اپنی باتوں میں مشغول ہیں۔ میں اُن سبھوں کے بیچ ہوتے ہوئے بھی الگ سوچ رہا ہوں۔ رات زیادہ گزر گئی ہے۔ اگر اس وقت چچا صاحب کے یہاں جاتا ہوں تو وہ اُلٹے ہی خفا ہوں گے۔ اتنی رات گئے سردی میں آنے کی کیا ضرورت تھی' صبح آجاتے — خود کو ٹٹولتا ہوں' لگتا ہے جیسے میں نے جان بوجھ کر خود سے اتنا وقت گزار دیا ہے۔ اور اب نہ جانے کے لیے بہانے تلاش کر رہا ہوں۔ امّاں سے پوچھتا ہوں —

"چچا بیمار تھے ؟"

"ہاں بہت زیادہ۔"

"اب کیسے ہیں ؟"

"اب تو اللہ کا شکر ہے۔ قریب قریب اچھے ہوگئے ہیں۔ کمزوری بہت زیادہ ہے۔"

میں سوچتا ہوں اچھا ٹھیک ہے۔ صبح سویرے اٹھ کر چلا جاؤں گا۔

اماں نے چھوٹے بھائی کی شادی کی بات چھیڑ دی ہے۔ میں فوراً کہہ اٹھتا ہوں۔ "ابھی جلدی کیا ہے ---؟ اس کی عمر ہی کتنی ہے --- ؟ (حالانکہ ۳۱ سال کا ہو گیا ہے) میرا بھائی چولہے کے پاس بیٹھا ہوا کچھ کھا رہا ہے۔ میری طرف دیکھتا ہے۔ پھر کھانے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ میری بات میں ابا نے بھی 'ہاں' ملا دی ہے۔ شاید وہ بھی میری ہی طرح سوچ رہے ہیں۔ اگر شادی کر دی گئی تو وہ اپنی پوری تنخواہ جو ہر ماہ گھر پر دے دیتا ہے' اس میں ضرور کمی پڑ جائے گی۔ اور شادی کے اخراجات کہاں سے پورے ہوں گے --- ؟ میں گھبرا کر سوچتا ہوں کہیں مجھ پر مزید بوجھ نہ پڑ جائے --- مگر میری بیوی اور ماں نے بھی ایک ساتھ ٹوکا ہے --- نہیں جلدی ہونی چاہیے۔ ہم نے لڑکی دیکھ لی ہے اور بات بھی پکی ہو گئی ہے۔ جلد ہی کوئی اچھی تاریخ دیکھ کر رکھ دینی ہے۔ بس تمھارا انتظار تھا ---"

چپ چاپ وہاں سے اٹھ کر اپنے بستر پر لیٹ جاتا ہوں۔ بڑی دیر تک سوچتا رہتا ہوں۔ چھوٹے بھائی کی شادی ہو گی۔ اس میں مجھے کتنا دینا ہو گا اور اس کا انتظام کہاں سے ہو گا۔ شاید اسی لیے مجھے بار بار گھر آنے کے لیے لکھا جا رہا تھا۔

چچا صاحب ایک چارپائی پر لحاف اوڑھے لیٹے ہوئے ہیں۔ بیماری اور بڑھاپے کی وجہ سے بہت نحیف و لاغر ہو گئے ہیں۔ اُن کے سرہانے میز پر چھوٹی بڑی بہت سی دواؤں کی شیشیاں بے ترتیبی سے رکھی ہوئی ہیں۔ گھر کا وہ حصّہ اسپتال کا ایک گوشہ نظر آتا ہے۔ میں بڑھ کر انھیں اور گھر کے لوگوں کو سلام کرتا ہوں اور جا کر ان کے پینتانے بیٹھ جاتا ہوں۔

اپنا دایاں ہاتھ اُن کی پیشانی پر بخار دیکھنے کے لیے رکھتا ہوں ---

"آپ اتنے زیادہ بیمار تھے، مجھے کیوں نہیں اطلاع دلوائی — ؟ میں فوراً بھاگ کر آتا۔"

مجھے لگا یہ الفاظ آپ ہی آپ میرے منہ سے نکل پڑے ہیں۔ میں خفیف سا ہو جاتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں جیسے میں کوئی ناٹک کر رہا ہوں — میں نے اپنے چہرے پر تمام کرب و اضطراب کے تاثرات پیدا کر لیے ہیں — میں کوشش کر رہا ہوں اور یہ ساری کوششیں اس لیے ہیں کہ میں انھیں احساس دلا دوں کہ میں اُن کے لیے بہت فکرمند تھا۔

"کب آئے۔؟" انھوں نے بڑی کمزور آواز میں پوچھا ہے۔

اور مجھے لگا جیسے اب تک کی ساری ایکٹنگ بے کار ہو گئی۔ اگر کہتا ہوں رات آیا تو کہیں پوچھ نہ لیں "اب مجھ سے ملنے آئے ہو ؟"

میں نے پھر جلدی جلدی کہنا شروع کیا ہے۔ کیا ہو گیا تھا آپ کو۔ ؟ اب کیسی طبیعت ہے۔ ؟ کس کی دوا کر رہے ہیں۔ ؟" ایک ہی سانس میں میں نے کئی سوال کر ڈالے ہیں۔ تھوڑی دیر رک کر پھر کہتا ہوں "میں — رات آیا ہوں۔ قریب دس بجے۔ اس وجہ سے رات نہیں آسکا۔ صبح بھی سویرے آنے میں مجھے دیر ہو گئی — میں نے اپنی صفائی پیش کی ہے —

شدید سردی کے ساتھ بخار آ گیا تھا۔ چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ سمجھا تھا شاید اب نہ بچ سکوں گا۔ مگر لگتا ہے ابھی زندگی کے کچھ دن اور کاٹنے ہیں — تم بتاؤ کیسے ہو۔ ؟ میرا کیا۔ میں تو چراغِ سحری ہوں۔" انھوں نے کہا ہے اور میں سوچتا ہوں، انھیں میرا کتنا خیال ہے اپنی بیماری میں بھی میرا حال پوچھ رہے ہیں۔

میں نے اُن کا سر دباتے ہوئے پوچھا ہے "کس کا علاج کر رہے ہیں۔ ؟"

"ڈاکٹر کا۔ بہت فائدہ ہے۔ اُن کی تین ہی خوراک میں بخار بالکل غائب ہو گیا ہے — مجھے اب کوئی شکایت نہیں ہے۔ کمزوری بہت زیادہ ہے۔ جسم میں جیسے طاقت ہی نہیں رہ گئی ہے۔ دو قدم چلا بھی نہیں جاتا۔"

"آپ میرے ساتھ چلے چلیے۔ وہاں بڑے ماہر اور ایک سے ایک اچھے ڈاکٹر ہیں۔ وہاں آپ کا علاج اچھی طرح ہو جائے گا اور آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔"

میں نے یہ بات کہہ تو دی ہے ۔۔ مگر میرے اندر کہیں بہت گہرائی میں ایک سوال اُبھر آیا ہے ۔ اگر چلنے کے لیے تیار ہو گئے تو ۔ ؟ اور اسی طرح کے کئی سوال بین ڈبیوں کی طرح سر اُبھارنے لگے ہیں ۔۔۔ میں نے بلا وجہ ہی وہاں کے ڈاکٹروں کی تعریف کر دی ۔ یہاں کا ڈاکٹر کیا بُرا ہے ؟ ہزاروں مریضوں کا علاج کرتا ہے ۔ اور پھر مجھے لگا میری زبان لڑکھڑانے لگی ہے ۔ ساتھ ہی ساتھ وہ خیال بھی ۔۔۔

" اچھا سوچوں گا ۔ تم کب جاؤ گے ؟ " تھوڑی دیر بعد چچا نے مجھ سے پوچھا ہے ۔

" کل دوپہر کو ۔ میں آپ کو لینے آؤں گا ۔ اور سوچنا کیا ہے ۔ آپ کو چلنا ہو گا ۔ "

جیسے میں نے اپنے اس خیال کا گلا گھونٹ دیا ہے اور یہ انتقاماً کہا ہے ۔

رات میں دیر تک انھیں کے بارے میں سوچتا ہوں ۔ سوالیہ نشانوں کے قافلے صف بہ صف کھڑے ہو جاتے ہیں اور مجھ سے پوچھتے ہیں ۔

کل تمھارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئے تو ؟ کیا سچ مچ تم لے جانا چاہتے ہو ؟ انھیں لے جا کر تم ان کے علاج پر خرچ کر سکو گے ؟ اپنے اُسی بوسیدہ کمرے میں رکھو گے ؟ تمھاری بے سروسامانی دیکھ کر وہ کتنے اُداس ہوں گے ۔ انھیں یا کسی اور کو تمھاری ۔۔۔ ۔۔۔ سفید پوشی کے بارے میں کیا پتا ۔ وہ کیا جانیں تم کس طرح رہتے ہو ؟ ؟

ڈرتے ڈرتے دل ہی دل میں سوچتا ہوں اگر اس بار نہ چلتے تو اچھا تھا ۔ مگر اس خوف سے کہ ابھی میرا " میں " ہی میرا مذاق نہ اُڑانے لگے " میں اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیتا ہوں اور آنکھیں بند کر لیتا ہوں ۔

دوسرے دن سویرے ہی ان کے پاس پہنچ جاتا ہوں ۔ بڑی دبی ہوئی آواز میں کہتا ہوں ۔

" لایئے آپ کے کپڑے وغیرہ ٹھیک کر دوں "

جانے کیوں مجھے یہ الفاظ بڑے کھوکھلے اور بے جان سے لگے ۔

" ابھی بہت کمزور ہوں ۔ سردی بھی کافی پڑ رہی ہے ۔ اس بار تو نہیں ، ہاں دوبارہ جب تم آؤ گے تو ضرور چلوں گا ۔۔۔ اور یہاں کی دوا سے مجھے فائدہ بھی ہے ۔ "

" ہاں ہاں یہ ڈاکٹر کافی ہوشیار ہے اور دوائیں بھی لکھنؤ سے منگاتا ہے ۔

میں اس کی تعریف کر جاتا ہوں اور آپ ہی آپ یہ سوچ کر ڈر جاتا ہوں کہ کہیں میرے

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

جامِ نو

محروم

۱۸۸۷ ـــــ ۱۹۶۶

تلوک چند نام، محروم تخلص، گاجراں والا، ضلع میانوالی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے خاندان کے لوگ چھوٹے موٹے کاشت کار تھے یا دوکان دار۔ محروم کے والد ایک فقیر منش بزرگ تھے۔ پانچ برس کی عمر میں اپنے بزرگوں کے ساتھ آبائی وطن سے نکل کر عیسیٰ خیل میں آکے آباد ہوگئے۔ بچپن کے دن مسلمان لڑکوں کے ساتھ کھیل کود اور تیراکی کے شوق میں گزارے۔ چھے سات سال کی عمر میں عیسیٰ خیل کے ورناکلر مڈل اسکول میں داخل کرائے گئے۔ ابتدائی جماعتوں سے لے کر آٹھویں جماعت تک ہر امتحان میں اوّل آتے رہے اور وظیفہ حاصل کرتے رہے۔ وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی اسکول (بنوں) سے فرسٹ ڈویژن میں میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا اور اس کے بعد مدرّسی یا معلّمی کے پیشے سے وابستہ ہوگئے۔ ایف۔ اے اور بی۔ اے کے امتحانات ملازمت کے دوران میں پاس کیے۔ محروم نے معلّمی کا پیشہ محض کھانے کمانے کی غرض سے نہیں اختیار کیا تھا بلکہ صحیح معنوں میں ایک استاد کی جملہ خوبیاں اور صفتیں ان کے اندر موجود تھیں اور ان اوصاف میں مرتے دم تک اضافہ ہی ہوتا رہا۔ جب تک وہ راولپنڈی نہیں آگئے اور اسکولوں کی مدرّسی اور ہیڈ ماسٹری سے باقاعدہ طور پر اور اعزاز کے ساتھ ریٹائر نہیں ہوگئے، ساتھیوں اور افسروں کی سازش اور ریشہ دوانیوں کے بھی شکار رہے۔ پیشے کا احترام اور اس کی عظمت کے مقابلے میں انھوں نے مخالفوں کی ہر طرح کی مخالفتیں برداشت کرلیں لیکن اپنی عزتِ نفس اور ایمان داری پر حرف نہیں آنے دیا۔ کچھ عجیب اتفاق ہے کہ جس فرقے کے لوگ ان کے بدخواہ اور دشمن بنے اسی فرقے کے لوگ ان کے مداح اور قدرشناس بھی ثابت ہوئے۔ دشمنوں کی دشمنی کو انھوں نے نظر انداز کیا اور دوستوں کی دوستی کا دم

ہوتے رہے ۱۹۳۳ء میں "بہ سگاں ادب نموم بہ خوباں سلام کردم" کہہ کر جیسے ہی وہ ریٹائر ہوئے تو گارڈن کالج راولپنڈی میں اُردو فارسی کے لکچرر مقرر ہوئے گویا بقول مولانا تاجور نجیب آبادی جہاں ان کو پہلے پہنچنا تھا وہاں آخر میں پہنچے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کی افراتفری کے باعث ان کو دہلی آنا پڑا، یہاں کچھ دن وہ اخبار تیج کے عملۂ ادارت سے وابستہ رہے۔ پھر پنجاب یونیورسٹی کے کیمپ کالج نئی دہلی میں اپنے سابقہ عہدے پر کام کرنے لگے اور وفات سے تھوڑے دنوں پہلے تک واقعی وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک پوری نسل کے معلمِ اخلاق رہے!

شاعری کے معاملے میں نہ انھوں نے کسی کو اپنا استاد بنایا اور نہ کسی کو شاگردی کا شرف بخشا۔ وہ ایک حساس طبیعت، موزوں سرشت، دردمند، تنگ نظری اور کوتاہ بینی سے کوسوں دور رہنے والے لوگوں میں سے تھے۔ اپنے عقائد، اعمال اور افکار میں پختگی اور استقامت کے ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب کا بھی ان کے یہاں یکساں احترام پایا جاتا تھا، اسی بنا پر ہر فرقے اور مسلک کے افراد اور نوجوان ان کے دوستوں اور شاگردوں میں موجود ہیں۔

شاعری انھوں نے اوائلِ عمر ہی سے شروع کر دی تھی، عمر کے ساتھ مطالعہ اور ذوقِ نظر میں بھی وسعت اور گیرائی پیدا ہوتی رہی چناں چہ جلد ہی ان کو اس میدان میں بھی شہرت اور مقبولیت حاصل ہونے لگی اور عمر کے ساتھ ان میں اضافہ ہی ہوتا رہا، پنجاب اور یوپی کا ہر ادیب اور شاعر ان کی زندگی میں بھی عزت کرتا تھا اور آج بھی لوگ ان کی خدمات کے اعتراف کے ساتھ ان کا نام ادب سے لیا کرتے ہیں۔ علامہ اقبال، سر عبدالقادر، منشی دیا نرائن نگم، حفیظ، جوش اور نئی نسل کے سب ہی بڑے چھوٹے شاعر اور انشا پرداز مرحوم کے مداح معترف اور ان کے شاعرانہ کمالات نیز انسانی خوبیوں کے قائل اور مداح ہیں۔

ملک کے وہ چند بہت ہی محدود اور مخصوص شعرا جنھوں نے ملک و قوم کے نونہالوں کو اپنے پاکیزہ خیالات سے سنوارنے اور ان کو ایک بلند کردار انسان بنانے کی مخلصانہ کوششیں کی ہیں مرحوم کا نام اس فہرست میں بھی بہت نمایاں ہے، ان کی نظموں، غزلوں رباعیوں اور قطعات میں شاعرانہ محاسن، بلندیٔ فکر، صاف ستھری زبان، مشاقی

اذ رنگی، کلام کے جملہ اوصاف اور التزامات پائے جاتے ہیں مسلسل پچاس ساٹھ سال تک انھوں نے اپنے شاعرانہ کمالات اور رشحاتِ فکر سے چمنِ اُردو کی آب یاری کی ہے گنج معانی، رباعیاتِ محروم، کاروانِ وطن، بہارِ طفلی، نیرنگ معانی، شعلۂ نوا، بچوں کی دنیا اور ساٹھ سالہ کلام کا نچوڑ "انتخاب کلام محروم" یہ سب ان کی روائتی سیاسی، وطنی، قومی، ملکی اور ملّی شاعری کی زندہ اور پائندہ یادگاریں موجودہ دنیا اور آئندہ نسلوں کے لیے ایک قابلِ قدر اور باعثِ فخر سرمائے کی صورت میں موجود ہیں۔

انتخاب

دریائے سندھ

بھولا نہیں عالم تری امواج رواں کا　　وہ ماضئ زنہار مری عمر گزراں کا
تو اور تلاطم وہ مرے ذوقِ نہاں کا　　افسوس کہاں میں ہوں یہ قصہ ہے کہاں کا
گو رشتہ کناروں سے ترے توڑ کے آیا
طفلی بھی جوانی بھی وہیں چھوڑ کے آیا

تقدیس چمن سے مجھے انکار نہیں ہے　　گو پاک نہیں اس سے سروکار نہیں ہے
کیا کیجیے وہ آر نہیں پار نہیں ہے　　آسودہ کسی طور دلِ زار نہیں ہے
وہ ہمہمہ وہ جوش و خروش اس میں کہاں ہے
افسردہ سی، بے جان سی اک نہرِ رواں ہے

گو جور و جفا کی مجھے عادت بھی رہی ہے　　فطرت تری کچھ مائلِ وحشت بھی رہی ہے
مضمر ترے طوفاں میں آفت بھی رہی ہے　　ساتھ اس کے نمایاں یہ حقیقت بھی رہی ہے
دیہات اجاڑے تو بسائے بھی ہیں تو نے
نقشے جو بگاڑے تو بنائے بھی ہیں تو نے

ہاں میرے تصور میں ہے آباد جو قریہ　　آتا ہے ابھی مجھ کو بہت یاد جو قریہ
تھا جلوہ گہہ حسنِ خداداد جو قریہ　　ہر قید تکلف سے تھا آزاد جو قریہ
بستا ہے کنارے پہ ترے اب بھی کہیں اور
مضمون تو ہوگا وہی ہو گرچہ زمیں اور

علامہ اقبال کی موت پر

ظاہر کی آنکھ سے جو نہاں ہو گیا تو کیا　　احساس میں سما گیا دل میں اتر گیا

گنجِ مزار میں تنِ خاکی کو چھوڑ کر
قدسی نژاد اوجِ سماوات پہ گیا

کاشانۂ بقا میں مسافر پہنچ گیا
ویرانۂ فنا سے سلامت گزر گیا

باغِ جہاں میں صورتِ نکہائے تر رہا
باغِ جناں میں مثلِ نسیمِ سحر گیا

خاکِ چمن میں گوہرِ شبنم نہاں نہیں
خورشیدِ جلوہ بار سے پوچھو کدھر گیا

"ہر گز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق"
روشن تر اس حقیقتِ روشن کو کر گیا

محروم کیوں ترے حرماں نصیب کو
یہ وہم ہو گیا ہے کہ اقبال مر گیا

غزلیات

چلو اب لطف ہی کو آزماؤ
تمھیں آتا نہیں بیداد کرنا

وہیں تک ضبطِ وحشت میں دلِ بیتاب کوشاں تھا
تمھارے کوچے سے ہم نکلے تو پھر کوسوں بیاباں تھا

آپ کو مجھ سے کدورت نہیں کیا فرمایا
صدقے اس صاف بیانی کے بجا فرمایا

دنیا میں اے زباں روشِ صلحِ کل نہ چھوڑ
جس سے کسی کو رنج ہو ایسا بیاں نہ چھیڑ

ترکِ عشقِ بتِ خود کام غلط
ہم پہ نادانستہ یہ الزام غلط

کس سے سنوں جو تم نہ کرو بات پیار کی
کس سے کہوں جو تم نہ سنو ماجرائے دل

کوہ و صحرا و ساحلِ دریا
بے ٹھکانوں کے سو ٹھکانے ہیں

نہ میرے اشک ہیں شامل نہ ان کے دامن پر
میں کیا بتاؤں انھیں خونِ آرزو کیا ہے

سخن ہو شمع خراشی تو خامشی بہتر
اثر کرے نہ جو دل میں وہ گفتگو کیا ہے

وہ شام کی صورت ہے نہ وہ رنگِ سحر ہے
کس کوکبِ منحوس کا یارب یہ اثر ہے

روتی ہوئی آنکھوں میں ہیں غرقاب تبسم
پنجاب ہے دہلی میں جو ابِ راہ گزر ہے

کوئی سوتا ہو جیسے ڈوبتی کشتی کے تختے پر
اگر کچھ ہے تو بس اتنی ہے اس دنیا کی راحت بھی

ہم گلشنِ دہر میں اے ہمدم آزارکشِ بے داد رہے
سبزے کی طرح پامال ہوئے نکہت کی طرح برباد رہے

رباعیات

انکارِ گناہ بھی کیے جاتا ہوں
تکرارِ گناہ بھی کیے جاتا ہوں
حاصل ہو ثواب مفت اس لالچ میں
اقرارِ گناہ بھی کیے جاتا ہوں

ہر چند بری میں نے روش رکھی ہے
فطرت پہ نگاہ بے خلش رکھی ہے
گر بے ادبی نہ ہو تو اتنا پوچھوں
کیوں تو نے گناہ میں کشش رکھی ہے

نئی مطبوعات

کتاب	مصنف / مرتب	ناشر	قیمت
دلّی کی شام (ناول)	احمد علی ترجمہ: بلقیس جہاں	دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۷/۵۰
پریم چند کے خطوط	مرتبہ: مدن گوپال	" " " "	۶/۵۰
فسانۂ عجائب کا تنقیدی مطالعہ (نیا ترمیم شدہ ایڈیشن)	سید ضمیر احمد دہلوی	" " "	۳/۰
خوابوں کے شکاری (ناول)	مظہر الحق علوی	لکھنؤ، نسیم بک ڈپو	۱۰/۰
ڈراکیولا کی واپسی	" "	" " " "	۵/۰
لاج (ناول)	بلقیس صادق علی	" " " "	۶/۰
آزاد نظم اردو شاعری میں (ادبی)	کنول کرشن بالی	" کتاب پبلشرز	۴/۰
عکس ریز	مظفر حنفی	" " "	۲/۵۰
اصنافِ ادب اردو	مرتبہ: ڈاکٹر قمر رئیس	علی گڑھ سرسید بک ڈپو	۲/۵۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	عبدالقادر سروری	" ایجوکیشنل بک ہاؤس	۳/۵۰
کھلونے	مسعود مفتی	لکھنؤ کتاب پبلشرز	۳/۰
اردو مرثیے کا ارتقاء	ڈاکٹر مسیح الزماں	" کتاب نگر	۱۴/۰
مثنوی دریائے عشق	مرتبہ اظہر مسعود رضوی	" " " "	۰/۵۰
قلمی مکتوب مبارک و تبلیغی تقریریں	مولانا محمد یوسف	دہلی، کتب خانہ انجمن ترقی اردو	۲۰/-
باپی (ناول)	عارف مارہروی	" پنجابی پستک بھنڈار	۲/۰
تاریخ آصفی	مرزا ابو طالب اصفہانی	" مکتبہ صبح ادب	۵/۰
روشن آرا (ناول)	عذرا جمال	" مشہور تاج کمپنی	۷/۰
خواب تماشا (نظم)	کمار پاشی	" نازش بک سنٹر	۴/۰
کٹی پتنگ (ناول)	گلشن نندہ	" ہند پاکٹ بکس	۳/۰
بڑی بڑی آنکھیں "	اوپندر ناتھ اشک	" " " "	۲/۰
اردو شاعری کی رنگینیاں	مرتبہ: پرکاش پنڈت	" " " "	۲/۰
چھ لاشیں (ناول)	کرنل رنجیت	" " " "	۱/۰

جائزے

سوزِ حیات

(مجموعہ کلام)

مصنف: یحییٰ بھائی جبدن والا
سنہ اشاعت: ۱۹۶۷ء
سائز: ۲۰×۲۶ صفحات: ۳۲۰
قیمت: سات روپے ۵۰ پیسے
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ بمبئی ۳

جناب یحییٰ بھائی جبدن والا کا مجموعۂ کلام "سوزِ حیات" پیشِ نظر ہے۔ اس سے پہلے موصوف کے دو مجموعے سیلِ غم اور مضراب غم شائع ہو چکے ہیں۔ اگر یہ قول صحیح ہے کہ "ناموں کا انتخاب افتادِ طبع کی آئینہ داری کیا کرتا ہے" تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان مجموعوں کا مصنف گدازِ دل کی دولت سے بھی مالا مال ہے جو غزلیہ شاعری کے لیے جزوِ لازم ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں مصنف نے شاعری سے متعلق تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان خیالات میں جو پاکیزگی، وضاحت اور سادہ بیانی ہے اُس سے مزید ثبوت ملتا ہے اس بات کا کہ اس شخص کے مزاج میں وہ سادگی موجود ہے جس سے بات میں تاثیر کی چمک پیدا ہوتی ہے، اُس کے ذہن و فکر میں وہ پاکیزگی کارفرما ہے جو انسان کو مثبت اندازِ نظر بخشا کرتی ہے اور اُس کے دل میں سوز و گداز کی وہ کیفیت نشین ہے جس سے "حسنِ فروغِ شمعِ سخن" ملا کرتا ہے۔ اس زمانے میں جب کہ دل کی دھڑکنیں، مشینوں کے شور میں ڈوبی جا رہی ہیں، خیالوں میں نفرتوں کی سیاہی اس طرح پھیلتی جا رہی ہے جیسے انسانیت کی آنکھوں میں پاکیزگی کا نور باقی نہ رہا ہو اور نفرت نے اچھائیوں کے سارے دروازے انسانیت پر بند کر دیے ہوں، ایسے لوگوں کا وجود بہت غنیمت ہے اور ضروری بھی ہے جن کا انسانیت پر ایمان ابھی تک باقی ہو اور جو فطرت کی نوازشوں سے مایوس نہ ہوئے ہوں۔ شعر و ادب کا ایک بڑا کام یہ بھی ہے کہ وہ انسان کو تسکین کی فرحت عطا کرے کیونکہ اس دنیا میں مصیبتوں کے اندھیرے بہت گہرے ہیں۔ یہ بات ہم کو یاد رکھنی چاہیے کہ ایسی کوئی دنیا اس زمین پر کبھی نہیں تھی جب کہ مصائب نہ ہوں اور آئندہ بھی ایسی کسی خیالی دنیا کا تصور نہیں کیا جا سکتا جو اس سرزمین پر موجود ہو اور مصائب سے یکسر خالی ہو۔ انسان کی سب سے بڑی کوشش

یہ رہی ہے اور یہی رہے گی کہ مصائب کا اندھیرا ہمہ گیر نہ ہونے پائے اور مسرتوں کی روشنی اپنا کام کرتی رہے۔ فنونِ لطیفہ کا وجود انسان کی اِسی کوشش کا ایک رخ ہے۔ اِن کے واسطے سے مصیبتوں سے بھری ہوئی اس دنیا میں وہ پناہ گاہیں فراہم کرتے ہیں جہاں انسان کچھ دیر کے لیے دم لے کر کاروبارِ حیات میں حصّہ لینے کے لیے پھر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ یہ حصولِ مسرّت کے مواقع اگر نہ ہوتے تو شاید انسانوں کے اندر سے جذبے کی لطافت ہوا ہو چکی ہوتی۔ شعر و ادب سب سے زیادہ اس مقصد کے حصول میں مدد کرتے ہیں۔ اِس لحاظ سے شاعری اور ادب کا وجود انسانیت کے لیے سب سے بڑی ضرورت ہے۔

اب یہ بھی واضح ہے کہ ایسی شاعری اور ایسا ادب جس میں منفی اندازِ نظر کارفرما ہو، جس کو پڑھ کر زندگی ناقابلِ برداشت بوجھ معلوم ہونے لگے اور اس بھری دنیا میں اندھیرے کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے، اور جس کا مآل یہ ہو کہ آدمی گھبرا کر خودکشی کے لیے آمادہ ہو جائے؛ ظاہر ہے کہ ایسی شاعری اور ایسا ادب اُس مقصد کو پورا نہیں کرے گا جس کے لیے وہ عالمِ وجود میں آیا ہے اور صحیح الفاظ میں اس کو انسانیت دشمن اگر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا ـــ

یحییٰ صاحب کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کو پڑھ کر زندگی سے نفرت کرنے کے بجائے، اس سے محبت کرنے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ اُن کی غزلوں میں افکار کی وہ پیچیدگی اور گہرائی نہیں ہے جن سے فلسفیانہ حقائق کی عقدہ کشائی کی طرف ذہن منتقل ہو، اس کے بجائے ایسی سادہ خیالی اور سادہ بیانی ہے جس سے جذبے کی گرمی پیدا ہوتی ہے۔ یہ بھی بڑی بات ہے، چند اشعار سے اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے:

فقط عنوان بدلے ہیں محبت کے مگر اب تک
نہ دل بدلا کسی کا اور نہ دل کی داستاں بدلی

اب نہ گھبراؤں گا انجامِ وفا سے ہرگز
اب تو ہر رازِ محبت کا عیاں ہے دل پر

جیسے جیسے ٹوٹتی جاتی ہیں امیدیں مری
ویسے ویسے رازِ ہستی مجھ پہ کھلتا جائے ہے

مطمئن کر نہ سکے جو مرے ٹوٹے دل کو
اُس یقیں سے تو مرا وہم و گماں اچھا ہے

جتنا تجھے بھلانے کی کوشش کرے گا دل
اتنا تری جدائی کا غم ہوگا اور بھی

نظروں سے ہو نہ شوق کا اظہار دیکھنا
پھر تمنا اُٹھے نہ رخِ یار دیکھنا

عشق کی قسمتِ محرومِ الٰہی توبہ　　یہ بھی اب یاد نہیں ہم کو کہ کیا بھول گئے
گر خزاں رہتی تو ہوتے پامال　　فصلِ گل آئی تو بدنام ہوئے
فردا کا ہے مدار تمنائے مرگ پر　　حسرت نکل گئی تو نہ فردا نہ حال ہے
ذوقِ نظارہ کا سرمایہ بہت تھا پھر بھی　　تم کو گر دیکھ نہ لیتا تو کمی رہ جاتی

کتاب اس حسن کے ساتھ چھپی ہے کہ "عروسِ جمیل و لباسِ حریر" کا مقولہ اس پر صادق آتا ہے۔ ان کے پہلے مجموعے بھی ایسے ہی حسن کے ساتھ چھپے ہیں۔ اس سے ان کے مزاج کی نفاست کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ایسے نفیس مزاج میں فکر و خیال کی کثافت کا گزر ویسے بھی نہیں ہوسکتا۔ اس مجموعہ کی کتابت میں ضرورت سے زیادہ جلی قلم استعمال کیا گیا ہے اور اس نے حسنِ تناسب میں کمی نمایاں کردی ہے مجموعہ مصوّر ہے لیکن بعض تصویریں بے جوڑ سی معلوم ہوتی ہیں مثلاً صفحہ ۱۶۸ پر۔ اس غزل میں ایسا کوئی شعر نہیں جو اس نقش کے کسی پہلو سے کوئی مناسبت رکھتا ہو۔ اچھا یہ ہوتا کہ ہر صفحے پر جو نقش مرتسم کیا جاتا اُس کو اُس صفحے کے کسی شعر سے کوئی خصوصی مناسبت ضرور ہوتی۔

یہ کتاب اس قدر دیدہ زیبی کے ساتھ شائع کی گئی ہے کہ مکتبہ جامعہ کے معیارِ حسنِ طباعت پر ایمان لے آنا پڑتا ہے اور اسے ہر خوش ذوق قاری کے کتاب خانے کی زینت ہونا چاہیے۔

سعادت صدیقی

●

تلاش و توازن

مصنف: ۔ ڈاکٹر قمر رئیس
سائز: ۲۰×۳۰/۱۶　　صفحات: ۲۵۶
سنہ اشاعت: ۱۹۶۸ء
قیمت: چھ روپے ۵۰ پیسے
ملنے کا پتا: ادارۂ خرام پبلیکیشنز، حوض قاضی دہلی ۶

پریم چند کا تنقیدی مطالعہ "شخصیت اور کارنامے" مضامین، غرض ان کو مختلف حیثیتوں سے مقبول اور متعارف کراتے رہنے کی وجہ سے خود ڈاکٹر قمر رئیس کے کسی تعارف کی ضرورت نہیں رہ گئی ہے۔

"تلاش و توازن" مجموعہ ہے ان کے گیارہ مضامین بلکہ مقالوں کا، یہ مضمون بعض رسالوں میں بھی چھپ چکے ہیں اور اب ان کو کتابی صورت میں پیش کرتے وقت نظرِ ثانی بھی کی گئی ہے یہ تمام مضامین ایک سوچے سمجھے ہوئے نقطۂ نظر اور اندازِ فکر کے ترجمان ہیں۔ اُن کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ اور یہ مضمون کب اور کن محرکات کے تحت لکھے گئے ہیں، اُن کا ذکر اور صراحت دیباچے میں موجود ہے۔

مضامین کا بیشتر حصہ افسانوی ادب سے متعلق ہے "پریم چند" اور "افسانوی آرٹ" ان دونوں پر بحیثیتِ مجموعی، اور الگ الگ، بلحاظ عنوان اور موضوع، ڈاکٹر قمر رئیس کا مطالعہ بہت وسیع ہے ان کی نظر بہت گہری، ان کی لکھی ہوئی باتیں صاف اور سلجھی ہوئی نیز اُن کی رائے بہت مستحکم اور وقیع ہے۔

پریم چند سے پہلے اور بعد کے افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں سے متعلق ڈاکٹر قمر رئیس کا جو زاویۂ نگاہ اور اندازِ فکر ہے وہ کم ہی لوگوں کے حصے میں آیا ہوگا تعریف و تنقیص بظاہر جتنی عام اور آسان ہے اتنی ہی زیادہ نازک اور خطرناک بھی۔ اس معاملے میں بڑوں بڑوں کے قدم ڈگمگاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور بہت سے ایسے بھی ملیں گے جو اس راہ پر چل کر گمراہ بھی ہو گئے ہیں۔ بہر حال! اعتدال اور توازن ہی وہ چیز ہے جو معیار کو گھٹنے اور منطقِ نظر کو پست نہیں ہونے دیتی۔ قمر رئیس کی تحریریں اس وصف سے خالی نہیں کہی جا سکتی ہیں۔ ان کے کسی مضمون کو دیکھ کر یہ گمان نہیں ہوتا کہ انھوں نے افراط و تفریط سے کام لیا ہے اس لیے کہ ان کی تعریف میں نہ غلو ہوتا ہے اور تنقید میں شدت اور جانب داری "اردو ناول کا تکمیلی دور" اور "جدید اردو ناول" ان مقالوں میں دورِ اوّل کے ناول نگاروں سے لے کر آج تک کے تمام قابلِ ذکر ناول نویسوں کا ذکر آ گیا ہے محرکات، سماجی اثرات، جائزے اور تبصرے غرض ہر ادبی اور تنقیدی پہلو سے ان کی نگارشات اور نمائندہ ناولوں کو دیکھنے، جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور پھر جو رائے قائم کی گئی ہے اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ لکھنے والے کا ذہن اور قلم "تلاش و توازن" کے صحیح مفہوم سے کہیں بھی منحرف یا متجاوز ہو گیا ہے۔ سوچنے کا یہ طریقہ اور لکھنے کا یہ سلیقہ بہت سی حیثیتوں سے ہمارے بزرگوں کے لیے ہمت افزائی اور نوجوانوں کے لیے تقلید کا مستحق ہے۔

غالب، ٹیگور، آزاد انصاری، فراق، ندیم اور شاذ تمکنت ان لوگوں کے بارے

ین بھی تمر رئیس نے جو کچھ لکھا ہے اس ضمن میں ان کی وسعتِ مطالعہ اور ثابتِ رائے کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ "جدید ازبکی شاعری" میں وہاں کے بعض مشہور شاعروں کے رجحانات اور انداز فکر کی منظوم ترجمانی بڑی خوبصورتی سے کی ہے۔

افادی اور معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ کتابت و طباعت میں بھی صحت اور خوش نمائی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ ان اوصاف اور محاسن کی بنا پر اس کتاب کو اہل علم اور ارباب ذوق کے حلقے میں مقبول ہونا چاہیے۔ (رشید نعمانی)

دلّی والا

چیف ایڈیٹر: صابر دت
معاون: سب پڑھنے والے
سائز: ۲۰×۳۰/۴ صفحات: ۸
قیمت سالانہ: چھ روپے، فی پرچہ ۲۵ پیسے
پتا: پوسٹ بکس نمبر ۳۷۱، نئی دہلی

"دلّی والا" ایک پندرہ روزہ اخبار ہے اور اب تک اس کے دس گیارہ شمارے منظرِ عام پر آ چکے۔ تعریف کی بات یہ ہے کہ نئے اخبار رسالوں کی روایات کے برخلاف یہ ابھی تک بند نہیں ہوا ہے اور خلاف توقع نہ صرف یہ کہ برابر شائع ہو رہا ہے بلکہ تعجب تو یہ ہے کہ وقت پر شائع ہو رہا ہے اور اس کا ہر شمارہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور دلچسپ سے دلچسپ تر بنتا جا رہا ہے۔ لیکن اگر اس کے سب شمارے ایک ساتھ دیکھ ڈالے جائیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اخبار یا تو ابھی تک پوری طرح اپنی پالیسی کا تعین نہیں کر سکا ہے یا اسی غیر متعین پالیسی کو ہی اس نے اپنا شعار بنا یا ہے۔ شائد اسی لیے اس کے نویں شمارے کے ایڈیٹوریل میں اور باتوں کے علاوہ اس طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے کہ "..... ہم اور ہماری پالیسی کسی خاص شخص یا کسی خاص سرپرست کی پابند نہیں ہے ہم نے اب تک جو درست اور صحیح سمجھا ہے وہی شائع کیا ہے اور آئندہ بھی یہی رویہ اختیار کیے رہیں گے ..." شائد اسی پالیسی کی وجہ سے "آخری صفحہ" کے نام سے مستقل عنوان کے تحت فکر تونسوی صاحب کے مزاحیہ خاکے یا مضمون کے علاوہ، جو البتہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے، اس اخبار میں کوئی مضمون، خبر یا سلسلہ مستقل شائع نہیں ہو رہا۔ ادبی اور

سیاسی خبریں، خبروں پر تبصرے، خاکے، ذاتی اور ادبی خطوط، شعر و شاعری، مشاعروں، ادبی محفلوں اور نشستوں کی رپورٹ، غرض یہ اور اس طرح کی بہت سی چیزیں پڑھنے کو ملیں گی لیکن بغیر کسی التزام کے۔ ہو سکتا ہے بہت سے پڑھنے والے خود بھی کسی پابندی کے قائل نہ ہوں، اور اخبار کا یہی انداز انھیں پسند بھی ہو لیکن ان کی پسند کا احترام کرتے ہوئے بھی اگر اخبار کے نام کی مناسبت سے ایک یا دو صفحے دلی اور دلی والوں کے لیے وقف ہو جائے تو بڑی اچھی بات ہوتی، اس طرح وقت کی ایک بڑی ضرورت بھی پوری ہو جاتی اور اس کے پڑھنے اور پسند کرنے والوں کا ایک نیا حلقہ بھی بن جاتا۔

دلی کی تاریخی عمارتیں یہاں کے میلے ٹھیلے، قومی تہوار، نئے نئے دفاتر، سڑکیں، بسیں، یہاں کے رہنے والے اور ان کے شب و روز غرض اس طرح کے بہت سے موضوع ہیں جن پر لکھا جا سکتا ہے اور مہینوں لکھا جا سکتا ہے۔ زیادہ نہیں تو صرف یہی ہو جاتا کہ دلی کی بولی ٹھولی میں یہاں کے روزمرہ کے حالات پر طنزیہ مضامین کا ایک مستقل سلسلہ ہی شروع کر دیا جاتا تو اس طرح ادب کی خدمت بھی ہو جاتی اور اخبار کی افادیت بھی بڑھ جاتی ـــــ ریحان احمد عباسی

عرشیہ

مصنف : نوشابہ سعید ناز

صفحات : ۱۹۰ سائز : $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۱۶}$

قیمت : تین روپے ۵۰ پیسے

ناشر : نسیم بک ڈپو، لکھنؤ

عرشیہ ایک ایسی لڑکی کی داستان ہے جو بیک وقت دو روپ میں اُجاگر ہوتی ہے ایک روپ ہے جاہل اور کند ذہن لڑکی کا اور دوسرا ایک مایہ ناز ادیبہ کا۔ دراصل یہی ہستی، جو دو متضاد پارٹ ادا کرتی ہے اس ناول کا مرکزی کردار ہے جس کے گرد کہانی کے تانے بانے بنے گئے ہیں اور بالآخر جسے ایک بہترین اور دلچسپ داستان کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔ یہ دو کردار جس خوبصورتی اور چابک دستی سے نوشابہ سعید ناز نے ادا کرائے ہیں یہ اُن ہی کا حصہ ہے جس کے لیے بے اختیار داد دینے کا جی چاہتا ہے۔ کہانی کا انداز، اس کے واقعات اور حادثات اتنے دلچسپ اور برمحل ہیں کہ پڑھنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس میں قہقہوں کی یورش بھی ہے اور جذبات کی حرارت بھی۔ زبان سادہ اور بامحاورہ ہے

ادبی خبریں

انجمن ترقی اُردو ہند نے اپنی نئی پانچ منزلہ عمارت کی تعمیر کے سلسلے میں، جس کا سنگ بنیاد نئی دہلی میں رکھا جا چکا ہے، اُردو دوستوں سے چندے کی اپیل کی ہے۔ اس سلسلے میں انجمن نے ایک روپیہ، پانچ روپے، دس روپے، بیس روپے اور پچاس روپے کی رسیدیں چھپوائی ہیں اور اس مقصد کے لیے طریقۂ کار یہ تجویز کیا ہے کہ خود اراکینِ انجمن اور انجمن کی دوسری شاخوں کے ذمہ دار حضرات ملک بھر میں گھوم کر چندہ جمع کریں۔ جو صاحبان بھی جمع کرنے کے مجاز ہوں گے اُن کے اور ان کے معاونین کے ناموں کا باقاعدہ "ہماری زبان" اور دوسرے اخبارات میں اعلان کیا جائے گا۔ لیکن چونکہ ان حضرات کی تعداد زیادہ نہیں ہوگی اور وہ ہر جگہ پہنچ بھی نہیں پائیں گے اس لیے محبانِ اُردو سے یہ اپیل بھی کی ہے کہ وہ رقوم براہِ راست انجمن کے صدر دفتر علی گڑھ کے پتے پر بذریعہ منی آرڈر، چیک یا ڈرافٹ بھجوانے کا کرم فرمائیں۔ رقم بھیجنے کے لیے اتنا پتا کافی ہوگا: جنرل سکریٹری۔ انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ۔ جو رقوم براہ راست یا بہ توسط دفتر پہنچیں گی، انجمن کے دفتر سے ان کی ایک رسید بھی جاری کی جائے گی اور اُن کے اسمائے گرامی کی فہرست ہفتہ وار "ہماری زبان" میں شائع کی جائیں گی۔

●

مورخہ ۳ راگست ۱۹۶۸ء بوقت ۸ بجے شب "ادارہ بزم شفا" سیجوا (دھنباد) کے زیر اہتمام جناب شاہد جمال صاحب کی صدارت میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں مشہور و معروف شاعر استادِ سخن حضرت شفا گوالیاری کی اچانک موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ اس موقع پر مرحوم کے دو عزیز شاگردوں جناب عابد عزیزی اور شان بھارتی کے علاوہ پروفیسر اُلفت مظفرپوری، ڈاکٹر راہی، مضطر جوادی ادیب کامل (علیگ) اور شاہد جمال نے مرحوم کی نجی زندگی، ان کے حسنِ اخلاق اور ان کی شاعری پر اپنے اپنے مضامین پڑھے اور مندرجہ ذیل شعراء نے مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے منظوم تخلیقات سے اپنے رنج و الم کا اظہار کیا۔

شاہد جمال، پروفیسر اُلفت مظفر پوری، مضطر جوادی ادیب کامل (ملیگ) عابد عزیزی، شاں بھارتی، سرور نگینوی، انجم مونگیری، ڈاکٹر راہی، قدوس سبحلی، صبا اُناوی،

آخر میں پروفیسر اُلفت مظفر پوری نے ایک تعزیتی قرارداد پیش کی جس میں مرحوم کی اچانک موت پر گہرے رنج والم کا اظہار کیا گیا اور خدا سے دعا کی گئی کہ وہ ان کی روح کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ مرحوم کے لیے دُعائے مغفرت کے بعد جلسے کا اختتام ہوا (منیر ہاشمی پروپیگنڈہ سکریٹری "بزم تشغا")

●

وسکانسن یونیورسٹی کے شعبۂ علوم ہند نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو ایک سال کے لیے اردو زبان وادب کی وزیٹنگ پروفیسر شپ کی پیش کش کی ہے۔ ڈاکٹر نارنگ اس سے پہلے بھی وسکانسن میں کام کر چکے ہیں، جہاں ان کی مرتب کی ہوئی کتاب Readings in Literary Urdu Prose حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ وسکانسن میں وہ تعلیمی کام کے علاوہ اُردو صوتیات پر ایک کتاب بھی لکھیں گے۔

●

"تاشقند ۴ اگست۔ ایک مقامی اشاعت گھر نے افریشیائی ادیبوں کی تاشقند کانفرنس کی دسویں سال گرہ کے سلسلے میں ہندوستانی ادیبوں کی متعدد کتابوں کے ازبک تراجم کا اجرا کیا ہے۔ ان میں پریم چند کا ناول "نرملا" اور انا بھاؤ سلٹھے کی کہانی "چترا" شامل ہیں۔ جن کتابوں کے تراجم کی اشاعت کی تیاریاں ہو رہی ہیں، ان میں بھوانی بھٹاچاریہ کا ناول "ٹائگر سوار" اور رضیہ سجاد ظہیر کا ناول "سمن" شامل ہیں۔
بھوانی بھٹاچاریہ کے ناول "ٹائگر سوار" کا اُردو ترجمہ "دلدل" کے نام سے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ سے شائع ہو چکا ہے جس کا ترجمہ بیگم رضیہ سجاد ظہیر نے کیا ہے۔

●

ہندوستان کے عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب کی سو ویں برسی ۱۵ فروری کو سوویت یونین میں بھی منائی جائے گی۔ سوویت ادیبوں نے ۱۹۶۹ء کو مرزا غالب کا سال قرار دیا ہے۔ اور منصوبہ بنایا ہے کہ اس سال غالب پر اور بھی زیادہ کتابیں شائع کی جائیں۔

REGD. NO. D56 SEPT. 1968

KITAB NUMA
Jamia Nagar, N. Delhi - 25.

پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے جمال پریس دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر نئی دہلی نمبر ۲۵ سے شائع کیا۔

۹(۱۵)

ماہنامہ

اکتوبر ۱۹۶۸ء

مکتبہ جامعہ ملیہ نئی دہلی

قاعدہ

یسّرنا القرآن

یہ قاعدہ مکتبہ جامعہ نے تعلیمی اصولوں کے پیش نظر نئی ترتیب کے ساتھ نئے سرے سے مرتب کیا ہے۔ غیر ضروری چیزیں کم کی گئی ہیں۔ سبقوں اور مشقوں میں مفید اضافے کیے گئے ہیں۔

ہر سبق کے شروع میں پڑھانے والوں کے لیے آسان اور مختصر ہدایتیں دی گئی ہیں جن کی مدد سے معمولی اُردو جاننے والے والدین بھی اپنے بچوں کو آسانی کے ساتھ بہت کم مدت میں قرآن مجید پڑھا سکتے ہیں۔

ان خوبیوں کی وجہ سے اس قاعدے کی افادیت بازار میں ملنے والے عام قاعدوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔

سفید گلیز کاغذ.................. آفسٹ کی چھپائی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار، دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

مینیجنگ ایڈیٹر:-
غلام ربانی تاباں
مدیر مسئول:-
مجیب احمد خاں

ماہنامہ
کتاب نما
نئی دہلی

اکتوبر ۱۹۶۸ء
جلد ۹ شمارہ ۱۰

سالانہ چندہ دو روپے
فی پرچہ بیس پیسے

اشاریہ

۲ر اکتوبر کو مہاتما گاندھی کی سنوپیں سالگرہ منانے کے سلسلے میں پورے ہندوستان میں بڑے زور شور سے تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ بیرونِ ہند سے بھی اس قسم کی خبریں آرہی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس بار پوری دنیا میں یہ دن بڑے جوش و خروش اور خاص اہتمام سے منایا جائے گا۔ اس موقع پر ہزاروں جگہ بڑے پیمانے پر جلسے جلوس تو ہوں گے ہی، اس کے علاوہ گاندھی جی کے اقوال و افکار اور ان کی سیرت و شخصیت سے متعلق بھی جگہ جگہ مختلف زبانوں میں بہت سی کتابیں شائع کی جائیں گی تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان سے مستفید ہو سکیں۔

ہر سال گاندھی جی کے یومِ پیدائش اور وفات دونوں موقعوں پر "پرارتھنا سبھائیں" ہوتی ہیں جن میں ہر مذہب و ملت کے ماننے والے شریک ہوتے ہیں اور سب لوگ اور خاص طور سے وہ بڑے آدمی جنھیں خیر سے اس وقت حکومت چلانے کا فخر حاصل ہوتا ہے، بڑی عقیدت اور احترام سے گاندھی جی سے اپنے مخصوص لگاؤ کی طرف اشارہ کرتے ہیں بعدۂ اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کا عہد اور تلقین کرتے ہیں۔

"آتم کتھا" کے نام سے بھی ہم روزانہ ہی ان کے خیالات ریڈیو پر سنتے ہیں اور جگہ جگہ تختوں کے فریموں اور دیواروں پر ان کے اقوال بھی پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ آج سے نہیں بلکہ پچھلے بیس سال سے قائم ہے جب سے وہ شہید ہوئے۔ لیکن افسوس کہ بجز معدودے چند، زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی نظر آتی ہے جو صرف دکھاوے کے لیے ہر سال یہ ڈرامہ کھیلتے ہیں اور ان عہد و پیمان کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور جو کہتے ہیں اس پر کبھی عمل

نہیں کرتے۔

گاندھی جی کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کے قول و عمل میں تضاد نہ تھا۔ جو کہتے تھے وہی کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ سچائی کا ساتھ دیتے اور حق کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے ہر وقت سینہ سپر ہو جاتے تھے۔ وہ جب کسی بات کو ایک بار مان لیتے تو پھر اس سے کبھی پیچھے نہ ہٹتے تھے چاہے اس میں انھیں کتنی ہی دشواری اور پریشانی کیوں نہ اُٹھانی پڑتی۔ اربابِ حکومت ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں کہ کیا وہ بھی یہی انداز اور یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں؟ اور باتوں کو چھوڑیے، صرف زبان ہی کے معاملے میں کیا انھوں نے گاندھی جی کے خیالات کا لحاظ رکھا ہے؟ کیا انھوں نے سب زبانوں کے ساتھ انصاف سے کام لیا ہے؟ گاندھی جی جس طرح کی زبان کو سرکاری زبان بنانے کے حق میں تھے کیا آج وہی زبان رائج ہے؟

ہم تو بس اتنا ہی کہتے ہیں کہ خدا کرے کہ طفل تسلیوں اور جھوٹے وعدوں کا یہ سلسلہ اب کسی طرح بند ہو جائے اور اس بار جو بھی عہد کیے جائیں وہ سچے دل سے ہوں اور خدا اس پر عمل بھی کرنے کی توفیق عطا کرے۔

یو پی میں بہت جلد ضمنی انتخابات ہونے والے ہیں۔ سنا ہے کہ کانگریس پارٹی نے وعدہ کیا ہے کہ اگر اس بار یو پی میں برسرِ اقتدار آگئی تو وہ اُردو کو اس کا جائز حق دلائے گی۔

مجھے دے رہے ہیں تسلیاں وہ ہر ایک تازہ پیام سے
کبھی آکے منظرِ عام پر، کبھی ہٹ کے منظرِ عام سے

(جگر)

فسانۂ عجائب کا تنقیدی مطالعہ (تنقید)

سید ضمیر حسن دہلوی

رجب علی بیگ سرور کی کتاب "فسانۂ عجائب" اُردو نثر کی شاہراہ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے یہ مقفّٰی و مسجّع نثر بھی ہے اور ایک مخصوص سماج کی آئینہ دار بھی۔ ضمیر صاحب نے سرور کی اسی مقفّٰی اور مسجّع عبارت کے تمام پہلوؤں پر انتہائی جامع انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے اس کا نیا اڈیشن بعد نظرِ ثانی ابھی حال میں ہی شائع کیا ہے۔

قیمت: تین روپے

تعارف

دلی کی شام

احمد علی کا ناول Twilight of Delhi پہلی بار ہوگارتھ پریس
لندن سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ اسے بہت جلد ساری مغربی دنیا میں غیر معمولی مقبولیت
حاصل ہو گئی۔ ای۔ ایم فارسٹر اور ایڈون میور، جیسے اصحاب نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ
اُسے سراہا۔ خود ہندوستان میں اُسے بے حد پسند کیا گیا۔ پھر بھی اس شہرۂ آفاق ناول کا ترجمہ
اُردو میں شائع نہیں ہوا۔ بڑی مسرت کی بات ہے کہ اب ہندوستان کے اُردو داں طبقے
کو اس مقبول و معروف ناول سے لطف اندوز ہونے کا موقع نصیب ہو رہا ہے۔ یہ ترجمہ
بلقیس جہاں کے قلم کا رہینِ منت ہے جو مصنف کی رفیقۂ حیات ہیں اور خود اس زبان و تہذیب
کی نمائندہ کہلانے کی مستحق ہیں جس سے یہ ناول عبارت ہے۔ خود مصنف نے اس ترجمے کے
بارے میں اپنے نہایت ہی مختصر دیباچے میں فرمایا ہے کہ "میں خود اس سے اچھا ترجمہ اُردو
میں پیش نہیں کر سکتا تھا" اور حقیقت بھی یہی ہے کہ 'دلی کی شام' ترجمہ نہیں بلکہ اصل ناول
ہی ہے۔ جس تہذیب کی آئینہ داری اُس میں کی گئی ہے' اسی عہد کی زبان کا چٹخارہ بھی اس
میں موجود ہے۔ وہی انداز، وہی لہجہ، وہی محاورے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ "ناول کے کردار
اور اس کا قصہ فرضی ہیں لیکن واقعاتِ زندگی اور دلی کے حالات تاریخی حیثیت رکھتے
ہیں۔" دراصل یہ یادگارِ زمانہ اور نمائندہ کردار ہیں جو اپنے بچے کھچے تہذیبی ورثے کے
آخری امین تھے جس کے آثار بھی اب مشکل سے نظر آتے ہیں۔

'دلی کی شام' ایک تہذیب اور ایک عہد کی داستان ہے۔ وہ خود مجسم دلی شہر ہے
۱۹۱۰ء کے آس پاس کی دلی، دلی دربار، پہلی جنگِ عظیم اور ترکِ موالات کے زمانے کی دلی۔

اس وقت کے شادی بیاہ، موت وزیست، مشغلے اور مرحلے سب ہی کچھ اس میں سموئے ہوئے ہیں اور اس طرح پیش ہوئے ہیں کہ ایک مربوط کہانی بن گئے ہیں جو ایک خاندان کی کہانی ہے ہے ایک محلّے اور ایک شہر کی کہانی بھی، ایک تہذیب اور ایک معاشرے کی کہانی بھی۔
ناول پڑھتے وقت جیتے جاگتے مناظر آنکھوں کے سامنے سے گزرتے چلے جاتے ہیں۔ اس میں اس حقیقت کا بیان ہے جو آج افسانہ بن چکی ہے۔ اس میں اُن افراد سے نیاز حاصل ہوتا ہے جن کے شناسا بھی آج دہلی میں بہ مشکل ہی نظر آئیں گے۔ اس اُن گلی کوچوں کا ذکر ہے جن کا کچھ نہ کچھ نام تو باقی ہے لیکن بُو باس مٹ چکی ہے۔ اور یہ سب کچھ احمد علی نے اس دل کے ساتھ لکھا ہے جس کے لیے دلّی کی شام، متاعِ عزیز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں خلوص کی گرمی اور محبت کی نرمی پائی جاتی ہے۔ ایک لٹی ہوئی تہذیب کے مٹتے ہوئے نقوش کی مصوّری میں خونِ جگر کے چھینٹے بھی ہیں اور خود داستان کی اپنی حسرت ناکی بھی۔ یہاں ایک ایسا تاثر اور تاسّف موجود ہے جو ناول پڑھنے کے بعد بھی دیر تک قائم رہتا ہے۔

اب ذرا دیکھیے کہ "اس تھکے ہوئے نظام کی یہ شام بھی کہاں ہوئی"!۔

دلّی کا حال سنیے:

"یہ سرزمین کبھی شہنشاہوں، تاجداروں، امرا اور رؤسا، داستان گو اور شاعروں کا مسکن تھی۔ مگر اب نہ کوئی بادشاہ ہے نہ محافظ، نہ شاعروں کے وہ قدردان۔ پرانے باسی گو آج بھی زندہ ہیں مگر غیروں کے محکوم، اپنا فخر و اقتدار، اپنا نام و نمود اور تمکنت سب کچھ لٹا بیٹھے ہیں۔

شہر آج بھی آباد ہے۔ قلعے، مقبرے اور محلات اور عمارتیں جو گزرے دنوں کی یاد تازہ کرتی ہیں، جوں کی توں زندگی کا دامن اس اعتماد سے تھامے کھڑی ہیں جو ادراک اور گمان سے بالاتر ہے۔"

ذرا میر نہال سے بھی متعارف ہو جائیے، یہی اس ناول کا مرکز ہیں۔

"میر نہال اندر آئے۔ یہ دراز قد اور دُہرے بدن کے جامہ زیب آدمی تھے۔ اسفید تنزیب کا انگرکھا پہنے ہوئے تھے اور کڑھی ہوئی گول ٹوپی بھوؤں پر بانکپن سے ترچھی رکھی ہوئی تھی۔ ان کی بنی سنوری چڑھی ہوئی سفید داڑھی کی مانگ کا ایک بال بھی بے جگہ نہ تھا۔ ان کے چہرے پر رعب و دبدبہ اور ان کی چال میں وجاہت اور شاہانہ وقار تھا۔

"آج تم بغیر کھائے پیے ہی چلے گئے" بیگم نہال نے ذرا تُنک کر کہا۔ "کون وقت ہو گیا کب سے راہ دیکھ رہی ہوں"

"ابھی تو صرف گیارہ بجے ہیں" میر نہال نے دبے لہجے میں جواب دیا: "گلی کے نکڑ پر گھنٹہ کی آواز آئی تھی"

اتنے میں رچھپن سینی میں کھانا لے آئی۔ بیگم نہال نے تخت پر دسترخوان بچھا کر کھانا چن دیا میر نہال نے انگرکھا اتار کر کاوٗتکیہ پر رکھ دیا۔ جا کر ہاتھ دھوئے اور اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ بیگم نہال قریب بیٹھ کر پنکھا جھلنے لگیں اور پھر میاں سے بولیں:

"اصغر اللہ رکھے بائیسویں میں ہے۔ اب ہمیں اس کے بیاہ کی فکر کرنی چاہیے خدا نہ کرے کہیں ایسے ویسے فعلوں میں نہ پڑ جائے"

اور ذرا میاں بیوی کی گفتگو بھی سنتے جایئے، وہی محبوب مشغلہ، بیٹے کی شادی:

"اللہ بکلا بر گردن ملا! ہر بات میں تم مجھ ہی کو قصور وار ٹھہراتے ہو۔ تمھاری ان باتوں سے تو مجھے مرچیں لگتی ہیں۔ آخر وہ تمھارا بھی تو بیٹا ہے تم خود کیوں نہیں کہتے، اور اسی لیے میں اس کی شادی کا کہہ رہی تھی" پھر بات کا رُخ بدلتے ہوئے بولیں "تم اللہ رکھے باہر کے پھرنے والے۔ گھر کی تمھیں خبر نہیں۔ میری جان کو ایک فکر ہو تو کہوں، سیکڑوں غم لگے ہیں۔ تمہاری بہو کا فکر کھائے جاتا ہے۔ لو تم سے کہنا ہی بھول گئی" پھر انھوں نے مڑ کر اپنی بیٹی کی طرف دیکھا جو بے خبر سو رہی تھی۔ جوں ہی وہ مڑیں لالٹین کی روشنی اُن کے چہرے پر پڑی اور اُن کی محراب دار پیشانی پر تین بل نمایاں ہو گئے "ہاں تو میں کہہ رہی تھی بھوپال سے خط آیا ہے۔ اُن لوگوں کو جلدی ہے"

اُن دنوں کا محبوب مشغلہ کبوتر بازی تھا ایک جھلک آپ بھی دیکھیے:

"میر نہال کے اُڑان کبوتر کوٹھے پر پلے ہوئے تھے۔ انھوں نے جا کر کبوتر کھولے۔ وہ ابھی جال میں سے نکلے ہی تھے کہ چھیپی لے میر نہال ان کی طرف لپکے اور زور سے شُش کی آواز لگائی۔ کبوتر اُڑ گئے۔ ان کی ٹکڑی میں ہر طرح کے جانور تھے، کاسنی اور لال بند، گھرے اور چپ، جنگلے اور شیرازی۔ کبوتروں نے چھت کا چکر لیا پھر جھنڈی کا اشارہ دیکھ کر مشرق کی سمت تیر کی طرح چل دیے جہاں خواجہ اشرف علی کے رنگین اُڑ رہے تھے۔ خواجہ صاحب کی ٹکڑی کے قریب پہنچتے ہی انھوں نے ایک کرکری لی اور ان کبوتروں سمیت پلٹ گئے

اور فوراً گھر کا رُخ کیا۔ اِنھیں آتا دیکھ کر میر نہال نے دو انگلیاں مُنہ میں ڈالیں اور سیٹی بجانے لگے۔ آواز سنتے ہی کبوتروں نے رُخ پھیرا اور دور نکل گئے۔"

روزانہ زندگی کا یہ رنگ ڈھنگ بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ:

"گردشِ دوجہاں سے بے خبر نازک اور معصوم زندگیاں گزرتی رہتیں، ایک دن آتا اور دوسرا چلا جاتا۔ صبح ہوتی شام ہوتی۔ ماہ و سال صدیاں بن جاتے، مرد زندگی کی آزمائشوں سے برسرِ پیکار رہتے، مردانہ قوتیں تلخیٔ حیات کا مقابلہ کرتیں اور یہ مورتیں دنیا کی آفتوں سے پناہ میں رہتیں۔ ان کا وقت گھر کے روزمرّہ کے کام کاج، سینے پرونے میں کٹ جاتا۔"

اور

"دونوں وقت سقّہ آواز لگاتا: "پانی لے آؤں؟" اور جواب ملے بغیر مُنہ پر اندھیری ڈال اندر آ جاتا۔ اس کی کمر مشک کے بوجھ سے جھکی رہتی۔ اس کے ہاتھوں کی جلد بارہ مہینے پانی میں بھیگنے سے موٹی اور سخت پڑ گئی تھی اور رگھائیاں پھٹ کر سفید سفید کھپرے جم گئے تھے۔ وہ مشک کا تسمہ کھولتا اور غلل غلل پانی مٹکوں میں بھر دیتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

دہلی کی جامع مسجد آج بھی بدستور اپنی جگہ پر موجود ہے۔ اس کی سیڑھیاں اب بھی آباد رہتی ہیں۔ لیکن اُس وقت:

"مشرق کی طرف نیچے سیڑھیوں پر چڑی مار طرح طرح کی چڑیاں بیچ رہے تھے۔ جن میں الّو، بٹیر، بُلبُل اور طوطے مینا سے لے کر شِکرے باز، نقرنوں، لال، پدڑیاں اور ہُد ہُد سب ہی کچھ تھے۔ نچلی سیڑھیوں پر بساطی تھے جن کے پاس رنگ برنگی لنگیاں، کارچوبی ٹوپیاں، موتی اور گوٹے کی ہڑوں کے ازاربند اور چٹیلے تھے۔ ان سے ذرا ہٹ کر کباڑیے ہر قسم کا سامان لیے بیٹھے رہتے تھے۔ ان میں بوسیدہ کتابوں کے قلمی نسخوں کے علاوہ چینی کے برتن، قابیں، طشت جاناں، غوریاں اور گلدان قرنوں پرانے شمع دان، ہنڈیاں اور فانوس، شیشے کی صراحیاں، فتیل سوز، دوشاخے اور سہ شاخے، اور یہاں تک کہ چھپر کھٹ اور میز کرسیاں۔ بڑے بڑے کاٹھ کے صندوق جن پر نَچّو، کاری، جست کی چادروں پر پھول پتّی اور رنگین نقش و نگار بنے ہوئے تھے سب ہی کچھ تھا۔

شمالی سیڑھیوں اور مقابل کے میدان میں دوا فروش اور جڑی بوٹی والے

سانڈھوں اور حواصل کا تیل، شیر کی چربی، ریچھ کے دانت، لومڑی کی دُم اور مگرمچھ کے منہ اور ریڑھ کی ہڈیاں لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ بعضوں کے پاس زندہ گرگٹ، گوہ، سانپ، بچھو، کنکھجورے، نیولے اور جھگادڑیں تار کے پنجروں اور کاٹھ کے ڈبوں یا بانس کی پٹاریوں میں بند تھیں، ان عطائی نیم حکیم طبیبوں کی جڑی بوٹیاں اور تیل عرقیات کی بوتلیں، چٹکی ڈبکی کی ڈبیاں اور گولیوں اور ٹکیوں کی تھیلیاں، زمین پر پھیلے ہوئے کپڑوں پر بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔"

یوں تو گھروں کے اندر کی زندگی میں کوئی تموج نہ تھا لیکن شادی بیاہ سے تو رونق بڑھ ہی جایا کرتی۔ میر نہال کے لڑکے کی شادی کا دن بھی اپنی گہما گہمی ساتھ لایا:

"آخر جس نیک گھڑی کے لیے بیویوں نے یہ ساری تیاریاں کی تھیں وہ بھی آ پہنچی نکاح سے تین روز پہلے ظہر کے وقت سے ساچق کی ہاہڑا بڑ پڑ گئی۔ وحیدہ بیگم نے کوٹھری کھول کر رنگین کاٹھ کے صندوق میں سے چڑھاوے کے سارے جوڑے نکالے کہنے کو تھے تو کل گیارہ مگر سب کے سب بھاری اور تلواں۔ زربفت اور کمخواب کے پیجامے، گلبدن کے کرتے اور دوپٹے، کسی پر مقیش کے ماہی پشت کے جال اور کسی پر گوکھرو کی دبکت بھول کی بیل، کسی پر دھنک کی جھڑیاں اور کسی پر کیری کی ترنج، زیور بھی دوسرا تہرا تھا، سادہ کاری اور کندن، نورتن اور ستاری الگ گلے میں گلوبند اور چمپا کلی اور چندن ہار، ہاتھوں میں نوگریاں اور جوشن، بازوبند اور پہنچیاں کانوں میں مگر چودانیاں، کرن پھول اور بالی تیتے، پیروں میں جھانجن اور پازیب، ناک کی نتھ اور سر کا جڑاؤ جھومر اور سیس پٹی، وحیدہ بیگم نے سب کو چڑھا دا دکھا دکھا کر لکڑی کے ہشت پہل خوانوں میں سجوا دیا۔ اور اوپر سے کھیلیں اور مُرمُرے ڈال جھمک جھمک کرتے ہوئے پٹاپٹی کے خوان پوشوں سے ڈھنک کر شرف اللہ کے حوالے کر دیے۔ بیگم جان حسب معمول ہدایتیں دینے لگیں:

"اے منجھلی دُلہن، بی چھوڑو ہنسنے کو۔ وقت ہوا جا رہا ہے، اور ابھی تک کسی نے سہاگ پڑے کی خبر بھی نہیں لی۔" اور وہ خود سہاگ پڑا اپنے سامنے چاندی کی سینی میں سنگوانے لگیں۔"

یہ تو چند جھلکیاں ہی ہوئیں۔ اسی طرح صفحے صفحے پر ایسا کچھ موجود ہے جو

حسرت ناک بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ تاریخ بھی ہے اور کہانی بھی۔

احمد علی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ 'دلّی کی شام' کے دیباچے میں آخری جملہ یہ ہے کہ "گو آج ہم دلّی کی گہما گہمی سے محروم اور اس کی یاد سے بھی دور ہیں مگر اس کو بھول نہیں سکتے :

گرچہ یاراں فارغند از یادِ من
من از ایشاں راہزاراں یاد باد

احمد علی صاحب نے 'یاراں' کہہ کر کسے پکارا ہے' یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے 'دلّی کی شام' کی اب ایک حیثیت ہمارے لیے اور بڑھ گئی ہے کہ ہم اُسے 'تحفۂ حبیب' بھی سمجھتے ہیں۔

(بقیہ خبریں)

عادل جعفری صاحب 'گلہائے عقیدت' کے نام سے ان نظموں، قطعات و رباعیات کو ترتیب دے رہے ہیں جو شعرائے اُردو نے غالب کی شخصیت و شاعری سے متاثر ہو کر وقتاً فوقتاً کہتے رہے ہیں۔ شعرائے کرام سے درخواست ہے کہ اپنی اپنی تخلیقات مع مختصر سوانح ذیل کے پتے پر مرحمت فرما کر شکر گزار کریں۔

عادل جعفری صاحب۔ ۹/۷۔ اوشا گنج۔ اندور ۱

(ایم پی)

جہانِ نو

اثر لکھنوی

۱۸۵۵ء — ۱۹۶۷ء

مرزا جعفر علی خاں نام، اثر تخلص، ان کے جدِ امجد مرزا محمد شفیع اصفہان (ایران) سے اکبرآباد (آگرہ) آکر مقیم ہوئے تھے بڑے ماہر طبیب تھے اس فن میں اپنی مہارت اور شہرت کی بنا پر نواب وزیر شجاع الدولہ نے ان کو لکھنؤ بلوا لیا۔ شجاع الدولہ کے بعد نواب آصف الدولہ کے عہد میں بھی ان لوگوں کی بڑی قدر و منزلت رہی۔ طبیبوں کے اس سلسلے کی آخری کڑی جناب اثر کے والد ماجد حکیم مرزا افضل حسین خاں تھے، لیاقت، وجاہت اور دوسرے اوصاف و کمالات کی بدولت حکیموں کا یہ خاندان لکھنؤ کے نہایت باعزت اور متمول لوگوں میں شمار ہوتا رہا ہے۔

اثر جس زمانے میں پیدا ہوئے لکھنؤ کی بزمِ نشاط افسردہ ہو چکی تھی، مگر اس دور کی بعض اچھی قدریں، علمی صلاحیتیں اور تہذیبی خوبیاں اثر کے زمانے میں باقی اور برقرار تھیں۔ اسی فضا اور ماحول میں انھوں نے آنکھ کھولی اور پلے بڑھے۔

۱۸۹۶ء میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لیے جوبلی اسکول میں داخل کرائے گئے۔ ۱۹۰۲ء میں انٹرنس پاس کیا۔ ۱۹۰۶ء میں کیننگ کالج (موجودہ لکھنؤ یونیورسٹی) سے بی۔ اے کیا۔ اور ۱۹۰۹ء میں یوپی پراونشل گورنمنٹ میں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ ۱۹۳۶ء میں حکومتِ برطانیہ کی طرف سے خان بہادر اور اس کے تین سال بعد او۔ بی۔ ای کے خطابات حاصل کیے اور ڈپٹی کمشنری کے عہدے سے ۱۹۴۰ء میں ریٹائر ہو گئے، نیک نامی اور حسن کارکردگی کی بدولت کچھ دن الہ آباد کے اڈیشنل کمشنر اور پھر ریاست جموں کشمیر کے

ہوم منسٹر اور وزیر تعلیم بھی رہے ۱۹۴۶ء کے بعد ان تمام سرکاری اور ریاستی خدمات سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن لکھنؤ میں فردکش ہو گئے، علمی اور ادبی شغلہ عمر بھر رہا، مگر ملازمت کے بعد سے پھر تو سارا وقت شعر و شاعری اور زبان و ادب کی اصلاح و خدمت ہی میں صرف ہونے لگا۔

اخلاق، مروّت، عالمانہ انکسار، وضع داری، خوش مزاجی اور نیک نفسی جو قدیم شرافت اور مشرقی تہذیب و تمدن کا جوہر ہیں وہ سب شروع سے آخر تک اثر صاحب کی سیرت، کردار، نیز روزمرّہ کے معمول اور معاشرت کا نمایاں جزو بنی رہیں۔

شعرگوئی میں وہ جناب عزیز لکھنوی مرحوم کے شاگرد تھے۔ بڑے پرگو اور قادر الکلام۔ غزل کے علاوہ اور بھی بہت سی اصناف سخن میں انھوں نے دادِ سخن دی ہے، فنِ شعر پر ان کو عبور تھا، زبان دانی میں وہ اپنے تمام ہم عصر اور ہم وطن شعرا میں مستند تھے۔ مشاقی، پختگی، زبان دانی، اور سلاستِ زبان ان کے کلام کی مسلمہ خوبیاں ہیں۔ شعر و ادب کے معاملے میں وہ کسی سقم یا بے راہ روی کو قطعاً گوارا نہیں کرتے تھے، اس ضمن میں خود اپنے زمانے کے لوگ ہوں یا اپنے سے پہلے کے، جب اور جس کے یہاں کوئی خامی یا کمی ان کو نظر آئی اُس پر انھوں نے بغیر کسی تکلف کے تنقید بھی کی ہے، اچھے شعر اور اچھے شاعر کو جی بھر کے سراہتے تھے بہر حال ایک مشاق اور پختہ کار شاعر کے ساتھ ساتھ نقد و نظر کے میدان اور معاملات میں اُن کی ایک رائے اور جگہ تھی۔

اُردو کے علاوہ مشرق و مغرب کی آٹھ نو زبانوں کی بعض مشہور بلکہ شاہکار نظموں کے (منظوم) ترجمے بھی انھوں نے بڑی استادی اور خوب صورتی کے ساتھ کیے ہیں۔ زبان و بیان کے علاوہ اکثر شعری محاسن بھی ان ترجموں میں موجود ہیں۔

مرحوم کی نظم و نثر کی جملہ تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

اثرستان، بہاراں (غزلوں کے مجموعے)، نو بہاراں (منتخب غزلیں)، رنگ بست (دوسری زبانوں کے شاہکار نظموں کے ترجمے)، چھان بین (تنقیدی مقالات) اثر کے تنقیدی مضامین۔ مطالعۂ غالب، انیس کی مرثیہ نگاری اور فرہنگ اثر (سرمایۂ زبان اردو اور نور اللغات کا ناقدانہ جائزہ)

انتخاب

تغزل

وہ اسی شخص کو میں نے انسان جانا | کہ احسان کرکے نہ احسان جانا
جن خیالات سے ہو جاتی ہے وحشت دونی | کچھ انہیں سے دل دیوانہ بہلتے دیکھا
شوق تھا تیغ آزمائی کا | کہیے! کیا حال ہے کلائی کا؟

کبھی ہے تکیہ ترے کرم پر کبھی ہے خوف عتاب دل میں
یہی ہے جنت یہی ہے دوزخ، عذاب کیسا، ثواب کیسا

آغاز محبت ہو کہ انجام محبت | ہے دور ہمیشہ لب ساحل سے کنارا
اُن کی حسرت نہ پوچھو جو تارے | دامن صبح میں بکھر جائیں
مطلب جو شیخ کا ہے وہی برہمن کا ہے | یونہیں سا اختلاف ہے وہ بھی کبھی کبھی
پھول ڈوبا ہوا گلاب میں تھا | اُف وہ چہرہ حجاب آلودہ

اس واسطے کہ چین نہ آئے لگی رہیں
دو چار حسرتیں دل بے خانماں کے ساتھ

جہاں مل گئے دو محبت بھرے دل | کہا اک فسانہ سُنا اک فسانہ
چمن سے بھی بڑھ کر جنھیں جان پیاری | چمن سے اٹھا لے گئے آشیانہ
ادب لاکھ تھا پھر بھی اس کی طرف | نظر میری اکثر بہکتی رہی
کچھ دن کی اور کشمکش زیست ہے اثر | اچھی بُری گزرنی تھی جیسی گزر گئی

تمھیں چاہا؟ خطا دل کی، وفا کیوں کی؟ سزا دل کی
گنہگار محبت ہوں، نہ کھلواؤ زباں میری

جھپکی ذرا جو آنکھ جوانی گزر گئی | بدلی کی چھاؤں تھی اِدھر آئی اُدھر گئی

یہ کس کی جدائی میں ہر اک آنکھ ہے پُر نم
یہ کس کو زمانے کی نظر ڈھونڈھ رہی ہے

میرے بھی سیہ خانے میں دم بھر کو چلا آ
میری بھی شب تار، سحر ڈھونڈھ رہی ہے

اس انداز سے پہلے کھلتی نہیں تھی | کلی نے تری مسکراہٹ چرا لی

سوال آپ کرنا جواب آپ دینا یہ فرقت میں نکلیں کی صورت نکالی

مقصودِ زندگی نہیں حبِ وطن ابھی اپنا سہاگ ڈھونڈھ رہی ہے دلھن ابھی
جو بھول ہو بہار کا چشم و چراغ ہو مالی ترا چمن نہیں ایسا چمن ابھی
پامال ہوتے ہوتے بھی خوشبو لٹا گئے سیکھا نہیں بشر نے گلوں کا چلن ابھی

نکہت ہیں رنگ، رنگ میں مستی شراب کی
تصویر ایک یہ بھی ہے تیرے شباب کی
اس لعل لب پہ یوں ہے تبسم کی اک جھلک
جیسے شفق میں ڈوبی کرن آفتاب کی
اک دوسرے کے حسن و محبت ہیں رازداں
حاجت سوال کی نہ ضرورت جواب کی

ہم کو اپنا تو کہا ساقیِ دریا دل نے بہتی گنگا میں مگر ہاتھ نہ دھونے پائے
خواب کیا کیا نہ تھے سہانے مگر اُن کی تعبیر کھیلنے کے لیے بچوں نے کھلونے پائے

آنکھ میں اشکِ ندامت ڈبڈبا کر رہ گئے
ہم یونہیں اکثر دعا کو ہاتھ اٹھا کر رہ گئے
اُن پہ ہنسیے شوق سے جو مائلِ فریاد ہیں
اُن سے ڈریے جو ستم پر مسکرا کر رہ گئے

بھلانا جو چاہا تو یاد اور آئے وہ عشرت کے لمحے وہ بیتے زمانے

منظومات

سبھی پیتے ہیں

دھرتی پیتی ہے مینہ کا پانی اور شجر پیتے ہیں نمی اس کی
خود سمندر ہوا کا پیاسا ہے اور سمندر کا چاند ماتا ہے
بندہ بھی مہربان پیتا ہے جب کہ سارا جہان پیتا ہے

(یونانی)

یاد اُس جانِ تمنا کی رلاتی ہے مجھے
اُف انوکھی وہ سجاوٹ وہ رسیلی چتون چمپئی رنگ پہ چندن کی وہ بندی کی پھبن

کِھل گیا جیسے چمن، یہ تھا ہنسی کا نقشہ — تازہ اک پھول کنول کا تھا شگفتہ چہرہ
بسترِ ناز سے اٹھنے پہ یہ تھا جس کا حال — چھوئی موئی کی طرح درد جدائی سے نڈھال
یاد اس جانِ تمنا کی رُلاتی ہے مجھے

جیسے پیغامِ سحر پر کوئی نرگس کی کلی — مسکراتی ہے کبھی اور لجاتی ہے کبھی
یہی اُن انکھڑیوں میں نیند کا نقشہ دیکھا — خوابِ رنگیں کے تصور کا کرشمہ دیکھا
یاد اُس جانِ تمنا کی رُلاتی ہے مجھے

وصل کے بعد یہ تھا شرم سے اُس کا عالم — سُرخی آنکھوں کی نہ تھی خونِ کبوتر سے کم
اور کندن سے دمکتے ہوئے چہرے پہ عرق — گل کے رُخسار پہ غازہ ملے جس طرح شفق
یوں تھی اک بوند پسینے کی لبِ نازک پر — جھلملاتا ہو ستارا کوئی ہنگامِ سحر
یاد اُس جانِ تمنا کی رُلاتی ہے مجھے

بھولی صورت پہ غضب اُس کا وہ اندازِ حجاب — جس سے مدہوش ہو عالم وہ شرابِ اُس کا شباب
جیتے جی اُس کو جو پھر ایک نظر دیکھ سکوں — عیشِ لافانیٔ فردوس کو قربان کروں
یاد اُس جانِ تمنا کی رُلاتی ہے مجھے

کیوں کٹھن ہو نہ مجھے زیست کا اک اک لمحہ — دُور جب اُس سے رہوں لطف نہیں جینے کا
کاٹ دے کاٹ دے اے موت گلے کا پھندا — صبرِ جاوید و سکونِ ابدی کر کے عطا
یاد اُس جانِ تمنا کی رُلاتی ہے مجھے (سنسکرت دوہے)

چوری

چاندنی چھائی ہوئی تھی اُدھر گلشن میں — محوِ گلگشت اُدھر رشکِ چمن گلشن میں
"کنج میں کیجیے آرام" نزاکت نے کہا — بچھ گئے چار طرف دامِ نظر گلشن میں
ناز سے اُس نے اُدھر بندِ قبا کھول دیا
اور غنچوں نے اِدھر دستِ دُعا کھول دیا

دل سے مجبور تھا جھانکا تو بھلا کیا دیکھا — ایک نازک سی کرن کا یہ تماشا دیکھا
دبکی دبکی بڑھی، عارض کی بلائیں لے لیں — لعلِ لب چوم کے، نہ چونکی، یہ سلیقا دیکھا
چپکے سے اُڑ گئی، وہ رقص کناں سوئے فلک
مجھ پہ یہ لے دے ہے، نہیں جانا گماں سوئے فلک (بھرتری ہری)

طفیل ھوشیار پوری

غزل

مرحلہ دید کا تکرار تک آپہنچا ہے
طور سے چل کے جنوں دار تک آپہنچا ہے

بات آپہنچی ہے اندیشۂ رسوائی تک
جذبۂ دل لبِ اظہار تک آپہنچا ہے

شعلۂ عشق جو روشن ہے مرے سینے میں
رنگ بن کر ترے رخسار تک آپہنچا ہے

نام کو بھی نہیں اب دل میں کدورت کا نشاں
آئینہ عکسِ رخِ یار تک آپہنچا ہے

حُسنِ مستور اسے اپنی تجلّی سے نواز
ایک سایہ تری دیوار تک آپہنچا ہے

شعلے نے لے لیا آغوش میں پروانے کو
جب یہ سمجھی مرے معیار تک آپہنچا ہے

اُن کی سرشار نگاہوں کا تصوّر جیسے
میکدہ خود لبِ میخوار تک آپہنچا ہے

اب کسے منزلِ جاناں پہ رسائی کا خیال
ہر قدم کوششِ بے کار تک آپہنچا ہے

برملا کہتی ہے یہ وقت کے ماتھے کی شکن
دورِ یہ کیفرِ کردار تک آپہنچا ہے

مطمئن قبر کی آغوش میں ایسے ہے طفیل
راہرو جیسے در یار تک آپہنچا ہے

دشتہ گل، دریدا لانڈ و پاک مشاعرہ، صفحات ۷۶، سائز ۲۶×۱۶۲۲ قیمت ۱ روپیہ ۱ حصہ ۱۴۲

مرتبہ: مدن موہن گوپال

پریم چند کے تین خط

خط بنام دیا نرائن نگم

ستمبر ۱۹۱۰ء

برادرم آج ایک کارڈ لکھ چکا ہوں۔ اب مفصل خط لکھ رہا ہوں، اب کی میں نے "وکرمادت کا تیغہ" ایک قصہ لکھنا شروع کیا ہے۔ بارہ تیرہ صفحے ہو چکے ہیں، شاید پانچ چھ صفحے اور چلیں۔ جلد ہی ختم کر کے بھیجوں گا۔ پریم چند اچھا نام ہے۔ مجھے بھی پسند ہے۔ افسوس صرف یہ ہے کہ پانچ چھ سالوں میں نواب رائے کو فروغ دینے کی جو کچھ محنت کی گئی۔ وہ اکارت ہو گئی۔ یہ حضرت قسمت کے ہمیشہ لنڈورے رہے ہیں اور شاید رہیں گے۔ یہ قصہ میرے خیال میں کئی مہینے سے تھا۔ میں نے اپنے خیال میں رویندر ناتھ[1] کے طرز کی کامیابی کے ساتھ پیروی کی ہے مگر بری نقل نہیں ہے۔ پلاٹ بالکل اوریجنل ہے۔ میں نے کئی قلم توڑ دیے اور دس پانچ ورق بھی کالے کر ڈالے معلوم نہیں آپ کو بھی پسند آتا ہے یا نہیں۔ یہ قصہ ملا کر میرے پانچ قصوں کا مجموعہ نکلنے کا مسالہ ہو جائے گا۔ اگن کنڈ۔ سیر۔ سارندھا۔ بے غرض محسن (جو ادیب میں نکلے گا) اور وکرمادت کا تیغہ۔ اگر آپ اس مجموعے کو نکالیں گے تو میں اس میں کاغذ اور لکھائی کے متعلق جس قدر صرفہ آپ تجویز کریں گے، دوں گا۔ اور اگر آپ خود نکالیں تو اور بھی اچھا ہے جیسا مناسب سمجھیں کریں۔ مگر ایسا ہو کہ نئے سال تک تیار ہو جائے۔ اس مجموعے کا نام "برگ سبز" سوچا ہے، شاید آں جناب کو پسند آئے۔ شاید اس لیے کہ میں ناموں میں آپ کی پسند کا قائل ہوں۔

رام سرن کا خط مجھے اس وقت ملا، جب ڈراما لکھنے کے لیے ایک ہفتہ کی مہلت

---

[1] رابندر ناتھ ٹیگور

بھی نہ تھی کجا میں اور کجا ڈراما۔ گانا بالکل نہیں جانتا۔ اگر کوئی گانا ملا دے تو میں اپنے وکرمادت کے تتبعے کو ڈرامابنا سکتا ہوں۔

اب کچھ روپیہ پیدا کرنے کی بات چیت، اب کی ایجوکیشنل گزٹ الٰہ آباد نے ڈمیکہ میں ساون کی یاد اور مرزا سلیمان قدر کے حالات ’زمانہ‘ سے نقل کیے ہیں۔ مگر حوالہ نہیں دیا۔ خیر وہ زمانہ کے قائل ضرور معلوم ہوتے ہیں کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ کی طرف سے میں اس کے لیے کبھی کبھی مضامین لکھا کروں۔ میرے لیے مشکل کہ ہر ایک مضمون دکھانے کی ایسی بُری پخ لگی ہے کہ ایک مضمون مہینوں میں لوٹ کر آتا ہے اور چھٹویں مہینے چھپتا ہے، ریاست بھوپال اب جا کر چھپا ہے۔ مگر ایڈیٹر صاحب طویل مضمون نہیں لیتے۔ چار پانچ کالم سے زیادہ کے مضمون لیتے ہی نہیں۔ اگر آپ اس میں کوئی امر خلاف شان نہ سمجھیں تو میں کبھی کبھی ایک آدھ مضمون اُردو اور ہندی میں لکھ کر آپ کے پاس بھیج دوں۔ اور آپ اسے اپنی جانب سے انسپکٹر صاحب نارمل اسکولز کے پاس بھیج دیں یہی اس گزٹ کے ایڈیٹر ہیں۔ میرے خیال میں اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور نہ کوئی علمی بے ایمانی ہے۔ اس کا جواب ضرور دیجیے گا۔ پریم چند کا نام میں وہاں نہیں دینا چاہتا۔ نہیں معلوم یہ حضرت ہاتھ پیر سنبھالنے پر کیا نکلیں پڑھیں۔ انھیں قصّہ گو ہی رہنے دیجیے۔ بیٹھے بیٹھے پریم اور ہیر رس کے قصّے لکھا کریں۔ دسمبر میں الٰہ آباد میں ضرور ملاقات ہوگی۔

نوبت رائے نے مجھ سے ۲۵ (۲۵ روپے) طلب فرمائے۔ میں نے لکھا علمی دنیا میں اس طرح کی بات چیت مناسب نہیں۔ اس پر آپ نے مجھے وعدہ شکن کہا۔ اور دھمکی دی کہ میں اس کی تشہیر کر سکتا ہوں۔ دیکھا یہ سینہ زوری ہے۔ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ تب سے پھر لکھا پڑھی نہیں ہے۔ آج اپنے تین مضامین کابل بھیجتا ہوں۔

نیا ناول شروع کر دیا ہے۔ مگر اس کے لیے راجستھان کے مطالعے کی ضرورت ہے۔ آپ کو خانگی ترددات سے فرصت ملی یا نہیں۔ دو مہینے سے زمانہ میں رنگین تصویر اچھی نہیں نکلی۔ روی ورما اب گر گئے ہیں۔ رویندر ناتھ سے بہ حیثیت ایک قدر دان فن تصویر کے کیوں خط و کتابت نہیں کرتے۔ میں آپ کی جگہ ہوتا تو تصویروں کا خاص انتظام کرنے کے لیے ایک بار کلکتہ جا کر پچیس تیس روپے کا صرفہ برداشت کر لیتا۔ سعدی کی تصویر ادیب کو کہاں سے مل گئی۔

اور تو کوئی خاص حال نہیں۔ بیگم صاحبہ ملیکہ کی ہوا کھا رہی ہیں۔ میں تیزی کے ساتھ
بوڑھا ہو رہا ہوں۔ شاید چالیس تک دلی کھنگڑ ہو جاؤں۔
مجھے زمانہ میں رفتار نہیں نظر آتا۔ یہ ٹھیکلے جو آپ لکھتے ہیں رفتار نہیں کہلا سکتے
اب کے مہینہ سے میں نے مصمم ارادہ کیا ہے کہ چار صفحوں کا نوٹ ماہوار زمانہ کی نذر کیا کروں۔
اکتوبر نمبر میں انشاء اللہ ضرور ہوگا۔ سرور مر گئے کہ زندہ ہیں۔
ستمبر کب تک آوے گا۔

نیاز مند نواب

بنام امتیاز علی تاج

گورکھپور۔ ۲۵ ؍ اگست ۱۹۱۹ء

جناب مشفق۔ تسلیم۔ نوازش نامہ صادر ہوا۔ آپ اپنے سلسلۂ اشاعت کی توسیع کرنا چاہتے ہیں۔ یہ امر میرے لیے خاص طور پر باعثِ اطمینان ہے۔ اُردو میں رسالے اور اخبارات تو بہت نکلتے ہیں۔ شاید ضرورت سے زیادہ۔ اس لیے کہ مسلمان ایک لٹریری قوم ہے اور ہر تعلیم یافتہ شخص اپنے تئیں مصنف ہونے کے قابل سمجھتا ہے۔ لیکن پبلشروں کا یکسر قحط ہے سارے قلمروِ ہند میں ایک بھی ڈھنگ کا پبلشر موجود نہیں۔ بعض جو ہیں ان کا عدم اور وجود برابر ہے۔ کیونکہ ان کی ساری کائنات چند ردّی ناول ہیں۔ جن سے ملک یا زبان کو کوئی فائدہ نہیں۔ عرصہ ہوا "دائرۃ الادب" دہلی میں قائم ہوا تھا۔ اور بڑے طمطراق سے چلا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں اس کے ناظم صاحب کا جوش فرو ہو گیا اور وہ کچھ اس طرح غائب ہو گئے کہ معاملہ داروں کا حساب تک صاف نہ کیا۔ اس لیے میں آپ کی اس تجویز سے بالکل مطمئن ہوں۔ لیکن معاف فرمایئے گا۔ ایک ادبی رسالہ کا بار اپنے سر پر رکھتے ہوئے آپ اپنی نئی تجاویز میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اس میں مجھے شک ہے۔ ایک اوّل درجہ کا اُردو رسالہ ایک آدمی کو ہمہ تن مصروف رکھنے کے لیے کافی سے زیادہ ہے۔ ورنہ اس کا معیار سے گر جانا ضروری ہے۔ ایسی حالت میں آپ دونوں کام کامیابی سے نہیں کر سکتے "تا وقتیکہ آپ کو کوئی ہوشیار اسسٹنٹ نہ مل جائے۔ اور چونکہ آج کل لاہور میں بلا

معقول معاوضہ کے ہوشیار آدمی نہیں مل سکتا۔ اور کہکشاں کے لیے یہ بار شاید ناقابلِ برداشت ہو۔ اس لیے آپ کو اس کے سوا اور مفر نہیں۔ کہ یا تو اشاعت کے ہوں یا کہکشاں کے۔ میری ناچیز رائے ہے کہ اگر آپ اشاعت کا کام سرانجام دے سکتے ہیں تو کہکشاں کو خیر باد کہیے۔ کہکشاں جو کام کر رہا ہے۔ وہی کام اور بھی کئی ممتاز رسالے کر رہے ہیں یا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مگر پبلشنگ کا میدان بالکل خالی ہے اور زبان کی خدمت کرنے کے جتنے موقعے اشاعتِ کتب کے ذریعے مل سکتے ہیں ماہوا رسالہ سے ممکن نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ماہواری صحائف سے زبان کی خدمت نہیں ہوتی۔ مگر رسائل کے وسائل محدود ہوتے ہیں۔ اور اس کے حدود اسے تصنیف کے اکثر شعبوں سے بے فیض رکھتے ہیں۔ اُردو رسالوں میں آپ کوئی ضخیم اور محققانہ تاریخی تصنیف نہیں شائع کر سکتے۔ تاوقتیکہ وہ آپ کے روبرو خوردبینی صورت میں نہ پیش کی جائے۔ علیٰ ہذا 'فلسفہ'، 'شعر'، 'نظریات'، 'کیمیات'، وغیرہ وغیرہ سبھی اصنافِ کلام کا دروازہ آپ کے لیے بند ہے۔ آپ کو چلتے ہوئے مضامین، تفریح بخش چٹکلے، دلچسپ شاعرانہ تذکرے، رنگین قصے چاہئیں۔ یہاں تک کہ آپ کوئی ضخیم ناول ہاتھ میں لیتے ہوئے ڈرتے ہیں تو جناب چٹ پٹے مضامین سے ناظرین کی ضیافتِ طبع چاہے ہو جائے لیکن زبان کی کوئی مستقل خدمت نہیں ہو سکتی۔ ایسے مضامین سے زبان کے مستقل سرمایہ میں کوئی قابلِ قدر اضافہ نہیں ہوتا۔

اُردو کو ہر ایک شعبہ کی اچھی اور مستند کتابوں کی جتنی ضرورت ہے وہ محتاجِ بیان نہیں اور حالانکہ اس بے بضاعتی کا باعث ایک بڑی حد تک ہماری سیاسی بے دست و پائی ہے تاہم ہم نے اپنے لٹریچر کی طرف ابھی اتنی توجہ نہیں کی جس کا وہ مستحق ہے۔ اگر ہمیں اپنی لاج رکھنی ہے تو اپنے لٹریچر کو فروغ دینا پڑے گا اور چاہے یہ کام افراد کریں یا مجموعہ افراد۔ مگر اسے کاروباری اصولوں پر کیے بغیر استحکام نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ ایک مشترکہ سرمایہ سے کوئی پبلشنگ کام جاری کر سکیں تو کیا کہنا۔ لاہور جیسے تجارتی مقام پر ایسی کمپنی کھولنی بہت مشکل نہ ہونی چاہیے۔ بہرحال اگر آپ اشاعت کے کاروبار میں ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں تو کہکشاں کو بند کیجیے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ آپ کو اس کے جاری رکھنے میں سراسر خسارہ ہے۔ یہی میری دوستانہ صلاح ہے۔ امید ہے۔

آپ میری صاف گوئی کو معاف فرمائیں گے۔

خاکسار پریم چند

بنام شورانی دیوی

کاشی

پریہ رانی

میں تمھیں چھوڑ کر کاشی آیا۔ مگر یہاں تمھارے بنا سونا سونا لگ رہا ہے۔ کیا کہوں تمھاری بہن کی بات کیسے نہ مانتا۔ نہ ماننے پر تمھیں بُرا لگتا جس سے پر تمھیں انھوں نے روکا جی مسوس کر رہ گیا۔ تم تو اپنی بہن کے ساتھ وہاں خوش ہوگی۔ مگر میں یہاں پریشان ہوں۔ جیسے ایک گھونسلے میں دو پنچھی رہ رہے ہوں اور ان میں سے ایک کے نہ رہنے پر ایک پریشان ہو۔ تمھارا ایسی نیا ئے ہے کہ تم وہاں موج کرو اور میں تمھارے نام کی مالا پھیروں۔ تم میرے پاس رہتی ہو تو میں بھر سک کہیں باہر جانے کا نام نہیں لیتا۔ تم آنے کا نام نہیں لیتیں۔ میں ۵ تاریخ کو پریاگ یونیورسٹی میں بلایا گیا ہوں۔ یہی بات ہے کہ میں ابھی تک نہیں آیا۔ نہیں تو اب تک کبھی کا پہنچ گیا ہوتا۔ اسی لیے میں صبر کیے بیٹھا ہوں۔ اب تم پندرہ تاریخ کو آنے کے لیے تیار رہنا۔ سچ کہہ رہا ہوں گھر مجھے کھائے جا رہا ہے۔ کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ کیا سبھی کی طبیعت اسی طرح چنتت ہوجاتی ہے یا میری ہی۔ تمھارے پاس روپے پہنچ گئے ہوں گے۔ اپنی بہن کو میرا نمستے کہنا۔ بچوں کو پیار۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس پتر کے ساتھ ہی میں بھی پہنچوں۔ جواب جلد لکھنا۔

تمھارا دھنپت

"پریم چند کے خطوط" صفحات ۲۹۰ قیمت ۵۰/۶ (حوالہ صفحات ۲۹ تا ۳۲، ۸۶ تا ۸۶، ۳۰۳، ۳۰۴ تا ۳۱۴)

(صفحہ ۲۶ کا بقیہ) کتابیں زیادہ سے زیادہ شائع ہوں اور انھیں زیادہ سے زیادہ خریدا جائے تاکہ اس طرح ان لوگوں کے ہاتھ بھی مضبوط ہوں جو اس بُرائی کو دور کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں

ریاض احمد عباسی

نئی مطبوعات

تلاشِ حق (آپ بیتی) مہاتما گاندھی مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین دہلی، گاندھی سمارک ندھی -

تذکرہ حضرت انوا مولانا ابوالحسن امیرالدین احمد مترجمہ ڈاکٹر مجیب قریشی دہلی، علمی مجلس کتب خانہ ۵/-

رباعیات غالب فارسی مع اُردو ترجمہ مرتبہ: امیر حسن نورانی لکھنؤ، ادارہ فروغ اُردو ۳/-

کلیاتِ غالب فارسی مع مقدمہ " " " " راجہ رام کمار بکڈپو ۱۵/-

جدید نظمیں ساجد عابدی اندور سٹی، پاپولر بکس کارنر ۱/-

فتح اندلس ایک نظر میں ڈاکٹر خلیل احمد مشیر " " " " ۱/۰

مضامین نو ع۔ احمد میرا اور ش۔ احمد صدیقی " " " ۱/۷۵

ہفت تماشا مرزا قتیل دہلی، مکتبہ برہان ۹/-

ابتدائی اسکول میں تعلیم کے طریقے مترجم: جلیس عابدی " چمن بکڈپو ۱/۵۰

اُمراؤ جان ادا (ناول) مرزا رسوا " " " " ۴/۵۰

اپنے بیگانے " عارف مارہروی " پنجابی پستک بھنڈار ۳/۵۰

عالیہ " زبیدہ خاتون لکھنؤ، مکتبہ اُردو ۸/-

حمیرا " " " " کتابی دنیا ۴/-

کاؤس " مسعود جاوید

اردو شاعری میں منظر نگاری سلام سندیلوی " " " ۱۲/-

انشائے ماجد اوّل (نیا اڈیشن) عبدالماجد دریابادی " نسیم بک ڈپو ۱۰/-

" " " ۵/۵۰

سبزۂ بیگانہ (شعری مجموعہ) طالب دہلوی دہلی، طالب دہلوی ۴/-

کشمیر کی سیر " " " ۱/-

سندری جوان اور دوسرے نادر جرمن افسانے ترجمہ: منور لکھنوی " آدرش کتاب گھر ۶/-

جائزے

(تبصرے کے لیے کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

مولانا ابوالکلام آزاد

از: عابد رضا بیدار
صفحات: ۲۹۴ سائز ۱۸×۲۲/۸
قیمت: ۲۰ روپے
سنہ اشاعت: ۱۹۶۸ء
پبلشر: انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز
رام پور، یوپی

مرتب کے الفاظ میں: "یہ کتاب میری اب تک کی منتشر کوششوں سے ہٹی ہوئی ایک حد تک ذہنی شیرازہ بندی کی جانب پہلا قدم ہے"۔ انھیں کے الفاظ میں "اس کتاب میں مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت، سوانح اور افکار کے تجزیاتی مطالعے کی ایک بھرپور کوشش کی گئی ہے"۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیدار صاحب نے بڑی دل سوزی اور محنت کے ساتھ اس مبحث پر مواد جمع کیا ہے اور اس کی کوشش کی ہے کہ اس مواد کی مدد سے جس کا بیشتر حصہ خود مولانا آزاد کی تحریروں ہی پر مشتمل ہے مولانا کی شخصیت کا ایسا نقش ابھارا جائے جس میں اُن کے ذہن، اندازِ فکر اور طرزِ احساس کی جھلکیاں صاف صاف نظر آجائیں۔ یہ بھی ایک انداز ہے کسی اہم شخصیت کو سمجھنے سمجھانے کا، لیکن اس کے لیے یہ شرط ہے کہ لکھنے والا ایسی جذباتی وابستگی سے بے تعلق سا رہے جس سے اندازِ بیان میں غیر حقیقی رنگ کی آمیزش ہو جایا کرتی ہے۔ ساری خوبیوں کے باوجود اس کتاب میں متعدد جگہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود اسی اندازِ بیان کے اسیر ہو گئے ہیں، جس کی زیریں لہریں مولانا آزاد کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ شروع میں ۴۰ صفحات کا مقدمہ ہے۔ اس میں وہ خطوط بھی ہیں جو مرتب کے نام دوسروں نے لکھے تھے بعض مباحث کے سلسلے میں یہ غیر ضروری جزو ہے۔ اور اس سے ترتیب میں اور سلسلۂ مطالب میں انتشار سا پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مرتب کا اپنا لہجہ تجزیاتی

کم اور روانی زیادہ ہے اور اس سے جو صورتِ حال پیدا ہو سکتی ہے، وہ موجود ہے۔ رومانی عناصر، منطقی استدلال اور منطقی طرز پر استخراجِ نتائج کی راہ میں ہمیشہ حائل ہوا کرتے ہیں، یہ مسلّمات میں سے ہے۔

کتاب کا انتساب قاضی عبدالودود صاحب کے نام کیا گیا ہے، انتساب کی عبارت میں نیا پن ہے اور مرتب نے جو انداز اختیار کیا ہے اور جس طرح مختلف افراد کا ذکر کیا ہے وہ بہت خوب ہے۔ اس سے قاضی صاحب کی عظمت کے ساتھ ساتھ، مرتبِ کتاب کی صحتِ فکر کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ مولانا آزاد کے خطوط میں جن اختلافاتِ عبارت کی نشان دہی کی گئی ہے، وہ بے حد عجیب اور کام کی چیز ہے۔ مرتب نے صاف صاف تو نہیں لکھا ہے لیکن اس سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ خود مولانا آزاد نے ان خطوں پر اس خیال کو پیش نظر رکھ کر نظرِ ثانی کی ہے کہ وہ چھپیں گے اور عبارت کو باضابطہ بنایا ہے اس سے خود غبارِ خاطر کے متعلق بھی رائے قائم کرنے میں مدد مل سکتی ہے اور مولانا آزاد کے اندازِ نظر کو سمجھنے میں بھی یہ معاون ہو سکتے ہیں۔ ص ۲۳۰ پر ع "موج ز خود رفتہ تیز خرامید و گفت" کو رباعی کا مصرعہ بنایا گیا ہے۔ یہ رباعی کا وزن نہیں، ص ۳۳ پر ایک جملہ ہے: "یہ ایک انفرادی سوچ ہے"! عابد رضا بیدار جیسے خوش ذوق سے اس کی توقع نہیں تھی کہ وہ لفظ سوچ کو اس طرح استعمال کریں گے۔ ایسی ایک دو مثالیں اور بھی ہیں۔ بیدار رضا شہزاد اور احمد فراز کی شاعری کے مداح ہیں اور یہ اثر وہیں کی دین معلوم ہوتا ہے۔

۲۴۹ صفحے کی اس کتاب کی قیمت ۱۵ روپے ہے جب کہ کتاب نہایت معمولی ہے اور کاغذ بھی جو عام طور پر ایسی کتابوں میں معقول لوگ استعمال کرتے ہیں۔ یہ زیادتی ہے بلکہ بڑی زیادتی ہے اس سے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ مرتب کی زیادہ توجہ قیمت کے تعین پر مبذول رہی ہے۔ گرد پوش سادہ، مضبوط اور عمدہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ مولانا آزاد کے سلسلے کی قابلِ ذکر کتابوں میں اس کتاب کو بھی جگہ ملے گی۔

سعادت علی صدیقی

●

ریت کے پھول

آدم نصرت

صفحات: ۹۴ سائز: $\frac{20\times30}{16}$

قیمت: ۲ روپے پچاس پیسے

پبلشر: کوکن پبلیکیشن ٹرسٹ بمبئی ۹

یہ اقوال و افعال کا مجموعہ ہے جسے ایک شاعرانہ اور فلسفیانہ ذہن نے تخلیق کیا ہے۔
یہاں فکر و فن کی آمیزش ہے اور زندگی کو نکھارنے کا حوصلہ پایا جاتا ہے۔ عبارت میں صناعی دکھائی دیتی ہے اور جذبات میں طہارت۔ لیکن یہ فکر کی اکائیاں اپنی سطح رکھتی ہیں۔ بعض واضح ہیں، بعض مبہم بعض بالکل سپاٹ اور بعض مجسّم اسرار و رموز۔ چند ملاحظہ ہوں:-

— تڑپنے میں مزہ ضرور ہے
لیکن مزے کی خاطر تڑپنے والے مزہ نہیں اٹھا سکتے۔

— میں نے سمندر کے آگے اپنے آپ کو عریاں کر دیا اور دیکھنے والوں نے مجھ پر قہقہے لگائے۔

— قول و فعل دو خطوط ہیں، متوازی، جو آپس میں نہیں مل سکتے۔

— مفت خورے کا نام سنا ہوگا۔ یہ محنت کشوں کی دنیا کا پروردگار ہے۔

— تلفظ کی غلطیاں، اندازِ تحریر پر اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔

— انسان عقل کا تابع ہے، حالانکہ اسے عمل کا تابع ہونا چاہیے۔

— بعض تصادم بڑے حسین ہوتے ہیں۔

اس فیصلے پر قاری کے اپنے مذاق و مزاج کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ اسے کچھ اقوال و افکار "زریں" نظر آئیں گے اور کچھ محض "ذرے" لیکن اتنا بھی کچھ کم نہیں۔ کیونکہ ایسی کاوش سے اردو کا دامن، وسیع ہوتا ہے۔

آدم نصرت، خلیل جبران کے معتقد اور معترف ہیں۔ اس مجموعے میں راجندر سنگھ بیدی کا ایک مختصر "ابتدائیہ" بھی شامل ہے جس کی شروعات ان جملوں سے ہوتی ہے:

"آدم نصرت احساسات کی اس انتہائی منزل تک پہنچے ہیں جہاں حوصلے کے پر جلتے ہیں جہاں ہونٹ، آنکھیں، اور کان بند کرنا پڑتے ہیں اور پھر ایک ملکوتی نغمہ، ایک یدِ بیضا، آپ کی رہنمائی کرتا ہوا آپ کو ایسی دنیا میں لے جاتا ہے۔ جہاں کی سیر کے بعد اس کثیف کرۂ ارض کے سب رنگ پھیکے پڑ جاتے ہیں اور یہاں کے رشتے جھوٹے نظر آتے ہیں اور آدمی، علم سے زیادہ عرفان کی اساس کو پا لیتا ہے۔"

یہ ایک ایسے شخص کی رائے ہے جو خود ایک بڑا فن کار ہے۔ اس لیے ہم سب کے لیے بہت کچھ وقعت رکھتی ہے ——— کتاب، صاف ستھری چھپی ہے۔

عبداللہ ولی بخش قادری

فرقہ پرستی نہرو کی نظر میں

مرتبہ: نند لال گپتا مترجم: عنایت اللہ
سائز: ۱۸×۲۲/۸ صفحات: ۲۸۰
قیمت: -/۶ ناشر: فرقہ واریت درودھی کمیٹی
۱۵۔ بی والسن مارگ کراجندر نگر، نئی دہلی ۵

فرقہ پرستی یا فرقہ واریت کی وجہ سے جمہوریت کو نقصان پہنچے یا نہ پہنچے لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ وہ ہماری قوم، ہماری تہذیب اور ہمارے معاشرے کو جس طرح اور جتنی تیزی سے تباہی کی طرف لے جا رہی ہے اور اس طرح پورے ہندوستان کی سالمیت اور بقا کو جو سخت ترین خطرہ پیدا ہو گیا ہے اُسے اگر اب بھی نہ روکا گیا تو خدا نہ کرے یہاں وہ سب کچھ ہو جانے کے آثار نظر آنے لگے ہیں جس کو لکھتے ہوئے بھی قلم تھرا تا ہے۔

فرقہ واریت کے زہر کو پھیلنے اور پھیلانے میں کون لوگ یا کون جماعتیں مدد دیتی ہیں، یا حکومت کی کہاں تک ذمہ داری ہے یا اس کی کیا مجبوریاں یا مصلحتیں ہیں، اس پر پہلے سے ہی بہت کچھ کہا اور لکھا جاتا رہا ہے لیکن شاید یا تو کہنے اور لکھنے والوں کی تحریر میں اثر ہی نہ رہا یا پھر فرقہ واریت کے مجرم اتنے سیاہ دل، اتنے بے حس، اور اتنے خود غرض ہو گئے ہیں کہ وہ ایسی نصیحتوں سے قطعی متاثر نہیں ہوتے اور نتیجے سے بے پروا اپنے سیاہ کرتوتوں میں اب بھی برابر لگے ہوئے ہیں۔

آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اپنی زندگی میں اس خرابی کو دور کرنے کی کوشش کی اور نہایت صفائی اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعے اصل مجرموں کی نشاندہی کی اور انھیں اس کے خطرناک نتائج سے آگاہ کیا۔ جناب نند لال گپتا نے پنڈت جی کی ایسی ہی تقریروں اور تحریروں کو بڑی کاوش سے مرتب کیا ہے اور جناب عنایت اللہ خاں نے اسے سلیس اور بامحاورہ زبان میں ترجمہ کر کے اردو داں طبقے پر واقعی احسان کیا ہے جس کے لیے دونوں حضرات دلی شکریے کے مستحق ہیں۔ فرقہ واریت کے بارے میں پنڈت جی کا کیا تصور اور کیا نظریہ تھا اور ان کے نزدیک کون مجرم ہیں، ان سب باتوں پر تو اس کتاب سے روشنی پڑے گی ہی لیکن کوئی تعجب نہیں کہ وہ آواز جسے سننے کے لیے ہمارے کان ترستے ہیں، اب اپنا اثر دکھلا دے اور اسے پڑھ کر ہی ہماری آنکھیں کھل جائیں۔

فرقہ واریت کو ختم کرنے کے سلسلے میں جو حضرات اور ادارے کام کر رہے ہیں وہ بہر حال ہمت افزائی اور تعریف کے مستحق ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس طرح کی (باقی ص۲۱ پر)

ادبی خبریں

اُردو کے مایۂ ناز ادیب پروفیسر نجیب اشرف ندوی کا ۱۲ ستمبر ۱۹۶۸ء کو بعمر ۶۸ سال بمبئی میں اُن کی رہائش گاہ اندھیری پر انتقال ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

ندوی صاحب ایک متبحر عالم، ایک صاحب طرز ادیب، ایک عظیم انشا پرداز اور ایک انتہائی رفیع المنزلت انسان تھے۔ انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو جس خلوص، محنت اور لگن سے انھوں نے پروان چڑھایا اور اُسے جو بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی وہ سب مرحوم کی اَن تھک محنت اور خدمت کا ہی نتیجہ ہے۔ ادارہ کتاب نما دعائے مغفرت کے بعد پس ماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

●

لاہور۔ علامہ اقبال کے کلام کا مصور اڈیشن عمل چغتائی، اشاعت کے آخری مرحلوں میں ہے۔ اس اڈیشن کو عبدالرحمٰن چغتائی نے تیس سال کی محنتِ شاقہ کے بعد مکمل کیا ہے۔ اس کی اشاعت پر کم و بیش تین لاکھ روپے خرچ ہوئے ہیں۔ اس اڈیشن میں کم و بیش ستّر تصویریں رنگین لوح، جمیل صفحات، قدیم ایرانی اور مغل رنگوں کی صورت میں شامل ہیں۔ اس اڈیشن میں بعض تصاویر ایسی ہیں جو علامہ کی زندگی میں بنائی گئی تھیں اور بعض ایسی بھی ہیں جو ان کے مطالعے میں رہی ہیں (افکار)

●

علمی حلقوں کے لیے یہ اطلاع باعثِ مسرت ہوگی کہ مرزا غالب کا مکمل فارسی کلام ہندوستان میں پہلی مرتبہ یکجا شائع ہوگیا ہے۔ اس فارسی کلیات میں دیوان مطبوعہ ۱۸۴۵ء اور مطبوعہ ۱۸۶۳ء کے علاوہ سبد چین، باغ دودر اور منفرقاتِ غالب کے نام سے بہت سے ایسے اشعار بھی شامل کیے گئے ہیں جو قدیم رسائل یا بیاضوں سے دستیاب ہوئے۔ کلیات کی ترتیب امیر حسن نورانی صاحب شعبہ اُردو دلی یونیورسٹی نے دی ہے اور اسے وارث مطبع نولکشور، راجہ رام کمار بک ڈپو، لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ سب سے پہلے

پاکستانی مطبوعات

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
انوارِ اقبال	مرتبہ بشیر احمد ڈار	۱۵/۰
اسلام کا نظریۂ جنگ	مولانا ابوالکلام آزاد	۲/۲۵
اقبال نامہ جہانگیری	مرزا محمد عرف معتمد خاں	۶/۷۵
البرامکہ	مولانا عبدالرزاق کانپوری	۱۵/۰
افعالِ مرکبہ	تمنا عمادی	۳/۰
ادب اور تنقید	ڈاکٹر سید شاہ علی	۶/۰
ادیب	ڈاکٹر طٰہٰ حسین	۵/۰
افاداتِ مہدی	مرتبہ بیگم مہدی	۴/۵۰
احسن الکلام	احسن مارہروی	۸/۷۵
اصول فقہ اسلام	سر عبدالرحیم	۱۰/۰
انگلش اُردو ڈکشنری	مرتبہ فیروز سنز	۱۶/۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	عبدالقادر سروری	۲/۵۰
اردو کی عشقیہ شاعری	فراق گورکھپوری	۳/۰
برق و مقناطیس	پروفیسر حمید عسکری	۱۲/۵۰
بابر	دختی محمود آبادی	۱۳/۰
بستان العارفین	امام ابوزکریا محی الدین	۶/۲۵
بہارِ دانش	مرزا جان طپش	۳/۷۵
بیتال پچیسی	مظہر علی خان ولا	۵/۰
بہارستانِ ناز	حکیم فصیح الدین رنج	۵/۷۵
بیاض	سلیم احمد	۴/۵۰
بچوں میں جرائم پسندی	شیلڈن	۵/۰
برگِ خزاں	عبدالعزیز خالد	۴/۵۰
تفسیر حقانی کامل ۸ حصے	مولانا حقانی	۵۵/۰
تذکرہ علمائے ہند	مولوی رحمٰن علی	۱۹/۰
تحفۂ اثنا عشریہ	شاہ عبدالعزیزؒ	۱۹/۰
تاریخ اندلس	عبدالقوی ضیاء	۲۲/۰
تاریخ جمالیات	مجنوں گورکھپوری	۲/۵۰
ثانوی مدارس میں دستکاری کی اہمیت	یونسکو	۳/۷۵
ثقافت و انتشار	میتھو آرنلڈ	۴/۵۰
جواہر اخلاق	جیمز فریلنس کاڈرکرن	۲/۰
جنسی معلومات	ایمان سرحدی	۳/۷۵
جامع الحکایات ہندی	شیخ محمد صالح علوی	۳/۷۵
چہرے	شورش کاشمیری	۶/۲۵
خدائے سخن میر تقی میر	ادریس صدیقی	۴/۰
دریائے لطافت	انشاء اللہ خاں انشا	۳/۰
رباعیات انیس	مرتبہ عمر فیضی	۳/۷۵
سیاست نامہ	نظام الملک طوسی	۸/۷۵
شبلی نقادوں کی نظر میں	مرتبہ محمد واصل عثمانی	۲/۲۵
شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں	عبداللطیف اعظمی	۴/۵۰
فسانۂ عجائب	رجب علی بیگ سرور	۴/۵۰
میر و سودا کا دور	ثناء الحق صدیقی	۱۵/۰
ہم اور ہماری نفسیات	مرتضیٰ شفیع	۴/۰

ملنے کا پتہ — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ۔ نزد جے، جے ہسپتال۔ بمبئی ۳ بی آر

Regd. No. 58 October 1968.

KITAB NUMA

Jamia Nagar, N. Delhi-25.

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے جمال پریس دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

ماہنامہ

نومبر ۱۹۶۸ء

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر - نئی دہلی ۲۵
شاخ
اردو بازار دہلی ۶
شاخ
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳
شمشاد مارکیٹ
لبرٹی آرٹ پریس

مینجنگ ایڈیٹر:- غلام ربانی تاباں - مدیر مسئول:- مجیب احمد خاں

ماہنامہ
کتاب نما
نئی دہلی

نومبر ۱۹۶۸ء
جلد ۹ شمارہ ۱۱
سالانہ چندہ دو روپے
فی پرچہ بیس پیسے

اشاریہ

زندگی اور فکر و پریشانیاں لازم و ملزوم ہیں۔ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تکلیف کے احساس کے باوجود مسلسل جد وجہد ہی زندگی کا دوسرا نام ہے۔ اگر یہ احساس مٹ جائیں اور صابر وشاکر ہو کر ترقی کی کوششیں ترک کردی جائیں تو سمجھیے کہ آخری صدا آگئی اور ختم ہو جانے کا وقت قریب آگیا۔ اُردو آج کل اسی تکلیف کے دور سے گزر رہی ہے۔ حالات نے اسے ایک الجھا ہوا مسئلہ بنا دیا ہے اور زمانے نے اس کے لیے ترقی کے دروازے بند کرنے میں اپنی سی کسر نہیں چھوڑی ہے ہم آئے دن مختلف خبریں سنتے رہتے ہیں جنھیں سُن کر کبھی تو ہم خوش ہو جاتے ہیں اور ہمیں امید کی کرن نظر آنے لگتی ہے اور کبھی نا امیدی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور ہمارے دلوں میں بُرے بُرے خیالات گھر کرنے لگتے ہیں۔

تکلیف کا احساس جب ہی ہوتا ہے جب ترقی کا جذبہ اور صلاحیتیں اپنا کام کر رہی ہوں اور اُن کے سامنے کچھ رکاوٹیں آجائیں۔ اُردو کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ اس کے سامنے رکاوٹیں کھڑی کی گئی ہیں لیکن چونکہ یہ ایک ترقی پذیر زبان ہے اس لیے ہمیں تکلیف کا احساس بھی اسی شدت سے ہو رہا ہے اس تکلیف کے اظہار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی بقا کے لیے انفرادی اور اجتماعی طور پر جس طرح بھی ہو ہر ممکن کوشش جاری رکھی جائے اور دامے، درمے، قدمے، سخنے، جیسے بھی ممکن ہو اس بُرے وقت میں نہ صرف اسے بچانے بلکہ اسے پھیلانے اور بڑھانے میں سب جی جان سے لگے رہیں۔ لیکن ان سب باتوں سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہم نا امیدی کی باتیں ختم کردیں نا امیدی موت کی علامت ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ حالات اتنے ناساز گار نہیں ہیں کہ ہم اُردو کے معاملے میں اتنے دل برداشتہ ہو جائیں اور یہ سمجھنے لگیں کہ زبان ختم ہو گئی۔ حالات اگر خدا نخواستہ اور زیادہ خراب بھی

ہو جائیں تب بھی گھبرانے کی کوئی بات نہ ہونا چاہیے۔ زبانیں اس طرح ختم نہیں ہوا کرتیں۔ بھلے ہی کسی ریاست میں اردو سرکاری اعزاز نہ پا سکے لیکن نہ صرف یہ کہ ختم نہیں ہوگی بلکہ برابر ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہے ایک ملک سے دوسرے ملک تک بولی اور سمجھی جاتی رہے گی۔

تعارف

فسانۂ عجائب کا تنقیدی مطالعہ

اُردو ادب کے ابتدائی دَور کی تصانیف میں "باغ و بہار" اور "فسانۂ عجائب" کو جو فوقیت اور
مقبولیت حاصل ہے، اس کی دوسری مثالیں پیش نہیں کی جا سکتیں۔ اگر ایک طرف سادہ اور
بے تکلف زبان لکھنے کا سہرا میر امّن کے سر ہے تو مقفّٰی نثر میں رجب علی بیگ سرورؔ اپنی مثال آپ
ہیں۔ اُن کی عبارت میں صنائع و بدائع، استعارات اور تشبیہات، قافیہ بندی کے بہترین نمونے پائے
جاتے ہیں۔ فسانۂ عجائب نہ صرف انشا پردازی کی ایسی ہی خصوصیات کی وجہ سے ممتاز ہے بلکہ وہ اُس زمانے
کے لکھنؤ کی معاشرت کی عمدہ عکاس بھی کہلانے کی مستحق ہے۔ اسی بنا پر اس کے اقتباسات آج
بھی تعلیم کی ثانوی منزل سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک ہر جماعت میں التزام کے ساتھ اُردو کے نصاب
میں شامل کیے جاتے ہیں اور صاحبانِ ذوق لطفِ زبان کی خاطر اسے یوں بھی پڑھا کرتے ہیں
سید ضمیر حسن دہلوی نے اپنی کتاب کے مقدمے میں اس کتاب کے بارے میں یوں تحریر فرمایا ہے کہ

"فسانۂ عجائب اُردو کے چند ایسے نوادر کے زمرے میں آتا ہے جو روایات پر مبنی ہونے کے
باوجود خود زندہ روایت ہیں۔ سرورؔ کی حقیقت پسندی، ماحول سے گہرے روابط اور مشاہدے کی
بے پناہ وسعت نے اُسے وہ جداگانہ رنگ بخشا ہے جو ہمیں اس سے پہلے کے افسانوی ادب میں کہیں
نہیں ملتا۔ البتہ زبان و بیان کے اعتبار سے اس میں شگفتگی اور سلاست کی جو کمی پائی جاتی تھی
وہ یقیناً فسانے کا عیب ہے۔ مگر صرف اس عیب کی وجہ سے فسانے کا معتوب ہونا جرم بھی ہے
اور ظلم بھی۔ زیرِ نظر مقالہ دراصل اسی جارحانہ تنقید اور تشدد کے خلاف غیر جانب دارانہ
احتجاج ہے۔"

جس طرح زبان و بیان ہی کو سب کچھ سمجھنا صحیح نہیں اسی طرح زبان و بیان کو کچھ نہ سمجھنا
بھی غلط ہے۔ زبان اظہار کا آلہ ہے اور جب تک اس کی نوک پلک پر مناسب توجہ نہ کی جائے ادب
میں لطافت اور نشتریت کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ تاثر واقعات کے بیان سے نہیں۔ پیرایۂ بیان سے

پیدا ہوتا ہے۔ فسانہ عجائب میں زبان پر جو غیر معمولی توجہ کی گئی ہے۔ وہ اسی حقیقت کی وضاحت ہے۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرور کی قلم جا بجا شدت پسندی کی زد میں آ گئی ہے۔ مگر یہ بھی خیال رہے کہ فورٹ ولیم کالج میں سہل نثر نگاری کی جو تحریک چلائی گئی تھی لکھنؤ میں اس کا جذباتی ردِ عمل ہونا بھی ناگزیر تھا۔ کیونکہ یہاں نہ صرف شعراء و ادباء نے بلکہ پورے معاشرے نے الفاظ کی حک و اصلاح پر خونِ دل اور خونِ جگر صرف کیا تھا۔"

ضمیر صاحب نے اپنے مقالے میں فسانہ عجائب کے مختلف پہلوؤں پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ اُن کے بیان میں توازن ہے اور فکر میں گہرائی۔ انھوں نے مسائل کو بڑی دیانت داری سے میزانِ نقد پر تولنے کی کوشش کی ہے اور نپے تُلے انداز میں اُس کے اہم گوشوں کو اُجاگر کیا ہے۔ اُن کی زبان صاف ستھری اور رواں ہے۔ اس مقالے کے اہم ابواب یہ ہیں۔

۱۔ دہلی سے لکھنؤ تک ۲۔ ہماری داستانیں اور ان کی افادیت ۳۔ فسانہ عجائب کی کردار نگاری ۴۔ فسانۂ عجائب کے مکالمے۔ ۵۔ فسانہ عجائب کی منظر نگاری۔ ۶۔ فسانہ عجائب کی زبان۔ ۷۔ فسانہ عجائب کا معاشرتی اور تہذیبی پس منظر۔ ۸۔ فسانہ عجائب کا ادبی اور تاریخی مرتبہ۔ آخر میں فرہنگ فسانہ عجائب اور کتابیات کا بھی مفید اضافہ موجود ہے۔ اس طرح کتاب کی افادیت میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

ضمیر صاحب دلی کالج میں اُردو کے اُستاد ہیں۔ اور اُردو ادب سے اُن کی وابستگی محض رسمی اور منصبی ہی نہیں ہے بلکہ حقیقی دل بستگی اور فریفتگی کی غماز کہی جا سکتی ہے۔ اس مقالے سے قبل اُن کی کتاب "دلی سے دلی تک" منظرِ عام پر آ چکی ہے جو اُن کی زبان دانی اور انشاپردازی پر دلالت کرتی ہے۔ موجودہ مقالہ اُن کے ادبی ذوق کی ایک مثال ہے۔ امید ہے کہ اپنی مختلف خصوصیات کی بنا پر اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور اردو ادب کے طالب علموں کے لیے خاص طور پر مفید ثابت ہوگا۔ اس مقالے سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

قصوں کا مقصد

"ہماری داستانوں اور قصوں کا مقصد محض وقت گزاری اور دل بہلانا ہی نہیں بلکہ اُن کے ذریعہ ہمیں خاص خاص چیزوں کی تعلیم بھی دی گئی ہے۔ البتہ اس طرح کہ لاشعوری طور پر ہم اس درس کو قبول تو کر لیں لیکن اس کا انداز ناصحانہ نہ ہونے پائے اور پند و وعظ

کے باعث کہانی اور قصہ میں گرانی بھی پیدا نہ ہو۔

قصوں نے ہمیشہ حکمراں طبقے، راجوں، نوابوں اور شہزادوں کو سخاوت، فیاضی اور دریا دلی کی تعلیم دی ہے۔ انھیں تجارت اور سیاحت کا شوق دلایا ہے۔ ان کی شادی کو کسی مشکل سوال کے حل کرنے پر قرار دے کر ان میں جواں مردی اور جاں بازی کے جوہر کو ابھارا ہے داستانوں نے مایوس اور ناامید لوگوں کو امید کے سبز باغ دکھا کر انھیں محنت اور جستجو پر کمربستہ کیا ہے۔ تقریباً تمام داستانوں کا مقصد تمثیلی اعتبار سے زندگی کے کسی نہ کسی نصب العین پر توجہ دلانا ہے۔ کہیں یہ مقصد ابدی زندگی اور چشمۂ حیوان ہے۔ کہیں یہ محبوب مجازی کا وصال اور کہیں کسی طلسمی عجائبات کی تسخیر، داستانوں میں ایک انسان متعدد مہمات سر کر کے انسانی ذہن کو عمل کی دعوت دیتا ہے اور اسے بار بار کوشش کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔

داستانوں کا ایک اور سبق یہ ہے کہ انسان کو ناکامی پر دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ یہ سوچ کر خاموش ہو جانا چاہیے کہ دنیا میں اس ظاہری نظام کے علاوہ ایک پوشیدہ یا مخفی نظام اور بھی ہے۔ غرض جب کسی انسان کو پے در پے مصائب کا سامنا ہوتا ہے اور وہ اس سے تنگ آکر اپنے تئیں ہلاک کرنا چاہتا ہے تو کوئی بزرگ اور مقدس روح اس کی دستگیری کرتی ہے۔ یہ مقدس روح ہی دراصل حیاتِ جاوید کا ایک راز ہے جو انسان میں بے پناہ قوتِ اعتماد پیدا کر کے اسے جوئے شیر لانے کی صلاحیت بخشتی ہے۔ داستانوں نے ہمیں اٹل ارادے اور راسخ الاعتقادی کی تعلیم دی ہے۔ داستان کا ہیرو خطرناک منازل سے گزر کر ثابت کر دیتا ہے کہ ؎

راہِ دمِ تیغ پر ہی کیوں نہ ہو
جی پہ رکھیں گے تو گزر جائیں گے (دبیر)

اور دراصل اسی میں زندگی کا راز مضمر ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی تازہ مطبوعات

شہر آشوب
ڈاکٹر نعیم احمد

شہر آشوب اُردو شاعری کی ایک ایسی کلاسکی صنف سخن ہے جس میں ہیئت کی کسی خاص پابندی کے بغیر سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اقتصادی بحران اور عوام و خواص کی بربادی کا ماتم بیان کیا گیا ہے اس لیے یہ زندگی پر تبصرہ بھی ہے اور تنقید بھی۔ شہر آشوب میں انسان دوستی کا جذبہ کارفرما ہے اور مصیبت زدہ انسانوں کے اجتماعی دکھ درد کا بیان جذبات نگاری کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے۔ کتاب کے شروع میں مفصل دیباچہ ہے جس میں اس کی تاریخی اہمیت اور فنی نکات پر مشتمل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت : ۲۵/ ۷

دلی کی شام
مصنف : احمد علی — ترجمہ : بلقیس جہاں

'دلی کی شام' ایک تہذیب اور ایک عہد کی داستان ہے۔ 'دلی کی شام' خود مجسم دلی ہے۔ وہی جنگِ عظیم اور ترکِ موالات کے زمانے کی دلی۔ اس زمانے کے شادی بیاہ، موت و زیست مشغلے اور مرحلے غرض سب ہی کچھ اس ناول میں سموئے ہوئے ہیں۔ اس حقیقت کا بیان ہے جو آج افسانہ بن چکی ہے۔ ان گلی کوچوں کا ذکر ہے جن کا کچھ نہ کچھ نام تو باقی ہے لیکن بو باس بالکل مٹ چکی ہے۔ دلی کی شام ایک ایسا ناول ہے جس کے لیے بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ آپ اسے پڑھ کر محظوظ ہوں گے۔

قیمت ۵۰/ ۷

فسانۂ عجائب کا تنقیدی مطالعہ (تنقید)
سید ضمیر حسن دہلوی

رجب علی بیگ سرور کی کتاب 'فسانۂ عجائب' اُردو نثر کی شاہراہ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے یہ مقفّٰی و مسجع نثر بھی ہے اور ایک مخصوص سماج کی آئینہ دار بھی ضمیر صاحب نے سرور کی اس مقفّٰی و مسجع عبارت کے تمام پہلوؤں پر انتہائی جامع انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے اس کا نیا اڈیشن بعد نظرثانی ابھی حال میں ہی شائع کیا ہے۔ قیمت -/۳

آتشِ گل
جگر مرادآبادی

رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی کا یہ دیوان پُرکیف اور بہار آفریں غزلوں کا وہ مجموعہ ہے جس کا نام شعری ادب میں سرِفہرست ہے۔ ایک ایسا مجموعۂ کلام جو اپنے اندر بے پناہ رنگینیاں اور بہاریں سمیٹے ہوئے ہے اور جس کی ہر غزل اور ہر شعر خود بخود نغمہ بن کر لبوں پہ آجاتا ہے۔ قیمت ۵۰/ ۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی تازہ مطبوعات

پریم چند کے خطوط   مرتبہ: مدن گوپال

اس مجموعے میں پریم چند کے ۲۲۳ خطوط شامل ہیں جو پہلی بار اتنی بڑی تعداد میں مرتب ہو کر شائع ہوئے ہیں۔ ان نجی اور کاروباری خطوط نے شائقین ادب اور خاص طور سے طلبا کے لیے دانشی بڑی آسانیاں فراہم کر دی ہیں کیونکہ خطوط ہی ان کی سیرت و شخصیت سے آگاہی حاصل کرنے کا وہ بڑا اور مستند ذریعہ ہیں جس کے بعد پھر کسی اور حوالے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ہے۔   قیمت ۶/۵۰

ڈاکٹر ذاکر حسین (سیرت و شخصیت)   مرتبہ: عبداللطیف اعظمی

صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین پر اردو میں پہلی کتاب ہے جس میں اردو کے نامور ادیبوں پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ ڈاکٹر عابد حسین۔ پروفیسر محمد مجیب۔ خواجہ غلام السیدین، پروفیسر آل احمد سرور اور دوسرے اصحاب کے ذاکر صاحب پر بہترین مضامین شامل ہیں۔

ذاکر صاحب کے کردار، اُن کی صفات اور قومی و تعلیمی خدمات سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔   قیمت ۵/۵۰

شراب کہنہ   رشید نعمانی

قلی قطب شاہ سے لے کر آج تک دورِ متقدمین کے ۵۰ شاعروں کے حالات، اُن کے کلام پر تبصرہ اور نمونۂ کلام۔ ماہنامہ "کتاب نما" میں "شراب کہنہ" کے نام سے شائع ہونے والا وہ مشہور سلسلہ جو ہر جگہ پسند کیا گیا اور جو اب نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے تاکہ خاص طور سے طلبا اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں۔   قیمت ۳/۲۵

یادگار شخصیتیں   پنڈت جواہر لال نہرو   ترجمہ: رفیق محمد شاستری

جواہر لال نہرو کی ایک بڑی صفت یہ بھی تھی کہ وہ ایک نہایت غیر جانبدار انسان تھے شخصیات کا مطالعہ انھوں نے کسی جذباتی تعلق یا روایتی عقیدوں کے ساتھ نہیں کیا ہے بلکہ سب کو ان کے تاریخی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں اہم شخصیتوں کا ذکر ہے جن میں اوتار، پیغمبر، مصلح، مفکر، فلسفی، حکمران، سیاسی رہنما، ادیب اور شاعر، غرض دنیا کے قریب قریب سب ہی قابلِ لحاظ افراد کا تھوڑا بہت ذکر آ جاتا ہے۔   قیمت: ۵/۵۰

کچھ نئی کتابیں
جو
مکتبہ جامعہ کو ایجنسی پر حاصل ہوئی ہیں

نذرِ ذاکر (اردو) (مجموعہ مضامین جو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی خدمت میں ان کی ۷۱ ویں سالگرہ -/۴۰
" " (انگریزی) پر پیش کیا گیا۔ مرتبہ: مجلس نذرِ ذاکر، نئی دہلی) -/۴۰
اکبر (سوانح) (قومی سوانح حیات کے سلسلے کی کتاب) لارنس بینن ۳/۵۰
کبیر (") " " " " ڈاکٹر پارس ناتھ تواری ۲/۵۰
پنڈت وشنو دگمبر " " " " وی آر۔ اٹھاولے ۲/۲۵
آبادی (آبادی سے متعلق اعداد و شمار اور نظریات) ایس۔ این۔ اگروال ۵/۲۵
گاندھی جی کثرت میں وحدت (گاندھی جی کے اقوال) انتخاب کنندہ۔ نیشنل کمیٹی گاندھی صدی ۲/۲۵
عکس و شخص (۱۱ شخصیتوں پر تنقید و تبصرہ) عنوان چشتی -/۵
اسرار کائنات و اشرف المخلوقات ڈاکٹر اختر احمد ۲/۶۰
نوائے سرور (سرور جہاں آبادی کا منتخب کلام) ڈاکٹر حکم چند نیر -/۶
بے بات کی بات (۱۳ افسانوں کا حسین مجموعہ) سیدہ نسیم چشتی -/۴
سرورِ سرمدی (شعری مجموعہ) ناشاد کانپوری ۴/۵۰
افکارِ محروم (محروم کی شخصیت اور ادبی خدمات سے متعلق مضامین) مرتبہ: مالک رام -/۵
شعلۂ نوا (شعری مجموعہ) شاعر: تلوک چند محروم -/۶
متنی تنقید (اصولِ فن تنقید پر پہلی کتاب) خلیق انجم ۴/۵۰
فن اور تنقید (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) مرتبہ: انور کمال حسینی -/۹
نویدِ عصرِ لینن (انقلابی نظموں کا مجموعہ) نیاز حیدر -/۱
تلاشِ منزل (شعری مجموعہ) کرشن سونی نشا -/۴
جامِ سہ آتشہ " " پروفیسر پریم رنگپوری -/۳
درسِ تبلیغ (مذہبی) مولانا مقبول احمد سیوہاروی ۲/۵۰
مثنوی حیات کائنات (انسانی تاریخ نظم میں) عبدالمجید ۳/

شہاب جعفری

غزل

مٹ گئے ہم، سرخرو دنیا ہوئی
اے محبت تو کہاں رسوا ہوئی

لو حریمِ دل کے پردے جل گئے
لو وہ جانِ شوق بے پردا ہوئی

ایک اک کر کے امیدیں چل بسیں
دشتِ دل میں آرزو تنہا ہوئی

آج رسوائی تجھے روتا ہوں میں!
ایسی تنہائی بھری دنیا ہوئی

سبزہ اُگتا ہے مگر جل جائے ہے
گھر کی دیواروں کی حالت کیا ہوئی

کیسے کیسے قافلے گزرا کیے
چشمِ حسرت مٹ کے نقشِ پا ہوئی

(سورج کا شہر، شاعر شہاب جعفری، سائز ۲۲×۱۸/۸ مجلد صفحات ۲۴۸
قیمت -/۶ حوالہ صفحہ ۱۳۷)

پروفیسر محمد مجیب

ذاکر صاحب اور تعمیر جامعہ

مجھے حال ہی میں معلوم ہوا ہے کہ جامعہ ملیہ کو قائم کرنے کی تحریک قوم کے ان رہنماؤں نے نہیں کی تھی جن کے نام اس سلسلے میں بتائے جاتے تھے۔ مہاتما گاندھی استادوں اور طالب علموں کو اس پر آمادہ کرنے کے لیے کہ وہ سرکاری درس گاہوں کو چھوڑ دیں، ملک کا دورہ کر رہے تھے۔ ایک خاص تاریخ کو وہ علی گڑھ آنے والے تھے اور یونین میں ان کی تقریر ہونے والی تھی۔ ذاکر صاحب، جو اس وقت آدھے طالب علم، آدھے استاد تھے اور طالب علموں میں ممتاز اور ان کے خاص گروہ میں ہر دل عزیز تھے، چاہتے تھے کہ اس جلسے میں ضرور شریک ہوں۔ لیکن انھیں اپنے علاج کے لیے دلی بھی آنا تھا، جہاں وہ ڈاکٹر انصاری مرحوم سے وقت لے چکے تھے اور اتفاق سے جو تاریخ انھوں نے دلی جانے کے لیے مقرر کی تھی، اسی تاریخ کو علی گڑھ میں مہاتما گاندھی کی آمد ہوئی۔ انھوں نے بہت کوشش کی کہ جلسے کا وقت ایسا طے ہو کہ وہ دلی سے واپس آکر اس میں شریک ہو سکیں، مگر جب وہ اسٹیشن پہنچے، تو ان کے کئی دوست ان کے استقبال اور انھیں یہ خوش خبری سنانے کے لیے آئے ہوئے تھے کہ مہاتما جی کی تقریر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ مہاتما جی کی تقریر کا بنارس ہندو یونیورسٹی کے طالب علموں اور استادوں پر بھی کارگر اثر نہیں ہوا تھا، لیکن وہاں پنڈت مدن موہن مالویہ جلسے میں موجود تھے۔ علی گڑھ میں کوئی بات آداب کے خلاف جلسے میں تو نہیں ہوئی، البتہ جلسے کے بعد مہاتما جی کا بہت مذاق اڑایا گیا۔ ذاکر صاحب علی گڑھ اسٹیشن پر اترے، تو مذاق اڑانے کا سلسلہ جاری تھا اور اس میں ان کے بعض اپنے دوست بھی شریک تھے۔

ذاکر صاحب کو اس وقت مہاتما گاندھی سے کوئی عقیدت نہیں تھی۔ مہاتما جی نے اپنی اخلاقی حکمت رفتہ رفتہ قائم کی۔ پہلے ان کے ماننے والے بہت کم تھے، وقت کے ساتھ بڑھتے گئے۔ مسلمان تقریروں میں جب انداز بیان کو پسند کرتے تھے اسے دیکھتے ہوئے

اس کا امکان بہت کم تھا کہ مسلمانوں میں وہ اپنی قوت بیان کی وجہ سے اثر پیدا کر سکیں اور ہمیں علی گڑھ کے ان طالب علموں کو قصوروار نہیں ٹھہرانا چاہیے جنھیں ان کی تقریر سننے کے بعد ان سے عقیدت پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن تمسخر اور تحقیر کے جس انداز سے مہاتما جی کی تقریر اور ان کے مقصد پر فقرے چست کیے گئے، اس سے ذاکر صاحب کو بہت تکلیف ہوئی۔ ایسی فضا میں جیسی کہ اس وقت علی گڑھ میں تھی، اعتراض یا نصیحت کرنا یا سیاست اور تہذیب کا دوسرا رخ پیش کرنا بے کار تھا؛ پھر بھی ذاکر صاحب اگلے دن اس جلسے میں گئے، جس میں طالب علم مہاتما جی کی اس تحریک پر بحث کرنے والے تھے کہ اُستاد اور طالب علم سرکاری درس گاہوں کو چھوڑ دیں۔ انھیں بخار تھا اور وہ بحث میں حصہ نہیں لینا چاہتے تھے، مگر اس فریق کی تائید کیے بغیر نہ رہ سکے جو مہاتما گاندھی کی تحریک کے موافق تھا۔ اسی فریق کی مخالفت میں کسی نے طعنہ کے انداز میں کہا کہ جو لوگ موجودہ درس گاہوں کو چھوڑنے کی تلقین کر رہے ہیں انھیں یہ بھی تو بتانا چاہیے کہ ان درس گاہوں کو چھوڑنے والے کہاں جائیں؟ یہ علی گڑھ کے مقابلے میں ایک قومی درس گاہ قائم کرنے کا چیلنج تھا جسے ذاکر صاحب نے دل میں قبول کر لیا۔ وہ دلی آئے اور حکیم اجمل خاں مرحوم اور دوسرے لیڈروں سے مل کر انھیں یقین دلایا کہ علی گڑھ میں ایک قومی درس گاہ قائم کی جا سکتی ہے اگر قوم کے رہنما ان استادوں اور طالب علموں کو سہارا دیں جو اس میں تعلیم دینے اور تعلیم پانے کے لیے تیار ہیں۔ قومی لیڈر بغاوت کے ایسے ہی آثار کے تو منتظر تھے۔ انھوں نے بہت گرم جوشی کے ساتھ ایک قومی درس گاہ قائم کرنے کی تجویز کو اپنا لیا اور ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملّیہ وجود میں آگئی۔

جامعہ میں ذاکر صاحب کا کام فروری یا مارچ ۱۹۲۶ء سے شروع ہوا۔ اس وقت عبدالمجید خواجہ صاحب مرحوم شیخ الجامعہ تھے اور جامعہ کو علی گڑھ سے دلی منتقل کیا جا چکا تھا۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء سے اس وقت تک یہ بات رفتہ رفتہ ظاہر ہو گئی تھی کہ جامعہ میں کون بغیر شرط کے کام کرنے پر تیار ہے، کون نہیں ہے؛ اور ان شرطوں میں جن کے بغیر کام کرنا شرط تھا ایک یہ بھی تھی کہ چاہے جامعہ کے مقصد پر گفتگو اور بحث کی جائے، اس کے کاموں کو لا حاصل قرار دے کر اسے چھوڑا نہ جائے۔ غالباً اکتوبر ۱۹۲۰ء اور ستمبر ۱۹۲۲ء کے درمیانی زمانے میں یہ بات واضح ہو گئی کہ جامعہ کی غیر مشروط خدمت کرنے والوں میں سب سے زیادہ صلاحیت ذاکر صاحب میں ہے؛ اور انھوں نے جرمنی سے واپسی پر شیخ الجامعہ کے فرائض بھی اس طرح انجام دینا شروع کر دیے گویا وہ رخصت

سے واپس آئے ہوں ۔

جامعہ میں اس وقت تھا کیا؟ اسکولوں اور کالجوں کو ملا کر قریب ۸۰ طالب علم اور پچیس تیس استاد جن میں سے ہر ایک کی اپنی جداگانہ شخصیت اور نفسیاتی مسائل تھے ایک بیرک نما عمارت ہوسٹل اور بیشتر استادوں کے رہنے کے لیے تھی اور کتاب خانے، دفتروں اور کلاسوں کے لیے تین اور کرایے کی عمارتیں جن میں سے دو کے ساتھ چند کوٹھریاں تھیں۔ یہاں تک جامعہ کے علی گڑھ سے منتقل ہوتے وقت ایک سال کا خرچ دے چکے تھے۔ اس کے بعد سے جامعہ کی مالی ضرورتوں کو پورا کرنا، امیر جامعہ حکیم اجمل خاں مرحوم نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ طالب علموں کی تعداد ایک معمولی مدرسہ سے بھی کم تھی، مگر ۱۹۲۶ء کے شروع کے طالب علموں میں سے بیشتر اور استادوں اور کارکنوں میں سے نفر بیاسب ایسے تھے جو اس وقت جب علی گڑھ میں جامعہ کے بند کرنے کا مسئلہ زیر غور تھا اس کا اعلان کر چکے تھے کہ وہ جامعہ کو بند نہ ہونے دیں گے چاہے لیڈروں میں سے کوئی بھی ان کا سرپرست اور مددگار بننے کو تیار نہ ہو یہی عزم جامعہ کا اصل سرمایہ تھا اسی کے بل پر اپنے آپ کو اور دوسروں کو یقین دلاتا تھا کہ جامعہ ملیہ آزاد قومی تعلیم کا نمونہ اور تعلیم کی ایک نئی تحریک کا پیش خیمہ ہے۔

کسی تاریخی شخصیت کے عمل کو سمجھنے کے لیے سب سے مناسب طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس کی جگہ تصور کریں اور تمام حالات اور تمام لوگوں کی نظر میں رکھ کر سوچیں کہ ہم ہوتے تو کیا کرتے۔ اپنے آپ کو اس "مسند" پر تصور کیجیے جس پر ذاکر صاحب صبح آٹھ بجے سے سہ پہر ساڑھے چار یا پانچ بجے تک بیٹھتے تھے۔ بعض استادوں کا دستور ہے کہ گھنٹہ خالی ہوا تو آکر شیخ الجامعہ کے دفتر میں بیٹھ جائیں گے اور ادھر ادھر کی باتیں یعنی گپ کریں گے۔ یہ بزرگ ہیں، ان کا لحاظ کرنا ضروری، خود ان سے کام کی بات نہیں کی جا سکتی، ان کی موجودگی میں بھی وہی باتیں ہو سکتی ہیں جن سے ان کو دلچسپی ہو۔ ان کے علاوہ جو لوگ ملنے آتے ہیں، وہ یا تو ضرورت بیان کر کے روپے کا مطالبہ یا ساتھیوں میں سے کسی کی شکایت کرتے ہیں۔ آمدنی کا ذریعہ بس یہ ہے کہ کسی فرض شناس باپ نے بیٹے کی فیس بھیج دی یا مکتبہ کی کچھ کتابیں بک گئیں۔ حکیم اجمل خاں مرحوم کو جامعہ کی مالی حالت کا بڑا دکھ ہے، مگر ان سے اصرار کے ساتھ کہا بھی نہیں جا سکتا کہ جو کچھ کرنا ہے جلد کیجیے۔ وہ ضرور سوچتے رہتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیے؛ کس سے، کس وقت اور کہاں ملنا چاہیے؛ اصول اور عقیدے کی خلاف ورزی کیے بغیر جامعہ کی قوم پرستی اور حکومت دشمنی سے کس طرح نظر اور توجہ ہٹا کر جامعہ کی اہمیت کو واضح کرنا چاہیے؛ جامعہ کی نازک مالی حالت پر پردہ ڈال کر کس طرح دینے والے کو یقین دلانا چاہیے کہ اس کا روپیہ ایک ترقی پذیر کام میں صرف ہوگا۔ ان سب باتوں کے بارے میں غور کرنے کے لیے

ملاقات کی ضرورت ہے' اور اس وقت بڑے آدمیوں سے ملنے کی یہی صورت ہے کہ ان کی مصاحبت کی جائے۔ حکیم صاحب جب کبھی بلا بھیجتے ہیں' تو امید بندھتی ہے کہ روپے کا کچھ انتظام کیا جائے گا مگر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مشورے کے لیے وقت نہیں ملتا اس لیے حکیم صاحب کی ذمہ داریاں اور مجبوریاں بہت ہیں اور جانے آنے میں اپنی جانب سے کچھ خرچ ہو گیا۔ حکیم صاحب جن لوگوں سے روپیہ حاصل کرنے کے خیال سے ملاتے ہیں' ان کے پاس غریب بن کر جائیے تو ان کی نظروں سے گر جائیں گے' اور بے غرض بن کر خودداری کے ساتھ ملیے تو انھیں جامعہ کی ضرورتوں کا احساس نہ ہوگا۔ اگر کسی کو جامعہ بلانا اور جامعہ کے کام کو دکھانا ہو تو کیا کیجیے گا؛ جامعہ میں دکھائیے گا تو کیا دکھائیے گا' اور جلسے اور نمائش میں کچھ خرچ کرنا ہو تو وہ کہاں سے آئے گا۔ پھر لوگ ہیں کہ وقت بے وقت تقاضا کرتے رہتے ہیں کہ کہیں سے کچھ لائیے تو کام چلے' گویا جامعہ وہ ہیں اور ان کی ضرورتیں۔ کبھی مشورہ کیجیے کہ جامعہ کو ترقی دینے کے لیے کیا کرنا چاہیے' تو سب کہتے ہیں کہ یہ باتیں تو آپ ہم سے بہتر سوچ سکتے ہیں؛ ایک دو ایسے بھی ہیں جو سمجھتے ہیں اور جوش آجاتا ہے' تو کہہ بھی دیتے ہیں کہ جامعہ کے کاموں کو ترقی دی جا سکتی ہے' روپیہ مل سکتا ہے' اگر چندہ جمع کرنے کی اسکیم بنائی جائے؛ اور شیخ الجامعہ صاحب دفتر میں بیٹھے رہنے کے بجائے چندہ جمع کرنے میں اپنا وقت صرف کریں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ سہی' مگر جامعہ کا ایک اعلیٰ دینی اور قومی مقصد بھی تھا' جس کی خاطر ہر طرح کی مصیبتیں برداشت کی جا سکتی تھیں۔

جامعہ کو قائم کرنے کا ایک مقصد علم کو دین کے رنگ میں رنگنا تھا' اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بنیادی شرط یہ تھی کہ دین کا تصور واضح ہو اور فن تعلیم کے ایسے ماہر موجود ہوں جو علم کو دین کا اور دین کو علم کا رنگ دے سکتے ہوں۔ لیکن دین کو واضح کرنے کا حوصلہ کون کر سکتا ہے؟ عربی اور دینیات کے استادوں میں سے ایک بزرگ "وہابی" خیال کے تھے وہ پنج وقتہ نماز اور روزے کی پابندی کے علاوہ سر منڈا رکھنا بیس کتروانا اور ٹخنے سے اونچا پاجامہ پہننا لازمی سمجھتے تھے۔ وہ نامحرم عورتوں کی طرف دیکھنے یا ان سے ہاتھ ملانے کو اتنا برا سمجھتے تھے کہ ایک موقع پر مسز نائیڈو انتہائی کوشش کے باوجود انھیں آمادہ نہ کر سکیں کہ وہ ان کی طرف دیکھیں۔ ایک اور مرتبہ جلسے میں جب مرحومہ بیگم بھوپال سے ان کا تعارف کرایا گیا اور بیگم صاحبہ نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو انھوں نے یہ کہہ کر مصافحہ کرنے سے انکار کر دیا کہ میں نامحرم عورتوں سے ہاتھ ملانا غلط سمجھتا ہوں۔ ایک دو شیعی اور غیر مسلم استادوں کو چھوڑ کر باقی سب سنی حنفی تھے جن میں سے بعض ہر وقت اسلام کی بات کرتے تھے' اگرچہ خود روزہ نماز کے زیادہ

پابند نہ تھے۔ بعض دوسرے روزے نماز کے پابند تھے لیکن اسلام کی بات کم کرتے تھے۔ غرض جسے عام طور پر دینداری کہتے ہیں، اس کی مثال پیش کرنے کا شوق کسی کو نہ تھا۔ ایسی حالت میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ جامعہ میں بچوں کو اچھے مسلمان بنا سکھایا جاتا ہے۔ دوسری طرف فنِ تعلیم سے واقفیت رکھنے والے استاد بھی نہیں تھے؛ دینیات کے نصاب میں نئے تجربے کیے بھی جاتے تو شاید اس سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوتا، اس لیے کہ دینیات کے استاد صرف پرانے ڈھنگ پر تعلیم دے سکتے تھے۔ گویا جامعہ کی تعلیم کو دین اور علم کو سمونے کا ایک تجربہ ثابت کرنا تقریباً ناممکن تھا اور دین اور ملت سے دلچسپی رکھنے والے وہ مسلمان جن کی دولت سے مدد حاصل کی جا سکتی تھی جامعہ کے قومی رنگ کو ناپسند کرتے تھے اور اس سے الگ ہی رہنا چاہتے تھے۔ جامعہ کا دوسرا مقصد تعلیم کی ایک نئی تحریک شروع کرنا تھا جس کا سارے ملک پر اثر پڑے۔ یہ کام بعد کو بنیادی تعلیم اور بالغوں کی تعلیم کے سلسلے میں ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں پہلی کی ایک تجویز کے آثار نظر آتے تھے کہ جامعہ میں صنعتی تعلیم دی جائے۔ ان کے آثار میں دو ہینڈ پریس ایک کاتب، ایک مصلح سنگ اور ایک پریس مین تھا۔ کچھ اور سامان تھا، جس سے خیال ہوتا تھا کہ فوٹو گرافی سکھانے کی اسکیم بھی ذہن میں تھی۔ مگر سامان سب اَنمل بے جوڑ تھا؛ کچھ تالے اور اوزار قفل سازی کی اسکیم کی یادگار تھے۔ جامعہ میں بعض لوگ تھے، جن کے نزدیک سب سے اہم کام تبلیغی مدرسے قائم کرنا تھا؛ بعض جامعہ کے مدرسوں کے نمونے پر دوسرے مدرسے کھولنا چاہتے تھے؛ جامعہ کی ایک شاخ رنگون میں تھی، ایک نیا مدرسہ باڑہ ہندو راؤ (دلی) میں قائم کیا گیا تھا۔ کچھ لوگ ان تجربوں کو بڑی اہمیت دیتے تھے، مگر انھیں تجربوں پر جامعہ میں لوگ ہنستے بھی تھے۔

یہ ہیں وہ حالات جنھیں ذاکر صاحب کی شخصیت کے سمجھنے کے لیے نظر میں رکھنا چاہیے۔ اب اسی سمجھنے کی کوشش کی تکمیل کے لیے حالات کو ذاکر صاحب کی نظروں سے دیکھیے۔ کسی دل میں گھس کر ساری حقیقت معلوم کر لینا ممکن نہیں ہے اور کوئی شخص خود اپنا سارا حال بتانا چاہے تو بھی نہ بتا سکے گا۔ ..... (اقتباس)

("مذکر ذاکر" صفحات ۲۷۰ سائز ۲۲×۱۸/۸ قیمت ۴/- حوالہ صفحات ۵۵ تا ۵۹)

جامِ نو

دلؔ شاہ جہاں پوری

۱۸۷۵ ـــــ ۱۹۵۹

ضمیرالدین خاں نام، دلؔ تخلص، اصل و نسل کے لحاظ سے افغان۔ سلسلۂ نسب آٹھ واسطوں سے شاہ قاسم سلیمانی تک پہنچتا ہے، سلسلۂ قادریہ کے یہ ایک مشہور بزرگ تھے۔ آخری عمر میں مضافات پشاور سے ہندوستان آئے، جہانگیر کا عہد تھا۔ ان کے مریدوں اور عقیدت مندوں کی کثرت اور تعداد سے حکومت خائف ہوئی۔ قلعۂ چنار گڑھ میں مقید کر دیے گئے اور وہیں آپ نے رحلت فرمائی۔

خاندان کے بقیہ افراد شاہ جہاں پور آکر مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ حضرتِ دلؔ یہیں پیدا ہوئے، کم سنی میں والد کا انتقال ہو گیا۔ ننہال والوں کی سرپرستی اور نگرانی میں تعلیم و تربیت ہوئی۔ وطن کے بہترین اساتذہ اور علماء سے فارسی اور عربی پڑھی، تفسیر اور حدیث کے درس لیے۔ پھر اپنے موروثی پیشے یا شغلے علم طب کی طرف رجوع ہوئے اور اس میں سندِ تکمیل حاصل کی۔

پندرہ سولہ برس کی عمر سے شعر کہنے لگے تھے، کچھ دنوں کی مشق کے بعد منشی امیر احمد مینائی کے شاگرد ہو گئے اور تھوڑی ہی مدت میں اُن کے چند بہت ہی عزیز اور نام آور تلامذہ میں ان کا شمار ہونے لگا۔ آخر عمر تک خود ان کے شاگردوں کا حلقہ بھی بہت وسیع ہو گیا تھا۔

گھر میں تھوڑی سی زمینداری تھی، کچھ دنوں ٹھیکے اور تجارت میں بھی وقت گزرا، شکار، قوالی، صوفیوں اور فقیروں سے ارادت و عقیدت۔ خلق اللہ کی خدمت کی خاطر مطب اور طبابت۔ غرض انھیں مشاغل اور معمولات میں زندگی بسر کرتے رہے۔

بڑے خوددار، ذی مروّت، دوست دار، خلیق اور انتہائی مہمان نواز بزرگوں میں سے تھے اپنے انھیں خصائل اور خوبیوں کی بنا پر وطن اور وطن کے باہر سب لوگ ان کی عزت اور احترام کرتے تھے۔ آن بان اور وضع داری میں مرتے دم تک فرق نہ آنے دیا۔

شعروشاعری میں بھی ہر مدرسۂ فکر کے لوگوں میں ان کی خاصی مان دان رہی۔ ان کی زبان پر لکھنؤ کا اثر اور خیالات میں دہلی کا رنگ جھلکتا ہے۔

جناب ورک نے اپنی توجہ زیادہ تر غزل پر رکھی۔ کہنہ مشقی اور پختگی ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات میں سے ہیں۔ درد اور گداز کی کیفیتیں بھی ان کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ بحروں کے انتخاب میں ترنم اور نغمگی، جذبات کی فراوانی میں بھی اسلوب، شائستگی اور نفاست کا پاس اور لحاظ رکھتے تھے۔ انھیں محاسن اور فنی کمالات کی بدولت، اہل ذوق ہر زمانے میں ان کے اشعار کو لطف اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے رہا کریں گے۔

کلام کا مجموعہ "نغمۂ دل" کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔

انتخاب

مجھ پہ بڑا کرم ہے مرے چارہ ساز کا ۔۔۔ کیا جانے کس خیال سے چھوڑا بحالِ زار

وہ تم کہ رنگ اڑاتے رہے زمانے کا ۔۔۔ وہ ہم کہ جادۂ تسلیم سے قدم نہ ہٹے

کبھی چراغ نہ گُل ہو غریب خانے کا ۔۔۔ مُدام داغِ محبت سے دل رہے روشن

ہم نے ہر گُل میں ترے حُسن کا جلوہ دیکھا ۔۔۔ چمنِ دہر میں اک شاہدِ رعنا تو ہے

ہو جائے گا ختم آج ہی افسانہ کسی کا ۔۔۔ سُن لیجیے حالِ دلِ مضطر دمِ آخر

ہر دم ہے اُسی محوِ تغافل کا تصوّر
عشق اور کسی کام کے قابل نہیں رکھتا

وقتِ رخصت تسلیاں دے کر ۔۔۔ اور بھی تم نے بے قرار کیا

کہنے کی ہے کیا حاجت، احوالِ شبِ فرقت
گزرا ہے جو کچھ ہم پر، تم نے بھی سُنا ہوگا

سوئے صحرا، تہِ تربتِ قیسِ دیوارِ حبیب
ہم بھی تقدیر پہ شاکر ہیں جہاں ہو جانا

بارہا ڈوب کے ابھرا مرے دل کا نشتر
راز پھر بھی نہ کُھلا عشق کی گہرائی کا

بہلا رہے ہیں اپنی طبیعت خزاں نصیب ۔۔۔ دامن پہ کھینچ کھینچ کے نقشہ بہار کا

گو رازِ حقیقت کا اظہار نہیں ہوتا
ذرّوں میں کوئی ذرّہ بے کار نہیں ہوتا

گرے یوں اُن کے سنگِ آستاں پر — جبینِ عجز پہنچی آسماں پر
ہم صفیرو موسمِ گل آنے تو دو — خود بخود ہو جائیں گے تیار پر

او عہد شکن! حشر میں بھی وعدۂ فردا
آنے کو ہے اِس دن کے سوا کیا کوئی دن اور

دل سوز اگر ہو تو دکھائیں جگر کے داغ — تم چارہ ساز ہو تو کہیں ماجرائے دل
وہ خود غرض سُننے نہ سُننے اس سے کیا غرض — کہنا ہے بار بار ہمیں مدعائے دل

جانب دیر و حرم کان لگے رہتے ہیں
کاش پردے ہی سے سُنتے تری آواز کہیں

ہم کو بے چین کیے جاتے ہیں — ہائے کیا شے وہ لیے جاتے ہیں

نہ وہ آرام جاں آیا، نہ موت آئی شبِ وعدہ
اسی دُھن میں ہم اُٹھ اُٹھ کر ہزاروں بار بیٹھے ہیں

اُٹھائیں لطف مے نوشی، کُھلے بوتل، چلے ساغر
ہوا سنکی، گھٹا اُٹھی ہے کیوں مے خوار بیٹھے ہیں

مجھے در پر جو دیکھا بول اُٹھے اے دل وہ دربان سے
یہ کیا کہتے ہیں کیا مطلب ہے کیوں بے کار بیٹھے ہیں؟

جفا کے بعد وہ عہدِ وفا کریں تو سہی — محال ہے کہ مرے دل کو اعتبار نہ ہو
ستم جو حد کے اُٹھاؤ قضا کو یاد کرو — تمال ہستیٔ اہلِ وفا کو یاد کرو
جو بے حسی کبھی بڑھ جائے قلبِ مضطر کی — کرشمۂ نگہِ فتنہ زا کو یاد کرو

اُٹھے تو محوِ تمنا، ملے تو غرقِ نیاز
نگاہِ شوق کو فکرِ مآل کار نہ ہو

نگاہِ شوق رہی ہمزبانِ دل لیکن — کسی طرح نہ بنا شرحِ آرزو کرتے
تلاشِ یار کجا، آرزوئے دید کجا — ہیں تو عمر ہوئی اپنی جستجو کرتے
مآلِ عشق پہ دل مطمئن اگر ہوتا — تو چھیڑ چھیڑ کے ناصح سے گفتگو کرتے

دیا تھا عشق تو ہمت بھی یہ خدا دیتا کہ ایک وقت میں ہم ترکِ آرزو کرتے

اندازِ چشم تاب شکن تھا کہ الاماں اک پنکھڑی کی چوٹ سے دل چور ہو گئے

نگاہِ مست سے او دُور کے دیکھنے والے

تجھے تو ہے، مجھے اپنی خبر نہیں، نہ سہی

برپا ہوا ہے حشر بس اتنی سی بات پر

اک نالہ کش کے بس میں طبیعت نہیں رہی

او فتنہ گر! یہ حشر خرامی کی شان ہے

دل خود یہ کہے کہ اب کوئی حسرت نہیں رہی

کافر نظریں، قاتل ابرو، جن کے تیور دل کے دشمن

ہم نے ظالم! تیرے ہاتھوں، مٹتے دل کی دنیا دیکھی

معتکف تیرے آستانے کے کیوں نہ محسود ہوں زمانے کے

مکتبہ جامعہ کی چند اہم مطبوعات

(جو اس ماہ کے آخر تک شائع ہو رہی ہیں)

بکھرے ورق (مختلف مضامین کا مجموعہ)

مصنف: ڈاکٹر سونتی کمار چیٹرجی مترجم: شانتی رنجن بھٹاچاریہ

قیمت -/۳

چنار کا پتا (ناولٹ)

مصنفہ: سلطانہ آصف فیضی

قیمت ۲/۲۵

پاکستان اور اس کا قیام (سیاسی و تاریخی واقعات)

مصنف: سری پرکاش سابق ہندوستانی ہائی کمشنر قیمت -/۴

صلاح الدین (تاریخی ناول)

مصنف: قاضی عبدالستار

نئی مطبوعات

کتاب	موضوع	مصنف	مقام و ناشر	قیمت
شہر آشوب	(ادبی تحقیق)	ڈاکٹر نعیم احمد	دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۷/۲۵
عکس و شخص	(مضامین)	عنوان چشتی	〃 ، ادارۂ عارض	۵/-
پیغمبروں کی کہانیاں	(بچوں کے لیے)	شبنم قادری	امروہہ، سیرت پبلشرز	۲/۵۰
عدسہ	(ادبی تحقیق)	ڈاکٹر ش۔ اختر	گیا، کلچرل اکادمی	۶/-
آسمانی بلا	(ناول)	مظہر الحق علوی	لکھنؤ، نسیم بکڈپو	۲/۵۰
چنگاری	(ناول، نیا اڈیشن)	رئیس احمد جعفری	〃 〃 〃	۶/-
شعلہ و شبنم	(ناول)	نوشابہ سعید ناز	〃 〃 〃	۲/۵۰
مفلسی میں آٹا گیلا	(ناول)	عبدالمجید سہالوی	〃 〃 〃	۳/-
سرور سرمدی	(شعری مجموعہ)	ناشاد کانپوری	〃 〃 〃	۴/۵۰
زین المجالس	(مذہبی)	محمد مسلم	〃 〃 〃	۳/-
دامان باغباں	(نظموں کا انتخاب)	مرتبہ: پریم سنگھ کمار پریمؔ	دہلی نیشنل اکیڈمی	۵/-
تارا کا ڈنڈا	(بچوں کے لیے، نیا اڈیشن)	محمد شفیع الدین نیرؔ	〃 نیر کتاب گھر	-/۳۰
بونے کا بٹوا	〃	〃	〃 〃 〃	-/۳۰
پری کی چھڑی	〃	〃	〃 〃 〃	-/۳۵
بلخ شہزادی	〃	〃	〃 〃 〃	-/۳۵
بدھو کی بیوی	〃	〃	〃 〃 〃	-/۳۵
یادگار انگوٹھی	〃	〃	〃 〃 〃	-/۳۵
گھر کا آئینہ	〃	〃	〃 〃 〃	-/۳۵
عید کے کھلونے	〃	〃	〃 〃 〃	-/۳۵
اسلامی نظمیں	〃	〃	〃 〃 〃	-/۶۵
وطنی نظمیں	〃	〃	〃 〃 〃	-/۸۵
تکلف برطرف	(مزاحیہ مضامین)	مجتبیٰ حسین	حیدرآباد، حلقہ ارباب ذوق	۳/-

مکتبہ جامعہ بک کلب

کا

ممبر بننے کے بعد اردو کی ادبی اور معیاری کتابیں رعایتی قیمت پر حاصل کیجیے

امید ہے کہ اس اسکیم سے شائقین ادب زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں گے اور ہمیں موقع دیں گے کہ ہم کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ اچھی کتابیں پیش کرتے رہیں۔

مکتبہ جامعہ "بک کلب" کے قواعد و ضوابط

(۱) مکتبہ جامعہ بک کلب کی فیس رکنیت ۵ روپے ہوگی

(۲) ایک سال کی مدت گزر جانے کے بعد اگر کوئی ممبر اپنی رکنیت ختم کرنا چاہے گا تو فیس رکنیت واپس کر دی جائے گی۔

(۳) ممبری کے دوران ممبر حضرات جتنی بار چاہیں کتابیں منگا سکتے ہیں۔

(۴) ڈاک سے منگانے کی صورت میں ہر بار کم از کم پانچ روپے کی کتابیں منگانا ضروری ہوگا۔

(۵) ڈاک سے منگانے کی صورت میں محصول ڈاک اور صرفہ پیکنگ مکتبہ جامعہ بک کلب ادا کرے گا، اور کتابوں کی اصلی قیمت کا وی، پی کر دیا جائے گا۔ کتابیں مکتبہ جامعہ کے تینوں دفتروں سے منگائی جا سکتی ہیں۔

(۶) اگر ممبر حضرات اپنی مطلوبہ کتابیں ہماری شاخ بمبئی، شاخ اردو بازار دہلی، شاخ شمشاد مارکیٹ علی گڈھ یا صدر دفتر میں خود آ کر لیں گے تو انھیں ۲۵ فی صدی کمیشن پیش کیا جائے گا۔

(۷) آرڈر کے ہمراہ اپنا کلب کا ممبری کا نمبر دینا ضروری ہوگا۔

(۸) مکتبہ جامعہ کی "بک کلب" کا اطلاق صرف مکتبہ جامعہ کی مطبوعات پر ہوگا۔

(۹) بک کلب کا ممبر بن جانے کے بعد جو صاحب ماہنامہ کتاب نما کا خریدار رہنا چاہیں گے تو انھیں دو روپے سالانہ قیمت کے بجائے صرف ایک ہی روپیہ ادا کرنے پر وہ کتاب نما کے خریدار بن سکیں گے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

جائزے

اُردو زبان کا مذہبی ورثہ

از قیوم صادق احمد پوری
صفحات ۱۱۸ سائز ۳۰×۲۰/۱۶
قیمت تین روپے
سن اشاعت مارچ ۱۹۶۸ء
علوی بک ڈپو محمد علی روڈ بمبئی ۳

اردو کسی ایک فرقے یا مخصوص طبقے کی زبان نہیں ہے، ہندوستان کا ہر باشندہ خواہ اس کا تعلق کسی مذہب سے ہو اس نے اپنے مذہبی، سیاسی اور جذباتی خیالات و احساسات کے اظہار یا تبلیغ و اعلان کی خاطر اس زبان سے کام لیا ہے۔

ابتدا سے لے کر گزشتہ صدی تک اس کو متعدد نام دیے گئے ہیں، سلاطین، فقرا، صوفیا، مورخ، شعرا اور ادیبوں نے حسب ضرورت بلا تکلف اس کو اپنایا ہے، اس کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کیا ہے اور ہر موقع پر اس کی ساخت پرداخت میں شریک و معاون رہے ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ عوام سے رابطہ پیدا کرنے کے لیے اس سے زیادہ آسان اور مفید کوئی اور زبان نہیں تھی۔

یوں تو زبانِ اُردو کی مختلف زاویوں سے بہت سی مبسوط اور مختصر تاریخیں لکھی گئی ہیں لیکن مولوی عبدالحق کی مشہور کتاب "اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام" کے بعد یہ پہلی کتاب ہے جس میں خاص طور سے اسلامی ذخیرے کا تاریخی طور پر احاطہ کیا گیا ہے اور اس سلسلے کی ضروری اور مفید معلومات یک جا کر دی گئی ہیں۔

شروع میں اردو زبان کی خوبیوں اور ہمہ گیری سے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو کے قابل قدر خیالات (کا ترجمہ) اور جگن ناتھ آزاد کی قابل تعریف نظم ہے، پھر دس مختلف عنوانوں کے تحت لائق مولف نے جملہ صوفیائے کرام، قرآن و حدیث کے مترجمین، شعرا اور انشا پردازوں کی ادبی خدمات اور تصانیف پر نظر ڈالی ہے جن کی پرخلوص کوششوں کی بدولت اردو میں مذہبی

لٹریچر کی داغ بیل پڑی اور ایک وسیع ادبی ذخیرہ فراہم ہوا، جس سے عوام و خواص دونوں حسب توفیق مستفیض ہوتے آئے ہیں۔

مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان میں رہنے بسنے والے دوسرے فرقوں کے لوگوں نے بھی اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں اُردو زبان سے جو کام لیا ہے، اس کا ذکر بھی ایک علاحدہ باب میں موجود ہے۔ اچھا ہوتا اگر اس باب کو قلم بند کرنے میں سابقہ ابواب کی طرح اختصار سے کام نہ لیا جاتا۔

بہرحال تھوڑے سے وقت میں بہت ہی ضروری اور کام کی باتیں معلوم کر لینے کے لیے ایسی ہی کتابوں کی ضرورت رہتی ہے۔ ستائش اور ہمت افزائی کے مستحق ہیں جناب قیوم صادق صاحب جنھوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور ایک ایسی مختصر اور جامع کتاب مرتب کر دی جس سے تمام علم دوست اور اردو نواز استفادہ کر سکتے ہیں۔

کتاب کی قیمت کا تعین کرتے وقت اُردو دانوں کی حالت اور حیثیت کا لحاظ بالکل نہیں رکھا گیا ہے۔

رشید نعمانی

●

سرورِ سرمدی
(مطبوعہ جنوری ۱۹۶۸ء)

از : ناشاد کانپوری

سائز : ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات : ۲۱۰

قیمت ۴/۵۰

پبلشر : ایس، پی، نگم ناشاد

ملنے کا پتہ : سریدھر پرشاد نگم ناشاد، پانڈو نگر، کانپور

شاعر کا پہلا مجموعہ کلام 'کیف سرمدی' ۱۹۵۲ء میں منظر عام پر آیا اور کافی مقبول ہوا۔ 'سرورِ سرمدی' جناب ناشاد کانپوری کی دوسری تخلیق ہے۔ اس میں ۸۱ غزلیں، ۲۲ رباعیاں، ۱۱ نظمیں، ۸ قطعے اور تقریباً ۹۰ متفرق اشعار شامل ہیں جن سے شاعر کے نیرنگ فن کی نشان دہی ہوتی ہے۔ فن کار کی ندرتِ خیال، علمی بصیرت، عروض و بیان کی آگہی اور ریاض کا سراغ ملتا ہے۔

غزلوں میں وہ موضوعات داخل ہیں جن کی ایک حساس اور باشعور فن کار سے توقع کی جا سکتی ہے۔ لیکن شاعر کے لب و لہجہ نے ان میں گلاب کی نرمی، چاند سورج کی چمک اور نشتر کی

چبھن پیدا کر دی ہے۔ اس لیے قارئین کو خوشی اور روشنی کے ساتھ متاعِ درد بھی میسر آتی ہے۔
___ قطعوں اور رباعیوں میں سنجیدگی اور معنویت کے رنگ جھلکتے ہیں۔ نظموں میں سماجی اقدار، سیاسی افکار، وطن پرستی اور انسان دوستی کے عناصر جلوہ گر ہیں۔ شاعر کے یہاں ہیئت کے کامیاب نمونے ملتے ہیں۔ چھوٹی بحروں میں جو غزلیں اور نظمیں کہی ہیں وہ یقیناً داد طلب ہیں۔ "نیرنگ جستجو" اور "اب تو آنکھیں کھول"۔ اس مجموعے کی بہترین نظمیں ہیں۔ غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

بُرا ہو بے خودیٔ عشق کا خبر نہ ہوئی
ہزار بار گلے سے لگا لیا تو نے

جانے کیا آج ہونے والا ہے — دل دھڑکتا ہے کیوں خدا جانے
چاند تارے بھی اب تو سونے لگے — اے غمِ ہجر کتنی رات ہوئی
رکھے ہیں وہ دل پہ ہات اپنا — انگارا جگر دہک رہا ہے
دل کی قیمت رنجِ دو عالم — کچھ تو اس کا مول بڑھا نے

ہندوستان اور پاکستان کے نامور ناقدین نے "کیف سرمدی" اور "سرور سرمدی" پر اپنی پسندیدگی کی مہر ثبت کی ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا ایک جملہ نقل کرنا کافی ہے
"ان کے لب و لہجہ میں شائستہ تغزل کا ایسا رنگ ملتا ہے جو اس دور میں مفقود ہے"
کاغذ، کتابت، طباعت، سرورق سب چیزیں معقول ہیں۔ آرٹ پیپر پر شاعر کی تصویر شاملِ اشاعت ہے۔ ایسے پاکیزہ اور معیاری مجموعۂ کلام سے کسی لائبریری کو محروم نہیں رہنا چاہیے۔ اُردو دوستوں کو "سرور سرمدی" کے نسخے حاصل کرنا چاہئیں۔

سیفی پریمی

●

پیغمبروں کی کہانیاں
(مطبوعہ جون ۱۹۶۸ء)

از: حبیب احمد خاں شبنم قادری
سائز $\frac{20\times30}{16}$ صفحات: ۱۷۶
قیمت: ۲/۵۰
ناشر: سیرت پبلشرز، امروہہ، یو پی

"پیغمبروں کی کہانیاں" کے مصنف اور ناشر نے، خدا انھیں جزائے خیر دے، اس کتاب کو شائع کر کے نہ صرف مسلمان بچے بچیوں بلکہ نو آموز بالغوں کی بھی ایک علمی ضرورت کو

پورا کیا ہے اور دینِ اسلام کی ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ اس کتاب کو میں نے بھی پڑھا ہے اور میری بچی نے بھی جس کی عمر ساڑھے آٹھ سال ہے اور ہم دونوں باپ بیٹی کی کتاب کے بارے میں یہ رائے ہے کہ "پیغمبروں کی کہانیاں" بہت اچھی کتاب ہے۔ اس کی زبان سادہ، اندازِ بیان دل آویز اور ہر کہانی دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ کتاب میں چودہ کہانیاں ہیں اور ہر کہانی کسی ایک جلیل القدر پیغمبر سے متعلق ہے جس سے ہمیں نیکی، بہادری، ایثار، ہمدردی اور بہترین اخلاق و اطوار کا سبق ملتا ہے۔ لکھائی اور چھپائی خوشخط اور صاف ہے۔ ایک دو جگہ کتابت کی معمولی سی غلطی ہے لیکن وہ محسوس بھی نہیں ہوتی اور عبارت کا مفہوم واضح رہتا ہے، یہ مصنف کے اندازِ بیان کی خوبی ہے۔

"بادشاہ کا خواب" اور "لاٹھی کا سانپ" نامی کہانیاں بہت لمبی ہوگئی ہیں۔ انھیں مختصر کیا جا سکتا تھا کیونکہ طولِ کلام سے ذہن تھک جاتے ہیں اور بات کا اثر زائل ہونے لگتا ہے۔ کہانی سے پہلے کہانی کا نمبر شمار بھی جلی قلم سے اگر تحریر ہوتا تو کہانی تلاش کرنے میں آسانی رہتی۔ مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کی کہانی "بادشاہ کا خواب" صفحہ ۴۴ پر ہے اور اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کہانی "لاٹھی کا سانپ" صفحہ ۶۳ پر ہے لیکن موخر الذکر کہانی میں بھی ایک ذیلی سرخی "بادشاہ کا خواب" شروع ہی میں موجود ہے۔ اس سے پڑھنے والے کو الجھن ہو سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ نئے عنوان والے صفحے پر نمبر شمار نیچے دیا ہوا ہے جب کہ دوسرے صفحات پر نمبر صفحوں کے اوپر درج ہیں۔ یہ بھی نفسیاتی اعتبار سے کچھ اچھا نہیں، بہتر ہوتا کہ سارے نمبر صفحوں کے اوپر ہی تحریر ہوتے۔

کتاب کے سرورق پر جو اشتہار ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کہانیاں علیحدہ علیحدہ بھی چھپی ہیں۔ بلاشبہہ یہ کہانیاں ایسی ہیں جنھیں ہندی رسم الخط میں بھی ضرور شائع کیا جائے ان کی زبان اور اندازِ بیان اتنا اچھا ہے جسے ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے اور صرف چند الفاظ کے بدلنے سے آسان ہندی کہی جا سکتی ہے اور اس طرح وہ لوگ بھی ان سے مستفید ہو سکتے ہیں جو صرف ہندی جانتے ہیں۔ برادرانِ وطن کے علاوہ اب بہت سے مسلمان بھائی بھی چونکہ صرف ہندی ہی پڑھ سکتے ہیں اس لیے ایسا کیا جانا ضروری ہے۔

محمد احمد دلکش

★ مگدھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے اس سال اردو میں ایم اے کلاس کھولنے کی اجازت دے دی ہے۔ جناب ڈاکٹر حسنین شعبہ اردو گیا کالج گیا اس شعبے کے صدر منتخب ہوئے ہیں۔
(زاہد)

★ پاکستانی حکومت کے ایک فیصلے کے مطابق پاکستانی کے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کو جن ہندوستانی اخباروں اور رسالوں کی ضرورت ہوگی وہ نئی دہلی میں مقیم پاکستان کے ہائی کمشنر کی معرفت خریدے جایا کریں گے۔ چونکہ بنکوں کے ذریعے ہندوستان اور پاکستان میں لین دین بند ہے اس لئے اخباروں، رسالوں اور کتابوں کی قیمتیں نئی دہلی کے پاکستانی ہائی کمشنر کو بھیجی جائیں گی۔

★ سید نثار مصطفیٰ کو پٹنہ یونیورسٹی نے اُن کے تنقیدی مقالے "راجندر سنگھ بیدی اور اُن کی ادبی خدمات" پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ مقالہ ڈاکٹر اورینوی کی نگرانی میں لکھا گیا ہے۔

★ پچھلے دنوں اندرجیت لال صاحب کو جو اردو ادب کو انگریزی دانوں سے متعارف کرانے والے کی حیثیت سے بڑی شہرت رکھتے ہیں، اردو میں سائنس کے موضوعات سے متعلق ان کی کتاب "آج کی سائنس، نئی روشنی نئی باتیں" کے مسودے پر یونسکو کا انعام ملا ہے۔ اندرجیت لال صاحب کی کتاب کے موضوعات میں سے ایٹمی توانائی۔ ارضیات میں سائنس۔ فضائی سفر۔ چاند کی دنیا۔ موسمیات ٹیلی[illegible]ن۔ کمپیوٹر، راڈر۔ سائنس اور ہم۔ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے سائنسی موضوعات پر ایک ایسا اندازِ بیان اور اسلوبِ اظہار اپنایا ہے جس کی اہل سائنس بھی تعریف کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ اندرجیت لال صاحب اردو ادب سے متعلق اردو زبان میں متعدد مضامین کے علاوہ بڑی تعداد میں انگریزی زبان میں اردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھ چکے ہیں۔ اور آئے دن اردو ادب کی عظمت کو واضح اور روشن کرتے رہتے ہیں۔ ان کی اردو کی معیاری کتابوں پر تبصرے انگریزی زبان کے موقر جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اور اہل نظر حضرات سے خراجِ عقیدت حاصل کرتے رہتے ہیں۔

مطبوعات مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

ایک نظر میں

ادب، تنقید، انشا

آتش گل	جگر مراد آبادی	۵/۵۰
ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت	عبداللطیف اعظمی	۵/۵۰
پریم چند کے خطوط	مرتبہ: مدن گوپال	۶/۵۰
قلم کا مزدور	" "	۴/-
فسانۂ عجائب کا تنقیدی مطالعہ	سید ضمیر حسن	۳/-
شہر آشوب	ڈاکٹر نعیم احمد	۷/۲۵
کچھ پرانے خط اول	پنڈت جواہر لال نہرو	۸/-
" " دوم	" " "	۸/-
یادگار شخصیتیں	" "	۵/۵۰
آشفتہ بیانی میری	پروفیسر رشید احمد صدیقی	۲/۵۰
گنجہائے گرانمایہ	" "	۴/-
اردو اسٹنز	سید ظہیر الدین مدنی	۳/-
باغ و بہار	مرتبہ: رشید حسن خاں	۲/-
مثنوی گلزار نسیم	" " "	۱/۵۰
" سحر البیان	" " "	۱/۷۵
موازنۂ انیس و دبیر	" " "	(زیر طبع)
روح اقبال	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۸/-
کاروان فکر	" "	۳/۷۵
حسرت کی شاعری	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۱/-
بکھرے ورق	سونیتی کمار چٹرجی	۳/-
اردو مرثیہ	سید سفارش حسین	۴/-
ذکر غالب	مالک رام	۴/۲۵
غزل سرا	مجنوں گورکھپوری	۶/-
پردیسی کے خطوط	" "	۲/۷۵
تذکرۂ جگر	محمود علی خاں جامعی	۲/-
تنقید کیا ہے	آل احمد سرور	۳/۷۵
نقد اقبال	میکش اکبرآبادی	۴/۷۵
شراب کہنہ	رشید نعمانی	۳/۲۵

تعلیم

تعلیمی خطبات	ڈاکٹر ذاکر حسین	۴/۵۰
بنیادی استاد کے لیے	ڈاکٹر سلامت اللہ	۴/۲۵
ہم کیسے پڑھائیں	" "	۳/۵۰
چند پروجکٹ	عبدالغفار مدہولی	۲/۵۰
جامعہ کا طریقہ	" "	۲/۵۰
موجودہ تعلیمی مسائل	عبداللہ ولی بخش قادری	۲/۵۰

ناول

دلی کی شام	احمد علی	۷/۵۰
چنار کا پتا	سلطانہ آصف فیضی	۲/۲۵
عروس نیل	" "	۳/۲۵

آدمی کا مقدر	ترجمہ: قرۃ العین حیدر	۱/-
ڈنگو	" " "	۲/۲۵
ماں کی کھیتی	" " "	۲/-
یودوکیہ	" " "	۱/۷۵
ایک تھی انیتا	امریتا پریتم	۳/۲۵
بیوہ	منشی پریم چند	۲/۷۵
گئودان	" "	۸/-
میدان عمل	" "	۶/۵۰
باپ بیٹے	ترجمہ: انور عظیم	۵/-
دلدل	" رضیہ سجاد ظہیر	۴/۵۰
سات سال	" " "	۵/۲۵
راہِ عمل	صالحہ عابد حسین	۷/۵۰
صلاح الدین	قاضی عبدالستار	

افسانے

اپنے دکھ مجھے دیدو	راجندر سنگھ بیدی	۴/-
دانہ و دام	" " "	۳/۷۵
پت جھڑ کی آواز	قرۃ العین حیدر	۵/۲۵
پرندا اور دوسرے افسانے	آصف مجیب	۱/۵۰
چراغوں کا سفر	رام لعل	۴/-
خنداں	پروفیسر رشید احمد صدیقی	۵/۲۵
خیالستان	سجاد حیدر یلدرم	۳/۷۵
دو ہاتھ	عصمت چغتائی	۳/۵۰
سپنوں کا قیدی	کرشن چندر	۲/-
کالے صاحب	اوپندر ناتھ اشک	۲/۵۰
کیمیا گر	پروفیسر محمد مجیب	۲/
نروان	جیلانی بانو	۴/۷۵
نئی بیماریاں	مہندر ناتھ	۲/۵۰
واردات	منشی پریم چند	۲/۵۰

ڈرامے

انجام	پروفیسر محمد مجیب	۱/۲۵
آزمائش	" "	۱/۲۵
خانہ جنگی	" "	۱/۵
کھیتی	" "	۱/۲۰
اوپر کی منزل	کرتار سنگھ دگل	۴/-
آئینۂ ایام	بریسٹلے	۳/۵۰
آذر کا خواب	بیگم قدسیہ زیدی	۱/۵۰
بند لفافہ	اشتیاق حسین قریشی	۲/۳۱
نقش آخر	" " "	۱/۲۵
پردۂ غفلت	ڈاکٹر سید عابد حسین	۱/۲۵
دروازے کھول دو	کرشن چندر	۲/۵۰
موت پر فتح	جیالال ساز	۱/۲۵

تاریخ و سوانح

ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں	ڈاکٹر سید عابد حسین	۸/-
پاکستان اور اس کا قیام	سری پرکاش	۴/-
امن کا راستہ	عبدالغفار مدہولی	۳/-
کشمیر پر حملہ	کرشنا مہتا	۲/-
گاندھی جی بادشاہ خاں کے دیس میں	مصنف: پیارے لال، مترجم: ڈاکٹر سید عابد حسین	۵/

کتاب	مصنف	قیمت
دنیا کی کہانی	پروفیسر محمد مجیب	۲/۵۰
ایخ الامت اوّل	مولانا اسلم جیراجپوری	۴/-
" دوم	"	۳/۲۵
" سوم	"	۲/-
" چہارم	"	۳/۲۵
" پنجم	"	۳/۲۵
" ششم	"	۳/۴۵
" ہفتم	"	۲/-
" ہشتم	"	۳/۲۵

بچوں کی کتابیں

مذہب

کتاب	مصنف	قیمت
ن حضرتؐ	الیاس احمد مجیبی	۵۰/-
کانِ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۴۵/-
اریار	الیاس احمد مجیبی	۱/۳۰
غائے اربعہ	خواجہ عبدالحی فاروقی	۱/۵۰
ولِ پاکؐ	عبدالواحد سندھی	۱/۵۰
رکارِ دو عالمؐ	محمد حسین حسان	۲/-
نامۂ اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	۵۰/-
لمان بیبیاں	اعجاز الحق قدسی	۷۵/-
بوں کے قصے	خواجہ عبدالحی فاروقی	۸۷/-
رے رسولؐ	" "	۱/۲۰
رے نبیؐ	سید محراب علی رضوی	۴۰/-

معلومات

کتاب	مصنف	قیمت
ی کی کہانی	مشتاق احمد اعظمی	۱/۲۵
لھا عجائب خانہ اوّل	محمد حسین حسان	۵۰/-
انوکھا عجائب خانہ دوم	محمد حسین حسان	۴۰/-
" " سوم	"	۴۰/-
" " چہارم	"	۵۰/-
بجلی کی کہانی	علی احمد خاں	۵۰/-
بڑے دادا کی کہانی	پروفیسر عبدالغفور	۵۶/-
بجلی اور مقناطیس کے کھیل		۷۵/-
تاریخ ہند کی کہانیاں اوّل	خجستہ سلطانہ	۸۰/-
" دوم	ضیاء الرحمٰن	۸۰/-
" سوم	مشتاق حسین اعظمی	۷۵/-
" چہارم		۹۵/-
چٹانوں کی کہانی	محمد امین	۱/۷۵
خبر رسانی کے طریقے	رفیعہ امین	۸۵/-
دادا نہرو	منور لکھنوی	۱/۵۰
دہلی	ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی	۱/۵۰
دنیا کے بسنے والے	بشیر حسین زیدی	۷۵/-
دنیا کے بچے	محمد حسین حسان	۶۵/-
رابندر ناتھ ٹیگور	صفدر حسین	۱/۲۵
سمندر کے کنارے	سلطانہ آصف فیضی	۱/۳۰
سمندر کے نیچے	" "	۲/-
سماجی زندگی اوّل	احمد الیاس مثیل و غلام ابرار	۵۶/-
" دوم	" "	۸۰/-
" سوم	" "	۸۱/-
" چہارم	" "	۸۱/-
گاندھی بابا کی کہانی	بیگم قدسیہ زیدی	۲/-
مفید معلومات اوّل		۵۰/-

مفید معلومات دوم -/۷۵
〃 〃 سوم -/۲۵
〃 〃 چہارم ۱/۵۰
معلومات کی پانچویں کتاب ۱/۵۰
مقناطیس کی کہانی -/۴۴
میر تقی میر محمد حسین حسان -/۱
میر انیس 〃 〃 ۱/۲۵
ہماری پارلیمنٹ کیلاش چندر ۱/۵۰

کہانیاں

ابو خاں کی بکری ڈاکٹر ذاکر حسین ۲/۵۰
اُس نے کیا کرنا جانا آصف مجیب -/۳۷
ایک کٹوری تیل میں اسرار ندوی -/۴۰
بچوں کی کہانیاں عبدالواحد سندھی -/۳۷
پاک کہانیاں اوّل مقبول احمد سیوہاروی -/۹۵
〃 〃 دوم 〃 〃 ۱/۵۰
پرندوں کا ایکا سجاد ظہیر -/۲۰
پریم کی جیت -/۳۷
پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی -/۳۷
تانبیل خاں محمد حسین حسان -/۴۰
ترکوں کی کہانیاں -/۵۵
جنگو کی بلی عبدالواحد سندھی -/۲۵
چھوٹی لالٹین مشتاق احمد اعظمی -/۳۱
چقماق کی ڈبیا برکت علی فراق -/۴۰
چوہوں کی کانفرنس احسن عثمانی -/۴۵
چنبیلی محمد حسین حسان -/۵۰

چپاتی کا آدم خور شیر محمد معین -/۳۵
خیالی شہزادہ کا سپنا گیا کو شبانو -/۳۰
شہزادہ اور ٹھگ -/۴۵
شہزادی گلنار پروفیسر عطاء اللہ -/۴۰
شہزادی گلفام ثریا بیگم -/۵۰
شیدلا پروفیسر محمد مجیب -/۵۰
لال مرغی عبدالواحد سندھی -/۵۰
مزہ چکھائیں گے -/۳۱
مرغی اجمیر چلی ڈاکٹر ذاکر حسین -/۲۵
ننھا شیخو خورشید سلطانہ -/۳۰
ہمت کا پھل عبدالواسع عمری -/۳۵

ناول

تین اناڑی عصمت چغتائی ۱/۴۰
جن حسن عبدالرحمٰن اوّل ترجمہ: قرۃ العین حیدر -/۲
〃 〃 دوم 〃 〃 -/۲
خیالی پلاؤ 〃 ۱/۲۵
خرگوش کا سپنا کرشن چندر ۲/۷۵
ڈاکو کی گرفتاری ابرار محسن -/۵۰
ستاروں کی سیر کرشن چندر ۱/۷۵
کوئے والا ترجمہ: مجیب احمد خاں ۱/۲۵

متفرق

آؤ ڈراما کریں پروفیسر محمد مجیب -/۶۰
شمو کی عید احسن عثمانی -/۵۰
بچوں کے افسر حامد اللہ افسر -/۷۵
مزیدار پہیلیاں محمد علی -/۶۵

REGD. No. D56 Nov. 1968
Kitab Numa,
Jamia Nagar, New Delhi-25.

پرنٹر پبلشر سید احمد دہلوی نے جمال پریس دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

ماہنامہ

دسمبر ۱۹۶۸ء

3/12/68

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

چند نایاب پاکستانی رسائل

رسالہ	ماہِ نو	اقبال نمبر	اپریل ۱۹۵۵ء	۱/-
؍؍	ماہِ نو	اقبال نمبر	اپریل ۱۹۵۸ء	۱/-
؍؍	ماہِ نو	غالب نمبر	فروری ۱۹۵۹ء	۱/-
؍؍	ماہِ نو	اقبال نمبر	اپریل ۱۹۶۰ء	۱/-
؍؍	ماہِ نو	غالب نمبر	فروری ۱۹۶۱ء	۱/-
؍؍	ماہِ نو	اقبال نمبر	اپریل ۱۹۶۱ء	۱/-
؍؍	ماہِ نو	غالب نمبر	فروری ۱۹۶۲ء	۱/-
؍؍	ماہِ نو	اقبال نمبر	اپریل ۱۹۶۲ء	۱/-
؍؍	ماہِ نو	اشاعت خاص	اکتوبر ۱۹۶۲ء	۲/-
؍؍	ماہِ نو	غالب نمبر	فروری ۱۹۶۳ء	۱/-
؍؍	ماہِ نو	اقبال نمبر	اپریل ۱۹۶۳ء	۱/-
؍؍	ماہِ نو	غالب نمبر	فروری ۱۹۶۴ء	۱/-
؍؍	ماہِ نو	اقبال نمبر	اپریل ۱۹۶۴ء	۱/-
؍؍	ماہِ نو	اشاعتِ خاص	اکتوبر ۱۹۶۴ء	۲/-
؍؍	ماہِ نو	اشاعت خاص	اکتوبر ۱۹۶۵ء	۲/-
؍؍	ماہِ نو	اقبال نمبر	اپریل ۱۹۶۵ء	۱/-
؍؍	ماہِ نو	غالب نمبر	فروری ۱۹۶۶ء	۱/-
؍؍	ماہِ نو	اقبال نمبر	اپریل ۱۹۶۶ء	۱/-

مینجنگ ایڈیٹر
غلام ربانی تاباں
مدیر مسئول
مجیب احمد خاں

ماہنامہ
کتاب نما
نئی دہلی

دسمبر ۱۹۶۸ء
جلد ۹ شمارہ ۱۲
سالانہ چندہ ڈیڑھ روپے
فی پرچہ بیس پیسے

اشاریہ

لیجیے اب سن ۶۸ء کے بھی رخصت ہونے کا وقت قریب آگیا۔ اس سال میں کیا کچھ ہوا اور کس کس پہ کیا بیتی، اس کی تو بڑی لمبی کہانی ہے۔ اس کہانی کے سنانے کا یہ موقع نہیں ہے اور جناب سچ بات تو یہ ہے کہ یہ کہانی اتنی لمبی ہے کہ اگر کوئی سنانا بھی چاہے تو وہ ایک ساتھ سنا بھی نہیں سکتا۔ ہاں ہم تو اتنی بات جانتے ہیں کہ اس سال گرانی میں پہلے کی نسبت کچھ زیادہ ہی اضافہ ہوا۔ سب چیزوں کے ساتھ ساتھ کاغذ کے دام بھی بڑھ گئے۔ طباعت کے نرخوں میں اضافہ ہوا اور رہی سہی کسر گورنمنٹ نے محصول ڈاک کی شرح میں اضافہ کرکے پوری کردی۔ اس اضافے سے ذاتی طور پر تو سب متاثر ہوئے ہی لیکن کاروباری سطح پر اور بالخصوص اردو کتابوں کے ناشرین اور کتب فروشوں کو جو پہلے ہی کسمپرسی کا شکار تھے اس اضافے نے سخت پریشانیوں میں مبتلا کردیا۔ تقریباً تمام سرکاری اور نیم سرکاری اسکول اور لائبریریاں تو پہلے ہی اردو کتابوں کی خریداری کی مدیں ہر سال برابر کم کررہی تھیں مگر جو چند باذوق حضرات انفرادی طور پر کتابیں منگاتے تھے، وہ بھی ان عالمگیر اضافوں کی وجہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور مجموعی طور پر ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کتابوں کی فروخت اب پہلے سے بھی کم ہوکے رہ گئی۔

مکتبہ جامعہ نے ان ناسازگار حالات کے باوجود اردو کی ادبی اور معیاری کتابوں کی اشاعت کا کام جاری رکھ کے بہرحال اپنا فرض ادا کیا ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ ہم نے اس سال جو کتابیں شائع کی ہیں وہ ہر طرح معیاری اور بہرصورت اہم اور قابلِ ذکر ہیں۔ ان کتابوں میں احمد علی کا ناول "دلّی کی شام"، ڈاکٹر نعیم احمد کی ادبی و تحقیقی کتاب "شہر آشوب"، مدن گوپال کے مرتبہ

"پریم چند کے خطوط"، سید ضمیر حسن دہلوی کی "فسانہ عجائب کا تنقیدی مطالعہ"، قاضی عبدالستار کا تاریخی ناول "صلاح الدین"، ڈاکٹر سونتی کمار چیٹرجی کے بنگلہ زبان سے ترجمہ کیے ہوئے مضامین "بکھرے ورق" (مترجم: شانتی رنجن بھٹاچاریہ) سلطانہ آصف فیضی کا ناولٹ "چار کا ہما" اور سابق ہندوستانی ہائی کمشنر سری پرکاش کی سیاسی و تاریخی واقعات پر مبنی کتاب "پاکستان اور اس کا قیام" ہر طرح قابلِ توصیف اور قابلِ ذکر ہیں اور ہمیں امید ہے کہ ان کی ہر طبقے میں پذیرائی ہوگی۔

امسال جامعہ ملیہ کا سالانہ تعلیمی میلہ ۳۰ر اکتوبر سے یکم نومبر تک اپنی سابقہ روایات کے مطابق انجام پذیر ہوا۔ اس میلے میں حسب سابق مکتبہ جامعہ کی طرف سے "فن اور فن کار" کا ادبی پروگرام بھی پیش کیا گیا۔ یہ خاص پروگرام اس سال ڈراما ریڈنگ کے نام سے ترتیب دیا گیا تھا اور اس میں جیالال ساز کے ڈرامے "موت پر فتح" کی تھوڑی سی تبدیلی کے بعد ریڈنگ اس طرح کی گئی تھی کہ بغیر ایکٹنگ کیے صرف مکالموں کے ذریعے ہی پوری کہانی سمجھ میں آسکے اور تسلسل میں بھی فرق نہ آئے۔ ڈراما ریڈنگ کے لیے اسے ریحان احمد عباسی صاحب نے ترتیب دیا تھا اور ہمیں خوشی ہے کہ سامعین نے اسے پسند کیا اور اس سے محظوظ ہوئے۔

تعارف

شہر آشوب

پرانی چیزوں کو خواہ کتنا ہی نظر انداز کیا جائے مگر ایک نہ ایک وقت ضرور ایسا آجاتا ہے کہ وہ سامنے آکر اپنی اہمیت اور افادیت کا اقرار کرا ہی لیتی ہیں، خاص کر وہ چیزیں جن کے پیچھے ایک خلوص ایک حقیقت کچھ علمی کوششیں یا ادبی کاوشیں کارفرما رہی ہوں۔ شہر آشوب جسے "کلاسیکی صنف سخن" کے زمرے میں شامل کر لیا گیا ہے۔ ہمارے بزرگوں کا ایک ایسا ہی ترکہ یا کارنامہ ہے جو ہم کو عہد رفتہ کی بہت سی بھولی بسری باتیں یاد دلا دیتا ہے۔

اردو زبان میں اس سلسلے کا خاصا بڑا سرمایہ موجود تھا۔ مگر ہماری نظروں سے اوجھل اور بعض چیزیں دسترس سے دور، ڈاکٹر نعیم احمد کی داد دینا چاہیے کہ ان کی کوششوں سے ایسی بہت سی ڈھکی چھپی چیزیں یک جا ہو کر کتابی صورت میں سامنے آگئیں۔ اگر وہ اس طرف توجہ نہ کرتے تو شاید اس سرمائے کا بڑا حصہ کچھ دنوں میں تلف ہو جاتا۔

یہ کلاسیکی صنف بقول ڈاکٹر صاحب موصوف "اردو کے علاوہ فارسی اور ترکی میں بھی موجود ہے" یہ صحیح ہے کہ اردو میں یہ صنف سخن ترکی اور فارسی کی راہ سے آئی ہے لیکن موضوع اور مقصد بدل کر، اس تبدیلی اور نوعیت کو ڈاکٹر نعیم احمد صاحب یوں واضح کرتے ہیں "فارسی اور ترکی شہر آشوبوں میں کسی شہر کا وہاں کے باشندوں اور ان میں بھی زیادہ تر پیشہ وروں کے نوعمر لڑکوں کی خوب صورتی کا ہزلیہ انداز میں تذکرہ کیا گیا ہے" لیکن اردو شہر آشوب کی معنوی روایت، اس کا مزاج اور اس کی فضا فارسی اور ترکی نظموں سے بحیثیت مجموعی بالکل مختلف ہے" اس کی تاریخ اور ہیئت کے بارے میں بھی نعیم صاحب لکھتے ہیں "اردو شہر آشوب کا آغاز اٹھارھویں صدی کے آغاز میں ہوا۔

اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد ہر طرف زوال و ادبار کے مہیب سائے منڈلانے لگے۔ چناں چہ جو سخن، فارسی اور زبر کی میں ذہنی انبساط کے لیے مخصوص تھی، وہ اُردو میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی اختلال کے بیان کا ذریعہ بن گئی۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہر آشوب اُردو کی وہ کلاسیکی صنف سخن ہے، جس میں ہیئت کی کسی خاص پابندی کے بغیر سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی بحران کی وجہ سے عوام و خواص کی بربادی کا حال بیان کیا گیا ہے . . . ."

ہندوستان کے وہ شہر اور صوبے جو حکمرانوں کے مستقر یا حکومتوں کے مرکز رہے ہیں شہر آشوب عام طور سے انھیں مقامات اور مراکز سے متعلق ہے۔ اردو کا پہلا شہر آشوب جعفر زٹلی نے لکھا پھر تو اس زبان کے قریب قریب سب ہی مشہور اور نام آور شاعروں نے اس کو اپنا موضوعِ سخن بنایا۔ جن شاعروں کو شہرت اور مقبولیت نصیب ہوئی ان کے دیوانوں اور کلیات میں وہ شہر آشوب بھی شامل ہو کر چھپ گئے، مگر جو شہرت سے محروم رہے ان کی یہ کارگزاریاں کیسے سامنے آسکتی تھیں۔

حاتم، سودا، اور میر۔ جرأت، مصحفی اور نصیر انھیں کے بہت سے ہم عصروں کے شہر آشوب کسی قدر مرتب اور مطبوعہ شکل میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔

ڈاکٹر نعیم کا خیال ہے کہ "آشوب گوئی کا یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء کے چند برس بعد تک جاری رہتا ہے" اور "اس کے جائزے کو دو حصّوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے (۱) ۱۸۵۷ء سے قبل کی کیفیت (۲) ۱۸۵۷ء کی صورتِ حال" پہلے دور کی آشوبیہ نظموں پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب موصوف لکھتے ہیں ۔۔ "یہ بات اس حقیقت کی مظہر ہے کہ شخصی حکومت کے اس دور میں بھی ہمارے شعرا میں اتنی اخلاقی جرأت تھی کہ وہ بادشاہ کی کوتاہیوں پر بھی نکتہ چینی کر سکتے تھے"۔ سودا، میر اور فائز وغیرہ کے بارے میں تو کچھ کہنا ہی نہیں، اسی دور کے ایک نسبتاً کم معروف اور غریب الوطن شاعر (راغب) کی زبان سے زمانے کی ابتری اور با ہنر لوگوں کی ناقدری کا حال سنیئے انداز مثنوی کا ہے زبان صاف، سہل اور سادہ، حالات نہایت حیرت خیز اور بیان عبرت انگیز!!

زمانے کا کچھ طور بے طور ہے — عجب عہد ہے اور عجب دور ہے
سفیہوں کا گرم اس سے بازار ہے — جو ذی قدر ہے سو بہت خوار ہے
جسے دیکھو نالاں ہے افلاس سے — خراب اور پریشاں ہے افلاس سے

لگا شامت سے "تا امیر و وزیر　　جو دیکھو تو دل ہے سبھوں کا فقیر
سپاہی جو ہے تیر زخم کا نشاں　　مگر ہے دوتا اس کی شکل کماں
دلِ اہلِ دفتر جو پُر درد ہے　　جگر چاک جوں خامہ ہر زرد ہے
نہ دُھنیا ہی سر اپنا دُھنتا ہے اب　　کبابی کا بھی سینہ بھنتا ہے اب
مفرّح فروش آہ محزون ہے　　تنبولی کا دیکھو تو دل خون ہے
معلّم جو قابل بہت آج ہے　　نپٹ نوکری کا وہ محتاج ہے
کسو بزم میں کوئی مطرب جو جائے　　تو ڈھولک کی جا پیٹ اپنا بجائے
کہوں آہ کیا شاعروں کی میں بات　　گیا مل انھوں کا ہی پائے ثبات
کریں شعر کی فکر، کیا ذکر ہے　　ہمیشہ انھیں پیٹ کی فکر ہے

صـ ۱۱۳ تا صـ ۱۱۸

یہی وہ عہد بھی تھا جب ہمارے شعراء کے یہاں گالیاں، غیر مہذب باتوں کا ذکر اور لب لہجے میں ناہمواریاں بھی نظر آتی ہیں۔ بعض نظموں میں تو سال خوردگی اور نقل در نقل کی وجہ سے بہت سے لفظ غلط یا مشکوک، مصرعے ناموزوں اور بحر بس کچھ سے کچھ ہو گئی ہیں اس کے باوجود ذہنِ گوئی کی عکاسی ہر شاعر کے شہرِ آشوب میں موجود ہے۔ ۱۸۵۷ء کے شہر آشوب زبان و بیان اور شعری محاسن کے لحاظ سے بہت بہتر ہیں، دہلی کی بربادی پر شعرا واقعی خون کے آنسو روئے ہیں۔ انقلاب کے جیسے جیسے درد انگیز اور دل گداز مرثیے محمد حسین آزاد سے لے کر منیرؔ تک نے (تقریباً ۵۰ شاعروں نے) پیش کیے ہیں اُن میں عبرت، حسرت اور موعظت سب کچھ موجود ہے
ع تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ، یا ع فلک زمین و ملائک جناب تھی دتی،
اور ع مل گئی خاک میں شانِ دہلی۔ حالیؔ، داغؔ اور حکیم آغا جان عیشؔ کے یہ مرثیے تڑپنے تڑپانے کا پورا سامان اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں۔ لیکن انھیں کے چند ہم عصر ہم زبان اور عہدِ رفتہ کے نوحہ خواں کچھ اور بھی تھے۔ لالہ رائے برشاد ظاہر کی باطنی کسک ملاحظہ ہو۔ غزل کے پیرائے میں احترام و عقیدت اور تعلقِ خاطر کی کیا کیا کیفیتیں اور منظر سامنے آتے ہیں:

بارِ منّت سے نہیں کس کا بھلا سر نیچا　　کس کے سر پہ نہیں احسانِ شہانِ دہلی
کوئی ظاہر میں نہ تھا، اُن کی خرابی کا سبب　　اپنے اعمال ہوئے آفتِ جانِ دہلی
رشکِ طوبیٰ، قدِ دلجو، رُخِ انورِ خورشید　　ماہِ نو تھا، خمِ ابروئے بتانِ دہلی

میرے نزدیک تو جب داد فصاحت کی ملے ذہن اللہ کا ہوا ور زبان دہلی ص ۲۷۹

دلی کی بربادی پر اشک بار ہونے والوں میں سے ایک بزرگ کنور لشن پرشاد فرحت بھی تھے۔ تخلص سے قطع نظر اُن کی اداسیوں، محرومیوں اور کرب کا اندازہ کرنے کے لیے ایک مخمس کے دو تین بند اور پڑھ لیجیے

کوئی مفلسی میں ہے مبتلا، کوئی تنگ حالی سے خوار ہے
کوئی بے کسی میں اداس ہے، کوئی رنج کے تہ بار ہے
جسے دیکھو آہ زمانے میں، وہ الم سے زار و نزار ہے
کوئی ہے قلق سے شکستہ دل، کوئی غم سے سینہ فگار ہے
یہ اُٹھائے لوگوں نے غم پہ غم، نہ حساب ہے نہ شمار ہے

گیا سر بسر یہ اُجڑ جہاں، ہوا انقلاب زمانہ یہاں
نہ وہ عیش و عشرتِ جاوداں، نہ زمیں رہی نہ وہ آسماں
کیا تو نے کیا ارے آسماں، گئے سب کے سب وہ چمن کہاں
ہوئیں یک بہ یک یہ اُداسیاں، نہ وہ گل رہے نہ وہ بوستاں
یہ کہاں سے آگئی اب خزاں، نہ وہ باغ ہے نہ بہار ہے

ص ۳۳، بند ۱، ۳، ۴

۴۴ صفحے کی صاف ستھری چھپی ہوئی کتاب میں جعفر زٹلی بلکہ تجلی تک ۲۷، شاعروں کی کوئی ۱۱۰ طویل اور مختصر آشوبیہ نظمیں، غزلیں، مخمس اور مسدس جو ڈیڑھ سو سال تک کہے اور سنے جاتے رہے۔ اردو میں اس طرح کا کلام، پہلی بار یک جا، مرتب اور مطبوعہ شکل میں سامنے آیا ہے۔ ان میں سے کئی شہر آشوب ایسے ہیں جو عام نگاہوں سے مخفی ذخیروں، کتب خانوں، نجی املاک اور ذاتی بیاضوں سے نہایت کاوش اور دیدہ ریزی کے ساتھ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالے گئے ہیں۔ اور اُن کو تاریخی ترتیب، ضروری حواشی، تشریحی اشاریوں اور مقدمے میں مفید معلومات اور آخر میں مآخذ کی بسیط فہرست کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

امید ہے اہل علم اور اہل نظر اس کتاب کو تحسین کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ اور اس کی تمام شاخوں سے یہ کتاب ۲/۲۵ میں حاصل کی جا سکتی ہے۔

رواںؔ

۱۸۸۹ء ـــــ ۱۹۳۴ء

جگت موہن لال، نام، رواںؔ تخلص، اناؤ (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے، نو ہی برس کے ہو پائے تھے کہ ان کے والد ماجد چودھری گنگا پرشاد کا انتقال ہو گیا۔

اس ہونہار اور کنبے کا نام روشن کرنے والے بچے کی تعلیم و تربیت اور دیکھ بھال پرداخت کی کُل ذمہ داریاں بڑے بھائی بابو کنہیا لال نے اپنے ذمے لے لیں اور واقعہ یہ ہے کہ جتنی شفقت اور خلوص کے ساتھ انھوں نے جگت موہن لال کی دیکھ بھال کی اور بہتر سے بہتر تعلیم دلوائی اس کی مثالیں آسانی سے نہیں ملیں گی۔

۱۹۱۳ء میں ایم۔ اے۔ کی ڈگری لی اور اس کے تین سال بعد ایل۔ ایل۔ بی۔ کر کے وطن ہی میں وکالت شروع کر دی، ذہین، طباع اور حوصلہ مند نوجوان تھے جب تک طالب علم رہے، بہترین طالب علموں میں شمار ہوتا رہا، جب ایک وکیل کی حیثیت اختیار کی تو اس پیشے میں بھی اپنی ذہانت اور طباعی کی بدولت جلد ہی نہ صرف ایک کامیاب بلکہ درجۂ اول کے وکیلوں میں نام لیا جانے لگا۔

بچپن ہی میں شعر و شاعری سے دل چسپی ہو گئی تھی، سنِ شعور کو پہنچ کر مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی کے شاگرد ہو گئے، فطری صلاحیتوں کو ایک کاملِ فن کی نگرانی اور تربیت میں آب و تاب کے ساتھ اُبھرنے کا موقع ملا اور تھوڑی ہی مدت میں ایک خوش گو شاعر کی حیثیت سے بھی مشہور و معروف ہو گئے ـــ رنگِ سخن اور مزاج و مذاق کا صحیح اندازہ کر کے استاد اپنے اس شاگرد کو "دل کا شاعر" کہا کرتے تھے۔

رواںؔ نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی لکھیں، اور رباعی تو ان کی سب سے زیادہ مرغوب صنفِ سخن بن گئی۔ اُن کی غزلوں میں اعلیٰ تخیل، پاکیزہ جذبات اور صاف ستھری زبان

کے اچھے نمونے ملتے ہیں نظمیں بھی حسن و عشق کی واردات، کردار نگاری اور منظر کشی سے خالی نہیں کہی جا سکتی ہیں۔

رباعیوں میں ان کی جودتِ طبع علوئے فکر اور شاعرانہ محاسن و کمالات پورے طور پر نمایاں ہیں۔ زندگی کے مختلف موضوعات اور مسائل پر فلسفیانہ انداز سے نگاہ ڈالی ہے، بعض ادق مضامین اور مشکل معاملات کو سہل اور دل پذیر انداز میں بیان کر دیا ہے، تشبیہ واستعارات کا استعمال بھی جہاں کہیں ہوا ہے خوب صورتی اور استادی کے ساتھ ہوا ہے۔ کلام کا بہت کم حصہ ایسا ہوگا جس میں تازگی اور جاذبیت نہ پائی جائے۔ رواں جیسے شاعر سے اردو شاعری کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں لیکن موت نے ان امیدوں کو پورا ہونے کا موقع ہی نہ دیا۔ رواں نے اپنی مختصر زندگی میں جو کہا وہ قابلِ قدر ہے اور قابلِ فخر بھی "روحِ رواں" (غزلوں، نظموں، قطعات اور رباعیوں کا مجموعہ) اور پھر "رباعیاتِ رواں" ایک علیحدہ کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔

انتخاب:۔

تغزل

نزع میں آکر کھلا ہے عالمِ فانی کا راز
اے مری جاتی ہوئی دنیا بڑا دھوکا ہوا

پیہم دیے وہ رنج کہ انساں بنا دیا ___ منت پذیر ہوں ستمِ روزگار کا
میں یک جا ہی کرتا تھا اپنے حواس ___ کہ ان سے مرا سامنا ہو گیا
جہاں میں صورتِ فوارہ زندگی ہے مری ___ کہ آپ اپنی بلندی پہ اشکبار ہوں میں

ذکر ہے زنداں میں وہ گلزار پہ بجلی گری
آج میرے آشیاں میں روشنی ہو جائے گی

چلو وہیں دلِ پژمردہ لے چلیں اپنا
جہاں سے بادِ بہاری چمن میں آئی ہے

حسنِ مغرور میں ممکن نہیں اصلاحِ فروغ
کیا بھرے کوئی چھلکتے ہوئے پیمانے کو

منظومات :-

شاعری

راز دارِ ضبطِ دل اے پردہ دارِ رازِ نفس — کاشفِ اسرارِ باطن، عکسِ سوز و سازِ نفس
اے بہارِ بے خزاں! اے آفتابِ لازوال — کر نہیں سکتا تجھے، جورِ زمانہ پائمال
جس پہ سو جاں سے ہو دل صدقے ترا وہ ناز ہے — جس نے عالم کو کیا بسمل، ترا انداز ہے
اے انیسِ گوشۂ عزلت گریبانِ الم — اے شریکِ حالِ زارِ صاحبانِ درد و غم

کب تری معراج کے ہمسر ہے معراجِ شہی
تیرے قدموں پر نچھاور سیکڑوں تاجِ شہی

لاوارث بچہ

سچ بتا بچے ترا وارث ترا والی ہے کون — پھول ہے تو کس چمن کا اور ترا مالی ہے کون
زینتِ آغوش ہے تو جس کا وہ مادر ہے کون — نور ہے جس گھر کا تو بچے! بتا وہ گھر ہے کون

کیا اڑا لائی کسی گلزار سے تجھ کو ہوا — پھول ہوتے ہیں جہاں، ایسے ہی پیدا خوش نما
یا عناصر میں ہوئی ترتیب پیدا اس قدر — خود مرکب ہو گئے اور بن گئے شکلِ بشر

آہ یہ تیری ادا حسنِ تحیر زا ترا!
رو کشِ لطفِ تبسم، آہ یہ رونا ترا

یوں نہ کرتی ورنہ ماں اپنا نثارِ آرزو — یوں بناتی خود نہ ماں اپنا مزارِ آرزو
حسن کا برباد ہو جانا، نہیں بھاتا نہیں — میرے مولا! یہ سمجھ میں راز کچھ آتا نہیں

رباعیات

میرے ساقی شرابِ صافی دینا — ہو جس سے گنہ کی کچھ تلافی دینا
اترے نہ خمار زندگی بھر جس کا — ایسی دینا، اور اتنی کافی دینا

افلاس اچھا نہ فکرِ دولت اچھی　　　جو دل کو پسند ہو وہ حالت اچھی
جس سے اصلاحِ نفس ناممکن ہو　　　اُس عیش سے ہر طرح مصیبت اچھی

کچھ وقت اگر خوشی میں کٹ جاتا ہے　　　تسکین ہوتی ہے، رنج بٹ جاتا ہے
اکثر تو کچھ ایسا حال ہوتا ہے رواں　　　بالکل دنیا سے جی اچٹ جاتا ہے

اِس دارِ فانی میں مقصدِ دل کیا ہے　　　کہیے تعبیرِ خواب باطل کیا ہے
جب قلب کو اک دم بھی راحت نہ ملی　　　آخر اِس زندگانی کا حاصل کیا ہے

گر پھر کبھی زندگی عنایت کرنا　　　مالک میرے خودی عنایت کرنا
ہوتے ہیں گناہ، وجہِ تکمیلِ حیات　　　پھر ذوقِ گناہ بھی عنایت کرنا

اے وعدۂ وصل کر کے جانے والے　　　دامن مرا ہاتھ سے چھڑانے والے
اس طرح نہ توڑ شیشۂ خاطرِ عاشق　　　ایسا کرتے ہیں پھر نہ آنے والے

ہر قلب پر بجلیاں گراتی آئی　　　ہر سمت اک آگ سی لگاتی آئی
بکھرے جاتے ہیں زخمہائے کہنہ　　　پھر صبحِ بہار مسکراتی آئی

شرابِ کہنہ

رشید نعمانی

قلی قطب شاہ سے حالی تک دورِ متقدمین کے ۰۰ شاعروں کے حالات، ان کے کلام پر تبصرہ اور نمونۂ کلام۔ ماہنامہ کتاب نما میں "شرابِ کہنہ" کے نام سے شائع ہونے والا وہ مشہور سلسلہ جو ہر جگہ پسند کیا گیا اور جواب نظرِ ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے تاکہ خاص طور سے طلبا اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں۔

قیمت ۳/۲۵

اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ...... سے آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے
ہمیں امید ہے کہ ۱۵ دسمبر تک مبلغ دو روپے بھیج کر آئندہ بھی پرچہ کی سرپرستی جاری رکھیں گے۔
آپ کا خریداری نمبر...... ہے　منیجر

ناشاد کانپوری

غزل

دل سے پیدا وہ نوائے راز ہے
ایک عالم گوش بر آواز ہے

گل کھلائے جا ہے کچھ وہم و قیاس
کون ورنہ آشنائے راز ہے

دل کی دھڑکن کہہ رہی ہے صاف صاف
کوئی سرگرمِ خرامِ ناز ہے

موت کیا ہے نغمۂ خاموش ہے
زیست کیا ہے دُکھ بھری آواز ہے

موت کیا ہے آپ ہی کھل جائے گا
پہلے سمجھو زندگی کیا راز ہے

کچھ سمجھتے ہی نہیں اہلِ حرم!
ورنہ جو سجدہ ہے کعبہ ساز ہے

فکرِ ناشاد آج ہے سحر آفریں
فیضِ فرحت کا یہی اعجاز ہے

(صریرِ سرمدی، شاعر ناشاد کانپوری، صفحات ۲۰۸، سائز ۳۰×۲۲/۱۶، قیمت ۵۰/۴، حوالہ صفحہ ۵)

کوثر چاند پوری

رام لیلا!

گھر سے چلتے وقت اس نے رانی کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی بجھی ہوئی بے رونق آنکھوں سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی نگاہوں میں محبت کی بے کسی اور مجبوری کا احساس تھا۔ رانی کے رخساروں پر پژمردگی چھائی ہوئی تھی، ہونٹ پپڑائے ہوئے تھے۔ چھ مہینے کا لاغر مگر خوبصورت بچہ اس کی سوکھی ہوئی چھاتیوں سے اس طرح چمٹا ہوا تھا جیسے چیونٹی گڑ کی ڈلی سے چمٹی ہوئی ہو۔ رانی کی گردن میں ٹی بی گلینڈ کی وجہ سے شدت کا درد تھا۔ وہ بہت دبلی اور نڈھال نظر آ رہی تھی۔ رگوں میں تازہ خون کی روانی کم ہو گئی تھی۔ دودھ بھی بہت تھوڑا اُتر رہا تھا۔ بچہ کمزور تھا مگر چھاتیوں کو دونوں ہاتھوں سے چبانے کی ہر وقت مشق کرتا رہتا تھا۔ سینہ کے جن مرمریں اُبھاروں کو گردھاری نے کبھی عشق و محبت میں ڈوبی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا، آج اس کا بیٹا سروپ انھیں بھوک کی شدت میں چبائے ڈال رہا تھا۔

اُس نے دیوار سے ٹکی ہوئی ڈلیا کو اُٹھا کر سر پر رکھ لیا اور رانی اور سروپ کے تصور میں کھویا ہوا سڑک پر آ گیا۔ ذرا دور چلنے کے بعد وہ نالی پر پیشاب کرنے بیٹھ گیا۔ پاؤں کے قریب ہی بہت سی چیونٹیاں مرے ہوئے کن کھجورے کو کھینچتی ہوئی سوراخ کے اندر لیے جا رہی تھیں۔ اس نے کنکھیوں سے انھیں دیکھ کر سوچا۔ چیونٹیوں کی یہ پلٹن اسی طرح پیٹ بھر لیتی ہے! اسے سڑکوں پر، گلیوں اور نالیوں میں بہت سے مرے ہوئے کیڑے مل جاتے ہیں اور وہ انھیں اپنے بلوں میں اکٹھے کر لیتی ہیں۔ خوراک کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے۔ روٹی کے ٹکڑے، گڑ کی ڈلیاں، مردہ ٹڈے، چھپکلی کے بچے، اسی قسم کی بے کار اشیاء جو مر کر بھی اپنے سے بہتر وجود کو جنم نہیں دے سکتیں، چیونٹیوں کی فوج کا بہترین راشن ہیں۔ جن کے سہارے وہ نہ جانے کب تک زندہ رہتی ہے۔ بھوک کبھی اسے نہیں ستاتی۔ ایک میں ہوں، میرا گھر بالکل خالی ہے۔ کھانے پینے کی کوئی چیز موجود نہیں۔ رانی کی چھاتیاں سوکھی پڑی ہیں، ان کے سوت بند ہو چکے ہیں، ان میں سے دودھ کی دھاریں نکلنی بند ہو گئی ہیں۔ سروپ انھیں دن بھر جھنجھوڑنے کے بعد

بھی بھوکا ہی رہتا ہے۔ کتنا فرق ہے چیونٹی اور آدمی میں۔ اپنی ہی باتیں سوچتا ہوا گردھاری دھیمی چال سے سڑک پر چلتا رہا۔ آج کافی دور نکل آنے پر بھی کسی نے آواز نہ دی۔ راستہ میں بہت سے آدمی سر پر بوجھ اٹھائے ہوئے ملے ؛ اس نے ہنس کر خود کلامی کے طور پر دھیرے سے کہا۔

شہر کا ہر آدمی چیونٹا بن گیا ہے اور اپنے رزق کی لاش سر پر اٹھائے بھاگ رہا ہے۔ چھابڑی والے کو نہیں پکارتا۔ اسی وقت کسی نے آواز دی :۔

"چھابڑی والے ۔۔ او چھابڑی والے۔"

اُس نے مُڑ کر دیکھا۔ ایک موٹا تازہ آدمی سفید کُرتے پر کالی صدری پہنے کھڑا ہے۔ اُس نے جلدی سے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا۔

"کیا ہے بابو جی ؟"

"لڈو ہے، جلیبی ہے" ۔۔۔ وہ جل کر بولا ۔۔ "پوچھتا ہے کیا ہے بابو جی۔ ارے وہی ہے جو روز ہوا کرتا ہے اور تیرا بھاگ بن چکا ہے۔ پندرہ من کلو کانچ کے ٹکڑے ہیں۔ بول چلے گا ؟"

"کہاں ؟"

"کارخانہ تک۔ نرک میں نہیں لے جاؤں گا تجھے۔"

"بابو جی، نرک میں تو دن رات رہتا ہوں۔ اب وہیں سے چلا آرہا ہوں۔ سورگ میں لے چلتے تو بڑا کام ہوتا۔"

"سورگ تیرے لیے نہیں۔ نہ جانے کتنی مرتبہ مر کر جیے گا تب کہیں سورگ میں جانے کے قابل ہوگا۔"

"آواگون کا چکر تو آپ جیسے لوگوں کے لیے ہے بابو جی۔ میں تو مرتے ہی مکت ہو جاؤں گا۔"

"باپ رے باپ کیا زمانہ آگیا ہے۔ چھابڑی والا بھی سائنس کی زبان میں بول رہا ہے۔"

"میرا کیا دوش ہے بابو جی۔ چاروں اور سے ایسی ہی آوازیں آرہی ہیں۔ سائنس سب ہی کی زبان سے بول رہی ہے۔ وہ بڑے اور چھوٹے کو نہیں دیکھتی۔ کارخانہ دار اور چھابڑی والے کو ایک ہی لکڑی سے ہانکتی ہے۔ کہاں ہے کارخانہ ؟"

"سامنے گلی میں۔ کیا ڈر لگتا ہے ؟"

"ڈر کس بات کا بابو جی۔ میری جیب بھاری نہیں ہے۔"

بابو جی نے کانچ کے ڈھیر کی جانب اشارہ کرکے کہا ۔۔ "ان ٹکڑوں کو لے چلنا ہے

کا تنا تک؟"

گردھاری نے ٹوٹی ہوئی شیشیاں، مرتبان اور بوتلیں ڈبیا میں بھر لیں۔ بوجھ کافی تھا۔ اس نے بابو جی سے کہا "ذرا ہاتھ لگا دیجئے!"

"اور جو کانچ چبھ گیا۔ . . . ."

"میرے سرکار دھیان نہیں آیا آپ کو، اپنے ہاتھ کا اتنا خیال ہے۔ جب دھندا ہی ٹھہرا تو لوہے کے دستانے ضرور بنوالو بابو جی!"

"لے بابا، باتیں مت بنا!"

انھوں نے ڈبیا کو برائے نام چھو کر سہارا دیا۔ گردھاری نے دونوں ہاتھوں کی پوری طاقت لگا کر بھری ہوئی ڈبیا کو سر پر رکھ لیا۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں پھول گئیں، سانس تیز ہو گیا۔ وہ ڈبیا سمیت اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا سر نیچے کو دبا جا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ پوری دھرتی کا بوجھ اس کے سر پر رکھ دیا گیا ہے۔ پیروں کے نیچے سیمنٹ کی سڑک نہ ہوتی تو پاؤں ضرور زمین کے اندر دھنس جاتے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہاں سے پانی اُبل پڑتا۔ وہ بابو جی کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ جو ایک گلی کے بعد دوسری گلی میں مُڑتے جا رہے تھے۔ اور پھر ایک دم تیسری گلی میں گھوم جاتے۔ نہ جانے کتنی گلیاں طے کرنے کے بعد وہ ایک بلڈنگ میں کھڑے ہو کر ہانپنے لگے۔

"یہی گودام ہے، ٹھہرے رہو۔ میں اوپر سے کنجی لاتا ہوں!"

بابو جی زینہ پر چڑھنے لگے اور جب تک واپس آئے گردھاری سر پر تیس چالیس کیلو کا وزن رکھے کھڑا رہا۔ بار بار محسوس ہوتا تھا کہ دونوں پاؤں دھرتی میں دھنستے جا رہے ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بوجھ تو میں اُٹھا کر اتنی دور سے لا رہا ہوں اور سانس پھول رہا ہے بابو جی کا۔ شاید انھوں نے میرا درد بانٹ لیا ہے۔ ان کی نسوں میں میری تھکن بھر گئی ہے۔ ایک آدمی کو دوسرے آدمی کے ساتھ اتنا لگاؤ تو ہونا ہی چاہیے۔

بابو جی نے گودام کھول دیا اور گردھاری نے کانچ کے ایک بہت بڑے ڈھیر پر ڈبیا اُلٹ دی۔ پھر وہ گودام میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑانے لگا۔ ہر طرف کانچ ہی کانچ تھا۔ سوڈے کی بوتلوں کے ٹکڑے زیادہ تھے۔ وہ کچھ سوچ کر بولا۔

"بابو جی، کل کے دنگے میں سوڈے کی بارہ سو بوتلیں چلی تھیں۔ ایسا لگتا ہے ان کے سارے ٹکڑے آپ نے گودام میں بھر لیے!"

بابو جی نے زور کا قہقہہ لگایا اور بولے۔ "مورکھ کہیں کے۔ ایسے دنگے نہ ہوں تو سارے گودام اور کارخانے بند ہو جائیں۔"

"کانچ کے ٹکڑوں پر نہ جانے کتنے آدمیوں کا لہو لگا ہو گا۔"

"اسے کون دیکھتا ہے۔ ہمیں تو کانچ کے دھندا چلانا ہے۔ اسے پگھلا کر دوبارہ بوتلیں اور چوڑیاں بنائیں گے۔ ان میں شربت، جوس، اور مٹھائی بھری جائے گی ـــ اور اسی طرح اواگون کا یہ چکر چلتا رہے گا۔" سوڈے کی بوتل، شربت کی بوتل اور مٹھائی کی برنی کی شکل میں آئے گی۔ یہ کسی بھونچال میں ٹوٹ جائیں گی تو پھر اُن سے مُنہ دیکھنے کے آئینے بنیں گے اور پھر شراب پینے کے گلاس، ہاتھوں میں پہننے کی چوڑیاں۔ اسی طرح ہر دنگے کے بعد ایک کہکشاں اُبھرتی رہے گی، دھنک کے رنگ بکھرتے رہیں گے۔

"بابو جی کتنا عمدہ دھندا کرتے ہیں آپ ٹوٹے پھوٹے کانچ کو پگھلا کر پھر برتنوں کے روپ میں ڈھال لیتے ہیں۔"

"اور کیا۔"

"کسی ابھاگن کا سہاگ لٹنے پر اس کی چوڑیوں کے ٹکڑوں کا سودا بھی کیا آپنے؟"

"کیوں نہیں۔ یہ اپنا پیشہ ہی ٹھہرا۔ نہ جانے ایسے ٹکڑوں سے کتنی چوڑیاں بنا کر ہم نے سہاگنوں کی کلائیوں میں پہنا دی ہوں گی۔ چوڑیوں کے ایک کارخانے میں بھی ہمارا حصّہ ہے۔ اچھا بول کیا دے دوں؟" بابو جی نے صدری کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

"جو دل چاہے دے دو بابو جی۔ میں ٹھہرایا نہیں کرتا۔"

"لے پچاس کا سکہ دیے دیتا ہوں۔"

"پچاس کم ہیں بابو جی۔"

"بہت ہیں، نکل جلدی سے۔ میں تالا لگاؤں گا۔"

"دور سے لایا ہوں بابو جی، بوجھ بہت تھا۔"

"پھر اور کیا لے گا؟ بلڈنگ لکھ دوں تیرے نام؟"

"بلڈنگ میرے کس کام کی۔ میں یہاں آبسا تو یہ بھی نرک بن جائے گی۔ اتنے بھا اور دے دو۔"

"پھر میرے ہاتھ کیا آئے گا یہ بھی سوچا تو نے۔ اچھا دس پیسے اور لے۔ کیا نام تیرا؟"

"مگر دھاری!"

"زیادہ لالچ اچھا نہیں ہوتا گردھاری!"

"کیا بات ہے بابوجی لالچ کی۔ یہ نہ ہو تو آپ جیسے بھاگوانوں کے دل میں سوڑے کی ہزاروں بوتلیں ایک دم کیونکر پھوٹ جایا کریں!"

"اچھا اب تم چلتے بنو۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ تم کسی ٹریڈ یونین کے سکریٹری ہو!"

"مخول مت کرو چھابڑی والے سے بابوجی!"

"جا بابا پیچھا چھوڑ میرا!" انہوں نے پانچ کا سکّہ اور دے دیا۔

"۵۰ پیسے میں تین آدمیوں کا پیٹ کیونکر بھر سکوں گا!"

"میں نے پیٹوں کا ٹھیکہ نہیں لیا۔ کھانے کو تو پرماتما ہی دے سکتا ہے بھائی۔ آدمی کی اتنی ہمت کہاں ہے کہ سو پچاس کا دوزخ بھر سکے!"

بابوجی نے منہ پھیر لیا۔ گردھاری کچھ اور کہنے کی ہمت نہ کر سکا۔ دوپہر تک جتنے پیسے اس نے کمائے وہ انہیں لے کر گھر کی طرف چل پڑا۔ اسے رانی اور سروپ کی بھوک کا خیال کھائے جا رہا تھا۔ راستہ کی دکان سے اس نے کلھڑ میں پچاس پیسے کا دودھ لیا اور جلدی جلدی چلنے لگا۔ اس کے کانوں میں رانی اور سروپ کی آوازیں آرہی تھیں۔ جیسے دونوں آوازیں آواز ملا کر پکار رہے ہوں —

"تم کہاں چلے گئے ....."؟

"....... اب تک آئے کیوں نہیں؟"

"..... کچھ کھایا بھی تم نے؟ —"

آخری آواز رانی کی تھی۔ وہ اپنی تکلیف بھول چکی تھی اور گردھاری نے چلتے چلتے ٹھوکر کھائی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ رانی کی چتا جل رہی ہے۔ وہ اکیلی آگ میں نہیں کودی سروپ اس کی گود میں ہے۔ شاید روشنی ہو جانا چاہتی ہے میرے ساتھ جل مرنے کی تمنا رکھتی ہے۔ جس وقت گردھاری نے گھر میں پاؤں رکھا ہے، ٹھیک بارہ بج رہے تھے۔ رانی پانی پی کر لوٹ رہی تھی۔ سروپ ٹاٹ پر پڑا ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ روتے روتے اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔

"کیا لے آئے؟ —" رانی نے پوچھا۔

"دودھ! — تم بھی پیو اور صرب کو بھی پلاؤ"

"کہاں سے مل گیا؟ — دودھ کی تو ہڑتال ہے"

"آج کھل گئی صبح سے!"

"بہت مہنگا ملا ہوگا — اور تم نے بھی کھایا؟"

"جاتے وقت ہوٹل میں چائے پی لوں گا"

"چائے سے پیٹ نہیں بھرا کرتا"

"دو توس کھا لوں گا"

وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکا۔ دوپہر ڈھلے کام زیادہ ملا کرتا ہے۔ لوگ بازار سے سودا خرید کر گھروں کو لوٹا کرتے ہیں۔ انہیں چھابڑی والے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اور شام کو آسے اتنے کے علاوہ رانی کی گولیاں بھی لانی تھیں۔ وہ ایک چھوٹے سے ہوٹل میں گھس گیا اور جھولے کھاتی ہوئی ایک پرانی کرسی پر میز کے سامنے بیٹھ کر چائے کا آڈر دیا۔

"ایک کپ چائے — دو بسکٹ"

"میٹھے یا نمکین؟" — بوائے نے سوال کیا۔

"ایک میٹھا — ایک نمکین"

اس لمحہ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی بہت بڑا کارخانہ دار ہے اور اس کے ایک ہی اشارہ میں سوڈے کی سیکڑوں بوتلیں ٹوٹ سکتی ہیں، بہت سی عورتوں کی چوڑیاں مل سکتی ہیں۔ وہ پیروں میں چھابڑی ڈالے بڑی شان سے اکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ یہ اکڑ اور تمکنت اس لیے نہیں تھی کہ اسے بابوجی نے کرسی پر بیٹھا دیا ہے بلکہ اس لیے تھی کہ اپنی محنت سے کمائے ہوئے پیسہ کی طاقت سے اس نے یہ سیٹ حاصل کی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ جیب میں اتنے پیسے ہیں کہ بل آسانی سے ادا کر دوں گا اور جب یہاں سے اٹھوں گا تو ہاتھ پیروں میں ایک نئی طاقت، امنگ اور تسکین ہوگی۔ رگوں میں تازہ خون دوڑ رہا ہوگا۔ ہوٹل سے نکل کر وہ سڑک پر گھومنے لگا۔ اور شام تک سامان ڈھوتا رہا۔ پیسے ملتے رہے۔ لوگ منہ مانگی اجرت دیتے رہے۔ وہ بچے ہوئے نوٹ کی جیب میں پیسے ڈالتا رہا جس کو رانی نے کل ہی موٹے دھاگے سے اچھی طرح گوتھ دیا تھا۔ پیسوں کا بوجھا تنا بڑھتا جا رہا تھا کہ اسے تھکن محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ جیب کو جلدی ہلکا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بازار کو دوسروں کے لیے خالی کر دینا چاہتا تھا۔ جانتا تھا کہ ہر چھابڑی والا ایک

رانی کا شوہر اور ایک سروپ کا باپ ہوگا۔ ابھی بھی اتنے ہی پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ آخر مزدوری کے ۸۰ پیسے اس نے جیب میں ڈالے تو ایسا لگا جیسے وزن اس کی بساط سے زیادہ ہو گیا ہو اور اب وہ اسے اٹھانے کا حوصلہ نہ رکھتا ہو۔ تین آدمیوں کو زندہ رکھنے کے لیے اتنے پیسے کم نہیں تھے، جتنے وہ کما چکا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنا کوٹہ پورا ہو چکا، اب کسی کا بوجھ نہیں اٹھاؤں گا، اور سورج ڈوبنے تک پیارے لال کے پاس بیٹھا بڑی بیتا رہوں گا۔ اس سے جگ بیتی کہوں گا اور آپ بیتی سنوں گا۔ یہ سوچ کر وہ شہر کی تنگ و تاریک اور گندہ گلیوں سے گذرتا پارک کی سمت چلنے لگا۔

پیارے لال کارپوریشن میں نوکر تھا اور پارک میں پھولوں، پودوں؟ ورتار کی باؤنڈری کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ دن بھر گدھے، گھوڑے اور بکریاں بھگاتا رہتا۔ جانور کھلا دیکھتے تو دوڑ کر گھس جاتے۔ سب سے بڑی مصیبت وہ بچے تھے جو پھول توڑنے اور لوہے کے تاروں پر جھولنے کی غرض سے ہر لمحہ چکر کاٹتے رہتے تھے۔ وہ انھیں گالیاں دیتا، کبھی مارنے کے لیے دوڑتا۔ گدھوں اور بچوں میں اتنا فرق تھا کہ ایک گدھے کا رُخ باہر کی طرف ہو جاتا تو سارے گدھے اس کے پیچھے بھاگنے لگتے اور بڑی تنظیم کے ساتھ پسپا ہو جاتے۔ لڑکوں میں یہ ڈسپلن بالکل نہ تھا۔ وہ ان کا پیچھا کرتا تو سب تتر بتر ہو جاتے۔ کوئی پورب کو بھاگتا، کوئی پچھم کو۔ بعض اوقات وہ جل کر سوچتا کہ اتنے لڑکے کہاں سے آجاتے ہیں۔ سرکار فیملی پلاننگ چلا رہی ہے۔ پھر بھی بچوں کی پیدائش نہیں رکتی۔ اور رُکے کیونکر۔ آپ ہی فیصلہ کرتا — آواگون کا دور کس کے روکے رکتا ہے۔ جتنے آدمی دنیا سے جائیں گے اتنے آئیں گے ضرور۔ پارک کے بیچ میں دوب کی دلفریب ہریالی تھی اور چاروں طرف خالی زمین دکھائی دے رہی تھی۔ وہاں دوب ابھی پیدا نہیں کی جا سکی تھی۔ دوسرے تیسرے دن سارے نل کھول دیے جاتے۔ ان سے اچھل کر پانی نکلتا اور خالی زمین کو خوب تر کر دیتا۔ وہاں دوب پیدا کرنے کی پوری کوشش کی جا رہی تھی۔ گردھاری سڑک پار کر کے اس حصہ میں پہنچ گیا جہاں گھاس نہ تھی اور زمین جھاڑی والے کی نئی منڈھی ہوئی چندیا کی طرح چمک رہی تھی — جگہ جگہ چیونٹیوں کی قطاریں رینگ رہی تھیں جیسے زندگی کا تھکا ہوا قافلہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا ہو۔ وہ دو چار چار قدم پر چونے کی سی سفیدی نظر آرہی تھی۔ دراصل وہ چونے کی سفیدی نہ تھی بلکہ دیسی گیہوں کے باریک پسے ہوئے آٹے کے نشانات تھے۔ صبح شام شہر کے بڑے بڑے دولت مند اور ریا پوجھیلیوں میں آٹا بھر کر لاتے اور ایک ایک چٹکی

چیونٹیوں کے سوراخوں پر ڈال جاتے۔ چیونٹیوں کی قطاریں اِدھر اُدھر دوڑتی رہتیں۔ وہ خیرات کے اس آٹے پر نگاہ ڈالے بغیر اپنی تگ و دو میں مصروف رہتیں۔ مرے ہوئے کن کھجوروں، ٹڈوں اور بھڑوں کی لاشیں ڈھونڈنے میں مشغول رہتیں۔ جب کوئی مرا ہوا کیڑا مل جاتا، وہ اسے گھسیٹ کر بل میں لے آتیں۔ گردھاری نے دیکھا کہ ایک شخص سر جھکائے چیونٹیوں کے بل تلاش کر رہا تھا۔ جب کوئی سوراخ مل جاتا وہ ایک مٹھی آٹا اس کے آس پاس بکھیر دیتا۔ گردھاری کو یہ کھیل بہت پسند آیا۔ وہ ایک جگہ ٹھہر کر آٹا ڈالنے والے کی زیادتی کا نظارہ کرتا رہا۔ اس نے دھوتی کے پلو میں سیر بھر کے قریب آٹا بھر رکھا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کا وزن کم ہوتا جا رہا تھا۔ گردھاری نے بالکل فلسفی کی نظر سے چیونٹیوں کی بےنیازی کا امتحان لینا شروع کر دیا۔ جو آٹے کے اوپر سے گزرتی پوری روانی اور تیزی سے میدان میں دوڑ رہی تھیں۔ لوگ انھیں پیروں سے روند دیتے تو بھی ان کی دوڑ دھوپ میں فرق نہ آتا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی بڑی مہم پر جا رہی ہیں۔ چیونٹیوں کی آرمی کے بعض دستے ایسے بھی تھے جو مرے ہوئے کیڑے مکوڑوں کو کھینچے بلوں کی سمت آ رہے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ دھن کی پکی چیونٹیاں بکھرے ہوئے آٹے کو اہمیت نہیں دیتیں۔ وہ آپ ہی اپنی محنت سے مہینوں کی خوراک بلوں میں اکٹھی کر لیتی ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے آٹا ڈالنے والے کی جھولی خالی ہو گئی۔ گردھاری کو اس کی فیاضی پر ہنسی آ گئی۔ وہ سوچنے لگا — اتنے آٹے سے ایک ایسے اپاہج کا پیٹ بھر سکتا تھا جو چلنے پھرنے سے بالکل معذور ہو یا چوتڑوں کے بل گھسٹتا ہوا ایشور کے نام پر بھیک مانگ رہا ہو۔ نہ جانے وہ کتنی دیر کھڑا رہتا۔ اچانک اسے اپنے قریب ہی پیروں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ وہی بابوجی چلتے چلتے دھوتی جھٹک رہے تھے جن سے کچھ آجرت پر اس کی معمولی سی تو تو میں میں ہوئی تھی۔ انھوں نے کہا تھا — پیٹ تو پر ماتما بھرتا ہے بھائی سب کا ہم نے پیٹوں کا ٹھیکہ نہیں لیا۔

"بابوجی!" — گردھاری بولا — "آپ کیوں یہ جھگڑا مول لے رہے ہیں۔ چیونٹی بھلا آپ کے اس چٹکی بھر آٹے کو کب نگاہ میں لاتی ہے۔ ان کے سوراخوں میں مہینوں کا راشن بھرا پڑا ہے۔ کیڑے مکوڑوں کی لاشوں، گڑ کی ڈلیوں اور روٹی کے ٹکڑوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں چیونٹیوں کے گودام میں۔"

بابوجی نے اسے دیکھا۔ بات زیادہ پرانی نہ تھی۔ جلدی ہی یاد آ گئی۔ ہنس کر بولے

(بقیہ صفحہ ۲۷ پر)

نئی مطبوعات

بکھرے ورق (ادبی مضامین) مصنف: سونیتی کمار چٹرجی مترجم: شانتی رنجن بھٹاچاریہ نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۳/-

چلم نامہ (مزاحیہ کلام) محمد یوسف پاپا " " اردو سماج ۲/-

ترجمان القرآن حصہ سوم (تفسیر) مولانا ابوالکلام آزاد " " ساہتیہ اکیڈمی ۱۲/-

گلشن گلشن (شعری مجموعہ) پریم پال اشک دہلی، اردو پبلیکیشنز ۲/۲۵

پتھر کا گلاب (ناول) کوثر چاندپوری " ۶/-

انجھ بیگانے (") عارف مارہروی " پنجابی پستک بھنڈار ۳/۵۰

پریم پجاری " " " " " " ۳/۵۰

کٹی پتنگ " گلشن نندہ " " " ۶/-

دل کے آنسو " عادل رشید " " " ۶/-

درندے " ہرچرن چاولہ " " " ۳/۵۰

افکار بیتر (ادبی) حبیب احمد خاں علی گڑھ انڈین بک ہاؤس ۹/-

ادب اور تنقید (") اسلوب احمد انصاری الہ آباد سنگم پبلشرز ۸/-

لفظ و معنی (") شمس الرحمٰن فاروقی " شب خون ۶/۵۰

آخری دن کی تلاش (شعری مجموعہ) محمد علوی " " " " ۲/۲۵

فروغ انجم (") مفتی احمد رضا خاں ٹونک، شفا منزل ۳/-

ہماری داستانیں (ادبی) وقار عظیم رامپور، مکتبہ عالیہ ۱۰/-

کسب معاش کا اسلامی نظریہ حامد علی خاں گورکھپور ۲/-

نئے ڈرامے (ڈرامے) محمد حسن علی گڑھ، انجمن ترقی اردو ۵/-

اندر سبھا (ڈراما) مسعود حسین رضوی لکھنؤ، کتاب نگر ۱/۵۰

رجب علی بیگ سرور (ادبی) نیر مسعود رضوی " " " ۱۲/-

فیصلہ خاموش (شعری مجموعہ) کالیداس گپتا رضا بمبئی، صبح امید ۵/-

تکمیں (کہانیاں) احمد ہمیش حیدرآباد، سلمیٰ سلطانہ حمیدی ۲/-

جائزے

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

تذکرۂ مسرت افزا

مولفہ ابوالحسن امیرالدین احمد عرف امراللہ الہ آبادی
مترجمہ ڈاکٹر محبوب قریشی
صفحات ۲۶۴ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$
قیمت پانچ روپے
سن طباعت ۱۹۶۸ء
ملنے کا پتا: علم مجلسی کتب خانہ ۲۷ اکلاں محل دہلی

بڑی مبارک گھڑی تھی جب مولوی عبدالحق مرحوم نے اردو شعرا کے قدیم و کمیاب تذکروں کو تلاش کر کے اپنے فاضلانہ مقدموں کے ساتھ ان کی طباعت و اشاعت کا آغاز کیا۔ ان کی اس حیثیں رو کے بعد پھر تو دکن، پنجاب یوپی اور بہار وغیرہ سے متعدد نایاب تذکرے شائع ہونے لگے اور ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک کم و بیش سترہ اٹھارہ نادر تذکرے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے اور چھپوائے جا چکے ہیں۔ تلاش و جستجو کی جو روش اور رفتار رہی ہے اس سے امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ بہت تھوڑی مدت میں شاید ہی کوئی ایسا قدیم اور قابلِ لحاظ تذکرہ رہ جائے جو اشاعت سے محروم رہے۔

تذکروں کی طویل فہرست میں میر تقی میر کے "نکات الشعرا" کو کئی حیثیتوں سے تقدم حاصل ہے۔ اسی زمانے میں قائم، اور حمید اورنگ آبادی نے بھی اپنے اپنے تذکرے ترتیب دیے تھے اور گردیزی نے ایک جوابی تذکرہ لکھا۔ ان تذکروں کے کوئی پچیس چھبیس سال بعد ایک اور جوابی تذکرہ ضبطِ تحریر میں لایا گیا جو ضخامت کے لحاظ سے سابقہ تذکروں سے کہیں زیادہ اور طنز و تعریض کی حیثیت سے گردیزی کے مقابلے میں تلخ تر ثابت ہوا، اور یہی وہ تذکرہ ہے جس کا نام ہے "تذکرۂ مسرت افزا" اس کی تلاش اور پھر رسالہ معاصر پٹنہ میں قسطوار اشاعت کا سہرا قاضی عبدالودود کے سر ہے۔ اس دور کے عام رواج کے مطابق اس کی زبان فارسی ہے ڈاکٹر محبوب قریشی نے اسے اردو میں ترجمہ کر کے اب کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی یہ کوشش تمام اردو دانوں کے لیے سہولت اور شکر گزاری کا باعث بن گئی ہے۔

تذکرے کے بارے میں تمام ضروری معلومات، اس کی خوبیاں اور خامیاں بڑے مناسب انداز میں فاضل مترجم نے اپنے دیباچے میں درج کردی ہیں۔ مثلاً یہ تذکرہ ۱۱۹۲ھ میں شروع ہوکر ۱۱۹۵ھ میں اختتام کو پہنچا، لکھنے والے کا جذبہ بہت کچھ معترضانہ اور جوابی ہے۔ مولف نے میر صاحب کو "نکتہ چیں" کہا ہے، ان کی تنقیدوں کو "تحقیر" اور ان کی رائے کو "بے پروائی" سے تعبیر کیا ہے۔ انتخاب کو "برے اشعار انتخاب کرنے کی عادت" قرار دیا ہے۔ غرض میر صاحب کی کارگزاری کسی لحاظ سے قابلِ ستائش نہ سمجھ کر طرح طرح سے اعتراضات کیے ہیں۔ اس وقت کا حال تو معلوم نہیں کہ پڑھنے والوں نے اس کا کیسا اثر قبول کیا ہوگا لیکن آج ابوالحسن امیرالدین احمد عرف امراللہ الہ آبادی کی اس رائے سے عام طور سے اختلاف ہی کیا جائے گا۔

بہرحال ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ یہ ایک قدیم تذکرہ ہے جس میں کوئی ۲۳۲ شاعروں کا ذکر ہے۔ میر پر اعتراض کرنے والا خود بھی محتاط نہیں کہا جا سکتا۔ غلط اور مشتبہ واقعات۔ ایک کا شعر دوسرے کے نام سے منسوب کردینا، ناموں کی جابجا غلطیاں۔ کلام پر جو رائیں دی گئی ہیں وہ بھی صحیح نہیں۔ غیر ضروری لفظی رعایتوں کی کثرت اور مبالغہ۔ ۔ ۔ اور یہ کمیاں کچھ اسی تذکرے کے لیے مخصوص نہیں کہی جا سکتیں ہیں اس زمانہ کے لوگوں کو زیادہ چھان بین اور کد و کاوش کی عادت نہیں تھی۔ اسی بنا پر تو قدیم تذکروں میں اسی طرح کی باتیں عام طور سے ملیں گی۔

اسلاف کی کارگزاریاں ہمارے لیے مشعلِ راہ اور ان کی سہو یا فرو گذاشتیں ہمارے تنقیدی شعور کو بیدار کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ بے جا گرفت اور خواہ مخواہ کی نکتہ چینی سے اصل حقیقت اور اجاگر ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم کو ہر ایسی کتاب کی قدر کرنی چاہیے جس کی ترتیب و تدوین میں ہمارے بزرگوں نے اپنا وقت اور توجہ صرف کی ہے۔ آج اس کا متن سامنے آیا ہے کل اس کی کوئی اصلاح اور اغلاط کی درستی پر آمادہ ہوگا۔ غرض یہی خام مواد کسی مستند اور معتبر تالیف یا تصنیف کا سبب بن جائے گا جس سے موجودہ اور آیندہ زمانے کے لوگ بہت کچھ سیکھیں گے اور اسی طرح زبان و ادب کے گلشن میں نت نئی بہاریں آتی رہیں گی۔　　　رشید نعمانی

عظیم اور لازوال

ترتیب و ترجمہ: عابد رضا بیدار
صفحات: ۳۲　　سائز: $\frac{20\times30}{8}$
قیمت: سات روپے
ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز، رام پور
بار دوم، سال طبع ۱۹۶۸ء

اس کتاب میں مندرجۂ ذیل معروف افراد کے اقوال اور تاثرات کو جمع کیا گیا ہے: ہمرشیلڈ، اقبال، رشید احمد صدیقی، جبران، نیٹشے، بھرتری ہری، معزی، سینیکا، لاؤتزو، گوتم، کامیو۔

معروف و برگزیدہ افراد کے مختصر اقوال اور وہ تاثرات جن کو عالمِ تنہائی میں قلم بند کیا جاتا ہے، واقعی عظیم اور لازوال ہوتے ہیں۔ اور ان کو غالب کے الفاظ میں "گنجینۂ معنی کا طلسم" کہنا چاہیے۔ بیدار صاحب نے ان اقوال کو مرتب کرکے ایک عمدہ کام کیا ہے کہ وہ اردو والے جن کی رسائی اصل تک نہیں ہو پاتی، وہ بھی اس گنج معانی سے فیض اٹھا سکیں۔ مرتب نے پیش گفتار میں لکھا ہے:

"ترجمہ ایمان داری کا فن ہے مگر بعض ترجموں میں ایمان داری اپنے ساتھ بے ایمانی کے مترادف ہو جاتی ہے خصوصاً جہاں مترجم کو مصنف کی ہر آواز اپنی گم شدہ آواز اور ہر صدا اپنی صدائے بازگشت لگتی ہو! لیکن اس بے ایمانی کا کچھ اور مطلب ہرگز نہ لیجیے۔ بلکہ صرف اتنا کہ مصنف کی آواز کو زیادہ موثر اس کے لہجے کو زیادہ پرخلوص اور اس کے جذبے کو زیادہ شدید کر دیا جائے — زیادہ، میں نے غلط کہا۔ اس کی فکر کی مناسبت سے "نیاں ولرزاں!"

یہ بہت بڑا ادعا ہے۔ کیا اچھا ہو کہ ہمارے واقعی اچھے کام کرنے والے، اس قسم کے خالص جذباتی اور رومانی اندازِ فکر اور اندازِ بیان سے دامن کش رہیں، پڑھنے والا شروع ہی سے بدگمانی کے دھندلکے میں آ جاتا ہے۔ اس قسم کے ادعا کے بغیر بھی بات کہی جا سکتی ہے۔

مترجم نے یہ نہیں بتایا کہ رشید صاحب کے اقوال کہاں سے ماخوذ ہیں۔ ان کی کتابوں سے، خطوں سے یا یہ مرتب کی ذاتی معلومات کا نتیجہ ہیں۔ یہی صورت اور جگہ بھی ہے۔ جب کہ اقبال، ہمرشیلڈ اور کامیو کی ڈائریوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ بڑی کمی ہے۔ مناسب یہ ہے کہ دوسروں کے اقوال کا ترجمہ کیا جائے اور ترجمہ جس حد تک اجازت دیتا ہے، اس حد تک اس کو تخلیقی صلاحیت سے آمیز کیا جائے۔ لیکن مترجم نے جس طرح کا دعویٰ کیا ہے اس کے نتیجے میں اصل خیال سامنے نہیں آ پاتا ہے۔ یا کوئی شخص یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس میں فرد کا حصہ کتنا ہے اور مترجم کا اضافہ کتنا ہے جب تک کہ وہ اصل کتاب کو سامنے نہ رکھے اور اگر اس کی شرط باقی رہے کہ اصل کتاب کو بھی سامنے رکھا جائے تو پھر ترجمے کا فائدہ کیا ہوا؟

کتاب جس قدر سادگی سے اسی قدر بری چھپی ہے۔ اور اس کی ترتیب میں بے ترتیبی سی

اس سے بظاہر یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ یہ دراصل کتاب نہیں ہے۔ بلکہ کسی رسالے میں چھپے ہوئے مختلف مضامین کے اجزا کی شیرازہ بندی کر دی گئی ہے۔ کامیو والا حصّہ تو شاید اُردو ادب میں بالکل اسی صورت میں شائع ہوچکا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسی کے اوراق کو لے کر چھاپ دیا گیا ہے۔ یہ بجائے خود خواہ غلط نہ ہو لیکن اس سے کتاب کی ترتیب پر بہم پر برا اثر پڑا کرتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب مضمون لکھا جاتا ہے تب صرف وہ مضمون پیش نظر ہوتا ہے اور جب اس کو کتابی صورت میں مرتب کیا جاتا ہے تو اسی کے لحاظ سے ترمیم و تنسیخ ضروری جاتی ہے تاکہ سب اجزا مل کر باضابطہ کتابی صورت میں منتقل ہوجائیں۔ اس مجموعے میں اس کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

سعادت علی صدیقی

●

گلشن گلشن (شعری مجموعہ)

نام شاعر: پریم پال اشک
صفحات: ۱۲۸ سائز: $\frac{۲۰×۳۰}{۱۶}$
قیمت: دو روپے ۲۵ پیسے
سن اشاعت
ناشر: اُردو پبلیکیشنز، اردو بازار دہلی ۶

پریم پال اشک اردو کے نوجوان ادیب و شاعر ہیں۔ زیرِ نظر مجموعۂ کلام میں ان کی غزلیں، نظمیں، گیت، کنڈلی، دوہے، کیرتن اور متفرق اشعار شامل ہیں۔ ان کی بعض غزلیں اور اکثر نظموں پر اردو شاعری کی مرکزی روایت کا گہرا اثر ہے۔ گیت، دوہے، کنڈلی اور کیرتن ہندی شاعری کی روایت سے قریب ہیں۔ غزلوں کے بعض اشعار اور گیتوں کے بعض حصّے جدت اور قدامت کے امتزاج کا حسین نقش ہیں۔ اشک نے کنڈلی کے فن میں معمولی سی تبدیلی کر کے اُردو قالب عطا کیا ہے۔

پریم پال اشک کو قدیم ہندوستان، تہذیب اور عقائد سے گہرا ربط ہے۔ اس لیے وہ حال کی شخصیتوں اور مسائل پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے بھی ہندو دیو مالا (MYTHOLOGY) اور قدیم ویدک اشارے اور علامتیں منتخب کر کے استعمال کرتے ہیں۔ پھر بھی ان کی شاعری مریضانہ ماضی پرستی کا اشتہار نہیں ہے۔

اشک کی زبان عوامی ہے۔ اس پر بڑی حد تک ہندی زبان کا اثر ہے اس لیے

اس میں فارسی کی موسیقیت کم اور ہندی کا رس زیادہ ہے اور اس کی نرمی اور ٹھنڈک متاثر کرتی ہے۔ مگر اس میں لسانی ذہنی پختگی اور شعری رچاؤ کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر گلشن گلشن میں حب الوطنی کے جذبات، ہندی شاعری کا رسیلا پن اور زبان کی نرمی کے عناصر ہیں۔ اس لیے اس کو ہلکی پھلکی شاعری کا مجموعہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ چند شعر دیکھیے

رام کی مایا دیکھو اندھا مکھڑا دیکھے درپن میں
کوئی نہیں سمجھانے والا ہر اک اس پر ہنستا ہے

رادھا بہ رنگ میں انتر کیا ہے یہ تجھ کو سمجھاتا ہوں
دونوں ہاتھ پسارے پھرتے دونوں کرتے پیار کا مول

ہوگئیں خیرہ نگاہیں نور سے دل کی دنیا میں اندھیرا ہی رہا

عنوان چشتی

(صفحہ ۲۱ کا بقیہ)

—"کیوں بے جھاڑی والے! اب بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا تو نے۔ میں ایک پیسہ نہیں دوں گا تجھے!"

"من دو سرکار۔ تم تو دھرتی کی مانگ میں آٹے کا سیندور بھرنے ہو۔ بلا سے جھاڑی والا بھوکا مرتا رہے۔ مگر ایک بات ہے بابو جی! دھرتی اپنا تھوکا چاٹا نہیں کرتی۔ وہ اناج اگلتی ہے اس کا آٹا کیونکر چاٹ سکے گی؟"

اسی وقت پیارے لال لاٹھی کندھے پر رکھے اُدھر آنکلا، بولا —"کیا ہے گردھاری! ادھر کیوں کھڑا ہے؟"

"ایک ناٹک دیکھنے لگا تھا۔ تم اسے رام لیلا کہہ لو۔ بابو جی چیونٹیوں کو آٹا چٹانے آئے تھے میری اُجرت کاٹ کر اُن کے لیے گیہوں کا آٹا لائے تھے جو میدے سے بھی زیادہ مہین تھا۔ انھیں کیا پتا کہ ان سیٹھانیوں کا گھر بھرا پڑا ہے کھانے پینے کی چیزوں سے۔ کون جانے کتنا راشن سڑ جاتا ہوگا ہر سال وہاں بڑے بڑے ان کے یہاں فیملی پلاننگ نہیں ہے۔ دن رات میں لاکھوں بچے انڈوں سے نکل پڑتے ہیں۔ چیونٹی ان سب کا پیٹ بھر دیتی ہے۔ اسے بابو جی کے سیر بھر آٹے کی بھلا کیا پروا۔ بابو جی اس بات کو نہیں سمجھتے۔ وہ ایک ایک چٹکی آٹے سے اپنی مکتی کا مول کرتے ہیں اور چیونٹی کو بھیک پر گزر کرنا سکھاتے ہیں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ ان کا یہ سپنا پورا نہیں ہوگا۔"

(بشکریہ مطالعہ پٹنہ)

ادبی خبریں

اساتذہ اردو جامعات ہند کی تیسری سالانہ کانفرنس اس سال شعبہ اُردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقد ہوئی۔ کانفرنس کا افتتاح ہندوستان کے ممتاز ماہر تعلیم اور نامور ادیب و دانشور پروفیسر جناب غلام السیدین صاحب نے فرمائی۔ ہندوستان کی تقریباً تمام یونیورسٹیوں اور اہم کالجوں سے آئے ہوئے پچاس سے زائد اردو اساتذہ نے کانفرنس میں شرکت کی؛ اردو ذریعہ تعلیم، نصابی کتابوں کی تیاری اور ان کے مسائل، تحقیق و تنقید اور اساتذہ اردو سے متعلق مسائل پر مقالات پڑھے گئے اور تبادلہ خیالات ہوا۔ کانفرنس کی طرف سے آزاد لائبریری میں نادر مخطوطات و مطبوعات اور معلمین اردو کے تصنیفی کاموں کی ایک نمائش ترتیب دی گئی اور کانفرنس ہال کے قریب ایک کمرے میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی علی گڑھ برانچ کی طرف سے کتابوں کا اسٹال بھی لگایا گیا۔

۱۹۶۹ء کے نظام خطبات دینے کے لیے دہلی یونیورسٹی نے اردو کے مشہور اور صاحب طرز ادیب اور نقاد پروفیسر رشید احمد صدیقی کو دعوت دی ہے۔ رشید صاحب' غالب کی شخصیت اور شاعری پر دو لکچر نظام خطبات کے تحت فروری ۱۹۶۹ء میں دیں گے اس موقع پر دہلی یونیورسٹی میں غالب کا جشنِ صدسالہ بھی منایا جائے گا۔

بمبئی۔ ساون کمار ٹاک غالب کے بارے میں ایک فلم تیار کرنا چاہتے ہیں جو ایسٹ مین کلر میں ہوگی۔ فلم کی رسم مہورت ادا کرنے کے لیے صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو دعوت دی جارہی ہے۔ اس کا مسودہ کیفی اعظمی نے تیار کیا ہے۔ فلم کو موہن سہگل ڈائرکٹ کریں گے اور مدن موہن اس کی موسیقی تیار کریں گے۔ دسمبر میں فلم کی باقاعدہ شوٹنگ شروع ہونے کی امید ہے۔ اور پروڈیوسر ٹاک چار مہینے کے اندر اندر اس فلم کو مکمل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تاکہ غالب کی صدسالہ تقریبات کے دوران اس کی نمائش ہو سکے۔

ادب — تنقید — انشا

کتاب	مصنف	قیمت
ادب اور تنقید	اسلوب احمد انصاری	۸/۰
ایران صدیوں کے آئینے میں	ڈاکٹر امرت لعل عشرت	۱۲/۰
اردو شاعری میں منظر نگاری	ڈاکٹر سلام سندیلوی	۱۰/۰
اردو نثر کا آغاز اور ارتقاء	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ	۵/۵۰
ادب اور جدید ذہن	دیویندر اسر	۴/۵۰
ادبی معرکہ (فروغ اردو)	مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	۵/۷۵
اردو کی تین مثنویاں	خان رشید	۳/۵۰
اصناف ادب کا ارتقاء	سید صفی مرتضیٰ	۱/۵۰
آب حیات	محمد حسین آزاد	۱۰/۰
اردو کے چاند ستارے	مرتبہ امیر حسن نورانی	۵/۰
اقبال کا تصور خودی	ڈاکٹر غلام عمر خاں	۳/۰
اردو میں تنقید کی اہمیت	قیوم صادق احمد پوری	۹/۰
اردو ڈرامہ اور اسٹیج	سید مسعود حسن رضوی ادیب	۹/۵۰
امیر خسرو اور ہندوستان	ڈاکٹر تاراچند	۱/۰
اٹھارہ سو ستاون اخبار اور دستاویزیں	مرتبہ عتیق صدیقی	۲۰/۰
اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ	ڈاکٹر سلیم حامد رضوی	۱۰/۰
اردو تعلیم کے لسانیاتی پہلو	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	۱/۹۰
اکبر	لارنس بنیین	۳/۵۰
اردو سے ہندوؤں کا تعلق	اجمل اجملی	۱/۵۰
ادب اور ادیب	ڈاکٹر اعجاز حسین	۴/۰
اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر	ڈاکٹر تاراچند	۷/۵۰
ادب اور زندگی	مجنوں گورکھپوری	۵/۰
اندازے	فراق گورکھپوری	۵/۷۵
آئینۂ عقل	نکہت شاہجہانپوری	۴/۵۰

کتاب	مصنف	قیمت
ادبی تاثرات	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۴/۵۰
امراؤ جان ادا	مرزا رسوا	۵/۵۰
ادب اور نفسیات	دیویندر اسر	۳/۵۰
ایلیٹ کے مضامین	جمیل جالبی	۵/۰
افکار نو	فیض الرحمٰن اعظمی	۳/۵۰
ارمغان نثر	عبدالاحد خاں خلیل	۲/۰
ارمغان نظم	" " "	۱/۷۵
انشائے بے خبر	مرتبہ سید مرتضیٰ حسین بلگرامی	۱/۰
اردو	جگن ناتھ آزاد	۰/۵۰
ادب کا مقصد	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	۴/۰
اردو شاعری پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	۶/۰
اکبر الہ آبادی اور ان کا کلام	نورالرحمٰن	۲/۰
اردو ڈرامہ	ڈاکٹر قمر رئیس	۴/۵۰
ایشیائی بیداری اور اردو شعر	اسلام بیگ چنگیزی	۳/۰
آپ سے ملیے	علی جواد زیدی	۳/۰
انمول موتی	مفتی فخر الاسلام	۲/۶۲
اردو تذکروں میں نکات الشعراء کی اہمیت	ایم کے فاطمی	۴/۰
اعتبار نظر	سید احتشام حسین	۴/۵۰
ادبی ڈرامے	ڈاکٹر اعجاز حسین	۳/۵۰
آثار الصنادید	سر سید احمد خاں	۱۸/۰
انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ	۲/۵۰
اردو زبان اور اس کا رسم خط	سید مسعود حسن رضوی ادیب	۱/۵۰
اردو کے چار مزاحیہ شاعر	مرتبہ احمد جمال پاشا	۳/۵۰
ادب کیا ہے	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	۲/۲۵
ادبی نقوش	شاہ معین الدین احمد ندوی	۵/۰

کتاب	مصنف	قیمت
الغزالی	شبلی نعمانی	۵/۰
اردو تنقید کی تاریخ	مسیح الزماں	۳/۰
انشاءاللہ خاں انشاؔ	اسلم پرویز	۴/۰
ایک نادر روزنامچہ	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	۲/۵۰
اقبال اور اس کا عہد	جگن ناتھ آزاد	۳/۵۰
ادبی رجحانات کا تجزیہ	راجندر ناتھ شیدا	۳/۰
اثر کے تنقیدی مضامین	اثر لکھنوی	۲/۵۰
اردو، ہندی، ہندوستانی	سجاد ظہیر	۰/۷۵
انتخاب جدید نثر اردو	سید احتشام حسین	۲/۵۰
امتحان وفا	سید مسعود حسن رضوی ادیب	۰/۵۰
ابوالکلام آزاد کے افسانے	ابوالکلام آزاد	۱/۲۵
البرامکہ اور ان کا عروج و زوال	حبیب حسین	۲/۰
اندر سبھا	مرتبہ پروفیسر مسیح الزماں	۱/۰
اردو زبان اور ادب	ڈاکٹر مسعود حسین	۲/۹۴
آرٹ	سید مجید اللہ	۲/۵۰
اردو شاعری	منشی امیر احمد علوی	۱/۵۰
امتیاز نظر	صفیہ اختر	۲/۰
امیر خسرو	ڈاکٹر محمد وحید مرزا	۵/۰
اردو زبان اور فن داستان گوئی	کلیم الدین احمد	۴/۰
اشتر و سوزن	قاضی عبدالودود	۴/۰
آموزگار فارسی	محمد حسین آزاد	۱/۲۵
ادبستان	مرتبہ پروفیسر اختر قادری	۵/۰
انیس کی مرثیہ نگاری	اثر لکھنوی	۲/۵۰
اس نے کہا	خلیل جبران	۲/۰
ادبی تنقید	ڈاکٹر محمد حسن	۴/۰
افادات مہدی	مرتبہ بیگم مہدی	۴/۵۰
ابتدائی تعلیم کی عام کہانی	رام پرشاد	۲/۵۰
اصول تعلیم	خواجہ غلام السیدین	۶/۰
اہل ہند کی مختصر تاریخ	ڈاکٹر تارا چند	۵/۵۰

کتاب	مصنف	قیمت
انسانی معاشرہ	محمد عبدالرحمٰن مہاجر	۱/۲۵
انشائے ہادی النساء	منشی احمد دہلوی	۲/۷۵
الف لیلہ	نول کشور	۸/۰
ارمغان آصف	مرتبہ خواجہ احمد فاروقی	۵/۵۰
اردوئے معلی (میر سوز نمبر)	مرتبہ خواجہ احمد فاروقی	۷/۰
〃 〃 (قائم نمبر)	〃 〃	۵/۰
انتخاب اودھ پنچ	مرتبہ رضی کاظمی	۲/۰
ادب کا مطالعہ	اطہر پرویز	۵/۰
آگہی و بے باکی	باقر مہدی	۵/۵۰
امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر	ڈاکٹر صفدر آہ	۲/۰
اسرار کائنات و اشرف المخلوقات	ڈاکٹر اختر احمد	۳/۶۰
بہادر شاہ ظفر فن اور شخصیت	پروفیسر خواجہ [illegible] حسین	۵/۷۵
بزم اکبری کامل	نول کشور پریس	۵/۰
ببلوگرافیا اردو ڈراما اول، دوم	ڈاکٹر نامی	۱۴/۰
بزم خیال	صفدر مرزاپوری	۲/
بھگوان بدھ	دھرما نند کوسمبی	۷/۰
۲۴ نظمیں ایک روایت ایک بغاوت	ڈاکٹر سید محمد عابدین	۳/۰
باپو کا خط منی کے نام	حبیب الحسن قادری	۱/۲۵
باقیات شبلی	مشتاق حسین	۳/۷۵
بچوں کی نفسیات	ڈاکٹر عبدالرؤف	۵/۵۰
باغ و بہار	میرامن دہلوی	۳/۰
بچوں کی رہنمائی	ڈاکٹر عبدالرؤف	۱/۵۰
بچوں کی تربیت	〃 〃	۱/۵۰
بے بات کی بات	سیدہ نسیم چشتی	۴/۰
بچوں کی دیکھ بھال	سوسن آئزک	۴/۰
بہترین افسانے	ایم حبیب خاں	۲/۷۵
بات بات	سید اقبال احمد	۱/۵۰
بیسوی صدی کے چند اکابر غزل گو	ڈاکٹر محمد اسلام	۲/۰

تازہ ہندوستانی مطبوعات

ادبی	آبادی	[illegible] آگروالی	۵/۲۵
"	گاندھی جی کا ہندوستان / کثرت میں وحدت	مرتبہ نیشنل بک ٹرسٹ	۲/۲۵
"	لفظ و معنی	شمس الرحمان فاروقی	۶/۰
"	تذکرہ (مولانا آزاد)	مرتبہ مالک رام	۱۵/۰
"	عکس و شخص	عنوان چشتی	۵/۰
"	ہفت تماشا	مرزا محمد حسن قتیل	۴/۰
"	تعارف اساتذۂ اردو	مرتبہ امیر حسن نورانی	۳/۰
"	مغرب کی بیداری کا اسلامی پس منظر	محمد سفیان علوی	۲/۵۰
شعری	خواب تماشا	کمار پاشی	۴/۰
"	گلشن گلشن	پریم پال اشک	۲/۲۵
طنزیہ	مفلسی میں آٹا گیلا	عبدالمجیب سہالوی	۳/۰
سوانح	کبیر	ڈاکٹر پارس ناتھ تواری	۲/۵۰
"	پنڈت وشنو دگمبر	وی آر اٹھاولے	۲/۲۵
تعلیم	ابتدائی اسکول میں تعلیم کے طریقے	روبی ایچ وارنر	۱/۵۰
رسالہ صبح (دہلی)	جواہر لعل نہرو نمبر	مرتبہ عبداللطیف اعظمی	۴/۷۵
ناول	کھلونے	مسعود مفتی	۳/۰
"	طوفانِ حوادث	پروین سرور	۳/۰
"	چنگاری	رئیس احمد جعفری	۴/۰
"	تاریکیوں کے بعد	زلیخا حسین	۲/۰
"	گرداب	ضیا عظیم آبادی	۲/۰
"	روح کے زخم	عارف مارہروی	۲/۰
"	جلتی چٹان	گلشن نندہ	۲/۰

ناول	راکھ اور انگارے	گلشن نندہ	۲/۰
"	قاتل کون ؟	وکیل الہ آبادی	۲/۰
"	شمیم منزل	آرشاد امروہوی	۴/۰
ناولٹ	شعلہ و شبنم	نوشابہ سعید ناز	۲/۵۰
افسانے	سمندری جوان اور دوسرے افسانے	مترجم منور لکھنوی	۱/۰
"	تلاشِ سحر	عارف نقوی	۳/۰
بچوں کی	ہمارا ہندوستان	اطہر پرویز	۱/۷۵

پاکستانی مطبوعات

انگلش اردو ڈکشنری	مرتبہ فیروز اینڈ سنز لاہور	۱۵/۰
اقبالنامہ جہانگیری	مرزا محمد عرف معتمد خاں	۸/۵۰
اسلامی حقوق و فرائض	مرتبہ غلام علی اینڈ سنز	۴/۰
اقبال بر کیے	ممتاز عابدی	۳/۲۵
اردو مثنوی کا ارتقاء	عبدالقادر سروری	۴/۵۰
ادب و آگہی	مجتبیٰ حسین	۵/۷۵
اردو کی عشقیہ شاعری	فراق گورکھپوری	۳/۰
اکبر کے شب و روز	محمد رحیم دہلوی	۶/۵۰
برق و مقناطیس	پروفیسر حمید عسکری	۱۲/۵۰
تحقیق الجہاد	مولانا چراغ علی	۱۵/۰
تین شاعر	ڈاکٹر زور	۵/۰
تاریخ جمالیات	مجنوں گورکھپوری	۲/۵۰
تحقیق کائنات	ابن حنیف	۷/۵۰
جامع تعلیمی نفسیات	جارج جی ٹامس	۱۰/۰

ملنے کا پتہ:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

پرنسس بلڈنگ ۔ نزد جے جے ہسپتال

بمبئی نمبر ۳ (بی - آر - ۳)

REGD. No. D 58 DECEMBER 1968

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI 25

پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے جمال پریس دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا۔

ماہنامہ
جون سنہ ۶۹ء
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

فہرست اور کتابیں ملنے کے پتے:-

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
شمشاد مارکیٹ
علی گڑھ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار
دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ
بمبئی ۳

ڈاکٹر ذاکر حسین

وفات	پیدائش
۳ مئی ۱۹۶۹ء	۸ فروری ۱۸۹۷ء

منیجنگ ایڈیٹر
غلام ربانی تاباں
ایڈیٹر
ریحان احمد عباسی

ماہنامہ **کتاب نما** نئی دہلی
لائبریریوں اور بک کلب کے ممبروں کے
لیے سالانہ چندہ ایک روپیہ

جون ۱۹۶۹ء
جلد ۱۰
شمارہ ۶
سالانہ چندہ ۲ روپے فی پرچہ
۲۰ پیسے

اشاریہ

ذاکر صاحب کے انتقال کی اچانک خبر سے سارا دیس سناٹے میں آگیا۔ اور جب دھیرے دھیرے اس منحوس خبر نے یقین کی شکل اختیار کی تو پورے ملک پر غم کے بادل چھا گئے۔

دلّی میں تو راشٹر پتی بھون کے دربار ہال میں خلقت امنڈ پڑی۔ جہاں ذاکر صاحب کا جنازہ رکھا تھا تین دن تک لوگوں کا تانتا لگا رہا۔ تین دن تک دربار ہال کلمۂ توحید اور قرآن خوانی کی آواز سے گونجتا رہا۔ کہتے ہیں اس تمام عرصے میں پچاس قرآن پڑھے گئے۔

پھر ۵ مئی کو جنازے کے جلوس میں ۹ میل تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ غرض دلّی والوں نے ذاکر صاحب کا اس طرح سوگ منایا۔

پھر باہر کے لوگوں نے تعزیت کے خط بھیجے، تار بھیجے، سارے دیس میں جگہ جگہ تعزیتی جلسے کیے گئے۔ اخباروں نے، انگریزی کے اور ہندوستان کی تمام زبانوں کے اخباروں نے ایڈیٹوریل لکھے اور اُن میں ذاکر صاحب کی خوبیوں کو اجاگر کیا۔ اُردو اخباروں نے بھی اور اُن اخباروں نے جو اُن سے تعصب رکھتے تھے، ایسے موقع پر اُن کی تعریف کی اور کوئی ایسی بات لکھنے سے پرہیز کیا جو اُن کے ماننے والوں کے لیے، اُن کے عزیزوں کے لیے ناگوار ہو۔ اسلامی آداب کا تقاضا بھی یہی ہے۔

مگر اس سلسلے میں ندوہ لکھنؤ کے "تعمیر حیات" اور دہلی کے ہفت روزہ "الجمعیۃ" نے تعزیت کا بالکل نیا ڈھنگ اختیار کیا ہے۔ خصوصاً "ہفت روزہ الجمعیۃ" کے ایڈیٹر صاحب نے تو حسب معمول بہت مجتہدانہ انداز میں ذاکر صاحب کی زندگی پر تبصرہ فرمایا ہے۔

محترم ایڈیٹر صاحب گستاخی معاف فرمائیں تو اُن کی یہ غلط فہمی دور کردی جائے کہ ذاکر صاحب نے عملی سیاست سے کبھی دلچسپی نہیں لی۔ نہ جانے یہ اطلاع آں محترم کو کہاں سے ملی۔

ذاکر صاحب علی گڑھ کالج سے نکل کر جامعہ کے تعلیمی اور تعمیری کاموں میں لگ گئے اور بڑے خلوص و تن دہی سے اُس زمانے کے ارباب بست و کشاد کا ہاتھ بٹانے لگے اور کچھ دنوں کے بعد مزید تعلیم کے سلسلے میں جرمنی تشریف لے گئے۔

ان کی عدم موجودگی میں دھیرے دھیرے جامعہ کے حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ تا آنکہ اس وقت کے رہنماؤں کی طرف سے اسے بند کرنے کی تجویزیں ہونے لگیں۔

یہ خبر جس وقت ذاکر صاحب کو برلن میں ملی تو مرحوم نے اُن بزرگوں سے درخواست کی کہ اُن کے آنے تک یہ تجویز ملتوی رکھی جائے۔

اور ۱۹۲۶ء میں ذاکر صاحب اپنے دو اور ساتھیوں کے ساتھ واپس تشریف لائے اور جامعہ کے شیخ الجامعہ بنا دیے گئے۔ اس وقت جامعہ کس حال میں تھی، اُس پر کیا بیت رہی تھی، اُس کا کام کیسا چل رہا تھا، یہ سب ڈھکی چھپی باتیں نہیں ہیں۔ محترم ایڈیٹر صاحب زحمت فرمائیں تو بہت کچھ مواد مل سکتا ہے۔

ذاکر صاحب نے جامعہ میں آتے ہی سب سے زیادہ بچوں کی تعلیم یا ابتدائی تعلیم کے طریقوں میں اصلاح کی طرف توجہ کی۔ پرائمری یا ابتدائی مدرسوں میں بچے بہت کچھ بے توجہی اور بے رخی کا شکار تھا ماس ایجوکیشن یا جبری ابتدائی تعلیم نے اس خرابی کو اور بڑھا دیا ہے۔ ہمارے خیال میں ماہرین تعلیم میں ذاکر صاحب پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے بچوں کو غیر معمولی اہمیت دی۔ پڑھائی کے ایسے طریقے اختیار کیے جس سے بچے میں پڑھنے کا شوق پیدا ہو۔ انھیں مدرسے کے انتظام میں دخیل کیا۔ ایسے ایسے کام کرائے جن سے اُن میں خود اعتمادی پیدا ہو، اُن کی شخصیت کی صحیح نشو و نما ہو۔

انھوں نے اِسی پر بس نہیں کیا۔ ساتھ ہی ساتھ اِس بات کا خیال رکھا کہ بچے میں مذہبی اور اچھی اخلاقی قدریں رچ بس جائیں۔

ذاکر صاحب کیا چاہتے تھے یہ خود انھی کی زبانی سُن لیجیے

"........ اگر عمر کے اِن تھوڑے دنوں میں جو شاید ابھی حصے میں ہوں، اس چھوٹے سے ادارے کو اس تعلیمی بستی کی حیثیت دینے کا ارادہ بار بار دل میں آئے جہاں لوگ سچی اسلامی زندگی دیکھ سکیں، جہاں اُن کے بے شمار تعلیمی اور تمدنی مسئلوں پر فکر و عمل کی روشنی پڑ سکے، جس کے تجربے قوم کے ذہنی سوالوں کا جواب دے سکیں، جہاں شخصیت کی نشو و نما کا سامان ہو، جہاں مل جل کر کام کرنا معمول ہو، جہاں قوم کی نئی نسل درس اور زندگی کی ہم آہنگ فضا میں پرورش پائے اور رحمۃ اللعالمین کے چمن کے نونہال بار آور اور سایہ دار درخت بنیں۔ یوں پھلیں پھولیں کہ اُن کے فیض سے سارا ماحول مستفید ہو اور ہر جگہ حکمت کو لیں کہ اُن کا کھویا مال ہے۔"

ذاکر صاحب بیس بائیس سال تک ایسی بستی کو بسانے کے کام میں لگے رہے۔ پورے صبر و سکون سے لگے رہے۔ جامعہ ملیہ کی یہ بستی دھیرے دھیرے، بہت دھیرے دھیرے آگے بڑھتی رہی۔ اتنے میں ۴۷ء کا حادثہ پیش آگیا۔ سارا کیا کرایا مٹی میں مل گیا۔ کیسا دردناک حادثہ تھا! ذرا اُس معمار کے دل سے پوچھیے جس نے اس کے بنانے میں زندگی کے بہترین سال گزار دیے ہوں۔

ذاکر صاحب اِس صدمے سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ بزرگوں کے حکم سے علی گڑھ جانا پڑا۔

یونیورسٹی پر مخالفین کی نظریں تھیں اور ذاکر صاحب کی تنہا شخصیت تھی جو اُسے بچا سکتی تھی بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی کو صحیح سلامت کنارے پر لا سکتی تھی۔

یہ بات ذہن میں رکھیے کہ جامعہ کی پریشان کن زندگی میں انھیں دو شدید امراض لاحق ہو گئے تھے: ذیابیطس اور آنکھ کی تکلیف (گلوکوما)۔ ان دونوں بیماریوں نے اُن کی جان آدھی کر دی تھی۔ پھر بھی وہ کام کر رہے تھے۔ اور اسی بیماری کی حالت میں اپنے بزرگوں کے حکم پر وہ علی گڑھ تشریف لے گئے۔

اور پھر انھوں نے اپنی دانش مندی، تدبر اور حکمتِ عملی سے اپنی مادرِ علمی کو دشمنوں کے نرغے سے بچا لیا۔ اس کے وقار کو، اس کی علمی ساکھ کو پہلے سے بھی زیادہ بڑھا دیا۔ جاننے والے اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔

لیکن اُن کی صحت برابر گر رہی تھی۔ آخر علی گڑھ ہی میں دل کا سخت دورہ پڑا اور کچھ دنوں بعد وہ علی گڑھ کے کام سے سبک دوش ہو کر جامعہ چلے آئے۔

جامعہ میں ابھی پورے طور پر آرام کا موقع نہ ملا تھا کہ یونسکو کی کانفرنس میں ہندوستان کی طرف سے نمائندے بنائے گئے۔ یونسکو نے انھیں اپنی ایگزیکیوٹو یا انتظامیہ کا ممبر بنا لیا اور اس تعلق سے انھیں یورپ جانا پڑا۔

ابھی یورپ میں تھے کہ پنڈت جواہر لال کا تار ملا کہ آپ کو بہار کا گورنر بنا دیا گیا ہے۔ ذاکر صاحب انکار نہ کر سکے۔ گورنری کے بعد نائب صدر اور پھر صدر بنائے گئے۔ اس تمام عرصے میں اُن کی صحت کی حالت برابر ڈانوا ڈول رہی۔

جامعہ کے قائم کرنے میں دوسروں کے مقابلے میں خود علی گڑھ کے اُس زمانے کے سمجھدار اور ترقی پسند بزرگوں کا ہاتھ زیادہ تھا۔ مولانا محمد علی، عبدالمجید خواجہ، مولانا شوکت علی، تصدق احمد خاں شیروانی، ذاکر صاحب وغیرہ سب علی گڑھ کے فیض یافتہ تھے۔ یہ سب اونچے خیال کے لوگ تھے۔ مقابلے والی طفلانہ بات ان کے ذہن میں آ ہی نہ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ دونوں کے راستے الگ الگ تھے۔ اس لیے علی گڑھ نے کچھ شاندار کارنامے انجام دیے ہیں تو یہ سب کے لیے فخر کی بات ہے۔

جامعہ تو بس اچھے شہری پیدا کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اس سلسلے میں کہاں تک کامیابی حاصل کی تفصیل طلب بات ہے۔ ان سطور میں اس کی کہاں گنجائش!

پر یہاں اس بات کی طرف اشارہ کر دینا شاید بے محل نہ ہو کہ جامعہ سے فیض پائے ہوئے چند اچھے شہری تھے جنھوں نے کراچی میں ایک گمنام جگہ جامعہ کے نمونے پر ایک چھوٹی سی بستی بسائی اور ان کے خلوص، نیک نیتی اور رات دن کی محنت میں خدا نے برکت دی اور وہ ننھا سا پودا آہستہ آہستہ قدآور درخت بن رہا ہے۔

جلالت مآب ایڈیٹر صاحب (ہفتہ وار الجمعیۃ) نے چلتے چلاتے ذاکر صاحب کے دماغ کے ایک "خانۂ خالی" کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے۔ بڑی بلند آہنگی بڑی مجتہدانہ شان سے

ذاکر صاحب پر ان چند سالوں میں اُردو اور انگریزی میں بہت سی کتابیں شایع ہو چکی ہیں مختلف رسالوں میں مضمون چھپ چکے ہیں، پیام تعلیم کا ذاکر نمبر شایع ہو چکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ محترم ایڈیٹر صاحب نے ایک نظر اِس مواد کو دیکھنے کی زحمت نہیں فرمائی اور حسب معمول مدعیانہ انداز میں جو کچھ جی میں آیا قلم برداشتہ تحریر فرما دیا۔ محترم ایڈیٹر صاحب عامۃ المسلمین کے لیے ایک پیغام لے کر آگے بڑھے ہیں کیا اچھا ہو کہ آئندہ احتیاط سے کام لیں تاکہ اُن کے فرمودات کی وقعت باقی رہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے کلاسیکی ادب کا سرمایہ عام قاری کی دسترس سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ پرانی کتابیں یا تو نایاب ہو گئی ہیں یا پھر غیر ذمہ دار ہاتھوں نے انھیں اِس قدر مسخ کر دیا ہے کہ اُن کی صحت مشکوک ہو گئی ہے اور افادیت معدوم۔

مکتبہ جامعہ نے اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ایسی کتابوں کی اشاعت کی ایک اسکیم مرتب کی ہے جس کے تحت ایسی کتابیں ایکبار پھر منظر عام پر لائی جا سکیں۔ خوشی کی بات ہے کہ حکومتِ جموں و کشمیر نے اِس اسکیم کو پسند کر کے اپنے تعاون سے نوازا۔ چنانچہ دونوں کے اشتراک سے یہ کام شروع کر دیا گیا ہے۔ سر دست تین کتابیں شایع کی جا رہی ہیں۔

یہ کتابیں ہیں علامہ شبلی کا "موازنہ انیس و دبیر" مولانا حالی کا "مقدمہ شعر و شاعری" اور نظیر اکبرآبادی کی نظموں کا انتخاب۔ انشاءاللہ ۳۰ ستمبر تک یہ کتابیں شایع ہو جائیں گی۔

اس کے بعد شایع ہونے والی کتابوں میں گذشتہ لکھنؤ، آرائش محفل، تلخیص فسانۂ آزاد، شریف زادہ، دیوانِ درد، انتخابِ آتش، انتخاب سراج وغیرہ پر کام شروع ہو گیا ہے۔ امید ہے پروگرام کے مطابق یہ کتابیں ۱۹۷۰ء میں شایع ہو جائیں گی۔

یہ کتابیں زیادہ سے زیادہ صحتِ متن کے ساتھ شایع کی جائیں گی تاکہ عوام، طلبا اور تحقیقی کام کرنے والے پورے اعتماد کے ساتھ اِن سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ہمیں یہ اعلان کرتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ حکومت جموں و کشمیر کے تعاون کے باعث ان کتابوں کی قیمتیں بھی عام بازاری شرح کے مقابلے میں کم رکھی جائیں گی تاکہ عوام زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں۔

نئی مطبوعات

لفظوں کا پُل   شعری مجموعہ   ندا فاضل   ۳/۵۰

مزدور سے منسٹر (سوانح)   عابد علی   ۱۲/-

بمبئی میں ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ، بمبئی ۳

محمد حفیظ الدین

ایک انسان کی موت

زندگی میں کبھی کبھی ایسی باتیں بھی پیش آجاتی ہیں جنھیں دل ماننے کو تیار نہیں ہوتا، لیکن جو حقیقت اور واقعہ آنکھوں کے سامنے ہو۔ کانوں نے سنا ہو، آرزوئیں اُسے کسی طرح جھٹلا نہیں سکتیں۔ رسولؐ کے فدائیوں میں سے فاروق اعظمؓ نے تلوار کھینچ لی "جو کوئی یہ کہے گا کہ رسول اللہؐ وفات پا گئے اُس کی گردن اُڑا دوں گا۔" جسم اطہرؐ حجرۂ مبارک میں موجود ہے لیکن کہنے والا پوری قوت و جوش سے یہ بات کہہ رہا ہے آخر عشق و محبت کے اِس جوش اور آرزو کو صدیق اکبرؓ کے دو حقیقت پسندانہ بول سے ہار ماننی پڑی اور جانشین رسول کے انتخاب میں وہی تلوار والا ہاتھ تائید اور بیعت کے لیے سب سے پہلے بڑھا۔ آرزوئیں حقیقت کو بدل نہیں سکتیں۔

سنیچر کا دن، مئی کی تین تاریخ تھی۔ کوئی ساڑھے گیارہ بجے کا وقت ہوگا کتنے سے دو صاحب (دلی صاحب اور حسین حسان صاحب) خلاف معمول آئے۔ غم و الم کی دو تصویریں ہمارے سامنے تھیں مشکل سے کہہ پائے "بڑی بُری خبر ہے" سب کے کان کھڑے ہوگئے، پھر انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے خبر سُنادی "ذاکر صاحب اب اِس دُنیا میں نہیں رہے" بیہوشی کی خبر اُن کی چہیتی بیٹی سعیدہ بی بی کو پہنچی، اضطراب میں چلنے کے لیے اٹھی تھیں کہ ٹیلیفون نے دوسری خبر بھی سُنادی۔ چند ہی منٹوں میں بیماری، آزاری، علاج معالجہ، اور آخری سفر کے تمام مراحل طے ہوگئے کتنی سُبک روح تھی یہ۔

راشٹرپتی بھون کی ایک ایک اینٹ سے آہ و بُکا کی صدائیں آنے لگیں۔ سب گھبرا گئے، کسی کے حواس بجا نہ تھے آخر دو گھنٹوں کے سوچ بچار کے بعد حکومت کے ضابطوں کے تقاضے پورے ہوئے اور اِس المناک حقیقت کو تسلیم کرکے اعلان کیا گیا۔ پرچم سرنگوں ہوگئے، ریڈیو میں غم کی دُھنیں۔ کلام پاک کی تلاوت ساری فضا میں گونجنے لگی۔ ہر دل افسردہ، ہر چہرا اُترا ہوا، آخری دیدار کیلئے غمگساروں کی خاموش اور آبدیدہ قطاریں چلی جا رہی تھیں۔ پورا

ایوانِ صدارت غم کے بادلوں میں ڈوب گیا۔ وہ شاندار محل آج ایک ماتم کدہ نظر آتا تھا۔ اُس کی بلند و بالا عمارت پر اُداسی ہی اُداسی چھائی ہوئی تھی۔

اے ذوق ہے مکان کی زینت مکین سے
مجنوں چلا گیا ہے تو صحرا اُداس ہے

احباب کہتے ہیں کچھ لکھو! سوچتا ہوں کیا لکھوں اور کس طرح لکھوں؟۔ ذاکر صاحب، صفائی ستھرائی، پاکیزگی، لطافت، نیکی، اخلاق، مروت، شرافت اور انسانیت کے پیکر تھے وہ انسانی قدروں کے ایک انسانی نمونہ تھے قدرت نے اُن کو ایک خوب صورت جسم اور حسین چہرہ عطا کیا تھا اور بہت سے مادّی خوبیوں سے آراستہ کیا تھا، مگر انھوں نے بڑی مشقت اور ریاضت سے اپنے باطن کو سنوار کر اُس سے بھی زیادہ حسین بنا لیا تھا۔ اُن کی مشقت اور ریاضت ایسی سخت اور کڑی تھی جو صرف خدا کے خاص بندوں کا وطیرہ ہے جسے بنائے رکھنے کے لیے انسان کو ہر دم، ہر آن، ہر گھڑی آخری سانس تک چوکنا رہنا پڑتا ہے ذرا چوک ہوئی نہیں کہ اس میں زوال آگیا۔ اُن میں انسانی خوبیاں اتنی اونچی اور بلند درجے کی بسی رچی ہوئی تھیں کہ اُن کی نزاکتوں کو کوئی قلم لکھ سکتا ہے نہ کوئی زبان بیان کر سکتی ہے نہ کوئی تصویر ظاہر کر سکتی ہے۔

دراصل بڑے انسان اپنی زندگی کی کہانی اپنے اچھے کردار اور دل پذیر اعمال و افعال سے خود ہی بیان کرتے ہیں اُن کی زندگی کی بلندیوں اور نزاکتوں کا پورا پورا احاطہ کوئی کر نہیں سکتا۔ اگر ایک مصور سے کوئی سادہ لوح کہے کہ کسی لطیف روح کی تصویر کھینچ دو تو یہ کیوں کر ممکن ہے۔ روحانی اور اخلاقی نزاکتوں کا بتانا تو خیر بہت مشکل ہے، جسمانی کیفیت کا بھی پورے طور پر عکس لینا دشوار ہے۔

ذاکر صاحب کی ہزارہا تصویریں ہیں مسکراتی ہوئی بھی، سنجیدہ اور غم زدہ حالت کی بھی، ایسی بے ساختہ بھی کہ معلوم دیتا ہے ابھی بول پڑیں گے۔ مگر ان تصویروں میں اُن کی جاں نواز مسکراہٹ کی ادنیٰ جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی۔ جب وہ لوگوں سے مسکراتے ہوئے ملتے تھے تو ہزاروں مرجھائے ہوئے چہرے بشاشت سے پھول کی طرح کھل جاتے تھے۔ سیکڑوں مایوس دلوں میں اُمید کی کرن اور زندگی کی لہر محسوس ہونے لگتی تھی، کتنے ٹوٹے ہوئے دل جڑ جاتے، کتنے ناتوانوں کو توانائی حاصل ہوتی تھی، کتنے غصے سے تمتماتے ہوئے چہرے اُن کے سامنے پہنچ کر ایسے ہو جاتے تھے کہ کبھی غصے نے اُن کو چھوا تک نہیں گویا اُن کے سینے میں دل کی جگہ برف کی سل ہے جو گرمی اور

غصے کی صلاحیتوں سے ناآشنا ہے۔ وہ آنکھوں آنکھوں میں ایسے بلیغ اشارے کردیتے تھے کہ اُن پر ہزاروں تقریریں قربان، وہ جانِ فصاحت تھے اُن کے بول شربت کے گھونٹ اُن کی خاموشی جادو کا عمل تھی، جب بولتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے لفظ جیسے آبِ کوثر میں دُھلے ہوئے صاف شفاف ڈھلکتے چلے آرہے ہیں دلوں میں اُتر کر امانت کی طرح محفوظ ہوتے جاتے ہیں۔ کیا ان کیفیتوں کو مصور کا کوئی کیمرہ یا موقلم اپنی تصویر میں دکھا سکتا ہے۔ جب مادی چیزوں میں ہماری یہ بے بسی ہے تو اُن روحانی بلندیوں کو کیونکر اور کس زبان میں بیان کیا جاسکتا ہے، مرنے والے کا خمیر نیکی، مذہب اور انسانیت کے پاک عناصر سے گوندھا گیا تھا اس لیے اُس کی ہر ادا انسانیت نواز تھی، ہر لمحہ عبادت اور ہر فعل نیکی و شرافت کا سرچشمہ تھا بس یہ چیزیں دیکھنے، سُننے، سمجھنے اور محسوس کرنے سے تعلق رکھتی تھیں، اُن کی ہر ادا اثر رکھتی تھی ہر آواز کی طرف دل کھنچتا تھا۔ عقیدت مند اُن کی باتیں بڑی دلچسپی سے سنتے تھے مگر اُن پر عمل کم ہوتا تھا شاید اسی لیے ہم سے وہ روٹھ گئے اور ہم سے انھوں نے مُنہ موڑ لیا مگر اُن کا مرقد زبانِ حال سے اب بھی یہ کہہ رہا ہے:

زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا
ہمیں سوگئے داستاں کہتے کہتے

مگر یہ اُن کی عادت تو نہ تھی کہ کوئی کام ہاتھ میں لیں اور اُسے ادھورا چھوڑ دیں پھر یہ داستان ادھوری کیسے چھوڑ گئے۔ شاید وہ چاہتے تھے کہ تشنۂ عمل اسکیمیں، نامکمل منصوبے اور تعمیری آرزوئیں نئی نسل کے ذریعے انجام کو پہنچیں اُن کے حوصلوں کے لیے میدانِ عمل تنگ نہ ہو۔

بہرحال جانے والا چلا گیا ایک شاندار ماضی اور راہِ منزل کے واضح نشانات اپنے پیچھے چھوڑ گیا، چلنے والے اُس کے سہارے چلیں گے اور منزل پر پہنچ جائیں گے۔

ہمارا پیارا مسافر بڑے ناہموار راستوں اور کٹھن منزلوں سے گزر کر آیا ہے زندگی کی بے شمار راتیں جاگ جاگ کر کاٹی ہیں تھک کر چور ہوگیا ہے۔ آنکھوں کا نور دل کا سرور سب کچھ قوم و ملک و مذہب کی نذر کر چکا ہے اب ذرا اُسے سو لینے دو۔ ابدی نیند۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

جس نے جامعہ کی سرزمین پر ہزاروں رنگ برنگے پھول کھلائے تھے وہ گلِ صد رنگ و سرسبد اب خود اس چمن میں آسودہ ہے۔ اے خاکِ جامعہ! تو نے ہمیشہ اُس کے مبارک قدم اپنی پیشانی پر لیے ہیں۔ اُس کے نقشِ پا سے تیری زمین کا چپہ چپہ منور ہے آج وہ تیری گود میں لیٹا ہوا ہے۔

خبردار! اُس کے مزاج کی نزاکتوں کا لحاظ رہے اُس کے دامن کی پاکیزگی کا خیال رہے ہم نے اپنی سب سے قیمتی پونجی تجھے سونپی ہے اس سے بڑھ کر دولت قیامت تک تجھے نصیب نہ ہوگی۔

اے خاک تیرہ خاطرِ مہماں نگاہ دار
کین نورِ چشمِ ماست کہ در بر گرفتہ ای

الٰہی: تیرے بندوں سے پیار کرنے والے اور تیرے حبیب کے فدائی کی یہ تربت ہے اس پر تیری رحمت کا سائبان چاہیے، اس پر تیرے فرشتے سدا تیری بخششوں اور نوازشوں کے پھول نچھاور کریں۔ اس مردِ مومن کی گور کو اپنے جود و کرم اور نور سے معمور کر دے۔ اور سونے والے کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کر۔ آمین

نئی مطبوعات

فاصلے (شعری مجموعہ)	مدہوش بلگرامی	ایجنسی: بمبئی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	۲/۵۰
بندہ خدا (ناول)	نجم آفندی	" " " "	۱/۵۰
قہقہہ زار (لطائف)	خواجہ عبدالغفور	" " " "	۴/-
نشانِ منزل (شعری مجموعہ)	احسن رضوی داناپوری	" " " "	۳/-
بوئے گل نامہ دل (" ")	حسرت سہروردی	ناشر: ترچناپلی، شیریں حسرت	۲/۵۰
سفر مدام سفر	بلراج کومل	الہ آباد، شب خون	۴/-
شب گشت	عمیق حنفی	" "	۵/-
اردو کے اہم ادبی رسالے اور اخبار	عابد رضا بیدار	رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز	۱۰/-
قومی تہذیب اور ہندوستانی مسلمان	" "	" "	۲/-

خواجہ غلام السیّدین

مردِ مومن

(خواجہ غلام السیدین صاحب، ذاکر صاحب کے بہت قریبی دوستوں میں سے ہیں، اُن کی شخصیت سے بہت متاثر ہیں اور ان سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں۔ وہ علی گڑھ میں ذاکر صاحب کے ہم سبق تو نہیں، مگر ہم عصر ضرور تھے۔ آگے چل کر قومی تعلیم کے بہت سے اہم کاموں میں، خصوصاً بنیادی تعلیم کا اساسی نصاب مرتّب کرنے میں دونوں کا ساتھ رہا۔ اس مبسوط اور جامع مضمون میں خواجہ صاحب نے ذاکر صاحب کے تعلیمی فکر و عمل پر نظر ڈالی ہے۔

خواجہ صاحب کا یہ مضمون جس کا کچھ اقتباس یہاں شائع کیا جا رہا ہے، عبداللطیف اعظمی صاحب کی کتاب "ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت" (مطبوعہ) میں شائع ہو چکا ہے)

جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ
تقلید سے آوارہ نہ کر اپنی خودی کو کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ

دنیا میں دو طرح کے لوگ ہیں، ایک وہ (ان کی تعداد بے شمار ہے) جو ہوا کے رُخ کو دیکھ کر چلتے ہیں اور پانی کے بہاؤ کو دیکھ کر تیرتے ہیں اور دوسرے وہ (اور یہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں، لیکن زندگی میں انھیں کے وجود سے نمکینی ہے) جو اپنی عقل اور ضمیر کی روشنی میں اپنا راستہ متعین کرتے ہیں اور باوجود مخالفت اور مشکلات کے اس راہ میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ دنیاوی کامیابی اور عیش و آرام اکثر پہلوں کے حصے میں آتے ہیں، لیکن حقیقی نیک نامی اور خدمت کی سعادت دوسروں کی قدم چومتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جو اپنے زمانے کو نئی قدروں سے آشنا کرتے ہیں۔ اور انھیں کے طفیل زندگی کی نبض زیادہ تیز، اس کے امکانات زیادہ وسیع اور اس کی معنویت زیادہ گہری ہو جاتی ہے۔ ذاکر صاحب کا شمار ایسے ہی خلاق لوگوں میں ہے۔

قدرت انسانوں کے معاملے میں کبھی اپنی جزرسی کا اظہار کرتی ہے، کبھی فیاضی کا۔ بیشتر انسان تو دل و دماغ کے اعتبار سے اس قدر گھٹیا ہوتے ہیں کہ ان کے وجود کی مصلحت کو سمجھنا ہی مشکل ہے

لیکن کبھی کبھی قدرت بعض انسانوں کو ایسی فیاضی کے ساتھ نوازتی ہے اور اپنے خزانے اُن پر اس قدر بے دریغ نچھاور کرتی ہے کہ عقل حیرت میں رہ جاتی ہے اور ایمان کی لو زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ "اچھے انسان" کی جھلک ایسے لوگوں کی ذات ہی میں دکھائی دیتی ہے اور اس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت کے سامنے "انسان" کا کس قدر بلند تصور ہے۔ جس شاعر نے نیازمندانہ گستاخی سے دستِ قدرت کو طعنہ دیا تھا کہ مٹی کے کھلونے بنانا تیرے شایانِ شان نہیں (لعبت خاک ساختن می نہ سزد خدائے را)، اس نے بے صبری اور مصلحت ناشناسی کو یہ کہہ کر تسکین بھی دی تھی کہ

مشو نومید زیں مشتِ غبارے پریشاں جلوۂ ناپائدارے
چو فطرت می تراشد پیکرے را تمامش می کند در روزگارے

جس طرح ہلال کی تنگ نائے میں بدرِ کامل کا جمال جہاں آرا پوشیدہ ہے، اسی طرح اس کم مایہ انسان میں وہ حیرت ناک امکانات موجود ہیں، جن کا جلوہ ہمیں کبھی کبھی بعض خاصانِ خدا کی ذات میں نظر آجاتا ہے، ان کو دیکھ کر ہمیں اس مہ افلاک سے بلند تر منزل کا سراغ ملتا ہے، جس کی طرف بڑھنے کی کوشش انسان ٹمٹماتی آنکھوں اور لڑکھڑاتے قدموں سے کرتا رہتا ہے لیکن یہ راستہ اس قدر صبر آزما اور دشوار گزار ہے کہ ہزاروں مسافر ہر ہر قدم پر تھک کر رہ جاتے ہیں۔ صرف وہ تھوڑے سے لوگ اس منزل کے قریب پہنچ پاتے ہیں، جن کو تائیدِ الٰہی حاصل ہے۔

ذاکر صاحب کا شمار انھیں گنے چنے لوگوں میں ہے، ان پر قدرت نے صورت اور سیرت، دل اور دماغ، شرافت اور دیانت، دوستی اور قیادت کی غیر معمولی صفات ارزاں فرمائی ہیں۔ لیکن وہ اس کو اس استغنا اور خود اعتمادی اور سادگی کے ساتھ برتتے ہیں کہ سرسری نگاہ سے دیکھنے والوں کو ان کا اندازہ نہیں ہوتا اور گہری نگاہ سے دیکھنے والوں کو ان کی بلندی اور عظمت گراں نہیں گزرتی یہ چیز بجائے خود انسانی شرف کے لیے ایک بڑی سخت کسوٹی ہے۔ ذاکر صاحب ان لوگوں میں نہیں جو اپنی بزرگی کی دوکان لگا کر بیٹھتے ہیں اور خریداروں کو باصرار وہاں آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کو شاید خود بھی اپنی قدر و قیمت کا پورا احساس نہیں یا اگر ہے تو ایسا ہی جیسا گلاب کے پھول یا شبِ ماہتاب کو ہوتا ہے، یعنی ان کے لیے خوشبو دینا اور روشنی پھیلانا عین فطرت ہے، اس کے لیے کسی تعریف یا معاوضہ کا مطالبہ ان کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا!

میرا خیال ہے اور غالباً ذاکر صاحب کے بہت سے دوست اور جاننے والے اس سے اتفاق کریں گے کہ وہ جس شعبۂ زندگی کو اپنے لیے اختیار کرتے اس میں اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت

شہرت، مقبولیت اور کمال حاصل کر سکتے تھے۔ ایک اتفاق تھا کہ وہ ڈاکٹر ہوتے ہوتے رہ گئے۔ طب کی تعلیم شروع کر کے چھوڑنی پڑی۔ ورنہ عجب نہ تھا کہ وہ ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کا زخم مندمل کر دیتے۔ فطرت کی ستم ظریفی نے ان کو ہندوستان کے غلام آباد میں پیدا کیا۔ اگر وہ کسی آزاد اور قدر شناس ملک میں پیدا ہوتے تو اس کی سیاسی زندگی میں ان کے لیے مقام اعزاز مخصوص ہوتا اور ملک کی سیاست اور اخلاق کا ٹوٹا ہوا ناتہ جوڑنے کا فرض انجام دیتے۔ اگر وہ وکالت کا دولت آفریں پیشہ اختیار کرتے تو ان کی تقریر کی قابلیت، ان کی نکتہ رسی، ان کی حاضر جوابی جھوٹ سے گزر کر بنیادی امور کی گرفت ان کو صفِ اوّل میں جگہ دلاتی۔ ان میں سمجھ داری ہے، خلوص ہے، ذاتی کشش ہے اور یہ تینوں صفات مل کر انسان کو ایسی قوت بخشتی ہیں کہ وہ جس کام کو ہاتھ میں لے اسے ایک امتیازی شان کے ساتھ انجام دے سکتا ہے۔ سمجھ داری راستہ دکھاتی ہے، خلوص کا انعام تائیدِ الٰہی ہے اور ذاتی کشش کی وجہ سے دوستوں اور ساتھ کام کرنے والوں کی رفاقت وفاداری اور اعتبار کی دولت میسر آتی ہے اور کام کرنے میں سہولت ہوتی ہے... تعلیم کی خوش قسمتی ہے کہ انھوں نے اپنی ذات کے لیے اس کو اختیار کیا۔

لیکن کسی غیر معمولی قابلیت کے شخص کے لیے اس میدان کو پسند کرنا بجائے خود ایک خلافِ توقع سی بات ہے، کیوں کہ اس میں بڑے صبر اور ایثار کی ضرورت ہے، انسان دوستی اور جذبۂ خدمت کی ضرورت ہے اور نفس کو مار کر محنت کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ صفات بالعموم ایسے لوگوں میں نہیں پائی جاتیں، وہ اپنی ذہنی قابلیت کی بہت اونچی قیمت لگاتے ہیں اور اسے بہت جلد دولت، قوت، رسوخ، شہرت اور لیڈری کے سکّوں میں وصول کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے لیے عام طور پر سیاست یا وکالت یا ملازمت کا میدان پسند کرتے ہیں، جہاں یہ تمام چیزیں آسانی سے ہاتھ آ سکتی ہیں یا کم سے کم ایک دل کش سراب کی طرح دسترس کے اندر معلوم ہوتی ہیں۔ اس لیے بیشتر لوگ ان چمک دار نگینوں کی خاطر اپنا سب کچھ تج دیتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل کی گرمی اور دماغ کی روشنی جو شاید ان کے ہم جنسوں کی شبِ تاریک کو سحر کرتی محض ان کی زندگی کی تنگ کوٹھری کو گرم اور روشن رکھتی ہے لیکن ذاکر صاحب ان غیر معمولی لوگوں میں سے ہیں جن کا خیال ہے کہ قوموں کے بنانے میں معلّم کے خاموش اور جانکاہ کام کی اہمیت اربابِ سیاست کی تگ و دو اور شور و غل سے زیادہ ہے یعنی ان کی آتش بازی اور تاروں کی ٹھنڈی روشنی کا باریک فرق معلوم ہے معلّم انسانوں کے دل و دماغ میں ان بنیادی صفات کا بیج بو سکتا ہے جن پر نہ صرف پائدار سیاسی

کامیابی کا انحصار ہے بلکہ جن کے بغیر کچی انفرادی اور جماعتی شرافت کا حصول ناممکن ہے۔ اگر افراد میں یہ صفات موجود نہ ہوں تو سیاست کی ساری کشمکش اور جدوجہد ایسی ہے جیسے ریت میں ہل چلانا یا سمندر کے پانی کو بلو کر اس میں سے دودھ نکالنے کی کوشش! ذاکر صاحب کا یہ انتخاب کار بجائے خود ان کی سیرت کے ایک روشن اور مرکزی پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جب انسان کے سامنے بہت سی راہیں کھلی ہوں اور ہر ایک زندگی کی کامرانیوں کو پیش کرتی ہو اور وہ تکلیف کو راحت پر، خدمت کو حکومت پر، ایثار کو دولت پر ترجیح دے تو وہ عقل دنیا دار کی نگاہ میں عقل کا دشمن ہے ایک واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ اور انسان کی ترقی میں ایسے جنوں کا مقام عقل سے کہیں بلند ہے۔

ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے
جس نے سیے ہیں ادراک کے چاک

ذاکر صاحب کے تعلیمی خیالات اور منصوبوں اور زندگی کے اصولوں پر مفصل بحث کرنے کے لیے ایک مفصل کتاب درکار ہے، اس وقت میرا مقصد محض چند ایسی باتوں کا ذکر کرنا ہے، جن کا تعلق ان کے تعلیمی کام اور ان کی ذات دونوں سے ہے۔ کیوں کہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے اصول اور عمل، عقیدہ اور پالیسی میں ہم آہنگی ہے، جن کا دل ان کے دماغ سے مصروف پیکار نہیں رہتا اور زبان دل کی ترجمانی کرتی ہے، ان کی تمام شخصیت میں وہ توازن جاری اور ساری ہے جو یونان کے فلاسفر اور اسلام کے معلمین اخلاق کی نظر میں انسانیت کا بہترین جوہر ہے، اس لیے ذاکر صاحب کی شخصیت کو سمجھ لینے سے ان کے تعلیمی خیالات کی کنجی بھی ہمارے ہاتھ میں آجاتی ہے۔

میرے خیال میں ذاکر صاحب کی سب سے نمایاں صفت انسانی زندگی کی قدروں کی صحیح پرکھ ہے، وہ کاموں اور مقصدوں کی اضافی قدر و قیمت کا بہت صحیح اندازہ لگاتے ہیں۔ بہت سی چیزیں جو دوسرے لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہیں، ان کی نگاہ اور ان کے دل کو کبھی مرعوب نہیں کر سکتیں۔ یہ بظاہر معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل ایک کمیاب صفت ہے اور خوش نصیب ہے وہ انسان جو آزمائشوں اور تحریصوں کی یورش میں اپنے نظام اقدار کو درست رکھے اور اس کی حفاظت کر سکے۔ دراصل تعلیم کا سب سے بڑا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ انسانوں کو قدروں کی پرکھ سکھائے۔ اس لیے ایک اچھے معلم کے ذہن میں انسان اور اس کی دنیا کی صحیح تصویر ہونی چاہیے۔ تاکہ وہ اہم اور غیر اہم، اصلی اور نقلی، سچی اور جھوٹی باتوں میں تمیز کر سکے۔ اگر اس کے خیال اور عمل میں غلط اور کم عیار چیزوں کی عزت، اور محبت بسی ہوگی تو اس کے شاگرد بھی خود بخود انھیں چیزوں کا احترام

کریں گے۔ ذاکر صاحب کی عظمت بحیثیت ایک معلّم کے دراصل اس وجہ سے نہیں کہ ان کے موجودہ اور قدیم تعلیمی اصولوں اور طریقوں سے بہت اچھی واقفیت ہے یا انھوں نے ایک بہت مشہور درس گاہ کی بنیاد ڈالی ہے اور اس کو پروان چڑھایا ہے، بلکہ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان کی اپنی ذات ہماری بہترین اخلاقی اور تہذیبی قدروں کی حامل ہے اور عصر حاضر کے شیطانی ہیجان میں انھوں نے اپنے مذاقِ سلیم اور احساس صالح کو قائم رکھا ہے اور یہ چیز علم اور عمل کے کارناموں سے بھی کہیں زیادہ دقیع ہے۔

آوازۂ خلیل ز بنیادِ کعبہ نیست
مشہور گشت زاں کہ بآتش نکو نشست

ذاکر صاحب کی قدروں کا اندازہ آپ کو دو مثالوں سے ہو جائے گا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ تعلیم کے میدان میں دولت کو علم کا خادم ہونا چاہیے، علم کو دولت کا دست نگر نہیں بنانا چاہیے اگر ارباب دولت و حکومت اپنی دولت یا قوت کے بل پر تعلیم گاہ یا تعلیمی نظام پر قابض ہو جائیں۔ اور اس کی آزادی کو چھین کر اپنا آلۂ کار بنالیں تو تعلیم کی روح مردہ ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ اپنے اصل مقصد کو پورا نہیں کر سکتی۔ ہندوستان میں تعلیم پر حکومت کا، مغربی ممالک میں دولت اور حکومت دونوں کا تسلط رہا ہے اور اس کے نتائج نگاہِ عبرت نے بار بار دیکھے ہیں، لیکن ذاکر صاحب کی طرح کم لوگوں کو توفیق ہوئی، زبان سے نہیں (وہ تو آسان ہے) عمل سے اس خطرے کے خلاف آواز بلند کرنے کی۔ جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے لیے یہ کام بہت مشکل اور صبر آزما ہے، کیوں کہ اس میں مانگنے والے کو مجبوراً اپنی خود داری کو آلودہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ذاکر صاحب کا چندہ جمع کرنے کا ایک نرالا انداز ہے اور کوئلوں کی اس دلالی میں بھی انھوں نے اپنے ہاتھوں کو پاک وصاف رکھا ہے اور جامعہ کی عفت کی روح کو آلودہ نہیں ہونے دیا۔ ابتدا میں تو انھوں نے اس مقصد کے لیے اربابِ ثروت کی طرف رجوع ہی نہیں کیا، بلکہ غریبوں اور متوسط طبقے کے لوگوں کا ایک ایسا حلقہ "ہمدردان" قائم کیا جو تھوڑا تھوڑا چندہ باقاعدگی کے ساتھ دیتے تھے اور رسالہ ہمدرد جامعہ کے ذریعے درس گاہ کے حالات اور اس کی ترقی اور مشکلات سے آگاہ رہتے تھے۔ اس طرح ابتدا سے جامعہ کا تعلق عوام کے ساتھ قائم ہو گیا جو ہر قومی ادارے کی صحت کے لیے ایک شرط لازم ہے، ورنہ یہ اندیشہ ہوتا ہے (جیسا بعض اداروں میں ہوا) کہ وہ ایک مخصوص اور غیر ذمہ دار گروہ کی اجارہ داری بن کر رہ جائے گا اور زندگی کی صالح تحریکیں اس پر اثر انداز نہ ہو سکیں گی۔ وہ جامعہ کے لیے اربابِ دولت

سے امداد کے خواہاں ہوتے ہیں تو ان کے اندازِ سوال میں عاجزی نہیں ہوتی، گویا وہ کسی کا احسان اٹھا رہے ہیں۔ وہ دولت کے سامنے جھکنا جانتے ہی نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ دولت کی نجات اور سعادت اسی میں ہے کہ وہ علم کی خدمت کرے اور نیک کاموں کے قدم چومے، ورنہ وہ اہلِ دولت کے گلے میں لعنت کا طوق ہے! ایک دفعہ ایک رئیس نے امداد کا وعدہ کر کے پورا نہیں کیا۔ رقم اچھی خاصی تھی اور اس کے نہ ملنے سے ان کے رفقائے کار کو پریشانی ہوئی اور انھوں نے مشورہ دیا کہ دوبارہ جائیے اور تقاضا کیجیے۔ لیکن ذاکر صاحب کی پیشانیِ استغنا پر شکن نہ پڑی اور انھوں نے صرف اتنا کہا کہ ایک وقت آئے گا کہ یہ لوگ خود خوشامد کریں گے اور چندہ دیں گے۔ ایک صاحب نے پوچھا کہ اگر نہ دیں گے تو؟ ذاکر صاحب نے فوراً اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا، جس کی ظرافت میں بھی ہمیشہ کوئی نہ کوئی گہری حقیقت پوشیدہ ہوتی ہے، "نہ دیں گے تو خود ان کی ہوا خیزی ہوگی" یہ بات نہیں کہ ان کو روپے کی قدر یا اس کی پروا نہیں۔ جن لوگوں نے پیسہ پیسہ جوڑ کر ادارہ کو چلایا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کے کارکنوں کو روپے کی قدر کس قدر ہوتی ہے اور کس طرح اس فکر میں ان کا دن کا آرام اور رات کی نیند جاتی رہتی ہے۔ جامعہ پر بارہا ایسے کٹھن وقت آئے ہیں جب بے زری کی پریشانی ایمان کی قوت سے ٹکرائی ہے لیکن یہ مردِ مومن کبھی اس بات کے لیے تیار نہیں ہوا کہ روپے کی خاطر جامعہ کے مخصوص اور آزاد نصب العین پر آنچ آنے پائے۔ ایک دفعہ ذاکر صاحب جامعہ کی جوبلی کے سلسلے میں چندہ کرنے کے لیے رام پور گئے تھے۔ اس موقع پر انھوں نے جلسۂ عام میں جو تقریر کی اس میں (دلچسپ بات ہے نا؟) چندہ مانگنے سے زیادہ اہلِ دولت کی تعلیم مدنظر تھی اور انھیں ان کے فرائض کا احساس دلانا۔ تقریر کا بے پناہ اثر ہر کسی کے چہرے پر نظر آتا تھا۔ بلکہ کسی کسی کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر جامعہ کا کام اچھا نہیں ہے، اگر چھان بین کرنے کے بعد آپ کو اس کی طرف سے اطمینان نہیں ہے تو کسی سعی و سفارش سے آپ ایک پیسہ نہ دیجیے لیکن اگر اس کی پچیس سالہ جد وجہد کو آپ نے دیکھا ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کام ملک اور قوم کے لیے مفید ہے تو جامعہ کے کارکنوں کا فرض نہیں کہ دستِ سوال آپ کے سامنے دراز کریں۔ آپ کا اپنا کام ہے کہ آپ اس کی امداد کے لیے ہاتھ بڑھائیں۔ جو قوم اپنے ایثار پیشہ خادموں کی قدر نہیں کرتی اور ان کے کام کو آگے بڑھانے کی تدبیریں نہیں سوچتی اسے بشارت ہو کہ اس میں اس قسم کے کام کرنے والے پیدا ہی نہ ہوں گے اور اس کی زندگی محض کاروبار، دولت آفرینی یا باہمی جنگ وجدل کے دلدل میں پھنس کر رہ

جائے گی۔ عام طور پر لینے والے کا ہاتھ نیچے اور دینے والے کا ہاتھ اوپر ہوتا ہے لیکن دولت مند کی سعادت یہ ہے کہ وہ علم اور تعلیم کی امداد کرتے وقت اپنا ہاتھ نیچے رکھے اور لینے والوں کا ہاتھ اوپر رہے۔ ذاکر صاحب کے فقر میں بھی یہ انوکھی شان ہے کہ اگر خانہ کعبہ کا دروازہ نہ کھلے تو وہ اُلٹے واپس آجاتے ہیں اور اسی کا فیضان ہے کہ اربابِ دولت اور مشاہیر سیاست ان سے جھک کر ملتے ہیں۔ انھیں مرعوب نہیں کر سکتے۔ ایک موقع پر جامعہ کا اصولِ حیات خود انھوں نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"مستقل سرمایہ جامعہ کا نہ ہے نہ کبھی ہوگا، اس کا سرمایہ اس کے کارکنوں کی ہمّت اور ایثار اور قوم کی ہمدردی ہے، ممکن ہے آپ اسے کافی نہ سمجھتے ہوں مگر میرے نزدیک تو یہ سرمایہ لازوال سرمایہ ہے۔ اگر جامعہ مُلک و قوم کی کسی ضرورت کو پورا نہیں کرتی تو وہ نہیں چلے گی اور نہ وہ اس کی مستحق ہوگی، لیکن اگر وہ کوئی مفید خدمت کر رہی ہے تو قانونِ قدرت اسے زندہ رکھے گا اور دنیا کی کوئی قوت اسے فنا نہیں کر سکے گی۔"

شاید ذاکر صاحب ان الفاظ کو کہتے وقت شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآن شریف کے اس اٹل اصول کی تفسیر کر رہے تھے کہ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ۔

اسی قسم کی ایک دل میں چُبھنے والی بات انھوں نے اس یادگار موقع پر کہی تھی جب اوکھلا میں جامعہ کی شاندار عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا جا رہا تھا (ذاکر صاحب کے ندرتِ تخیل کا ایک کرشمہ یہ تھا کہ انھوں نے سنگِ بنیاد مشاہیر ہند میں سے کسی سے نہیں رکھوایا بلکہ یہ عزت جامعہ کے سب سے کم سن طالب علم کے حصّے میں آئی۔ دکھانا یہ مقصود تھا کہ ان کی نظر مستقبل کی طرف ہے۔ جس کی تعمیر اس نئی نسل کا کام ہے جو آج مدرسوں میں تعلیم پا رہی ہے) اس موقع پر انھوں نے اپنی تقریر کے دوران میں جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا (الفاظ کی صحت کی ضمانت نہیں کرتا، لیکن مفہوم یہی تھا)، بڑی بڑی شاندار عمارتوں کے بنانے میں ہمیشہ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں تعلیم کی روح ان ہی میں اسیر ہو کر نہ رہ جائے اور ساز و سامان کی فراوانی تعلیم گاہ کے نصب العین کو دبا کر فنا نہ کر دے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جامعہ کو چھوٹی چھوٹی کچی عمارتوں اور جھونپڑیوں میں شروع کیا گیا تھا اور اس کے کارکنوں کی ہمیشہ کوشش رہی کہ اس

مروسامانی کی حالت میں اس کی آزادی اور بلند نظری کو قائم رکھا جائے، اگر ان نئی عمارتوں کے
سے یہ اندیشہ ہو کہ جامعہ اپنے بلند نصب العین پر قائم نہ رہ سکے گی تو میں دعا کروں گا کہ یہ عمارتیں
رہونے سے پہلے ہی برباد ہو کر زمین میں مل جائیں"۔ جس زمانے میں افراد کی عظمت کا اندازہ
کے لباس اور نمائشی شان سے اور درسگاہوں کی حیثیت کا اندازہ ان کی عمارتوں اور ساز و
مان سے کیا جاتا ہو، اس قسم کا خیال غیر معمولی صاحبِ نظر انسان کے دماغ میں ہی پیدا ہو سکتا
ہے۔ جس درسگاہ کے کارکنوں کو اس اندیشے کا احساس ہو اور جس کا راہبر ذاکر حسین جیسا شخص
، اس کو یہ مصیبت پیش نہیں آ سکتی۔ ایک درسگاہ میں وہی روح، وہی جذبہ اور وہی نظر
م کرتی ہے جو اس کے کارکنوں کے دل اور دماغ میں جلوہ گر ہے۔ ذاکر صاحب کے حریم ذات
یں جو چراغ روشن ہے وہ صرف جامعہ ہی کو نہیں بلکہ تمام ملک اور قوم کو روشن رکھنے کی امنگ
ور صلاحیت رکھتا ہے۔

ذاکر صاحب کے دل میں عالموں اور علم کے خادموں کی بہت قدر ہے، وہ اس
بات کو گوارا نہیں کر سکتے کہ درسگاہوں میں انتظامی جماعت یا اہلِ ثروت ان کے ساتھ
تنخواہ یاب ملازموں کا سا سلوک کریں. ایسا کرنا نہ صرف ان کی شان کے خلاف ہے بلکہ تعلیم کے
کام میں بھی اس سے خلل پڑتا ہے، کیوں کہ کارکنوں کو جس اطمینان خاطر، آزادی اور عزتِ نفس
کے احساس کی ضرورت ہوتی ہے، وہ انھیں میسر نہیں آتا۔ ان کا عقیدہ ہے درسگاہوں کا نظم و
نسق زیادہ تر اس کے اُستادوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے. لیکن اگر کوئی عمدہ انتظامی جماعت ہو
تو اسے اپنے معلّمین کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیے جو معزز شرکائے کار کے ساتھ کیا جاتا ہے
انھوں نے ہر موقع پر ہمیشہ اس بارے میں اسٹاف کے جائز حقوق کی علم برداری کی اور
جہاں کہیں خمارِ دولت یا خمارِ قوت کے زیر اثر اساتذہ کے ساتھ شایانِ شان سلوک نہیں ہوا
انھوں نے نہایت دلیری کے ساتھ ان کی حمایت میں آواز بلند کی۔ وہ چاہتے ہیں کہ تعلیم گاہوں
میں ایسا ماحول پیدا کیا جائے جس میں اُستاد فکرِ معاش سے بے نیاز ہوں (گو انھیں اور اہلِ جامعہ
کو اپنے ایثار کی وجہ سے یہ بات کبھی نصیب نہیں ہوئی) اپنا کام وقت اور توجہ تعلیم و تعلم میں صرف
کر سکیں اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں ترقی کرنے کے لیے جس تگ و دو اور ریشہ دوانی
کی ضرورت ہوتی ہے اس سے محفوظ رہیں. کس قدر مختلف ہے یہ تصوّر اس فضا سے جو آج کل
عام طور پر ہمارے بیشتر مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پیدا ہو گئی ہے۔ جہاں ذاتی اغراض

مقاصد، ذاتی ترقی اور تنخواہ، ذاتی اثر و رسوخ کی کشمکش میں تعلیم کی روح پنپ نہیں پاتی ہے، جامعہ کو جو کامیابی اور نیک نامی نصیب ہوئی اس کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ اس میں ذاکر صاحب نے، قابل، مستعد اور پر خلوص کارکنوں کی ایک ایسی جماعت اکٹھی کی تھی جس کے ساتھ وہ احترام، خلوص اور رفاقت کا برتاؤ کرتے تھے اور جس کو ان کی ذات کے ساتھ عقیدت تھی۔ ان کی ذاتی کشش کا فیض ہے کہ وہاں مدت تک بہت سے ایسے معلم کام کرتے رہے جن کو باہر بہترین مواقع مل سکتے تھے لیکن ان کے دل میں انھیں قدروں کی لگن تھی اور اسی عشق کا چراغ روشن تھا جو ذاکر صاحب کے سینے میں فروزاں ہے، اس لیے وہ جامعہ کو چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہیں ہوئے، انھیں کبھی معاش کی طرف سے اطمینان نصیب نہیں ہوا۔

لیکن اس کے بدلے انھیں اعتماد، رفاقت، عین پسندی کی دولت میسر تھی جو بعض مصلحت ناشناس لوگوں کے نزدیک مالی فراغت سے زیادہ قابل قدر چیز ہے اگر ذاکر صاحب کی شخصی کشش ان کے دلوں کو جامعہ کی طرف نہ کھینچتی تو اس درسگاہ کا بھی وہی حشر ہوتا جو ان درجنوں قومی درسگاہوں کا ہوا جو ۱۹۲۰ء کی سیاسی تحریک کے بعد قائم ہوئی تھیں۔ قوم کے جوش اور ولولے نے ان کو وجود بخشا تھا اور قوم ہی کی عظمت اور استقلال کی کمی نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ ۱۹۲۶ء میں ذاکر صاحب نے جامعہ کا کام اپنے ہاتھ میں لیا تھا، اس وقت وہ تقریباً نیم جان تھی اور اس کے بانیوں اور کارکنوں تک کے ذہن میں اس کا کوئی واضح تصور اور نصب العین نہ تھا، بعض اس کو ایک تعلیمی درسگاہ بنانا چاہتے تھے، بعض کی خواہش تھی کہ اس میں سیاسی کارکنوں کی تربیت کی جائے۔ لیکن جہاں تک اس کی مالی اور انتظامی ذمے داریوں کا تعلق ہے۔ کوئی شخص بھی (سوائے دو تین بندگانِ خدا کے جنھوں نے وقتاً فوقتاً اس کی مدد کی) اس بوجھ کو اٹھانے کے لیے تیار نہ تھا، بلکہ حکیم اجمل خاں کے بعد ایک وقت آزمائش کا ایسا آیا تھا جب تمام عمائدین ملک کی یہ رائے تھی کہ اس ادارے کے چلنے کا امکان نہیں ہے، اس کو بند کر دینا چاہیے۔ لیکن ذاکر صاحب کی اولوالعزمی اور بلند نظری اور ان کے ساتھیوں کے ایثار نے اس شکست خوردہ رائے کو نہیں مانا اور گاندھی جی کی ہمت افزائی کے طفیل خود اپنے بل بوتے پر وہ نہ صرف سخت کڑیاں جھیل گئے، بلکہ جامعہ کو اس مقام پر پہنچا دیا جہاں اس نے ہند اور بیرونِ ہند کے اہل الرائے ماہرین تعلیم سے خراج تحسین وصول کیا۔ (اقتباس)

پروفیسر محمد مجیب

ذاکر صاحب کے تعلیمی خطبے

(ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے تعلیمی مسائل اور موضوعات پر اردو میں جس قدر خطبے دیے ہیں یا ریڈیو پر تقریریں کی ہیں، ان کا ایک مجموعہ "تعلیمی خطبات" کے نام سے پہلی بار ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اور اس کے بعد سے اب تک اس کے متعدد ایڈیشن مکتبہ جامعہ سے شائع ہو چکے ہیں۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب کا پیش لفظ ذاکر صاحب کی کتاب "تعلیمی خطبات" سے نقل کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔ (مدیر)

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے یہ خطبات نہ جانے کتنی مشکل سے لکھے گئے اور اب کتنے پس و پیش کے بعد شائع کیے جا رہے ہیں۔ آپ اسے یقین نہ کریں گے لیکن زبان کی روانی اور بیان کی قدرت جو ان خطبات کی ایک نمایاں خوبی ہے، خود اس کا ثبوت ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو لکھنے میں کوئی دشواری، کوئی تکلف نہ ہوتا ہوگا، پھر بھی یہ بات اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کہ یہ کام جو مصنف کی استعداد کو دیکھتے ہوئے کوئی دیطلب کام نہیں، بہت مشکل سے انجام پا سکا ہے۔ خطبات کی زبان کی روانی، قلم کی روانی نہیں ہے، بیان کی وہ قدرت نہیں ہے جو ادیب مشق سے حاصل کرتے ہیں، یہ اس طرح لکھے ہی نہیں گئے جیسے کتابیں لکھی جاتی ہیں کتاب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ علم اور علم کے ساتھ انسان کو اپنے اندر بند کر لے اور اس لیے ہر کتاب نامکمل رہ جاتی ہے، جیسے وہ کپڑا جو پہننے والے کا جسم دیکھے بغیر کاٹا گیا ہو ادبی تصانیف میں زبان کی قینچی اکثر کاٹنے والے کے قابو میں نہیں رہتی، خود اپنے ہنر دکھانے لگتی ہے، ان تعلیمی خطبات میں وہ خامی نہیں ہے جو کتاب میں ہوتی ہے اور قدرتی استعداد نے زبان کو اپنا خادم بنا کر ان میں وہ خوبیاں پیدا کر دی ہیں جو ادیبوں کی تحریروں کو برسوں کی مشق اور محنت کے بعد نصیب ہوتی ہیں آپ دیکھیں گے کہ ان خطبات کا انداز تقریر کا ہے، تحریر کا نہیں، ان میں کوشش کی گئی ہے کہ قلم اور کاغذ اور کتاب کو درمیان سے ہٹا کر آپ سے براہ راست بات کہی جائے اور اس طرح کہی جائے

کہ آپ کے دل کو لگے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جو شخص ہر ایک سے اور ہر موقع کے مناسب بات کہنا چاہتا ہو اور کہہ سکتا ہو، اسے کتنا ناگوار ہوگا کہ نظر نیچی کر کے بیٹھے اور قلم کو کاغذ پر چلائے، اپنی تحریر کو دیکھے اور مخاطب کو بھول جائے، کتاب لکھے اور سمجھے کہ دل سے دل کی راہ یہی ہے۔

یہ تعلیمی خطبات مختلف موقعوں کے لیے مختلف لوگوں کے اصرار پر تیار کیے گئے، ان میں ہر ایک کا موضوع تعلیم کا کوئی بنیادی مسئلہ، کوئی اہم پہلو ہے اور مجموعی طور پر ان کا مقصد آپ کو سچی تعلیم سے روشناس کرنا اور اس کا یقین دلانا ہے کہ وہ کام جسے انجام دینا آپ ایک خاص سرکاری محکمے کے ملازموں کا منصب سمجھتے ہیں خود آپ کا سب سے بڑا اور سب سے اچھا کام ہے، ان خطبات کو پڑھنے کے بعد آپ کے ذہن میں تعلیم، درجا اور امتحان، نصاب اور کتاب پر مشتمل یا کسب معاش پر منحصر نہ رہے گی، بلکہ خود ان بندشوں سے آزاد ہو کر آپ کو آزاد کرے گی، آپ دیکھیں گے کہ تعلیم کا سلسلہ شعور کو بیدار کرنے والے اثرات سے شروع ہو کر کلام الٰہی میں انتہا اور تکمیل کو پہنچتا ہے، اس میں معلموں کا منصب یہ ہے کہ تعلیم کی مختلف منزلوں میں رہنمائی کریں اور تعلیم حاصل کرنے والے کا فرض یہ ہے کہ معلم سے معلم کا پتا پوچھتا ہوا علم کے سرچشمے تک پہنچے۔ یہ تعلیم انفرادی تو ہوگی کہ ہر شخص اس سے اتنا ہی فیض حاصل کرے گا جتنا کہ اس کا ظرف ہو، لیکن علم کے لیے مقاصد معین کرنا اور اس کی تحصیل کا انتظام کرنا جماعت کے اختیار میں ہے، اس لیے آپ کو ان تعلیمی خطبات میں اس نظام تعلیم کے خاکے ملیں گے جو علم کی روشنی کو گھر گھر پھیلا سکتا ہے، سوئی ہوئی قوتوں کو جگا سکتا ہے، اور فرد اور جماعت کے درمیان وہ سچی ہم آہنگی پیدا کر سکتا ہے جو مذہب، اخلاق، سیاست سب کا نصب العین ہے، تعلیم کی روح کو اس کے جسم سے الگ نہیں کیا جا سکتا، آپ کے دل میں جتنی قدر تعلیم کے اس تصور کی پیدا ہو جو ان خطبات میں پیش کیا گیا ہے، اتنا ہی حوصلہ آپ کو اس کا بھی ہونا چاہیے کہ آپ کی کوشش سے یہ تعلیم ایک عام اور پائیدار نظام کی شکل اختیار کرے۔

(۱۷ اکتوبر ۱۹۴۲ء)

قطعہ تاریخ وفات جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند

وا! دریغا! آج آیا اس کو رحلت کا پیام — ہاتھ میں جس کے تھا بھارت کی حکومت کا نظام
لکھ دو تم تاریخ رحلت، احقر از لفظ "امام" (۸۲) — نیک سیرت، نیک صورت، نیک طالع نیک نام

۱۸۸۷ء
۸۲
۱۹۶۹ء

(احقر عزیزی ابابکری)

جائزے

اُردو اور بنگال

از: ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ
صفحات: ۳۰۸، سائز ۳۰×۲۰/۱۶
قیمت: دس روپے
ملنے کا پتہ: نور محمد اینڈ سنز ۲ رسا روڈ، ساؤتھ ٹالی گنج (نزد شاہی مسجد) کلکتہ ۳۳

اشاعت نومبر ۱۹۶۸ء

افسانے، ناول، سیرت و سیاست، تاریخ، تعلیم اور ترجمے پر مشتمل ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی نصف درجن کتابیں موجود ہیں۔ بنگال میں اس وقت اردو کا کتنا رواج ہے اور وہاں آج کتنے شعرا اور شاعرات چمن اردو کی آب یاری میں مصروف ہیں ان کا تذکرہ باقی رہ گیا تھا سو اس کتاب کے ذریعے وہ بھی سامنے آ گیا۔

جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے، واقعی ڈاکٹر بھٹاچاریہ نے اپنی اس "تصنیف" میں، اردو اور بنگال سے متعلق شاید ہی کوئی ضروری بات چھوڑی ہو۔ عنوانات ملاحظہ ہوں:
"آزادی کے بعد بنگال میں اردو"۔ "تذکرہ شاعرات بنگالہ"۔ "آج کے شعرائے بنگال" "بنگال کا ایک قدیم کتب خانہ"۔ "اردو کا ایک جدید کتب خانہ"۔ "انیسویں صدی میں بنگال کی شائع شدہ مذہبی تصانیف"۔ اور دو ضمیمے جن میں باقی ماندہ اخبارات اور شعرا سے متعلق معلومات فراہم کر دی گئی ہیں

کتاب میں سب سے پہلے اُن تلخ حقائق کا ذکر کیا گیا ہے جن سے اکثر ادیبوں اور شاعروں کو آئے دن واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ وہی با اختیار افراد اور اداروں کا اغماز، ناشروں کی بے توجہی اور اچھے کاتبوں اور مطبعوں کی قلت۔

دوسرا مضمون یوں شروع ہوتا ہے: "..... بنگال کو اردو والوں نے کبھی اردو کا مرکز تسلیم نہیں کیا اور بیشتر اردو کے ادیب اور صحافیوں نے بنگال کی سرزمین کو اردو کے لیے سنگلاخ قرار دیا ہے۔ بنگال کی دھرتی اردو کے لیے سنگلاخ ہو تو ہو۔ پر یہ بنجر ہرگز نہیں۔ لہذا بنگال نے اردو زبان کی جو خدمت کی ہے اس کا ذکر کیے بغیر داستان اردو نامکمل رہ جاتی ہے..."
ان احساسات اور ان کی صداقت سے انکار نہ کرنا چاہیے۔ اسی مضمون میں احترام کے ساتھ اُن تمام صاحبانِ علم و ادب کا ذکر کیا گیا ہے جن کی ذات سے سرزمین بنگال پر اردو کی تبلیغ و ترویج

ہوتی رہی ہے۔ پھر اردو کے تین[۳] بتیس[۳۲] اخبارات و رسائل اور ۲۹ ایسی کتابوں کے نام بتائے گئے ہیں جو ۱۸۴۳ء سے ۱۸۶۸ء تک بنگال کے متعدد شہروں سے شائع اور طبع ہوئی ہیں۔

کتاب کا ایک اہم جزو وہ ہے جس میں پورے بنگال (پاکستانی + ہندوستانی) کی ۵۸ شاعرات اور ۳۵۴ شاعروں کا تذکرہ ہے۔ جس سے کم سے کم ان کے نام، وطن، تخلص اور نمونۂ کلام سے تو واقفیت ہو ہی جاتی ہے۔

بنگال کے ایک قدیم اور جدید کتب خانے سے متعلق ڈاکٹر بھٹاچاریہ نے جو معلومات بہم پہنچائی ہیں اس سے ان کی تلاش و تحقیق، سعی و کاوش اور اردو زبان سے غیر معمولی انس و شیفتگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں کرشن مکرجی کے حالات زندگی اور ان کی علم دوستی بہت سے صاحبان علم و دولت کے لیے قابلِ رشک ہے۔ "جدید کتب خانہ" کے ضمن میں کتابوں کے نام، ان کی اہمیت اور تعداد بتانے سے پہلے اردو سے بے التفاتی اور خاص طور سے حکومت کی اس کے ساتھ ناانصافیوں اور بے اعتنائیوں کا جس طرح ذکر کیا گیا ہے اس کے لفظ لفظ سے لکھنے والے کی دردمندی، دل سوزی اور حقیقت پسندی، عیاں، واضح اور آشکارا ہے۔ لطف یہ کہ مرض کی نشان دہی کے ساتھ اس کا درماں اور مداوا تلاش کرنے کی راہیں بھی بتا دی گئی ہیں۔

اردو کے ایسے محسنوں اور قابل رشک خدمت گزاروں کی قدر اور حوصلہ افزائی ہر اردو نواز پر واجب ہے اور قیمت مقرر کرتے وقت عام خریدار کی حیثیت اور حالت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔

رشید نعمانی

تاباں

مطبوعہ اگست ۱۹۶۸ء

ناول نگار: مسرور جہاں
صفحات ۔ ۳۵ ۔ سائز ۲۰ × ۳۰/۱۶
ناشر: نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ
قیمت: چھ روپے

مسرور جہاں نے مخرب اخلاق ناولوں کے مقابل اپنا اصلاحی ناول 'تاباں' پیش کر کے وقت کی ضرورت کو پورا کیا ہے۔

'تاباں' میں ایک متوسط طبقے کی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں کی عکاسی ملتی ہے مثلاً

سچی دوستی، مرد اور عورت کا ذہنی فرق، ہیروئن کی فطری محبت، ہیرو کا جذبۂ وفا و خلوص، مشترکہ خاندان کی روایت کے تحت آپس کی شادی کا غم ناک انجام، بیوی کی مشکوک نفسی کیفیت وغیرہ۔ انھی مخصوص تصورات کے گرد مختلف کرداروں کی تشکیل اور واقعات کے تسلسل کی مدد سے ایک ضخیم ناول کی تخلیق کی گئی ہے۔

ناول میں کش مکش کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ توصیف کی ماں اپنے بیٹے کی مرضی کے خلاف اپنی بہن کی بیٹی تبسم کو دلہن بنانا چاہتی ہے۔ ناول نگار نے چابکدستی سے ناول کے ہیرو توصیف کا کردار پیش کیا ہے۔ اس کے دل پر تاباں (ہیروئن) کی حکمرانی ہے لیکن وضع لحاظ اور خاندانی رشتوں کا بندھن توصیف کو تبسم سے شادی کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہاں تاباں کے کرداری نقوش قابلِ تحسین ہیں وہ ایک طرف تمام تر محبت ہے اور دوسری طرف اُس خاندان کے بارِ کفالت کی احسان مند اور مشرقی اقدار کی نگہبان ہے۔ وہ توصیف سے ملنے جلنے میں غیر معمولی احتیاط برتنے لگی ہے۔ لیکن ایک رات کو توصیف بیماری کی اضطراری کیفیت میں تاباں کے کمرے میں داخل ہو جاتا ہے اسی مقام سے تبسم کی مشکوک نفسی کیفیت اُبھرتی ہے اور یہی ناول کا کلائمکس ہے۔ تبسم صدمے سے بے ہوش ہو کر سیڑھیوں سے گر پڑتی ہے۔ اس کی زندگی کو بچانے کے لیے تاباں اپنا خون دیتی ہے۔ اس عمل ایثار سے تبسم کی مشکوک نفسی کیفیت زائل ہو جاتی ہے اور وہ بسترِ مرگ پر تاباں کے ہاتھ میں توصیف کا ہاتھ دے کر محبت کی فتح مندی کا اعلان کرتی ہے۔ اس ناول میں بعض واقعات کی کڑیاں قارئین کو "کایا کلپ" کا فریب دے سکتی ہیں مگر اصلاحی ناول نگار اس روش کو اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ناول میں قاری کی دلچسپی قائم رہتی ہے اور یہی تاباں کی کامیابی کی ضمانت ہے، کتابت، طباعت، کاغذ اور جلد عمدہ ہے صحت مند ادب کے پرستار خاندانوں، گرلز کالجوں اور لائبریریوں کو یہ ناول خریدنا چاہیے۔

سیفی بریلی
۶ مئی ۱۹۶۹ء

از مولوی معین الدین رہبر فاروقی

نئے مشاہدات اور معجزہ شق القمر

صفحات ۳۰۸ تقطیع $\frac{22 \times 18}{8}$

پتہ: یاقوت پورہ، علی بن حیدر آباد ۲۳

قیمت: سات روپے

چاند کے سلسلے میں جو نئے مشاہدات ہو رہے ہیں اور ان کی روشنی میں فلکیات کے ماہرین نے

جو خیالات ظاہر کیے ہیں ان کو پیش نظر رکھ کر مولوی معین الدین صاحب رہبر فاروقی نے قدیم دینی روایت کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔

پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معجزات کے سلسلے میں ایک معروف و مشہور روایت یہ ہے کہ آپ نے چاند کے دو ٹکڑے کر دیے۔ تاریخی روایات کے علاوہ احادیث میں بھی اس کا ذکر آیا ہے اور سورۂ قمر کی تفسیر میں بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ حدیث و تفسیر کی ان روایات کے مطابق شق القمر کے اس معجزہ کو بہت اہمیت دی گئی ہے اگرچہ بعض حقیقت پسند مسلمانوں نے ان روایات پر تنقید کی ہے اور آیات قرآنی کو قیامت کے واقعات سے متعلق قرار دیا ہے لیکن جمہور مسلمان اس تنقید سے متاثر نہیں ہوئے اور اس کے باوجود وہ شق القمر کے قائل رہے اور اس معجزہ کی تائید میں عقلی دلایل پیش کرتے رہے۔ پیش نظر کتاب بھی اسی مقصد سے لکھی گئی ہے اور جدید فلکی تحقیقات کی روشنی میں شق القمر کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ان کی محنت باعث اجر ہے لیکن ہر عقلی توجیہ و تشریح کو حرف آخر نہیں سمجھنا چاہیے ہو سکتا ہے کہ جدید تحقیقات بھی آگے چل کر بدل جائیں اور کوئی نیا نقطۂ نظر سامنے آئے۔ اس لیے تاریخی واقعات کی تصدیق کے لیے اصل بھروسہ روایات ہی پر کیا جانا چاہیے عقلی توجیہات وقتی طور پر ہی باعث اطمینان ہو سکتی ہیں۔

(مولانا) عبد السلام قدوسی

اناجوں کا بادشاہ

مصنف: اندرجیت لال
ناشر: سلوچنا پرکاشن ۱۴۵ تلک بازار کھاری باؤلی دہلی ۶
سائز: ۱۸×۲۲/۸ (کاغذ چھپائی۔ گٹ اپ نفیس)
قیمت تین روپے صفحات ۸۰

کہتے ہیں کہ اللہ میاں نے "گیہوں" کو جنت میں "شجرِ ممنوعہ" قرار دیا تو "شیطان" نے سانپ کا روپ دھار کر "حوّا" کو ورغلایا کہ گیہوں ہی تو ایک کھانے کی چیز ہے۔ آخر حضرت آدمؑ نے حوّا کی ترغیب پر گیہوں کھایا اور لذت گندم کے لیے جنت کو ٹھکرا دیا۔ یا یوں کہیے کہ ایک دانۂ گندم کی ہوس میں آدم و حوّا کو بہت بے آبرو ہو کر جنت سے نکلنا پڑا۔ اس حادثے کی تصدیق PL-۴۸۰ کے گیہوں سے بھی بخوبی ہو جاتی ہے کہ جس ملک نے، جس قوم نے PL-۴۸۰ کا گندم کھایا، وہ ملک اور

وہ قوم اپنی آزادی، خودداری، عزتِ نفس، غیرت وحمیت، خودداری اور انسان دوستی کی جنتوں سے نکلتی ہوئی نظر آئی۔ اور پھر ایک پرانی کہاوت بھی ہے کہ "جیسا کھاوے اَن، ویسا ہووے مَن"۔

ہندوستان ایک زراعتی اور آزاد ملک ہے۔ مگر گیہوں قرض لے کر کھاتا ہے شاید تاریخ کا یہ بدترین مذاق ہے جو اربابِ حل وعقد نے اپنے ملک اور اپنی قوم سے کیا ہے۔

تاہم بھارت کی مٹی بہت زرخیز ہے اور اسی مٹی سے خمیر اٹھا ہے۔ ہمارے جواں سال و جواں فکر ادیب وصحافی کا۔ جس نے محنت کشوں اور کسانوں کے لیے "صحیفۂ گندم" کی تخلیق کی ہے جس میں مصنف نے وہ تمام گُر بتائے ہیں۔ جن کے ذریعہ "اناجوں کا بادشاہ" گیہوں رام کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ صحیفہ بجا طور پر کسانوں کا گائڈ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس میں جن موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے وہ یہ ہیں: ہندوستان میں گیہوں کی کاشت کھیتی کرنے کے ڈھنگ، بونی قسموں کی کہانی، بونی قسمیں اور کام کی باتیں، آج کی کچھ مشہور قسمیں، ولایتی کھادیں، چند مشورے، گیہوں کی بیماریاں، فصل کے کیڑے، کیڑے مکوڑے، محاورے اور لوک کہاوتیں، چند سچی اور ضروری باتیں اور آخر میں انگریزی الفاظ کی فرہنگ بھی شامل ہے۔ زبان وبیان سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔

اس کتاب کی افادیت اور مقصدیت کے پیش نظر میں پر زور سفارش کرتا ہوں کہ سرکاری سطح پر مختلف علاقائی زبانوں میں اس کے ترجمے کرائے جائیں اور گرام پنچائتوں کی لائبریریوں میں اس کے زیادہ سے زیادہ نسخے رکھے جائیں۔ تاکہ گاؤں والے، کسان اور محنت کش اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھائیں۔

ملک میں خوراک کے مسئلہ کو حل کرنے اور سرکاری اور غیر سرکاری مہم (زیادہ اناج اُگاؤ) کو تیز سے تیز تر کرنے کے لیے "اناجوں کا بادشاہ گیہوں" ایک کامیاب حربہ ثابت ہوسکتا ہے۔

ع ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

(پروفیسر) جاوید وشِشٹ

مرتب: ریورنڈ ہیلنسن ریحانی لکھنوی
طابع: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان حیدرآباد
سائز: ۲۰×۳۰، صفحات: ۱۰۲، قیمت: دو روپے
ملنے کا پتہ: ادارہ زندگی ۱۶/۶ نور پوسٹ بکس ۱۴۵، عابد روڈ حیدرآباد (اے پی)

اشاعت اگست ۱۹۶۸ء

رنگ زار

ریورنڈ ہیلنسن ریحانی لکھنوی ایک خوش فکر شاعر ہیں۔ نواب جعفر علی خاں اثر مرحوم سے

فیضِ اصلاح پایا ہے۔ انھوں نے ۲۲ر اکتوبر، ۱۹۶۲ء کو لکھنؤ میں پہلا آل انڈیا مسیحی مشاعرہ منعقد کیا تھا جس میں سترہ (۱۷) مسیحی شعراء نے شرکت کی تھی۔ اس مشاعرہ کا انتخاب " رنگ زار" کے نام سے شائع کیا گیا ہے جس میں ہر شاعر کے انتخاب کلام کے لیے دو صفحے وقف کیے گئے ہیں۔ چہار رنگی کتابت ہے۔ آرٹ پیپر پر شعراء کی تصاویر چھاپی گئی ہیں۔ ڈاکٹر آر، ڈی، جوشی نے مشاعرے کے انعقاد اور طباعتِ کلام میں مالی اعانت فرمائی تھی ان کی تصویر بھی زینت رنگ زار ہے۔

ڈاکٹر سموئیل بہاجان طالب شاہ آبادی نے پیش قلم رقم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رنگ زار، مشاعروں کا انتخاب کلام چھاپنے والوں کے لیے ایک بہترین نمونہ ہے۔

نوائے ازل اس مجموعے میں مرتب مذکور نے ہندوستان اور پاکستان کے تینتیس ۳۳ مسیحی شعراء کا انتخاب کلام شامل کیا ہے جو مسیحی عقائد اور مخصوص عبادتوں سے متعلق ہے۔ صدقِ جذبات اور پاکیزگیٔ مبین کے لحاظ سے 'نوائے ازل' قابلِ قدر ہے۔

موجِ گل ریحانی لکھنوی کا مجموعۂ کلام ہے جو ۱۰۵ غزلوں پر مشتمل ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے 'کتاب نما' میں ہم اس پر تبصرہ کر چکے ہیں پھر بھی اتنا لکھنا ضروری سمجھتے ہیں کہ 'موجِ گل' میں فارسی اور اردو غزلوں کا اپنا ایک معیار ہے جس کے تحت غم حیات اور غم کائنات کی تصویریں موثر انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ شاعر کی اہمیت نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے ایک جملہ سے واضح ہو جاتی ہے:

'خیالات میں علو اور اسلوب ادا میں انفرادیت ہے'

ان مجموعوں کے مطالعہ سے ہمیں یہ احساس بھی ہوا کہ ہمارے عام مشاعروں میں مسیحی شعراء کی عدم شرکت عملاً اردو شاعری کے ساتھ بے انصافی ہے۔ اس طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے

سیفی پریمی

تحفۂ جذب
قیمت: ڈیڑھ روپیہ

شاعر: راگھویندر راؤ جذب، عالم پوری
سائز ۲۰x۳۰/۸، صفحات: ۱۰۰
ناشر: راگھویندر راؤ جذب، عالم پوری، ۹-۷-۸۱۹، عیسیٰ میاں بازار، حیدرآباد (۲۷) انڈیا۔

کامیاب رباعی کہنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اسی لیے صرف اردو کے بڑے بڑے

شعراء نے ہی اس میں طبع آزمائی کی ہے۔ حیدرآباد کے حضرت امجد اس صنفِ سخن میں یکتا تھے۔ راگھویندر راؤ صاحب جذب بھی ملک دکن کے کہنہ مشق و معمر شاعر ہیں۔ آپ نے بھی رباعی کو اپنا شعارِ شاعری بنایا ہے۔ زیرنظر مجموعہ نثور رباعیوں پر مشتمل ہے۔ اس سے قبل حضرت جذب رباعیات کے تین مجموعے اور شائع کر چکے ہیں جو مقبول ہوئے تھے۔ اس مجموعہ میں بھی شاعری سے ذوق رکھنے والے اصحاب کو اپنی اپنی پسند کا سامان ضرور مل جائے گا۔ اکثر رباعیاں حسنِ بیان کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ بامقصد بھی ہیں۔ مثلاً ؎

بیکار سی باتوں پہ جھگڑنا چھوڑو — اور قوتِ نمائش پہ اکڑنا چھوڑو
آپس میں خلوص اور محبت رکھو — مخلوق کی خدمت کرو لڑنا چھوڑو

سچے دل سے حرم کا دیوانہ ہوں — اور شام و سحر غلامِ بت خانہ ہوں
تفریق کروں دیر و حرم میں کیونکر — دونوں شمعوں کا جذب میں پروانہ ہوں

اور اس رباعی میں آپ بیتی اور جگ بیتی کا مزہ ہے ؎

سر حسن کے قدموں پہ جھکاتے ہی بنی — مجبور تھے ناز ان کے اٹھاتے ہی بنی
جب روٹھ گئے وہ تو بالآخر اے جذب — منت سے سماجت سے مناتے ہی بنی

کتابت و طباعت اچھی ہے۔ اور قیمت بھی مناسب۔

محمد احمد دلکش

نئی مطبوعات

قافلے بہار کے (ناول)	عفت موہانی	لکھنؤ نسیم بکڈپو	۵/۵۰
عربی شاعری کے ادبی رجحانات	ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی	لکھنؤ، دانش محل	۳/-
ایک سی دو پاٹ (ناول۔ پاکٹ اڈیشن)	گلشن نندہ	دہلی، پنجابی پستک بھنڈار	۲/-
پتھر دل اور آنسو (" ")	عادل رشید	" "	۲/-
گلشن گلشن ڈھونڈا تجھ کو (" ")	کرشن چندر	" "	۲/-
مجبور (" ")	عارف مارہروی	" "	۲/-
عقیدت کے پھول	مرتبہ: گوپی ناتھ امن	" "	۲/-

ادبی خبریں

● مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے صدر دفتر واقع جامعہ نگر، نئی دہلی میں آج مورخہ ۶ مئی ۱۹۶۹ء کو اپنے مربی اور سب سے بڑے محسن ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے اچانک انتقال پر محترم غلام ربانی تاباں جنرل منیجر، مکتبہ جامعہ کی صدارت میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس میں کارکنانِ مکتبہ جامعہ کی طرف سے دلی رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ اب سے تقریباً ۴۸ سال پہلے مکتبہ جامعہ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ذاکر صاحب مرحوم اس کے روحِ رواں تھے۔ جرمنی سے واپسی کے بعد مرحوم نے پھر مکتبے کی طرف توجہ کی اور اسے انتہائی عروج پر پہنچا دیا۔ فسادات کے ہنگامے کے بعد جب ۱۹۴۹ء میں مکتبہ کا نیا دور شروع ہوا اور اسے لمیٹڈ کمپنی کی شکل دی گئی تو ذاکر صاحب ہی اس کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے چیرمین منتخب ہوئے تھے شروع سے اب تک ذاکر صاحب مکتبہ جامعہ کے کاموں میں برابر دلچسپی لیتے رہے تھے اور گورنر بہار، نائب صدر اور صدر جمہوریہ ہند کے اہم فرائض اور ان کی غیر معمولی مصروفیات کے باوجود، جب بھی ممکن ہوتا، جب بھی موقع ملتا وہ برابر ہماری رہنمائی فرماتے۔

تعزیتی جلسے میں یہ تجویز متفقہ طور پر منظور ہوئی۔

"کارکنان مکتبہ جامعہ ذاکر صاحب کے تمام پس ماندگان اور ان کے اعزا سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ ہم سب اس سانحہ عظیم میں ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور اللہ پاک سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مرحوم کو جو تمام اعلیٰ صفات کے حامل تھے، اپنی رحمتوں سے نوازے اور انھیں جنّت الفردوس اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔"

● ۵ رمئی کو ادارۂ بھارتی بھون پٹنہ کے دفتر میں ایک ہنگامی جلسہ صدر جمہوریہ ہند کے انتقال کے سلسلہ میں شری موہت موہن بوس مالک ادارہ کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں ادارہ کے مالکوں اور کارکنوں نے مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین کو خراج عقیدت پیش کیا اور ایک قرار داد کے ذریعے مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی اور ان کے پس ماندگان کے ساتھ اظہار ہمدردی کے بعد احتراماً اس روز کے لیے دفتر بند کر دیا گیا۔

تازہ مطبوعات

رشید احمد صدیقی (شخصیت اور فن) (مقالہ) ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

رشید احمد صدیقی ایک ادبی قامت بھی ہیں ایک تاثر بھی اور ایک ادیب با نفوذ بھی۔ ان کے طنز و مزاح نے اردو ظرافت کو ایک شستہ ذہن اور شائستہ لہجہ عطا کیا ہے۔ زیر نظر کتاب رشید صاحب کی شخصیت اور فن پر تحقیقی مقالہ ہے۔ قیمت سات روپے

قہقہہ زار (لطائف) خواجہ عبدالغفور (آئی۔ اے۔ ایس)

اس کتاب میں سینکڑوں عمدہ لطیفے مختلف عنوانات کے تحت یکجا کئے گئے ہیں اور فن لطیفہ گوئی جیسے مشکل ترین فن کا علمی اور نفسیاتی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ ایک نہایت دل چسپ کتاب قیمت چار روپے

نشانِ منزل (شعری مجموعہ) احسن رضوی داناپوری

حضرت علامہ آرزو لکھنوی کے شاگرد رشید حضرت احسن رضوی داناپوری کی غزلوں کا تازہ ترین مجموعہ۔

قیمت تین روپے

لذتِ آزار (مزاحیہ مضامین) احمد جمال پاشا

احمد جمال پاشا نئی نسل کے مزاح نگاروں کے سالار قافلہ اور نئی ظرافت کے نقیب ہیں۔ "لذت آزار" آپ کے شستہ و شگفتہ مضامین کا رنگا رنگ مجموعہ ہے جس میں طنز کی لطیف چٹکیاں اور مزاح کی پھلجھڑیاں ان کے مخصوص مزاج کی نشان دہی کرتی ہیں۔ قیمت تین روپے پچاس پیسے

۹۔ ڈرامے احسان الحق

احسان الحق صاحب نے انسانی زندگیوں کو بمبئی کے فٹ پاتھ پر رینگتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور لندن کے پلش ہوٹل میں تھرکتے اور بہکتے ہوئے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ڈرامے انسانی زندگی کی ایک جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے ہیں۔ دلچسپ اور با مقصد ڈراموں کا مجموعہ۔ قیمت چار روپے

۳۔ روسی شاہکار ترجمہ صفدر حسین

اس کتاب میں پشکن کی کہانی "حوصلہ" چیخوف کی کہانی "پروانہ" اور شولوخوف کی کہانی "مقدر" کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ ترجمہ نہایت شستہ اور رواں ہے۔ قیمت دو روپے

غالب اور ابوالکلام عتیق صدیقی

مولانا آزاد، مرزا غالب کے مقلد بھی تھے۔ انھوں نے دقتِ نظر سے غالب کا مطالعہ کیا اور اس حد تک ان کے اثرات قبول کئے کہ آواگون کا کوئی قائل ہوتا تو گمان ہو سکتا ہے کہ غالب کی بیقرار روح نے ابوالکلام آزاد کے قالب میں دوبارہ جنم لیا تھا۔ غالب و مولانا آزاد کا تحقیقی اور نفسیاتی مطالعہ قیمت پندرہ روپے

غالب اور آہنگ غالب ڈاکٹر یوسف حسین خاں

اس کتاب میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے غالب کی شخصیت اور شاعری کا بالکل انوکھے انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ اس کتاب سے ہماری زبان کے تنقیدی ادب میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ قیمت [illegible] روپے

محسن فرخ آبادی

جناب محسن فرخ آبادی نے شاعری کے رموز و علائم سے کام لے کر جس طرح حدیث حسن اور حکایت روزگار ادا آپ بیتی اور جگ بیتی بنایا ہے وہ اس بات کی غماز ہے کہ انھوں نے غم جاناں اور غم دوراں دونوں وادیوں کو بیننے کے بعد طے کیا ہے۔ قیمت دو روپے

مہاتما گاندھی (سوانح) صفدر حسین

مہاتما گاندھی کی یہ سوانح حیات بڑی محنت اور جانفشانی سے ترتیب دی گئی ہے۔ مہاتما گاندھی کی صد سالہ سالگرہ پر ایک یادگار تحفہ۔ قیمت تین روپے

سائے کا سفر (افسانے) عوض سعید

عوض سعید کو کہانی بُننے کا ایک خاص سلیقہ ہے اور قدرت نے انھیں کہانی بیان کرنے کا ملکہ عطا کر رکھا ہے۔ ان کی کہانیاں مکالموں کی بیساختگی، مشاہدے کی گیرائی قاری کی توجہ ادھر ادھر بھٹکنے نہیں دیتی۔ قیمت چار روپے

بھوپال اور غالب (ادبی تاریخ) عبدالقوی دسنوی

بھوپال میں غالب کے ملنے والے بھی تھے، شاگرد بھی اور کچھ سسرالی خاندان کے قرابت دار بھی۔ یہ کتاب ان رشتوں کا ایک عمدہ خاکہ پیش کرتی ہے۔ قیمت دو روپے پچاس پیسے

سیاہ، سرخ، سفید (ناول) آمنہ ابوالحسن

آمنہ ابوالحسن کی کہانیوں کا مجموعہ "کہانی" کے نام سے شائع ہو کر داد مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ سیاہ، سرخ، سفید ان کا تازہ تخلیقی ناول ہے۔ اس ناول میں آمنہ ابوالحسن کا فن شعوری طور پر اپنے عروج کو چھونے لگا ہے۔ قیمت چار روپے

تنقید کے بنیادی مسائل (تنقید) مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور

شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ۱۹۶۴ء میں "تنقید" کے موضوع پر ایک سمینار منعقد کیا تھا جس میں ہندوستان کے بلند پایہ نقادوں نے حصہ لیا تھا۔ اس کتاب میں تقریباً ۱۹ نقادوں کے مضامین شامل ہیں۔ جس سے تنقید کے موضوع پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ ایک لاجواب کتاب۔ قیمت پانچ روپے

فانی بدایونی (حیات، شخصیت اور شاعری) ڈاکٹر مغنی تبسم

فانی کی حیات اور شاعری پر ابھی تک مستقل نوعیت کی کوئی ایسی تصنیف شائع نہیں ہوئی جو تنقید یا سوانح کے نقطۂ نظر سے قابلِ اعتنا ہو۔ یہ کتاب اس کمی کو پوری کرتی ہے۔ ایک تحقیقی مقالہ۔ قیمت پندرہ روپے

سفینۂ حیات (شعری مجموعہ) یحییٰ جیسن والا

غزل میں واردات حسن و عشق کے علاوہ اخلاقی و تمدنی مسائل، حقائق و معارف، تصوف و فلسفہ سبھی کے بیان کی گنجائش ہے۔ مگر سب کا اظہار زبانِ شعر و نغمہ میں ہونا چاہئے۔ اور یحییٰ جیسن والا کی زبان۔ زبانِ شعر و نغمہ ہے۔ پڑھئے اور لطف اٹھائیے۔

(مصور ایڈیشن) قیمت ۱۲/۵۰

اسلام اور عصر جدید (سہ ماہی رسالہ) مدیر۔ ڈاکٹر عابد حسین

اسلام اور عصر جدید کا یہ پہلا شمارہ ہے جس میں ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک کے اہل علم کے مضامین بھی شامل ہیں۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اس موضوع پر آج تک اتنا معیاری پرچہ شائع نہیں ہوا۔ قیمت سالانہ پندرہ روپے۔ فی پرچہ چار روپے

REGD. NO. D 58 JUNE 1969

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI.25

جون ۱۹۶۹ء کا پیام تعلیم مرحوم
ذاکر صاحب کی یاد میں شایع ہوگا
اس میں انتقال کے بعد جامعہ میں سپرد
خاک کرنے تک کا حال ہے۔ ان تین
دنوں تک عزیزوں، رشتہ داروں اور
ان کے ہزاروں، لاکھوں سوگواروں پر جو
بیتی اس کا حال ہے۔ ان کے عادات و
اخلاق پر بہت اچھے، بہت دلچسپ
مضمون ہیں۔ یادگار نمبر تاریخی دستاویز
ہوگا۔ محدود تعداد میں چھپے گا۔ آپ
اسے حاصل کرنا چاہتے ہیں تو چھ روپے
بھیجکر پیام تعلیم کی سالانہ خریداری قبول کیجیے۔

منیجر پیام تعلیم
نئی دہلی ۲۵

پرنٹر و پبلشر سید احمد ولی نے جمال پریس دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا

ماہنامہ

اگست ۱۹۶۹ء

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

معیاری رسائل کی مختصر فہرست

جن کو آپ کے عملی تعاون کی ضرورت ہے

نمبر		رسالہ		ایڈیٹر	پتہ	سالانہ قیمت
۱-	ماہنامہ	"جامعہ"	ایڈیٹر:	ضیاء الحسن فاروقی	جامعہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵	۶/۰
۲-	〃	"کتاب نما"	〃	ریحان احمد عباسی	جامعہ نگر 〃 〃	۲/۰
۳-	〃	"پیام تعلیم"	〃	حسین حسان ندوی	〃 〃 〃	۶/۰
۴-	〃	"شب خون"	〃	ڈاکٹر اعجاز حسین	۳۱۳- رانی منڈی الہ آباد ۳	۱۰/۰
۵-	〃	"شاعر"	〃	اعجاز صدیقی	پوسٹ بکس نمبر ۵۲۶ بمبئی ۸	۸/۰
۶-	〃	"شاہکار"	〃	محمود احمد ہنر	۱۳۴- بخشی بازار- الہ آباد ۳	۱۱/۰
۷-	〃	"گگن"	〃	شمس کنول	۴- لال نا فیلنس آگری پاڑا- ۸- سلا ڈاکٹر آنند راو ناتر روڈ- بمبئی ۱۱	۸/۰
۸-	〃	"صبح امید"	〃	عبد الحمید بوتیر	جامع مسجد بلڈنگ پائی روڈ بمبئی ۳	۶/۰
۹-	〃	"صبا"	〃	سلیمان اریب	۱۱- مجرگاہ معظم جاہی مارکیٹ- حیدر آباد	۱۰/۰
۱۰-	〃	"نقش کوکن"	〃	عشرت حسین خاں	۴۴ جیل روڈ- ایسٹ ڈونگری بمبئی ۹	۴/۰
۱۱-	〃	"پونم"	〃	ناصر زیدی	اعظم پورہ- حیدر آباد	۶/۰
۱۲-	〃	"آہنگ"	〃	سید حسن رضا	۱۱- دیاہ گستنگر- لکھنؤ ۳	۱۲/۰
۱۳-	〃	"سب رس"	〃	اکبر الدین صدیقی	خیریت آباد- حیدر آباد	۶/۰
۱۴-	〃	"معارف"	〃	معین الدین	دار المصنفین- اعظم گڑھ	۸/۰
۱۵-	〃	"برہان"	〃	سعید احمد اکبر آبادی	اردو بازار- دہلی ۶	۶/۰
۱۶-	دو ماہی	"کتاب"	〃	سید جمیل احمد	چوک لکھنؤ	۷/۰
۱۷-	〃	"ادبی تبصرے"	〃	خلیق انجم	انجمن راج- کلاں محل- دہلی ۶	۴/۰
۱۸-	〃	"دستاویز"	〃	میرا	۱۴۰- ڈی بلاک، کیلاش کالونی نئی دہلی۔ فی شمارہ	۲/۵۰
۱۹-	سہ ماہی	"گفتگو"	〃	علی سردار جعفری	۲- کیفی بھون جے ٹاٹا روڈ بمبئی ۱	۲۰/۰
۲۰-		"اسلام اور عصر جدید"	〃	ڈاکٹر سید عابد حسین	جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵	۱۵/۰
۲۱-		"تحریر"	〃	مالک رام	علمی مجلس ۴۲۹۵ احاطہ نواب صاحب فراشخانہ دہلی	۱۲/۰
۲۲-		"نوائے ادب"		عبد الرزاق قریشی	انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی ۱	۶/۰
۲۳	ہفتہ وار	"ہماری زبان"		آل احمد سرور	انجمن ترقی اردو- علی گڑھ	۵/۰

نوٹ: ماہنامہ "جامعہ" ماہنامہ "کتاب نما" ماہنامہ "پیام تعلیم" اور "اسلام اور عصر جدید" کی سالانہ قیمت [illegible] بھیج سکتے ہیں۔ باقی رسائل کی سالانہ قیمت براہ راست بھجوائیے۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ بمبئی ۳

اشاریہ

گزشتہ ۲۰-۲۱ برس میں ہمارے ملک میں زبردست تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ لوگوں کے سوچنے، سمجھنے اور محسوس کرنے کے انداز بدل گئے ہیں اور جس طرح ہم نئے فکری اور جذباتی تقاضوں سے دوچار ہوئے ہیں اُس کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہوگیا ہے کہ ہم اور باتوں کے ساتھ ساتھ اپنی پیاری زبان اردو کی طرف بھی خصوصی توجہ دیں اور اسے ایک علمی زبان اور اس کے ادب کو ایک آفاقی ادب کی حیثیت سے پڑھائے جانے کے لیے راہیں ہموار کریں تاکہ اس کی جامعیت اور وسعت کا دوسروں کو بھی اندازہ ہوسکے اور پھر یہ غلط تصور ختم کیا جاسکے کہ اردو ادب صرف چند عشقیہ مضامین اور چند قصوں تک ہی محدود ہے۔

ان تقاضوں کے پیش نظر پھر یہ لازم ہوجاتا ہے کہ اردو زبان و ادب کی تعلیم و تدریس کو بھی نئے حالات سے ہم آہنگ کیا جائے۔ اب حالت یہ ہے کہ تعلیم کی ہر سطح پر جو نوجوان اردو پڑھ رہے ہیں، ان کی استعداد اور معیار پہلے سے کہیں پست ہوگئے ہیں اور اسی وجہ سے اس بات سے یقیناً اتفاق ہی کیا جائے گا کہ اردو کے نصاب میں زمانے کے تقاضوں اور طلباء کی ضرورتوں اور دلچسپیوں کے مطابق مناسب تبدیلیاں بہت ضروری ہوگئی ہیں۔ لیکن دوسری طرف نصابی کتابوں کو چھوڑ کر تقریباً سبھی اصناف میں لکھنے والوں کے نئے کارنامے بھی سامنے آئے ہیں جن میں بہت سی یقیناً ایسی کامیاب تحریریں بھی ہیں، جو ہر طرح اعلیٰ ادبی معیار کی کسوٹی پر پوری اُترتی ہیں اور ان کی مناسب پذیرائی ضروری ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ ہم نے جہاں تک ممکن ہوا اس فرض کو نبھایا ہے۔ مکتبہ جامعہ نے گزشتہ چند سالوں میں جو کتابیں شائع کی ہیں وہ اسی ذیل میں آتی ہیں۔

یہ شکوہ کہ اردو میں درسی اور نصابی کتابوں کا قحط ہے، تمام تر بے بنیاد نہیں ہے لیکن جہاں تک ہم سے ہوسکا ہم نے نئے نصابی اور درسی ضرورتوں کو بھی پورا کرنے کی

کوشش کی ہے۔ اس لیے آپ کو یہ جان کر یقیناً مسرت ہوگی کہ مکتبہ جامعہ اپنی نئی اسکیم کے تحت اردو نظم و نثر کے شہ پاروں کا جو سلسلہ شائع کر رہا ہے اس میں ہر کتاب کی ضخامت اوسطاً ۲۰۰ سے ۳۰۰ صفحات تک ہوگی اور اسے نہایت ارزاں قیمت پر فروخت کیا جائے گا۔ سردست اس منصوبے کے تحت ولی، میر، درد، آتش، سراج اور نظیر اکبرآبادی کے انتخابات، طلسم ہوشربا اور فسانہ آزاد کی تلخیصیں، موازنۂ انیس و دبیر، یادگار غالب، شریف زادہ، گذشتہ لکھنؤ، آرائش محفل اور مقدمہ شعر و شاعری وغیرہ اہم کتابیں پروگرام میں شامل ہو چکی ہیں اور ان میں کچھ بہت جلد شائع ہو کر منظر عام پر بھی آنے والی ہیں۔

یہ کتابیں زیادہ سے زیادہ صحت متن کے ساتھ شائع کی جا رہی ہیں۔ امید ہے اپنی افادیت کی وجہ سے یہ کتابیں کالج اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل کیے جانے کی مستحق قرار پائیں گی اور طلبا، وتحقیق کرنے والے زیادہ اطمینان اور اعتماد کے ساتھ ان سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں گے۔

مکتبہ جامعہ کی کچھ عام کتابیں بھی، جن میں دو شایع ہو کر منظر عام پر بھی آ چکی ہیں اور دو ستمبر کے شروع تک تیار ہو رہی ہیں، ہر طرح قابلِ ذکر ہیں اور ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ کہلائے جانے کی مستحق۔

پہلی کتاب قاضی عبدالستار صاحب کا ناولٹ 'صلاح الدین ایوبی' ایک طرح سے تاریخی ناول کی حیثیت رکھتا ہے لیکن مصنف نے اس مثالی انسان کی کہانی جس دل چسپ انداز میں لکھی ہے اور اسلام کے اس جری و بیباک جنرل کے حالات کو جس خوبصورتی سے پیش کیا ہے اس نے کتاب کی افادیت اور اہمیت کو واقعی اور بھی دوبالا کر دیا ہے۔ یہ کتاب شایع ہو چکی ہے۔

دوسری کتاب، مہندر ناتھ صاحب کا ناول "پیار کا موسم" ایک نہایت دل چسپ رومانی ناول ہے۔ رنگینیوں سے بھرپور اس طرح کی کہانیاں پڑھنے والوں کے لیے یہ ناول یقیناً دل چسپ ثابت ہوگا۔ یہ ناول اگست کے آخر تک شایع ہو جائے گا۔

م۔ندیم کی کتاب "تیس مار خاں کے کارنامے" بچوں کے لیے ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں تیس مار خاں کی حماقتوں کا ذکر ہے 'بے وقوفوں سے عقل سیکھو' والے مقولے کے مصداق، ظاہر ہے ان حماقتوں سے بچے اچھا ہی سبق لیں گے۔ یہ کتاب بھی شایع ہو چکی ہے۔

مکتبہ جامعہ کی چوتھی کتاب ہے "پچھلی رات" یہ کتاب یوں تو اب سے پہلے ہی شایع ہو جانا چاہئے تھی لیکن چند ناگزیر مجبوریوں کی وجہ سے اس کا نمبر اب آسکا ہے۔ پچھلی رات رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کی غزلوں کا انتخاب ہے اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس انتخاب کو کسی اور نے نہیں بلکہ خود فراق صاحب نے ترتیب دیا ہے ظاہر ہے اس کے بعد اس کی افادیت میں کیسے شبہ ہو سکتا ہے۔

یہ کتاب فراق صاحب کی اب تک کی تقریباً ایک ہزار غزلوں کا نچوڑ یعنی ان کی غزلیات کا ایک ایسا اچھوتا اور بہترین انتخاب ہے جو ان کے کلام کی حقیقی نمائندگی کرے گا اور جنھیں لوگ مدتوں یاد رکھیں گے۔

یقین ہے اس کتاب کو ہر جگہ پسند کیا جائے گا اور اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔ یہ کتاب ستمبر کے شروع ہفتے تک منظر عام پر آرہی ہے۔

***

● ۶؍اگست ۱۹۶۹ء کو کتب خانہ عزیزیہ

(اردو بازار دہلی ۶) کے مالک مولوی سمیع اللہ قاسمی صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مولانا مرحوم اپنی ذات میں ایک انجمن تھے اور اردو بازار کی جان۔ ان کے انتقال سے اردو بازار کی وہ محفل سونی ہو گئی جو برسہا برس تک سیاستدانوں، شاعروں اور ادیبوں سے بارونق رہی۔ اردو کے بڑے سے بڑے شاعر نے کتب خانہ عزیزیہ کو اپنے وجود سے رونق بخشی، بڑے بڑے ادیبوں نے بلکہ یہاں ادبی گتھیاں سلجھائیں اور مسافروں اور بیروزگاروں نے ان کی دوکان کو اپنی پناہ گاہ سمجھا۔ سیاست ان کی گھٹی میں پڑی تھی حضرت مفتی کفایت اللہ مرحوم سے قرابت داری نے اسے اور جلا بخشی جس کے نتیجے میں کئی بار جیل خانے بھی جانا پڑا انگریزوں کے دور میں بھی اور کانگریس راج میں بھی۔ مولانا انور صابری نے ذیل کے قطعہ میں مرحوم کو جو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے ہم بھی ان کے ساتھ دعا گو ہیں کہ اللہ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

سمیع اللہ مردِ خوش طبیعت — نظر تھی جس کی نورِ حق سے معمور
گذاری جس نے ساری زندگانی — ہمیشہ شادماں ہر وقت مسرور
احبا کے لیے کوشان خدمت — غریبوں کی خبر گیری پہ مجبور
جوادوں کا نشانِ زندگی تھا — باندازِ مزاج سعی مستور
اٹھا خود دوستوں کی انجمن سے — ہمیں تنہا بنا کر سب کو رنجور

انورؔ اس کی رحلت کی لے گئی ہے
اجل نے بھی کیا ہے پاس مغفور

مخمور سعیدی

غزل

یاد پھر بھولی ہوئی ایک کہانی آئی
دل ہوا خون، طبیعت میں روانی آئی

صبحِ نو نغمہ بہ لب ہے، مگر اے ڈوبتی رات
میرے حصّے میں تری مرثیہ خوانی آئی

زرد رو تھا کسی صدمے سے اُبھرتا سورج
یہ خبر ڈوبتے تاروں کی زبانی آئی

ہر نئی رُت میں ہم افسردہ و دلگیر رہے
یاد گزرے ہوئے موسم کی جوانی آئی

پا گئے زندگیِ نو کئی مٹتے ہوئے رنگ
ذہن میں جب کوئی تصویر پرانی آئی

خشک پتّوں کو چمن سے یہ سمجھ کر چُن لو
ہاتھ شادابیِ رفتہ کی نشانی آئی

یاد کا چاند جو اُبھرا تو یہ آنکھیں ہوئیں نم
غم کی ٹھہری ہوئی ندی میں روانی آئی

دل بہ ظاہر ہے سبک دوشِ تمنّا مخمور
پھر طبیعت میں کہاں کی یہ گرانی آئی

(سیہ بر سفید، شاعر: مخمور سعیدی، صفحات: ۱۸۶، قیمت: ۵۰/۲، حوالہ ص: ۱۱۷)

تعارف

بکھرے ورق

'بکھرے ورق' ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کے چند بنگلہ مضامین کا اردو ترجمہ ہے۔

ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی عالمی شہرت کے مالک، مستند ماہر لسانیات اور عالم ہیں۔ علمی شغف، گہرے اور وسیع مطالعے، باریک نظری اور تجزیاتی ذہن نے ان کی تحریروں کو ایک بلند مرتبہ اور عالمی مقبولیت بخشی ہے۔ وہ مشرق و مغرب میں یکساں مقبول ہیں اور ہر جگہ ان کی تحریروں کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کی علمیت اور ان کی تحریروں کی اہمیت و افادیت کے سب ہی معترف ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا:

"ڈاکٹر چٹرجی مشرقی اور مغربی علوم کا ایک کم یاب سنگم ہیں۔ مختلف زبانوں کے آپس کے تعلقات پر ان کی جیسی عمیق اور بسیط نظر بہت ہی کم لوگ رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر تمام دنیا میں ان کا لوہا مانا جاتا ہے... مجھے ڈاکٹر چٹرجی کی سب سے اہم خصوصیت اس میں نظر آتی ہے کہ وہ زبانوں کی بنیادوں کو جانتے ہیں اور تہذیبوں کی روحوں کو پہچانتے ہیں۔ انھوں نے علم سے یہ کام نہیں لیا کہ علم کو جدا جدا کر دیں بلکہ وہ علوم کے باہمی رشتوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ تخریبی نہیں بلکہ تعمیری کام انجام دیتے ہیں۔ جہالت اور ہٹ دھرمی سے جو لوگ اپنے خیالات کو دوسروں پر لادتے یا ٹھونستے ہیں ڈاکٹر چٹرجی ان میں سے نہیں ہیں اور نہ مختلف تہذیبوں پر سطحی نظر رکھتے ہیں بلکہ ان کی گہرائیوں اور آپس کے اتحاد اور میل ملاپ پر عمیق نظر رکھتے ہیں۔ تاریخی تفرقہ اور بھید بھاؤ کے پاگل پن میں پھنس کر وہ راہ بھٹکتے نہیں، بلکہ علم کا سارا بوجھ اپنے کاندھوں پر لیے ہوئے وہ یکجہتی کا خواب دیکھتے ہیں جو ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں ہے۔"

م ہو یا ثقافت، مذہب ہو یا تہذیب ڈاکٹر چٹرجی اس میں رواداری اور وسیع المشربی کو

تلاش کرتے ہیں اور اس کے مطالعے اور تجزیے میں بھی اسی رواداری اور وسیع المشربی سے کام لیتے ہیں تنگ نظری اور کٹرپن چاہے وہ کسی صورت میں ہو ڈاکٹر چٹرجی اس کے مخالف ہیں۔

لسانیات ڈاکٹر چٹرجی کا خاص موضوع ہے۔ لسانیات پر ان کا سا علم اور عمیق و بسیط نظر رکھنے والے کم ہی ہوں گے۔ مستند ماہر لسانیات ہونے کے علاوہ ڈاکٹر چٹرجی زبردست عالم اور مانے ہوئے ادیب بھی ہیں۔ مختلف مذاہب، فلسفوں اور تہذیبوں کا مطالعہ، ان کے رشتوں اور سلسلوں کی تلاش اور ان کی تاریخی نوعیت کو سمجھنا بھی ان کا مشغلہ رہا ہے۔ وہ کلکتہ یونیورسٹی میں comparative philosophy کے شعبہ کے صدر رہے ہیں اور مختلف زبانوں کے علاوہ تاریخ اور تمدن اسلام کی تعلیم بھی دیتے رہے ہیں۔ بکھرے ورق میں ان کے جو مضامین شامل ہیں وہ لسانیاتی، علمی اور ثقافتی نوعیت کے ہیں۔

سنیتی کمار چٹرجی کے یہ مضامین تہذیب و تمدن کے مطالعے میں بہت سی نئی باتیں ہمارے سامنے لاتے ہیں اور زبان و تہذیب کے مختلف رشتوں کے سمجھنے میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔

کتاب کے شروع میں ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ (جنھوں نے ان مضامین کا انتخاب اور ترجمہ کیا ہے) کا لکھا ہوا تعارف ہے۔ اس میں ڈاکٹر چٹرجی کی شخصیت اور ان کی علمی حیثیت کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ تعارف خاصہ پُر از معلومات ہے اور ڈاکٹر چٹرجی کے بارے میں بہت سی ضروری باتوں کو پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ کے مضامین اور کتابیں اردو میں شائع ہو چکی ہیں۔ اور ان کے ذریعے ہمیشہ انھوں نے اردو زبان کو کچھ نہ کچھ ضرور دیا ہے۔ بکھرے ورق بھی ان کا اردو زبان کو ایک اہم دین ہے۔ اردو زبان میں ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کے مضامین کا یہ پہلا ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر بھٹاچاریہ نے آسان اور عام فہم زبان میں ڈاکٹر چٹرجی کے خیالات کو پیش کیا ہے۔ اگر ڈاکٹر بھٹاچاریہ ڈاکٹر چٹرجی کے لسانیات سے متعلق مضامین کا اردو میں ترجمہ کریں تو وہ یقیناً ایک بڑا کام ہوگا۔

بکھرے ورق کو مکتبہ جامعہ نے شائع کیا ہے اور اس کی قیمت صرف تین روپے ہے۔

پورا جوان

آنکھوں میں کاجل کی گھٹا، لب لعل درخشاں، گال گلابستاں، سراپا موسم بہار کی آمد آمد ـــ یہ تھی مہندری۔ وہ کبھی بچپن کو الوداع کہتی دکھائی دیتی اور کبھی اسی بچپن کے گلے لگتے نظر آتی۔ کبھی وادیٔ شباب میں محوِ خرام، اور کبھی طوفانِ شباب سے بدکتی ہوئی سی لگتی۔ غرض یہ کہ وہ بچپن او جوانی کی حدِ فاصل پر کسی بھٹکی ہوئی ہرنی کی طرح وحشت زدہ سی رہتی تھی۔

سوہنے کو مہندری سے عشق تھا، مہندری کو سوہنے سے محبت تھی لیکن سوہنا اپنی من موہنی کو نہیں پا سکتا تھا اور مہندری اپنے من موہنی کو حاصل نہیں کر سکتی تھی۔

ان کے راستے کی چٹان کابلا سنگھ تھا۔

ایک صبح سوہنے نے اپنے چچا کا گھوڑا مانگا اور منزلیں مارتا ہوا اٹھارہ کوس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اب وہ سائیں والا نام کے گاؤں کے باہر کابلا سنگھ کے کچی اینٹوں کے بنے مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ سوہنے کا اصلی نام بلکار سنگھ تھا لیکن وہ اتنا حسین تھا کہ لوگ اسے سوہنا (خوب صورت) کہنے لگے۔ اس کے حُسن نے علاقے کی حسین ترین لڑکی کا دل موہ لیا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ کس قدر مجبور اور بے دست و پا تھا۔

اس کا گھوڑا بے دم سا ہو کر نتھنے پھڑپھڑا رہا تھا۔ پسینے کی وجہ سے اس کی جلد گیلی مخمل کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ خود سوار کے چہرے پر پسینے کے موتیوں کی بارش ہو چکی تھی۔ اس کا سرخ سپید چہرہ، جو ابھی باقاعدہ داڑھی اور مونچھوں سے بری تھا، تمتمایا ہوا تھا۔ اس کی تیز آنکھیں گھوم پھر کر کابلا سنگھ کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس نے پہلے کبھی اس آدمی کو نہیں دیکھا تھا۔ آتا پتا پوچھتا وہ مکان تک پہنچ گیا۔ مکان کے باہر کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ سوہنا کو معلوم تھا کہ کابلا سنگھ کے تین بچے موجود تھے۔ لیکن اس نے بچوں سے ان کے باپ کے بارے میں پوچھ گچھ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

کابلا سنگھ کے پڑوس میں ایک سانسی رہتا تھا۔ (سانسی وہ لوگ ہوتے تھے جو کتوں کو ساتھ لے کر جنگلی بلوں کا شکار کھیلتے تھے۔ لطف یہ ہے کہ وہ بلوں کو کھا بھی جاتے تھے!) اس وقت ادھیڑ عمر کا

ساہنی اپنے صحن کی چھوٹی سی دیوار پر بیٹھا حقّہ گڑگڑا رہا تھا۔ اس کے لمبے لمبے پٹے اس کی گدّی تک پہنچے تھے اور ان میں تین چوتھائی چاند کی شکل کا کنگھا پھنسا ہوا تھا۔ سوہنے نے اس کے قریب پہنچ کر ابرو سے پڑوس والے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "کیا کابلا سنگھ اسی مکان میں رہتا ہے؟"

ساہنی نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر اس کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا "آہو۔"

"وہ گھر میں ہے کیا؟"

"نہیں، صرف اس کے بچّے ہیں۔ وہ بھی اب آتا ہی ہوگا۔"

ساہنی کی بات ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ دُور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کا شور سنائی دیا۔

ساہنی نے حقّہ کی نَے سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "لو! وہ آ گیا۔"

قریب آ کر گھوڑا ایک پھیریاں لینے لگا۔ ڈھول کے بادل بلبلا کر اس کی ٹاپوں کے نیچے سے نکل کر ادھر اُدھر اُڑنے لگے۔ اسی کیفیت میں سوار نیچے اُتر پڑا۔ سوہنے نے اسے بغور دیکھا۔ اس کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ سینہ چھاج کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ کمر کا حلقہ اب بھی مناسب حد سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ ٹانگیں لمبی اور سڈول تھیں۔ چہرے کا رنگ ایسا تھا جیسے کسی لق و دق صحرا میں ڈوبنے کے بعد تاریکی پر پھیلا رہی ہو۔ صرف آنکھیں غیر معمولی طور پر چمکیلی تھیں۔ مجموعی اعتبار سے وہ ناگ راج کی طرح حسین اور پُرکشش تھا۔

کابلا سنگھ گھوڑے کی لگام تھامے اپنے احاطے میں داخل ہو گیا۔ ساہنی نے دُور سے پکار کر کہا: "کابلا سنگھ تم سے یہ لڑکا ملنے کے لیے آیا ہے"۔

کابلا سنگھ نے اس کی بات بظاہر سُنی اَن سُنی کر دی۔ اس نے احاطے کے کونے میں کھپریل کے نیچے والے بانس سے بندھی رسّی کا پھندا گھوڑے کی گردن میں ڈال دیا۔ اس وقت تک گھوڑے پر سوار سوہنا اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

کابلا سنگھ نے کمر کا پٹکا کھول کر اس سے اپنے جوتے جھاڑتے ہوئے پوچھا "کہو کیا بات ہے؟ کیسے آئے ہو؟"

"میں آیا تو تھا تمھارا کھوپڑا توڑنے کے لیے..."

کابلا سنگھ نے اس کی طرف پیٹھ پھیر دی اور کچھ رُک کر بولا: "تو؟"

سوہنا گھوڑے سے اُتر پڑا اور تیز لہجے میں کہنے لگا "لیکن مجھے چار پانچ سال تک انتظار

کرنا پڑے گا۔ اِس وقت تمھارا گھوڑا توڑنا میرے بس کی بات نہیں ہے"۔

"چار پانچ سال کے بعد کیا ہوگا ؟" یہ کہتے ہوئے بھی کابلا سنگھ نے اس کی طرف ایک نظر ڈالنے کی ضرورت تک محسوس نہیں کی۔

اس کی اس بے اعتنائی سے سوہنے کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ اس نے کہا: "اس وقت تک میں پورا جوان ہو جاؤں گا"۔

"یعنی بالغ ہو جاؤ گے"۔

سوہنا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ گھوڑے سے اُتر کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ "میں نے سُنا ہے کہ کسی زمانے میں تم نے علاقے بھر میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ اب بھی تمھاری دھاک ہے۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ تم اپنی دھاک کا اس قدر ناجائز فائدہ اُٹھانے سے باز نہیں آتے"۔

کابلا سنگھ نے اس کے گھوڑے کی کاٹھی پر کہنی ٹیک دی اور اس کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھنے لگا۔ سوہنا اس کی اس کیفیت کو سمجھ گیا، اور اگلی بات کہنے کے لیے مناسب الفاظ کی تلاش کرنے لگا۔

گھوڑے کی پیٹھ کے اوپر سے پرلی طرف کو تھوکتے ہوئے کابلا سنگھ نے کہا: "چار پانچ سال کے بعد جب تم پورے جوان ہو جاؤ گے تو مجھے امید ہے کہ اس وقت تمھاری عقل اس قدر کچی نہیں رہے گی"۔

سوہنے نے اس کی اس چوٹ کو توجہ کے قابل نہیں سمجھا۔ اسے تو صرف اپنی بات کہنے میں دلچسپی تھی: "تمھاری پہلی بیوی مر چکی۔ اب تم کو اپنا گھر بسانے اور بچوں کی دیکھ بھال کرنے کے لیے عورت کی ضرورت ہے... اور تم نے مہندری کا ہاتھ اس کے باپ سے مانگا ہے"۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو... یہی نہیں، مہندری کا باپ بھی اس بات پر راضی..." اس کی آواز ایسی تھی جیسے کہیں بہت دور سے بادل گرج رہا ہو۔

اس پر سوہنے نے اپنے گھوڑے کی لگام کو جھٹکا دیا اور دھچکے سے آگے بڑھا تو کہنی کے نیچے سے سہارا ہٹ جانے کے باعث کابلا سنگھ ہلکا سا غوطہ کھا کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

سوہنا گھوڑے پر سوار ہو گیا اور مونہہ میں کف بھر کر بولا "اب تم انتظار کرو میں بھی انتظار کروں گا تین ــ چار ــ پانچ برس کے بعد میں ایک روز آؤں گا... اور تمھارا سر کاٹ کر لے جاؤں گا"۔

یہ کہہ کر سوہنے نے گھوڑے کو ایڑ دی۔ گھوڑا پہلے ہمٹا اور پھر پھر کر بہ یک جست ہوا سے باتیں

کرنے لگا۔

جب تک گھوڑ سوار نظر آتا رہا کابلا سنگھ اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔

جس تیز رفتاری سے سوہنا سائیں والا پہنچا تھا اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ وہ واپس لوٹا پھر بھی اپنے گاؤں تک پہنچتے پہنچتے دن ڈھل گیا۔

مہندری اسے گاؤں کے باہر ہی مل گئی۔ وہ نہ جانے کب سے اس کے انتظار میں تھی۔ حسب معمول سوہنا مہندری کی گہری آنکھوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ کہنے لگی: "تم گاؤں سے نکل کر گئے اور تھوڑی دیر کے بعد کابلا سنگھ یہاں آ پہنچا۔ وہ شادی کی بات پکی کرنے آیا تھا"۔

"تو بات پکی ہو گئی؟"

"ہاں"۔ وہ چہک کر بولی۔

سوہنا سوچنے لگا کہ عورتیں بھی کس قدر طوطا چشم ہوتی ہیں۔ کیسی دیدہ دلیری سے بات پکی ہو جانے کا اعتراف کر رہی ہے۔

وہ گھوڑے سے اتر چکا تھا۔ اس کا دل بھاری ہو رہا تھا اور وہ لگام ہاتھ میں لیے دھیرے دھیرے چاچا کے مکان کی جانب بڑھ رہا تھا۔

مہندری نے بیان جاری رکھا: "میں گھبرا گئی۔ تم گاؤں میں نہیں تھے اور وہ بات پکی کرنے آ پہنچا تھا۔ پھر بھی میں نے ہمت سے کام لے کر الگ سے کابلا سنگھ کو سب کچھ بتا دیا۔ میں نے تمھارے بارے میں بھی سمجھا دیا۔ اسے اس بات کا احساس کرا دیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کتنی ... کہ ہم ایک دوسرے کو کتنا چاہتے ہیں۔ میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے کہ تمھیں تو اور بھی لڑکیاں مل جائیں گی لیکن مہندری کی سوہنا اور سوہنے کو مہندری نہ مل سکے گی ..."

مہندری بچکانہ چاؤ سے بولی "سوہنے! وہ جتنا باہر سے قد آور ہے اتنا ہی قد آور بھیتر سے بھی نکلا۔ میری باتیں سن کر وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا کہ اسے ان سب باتوں کا کچھ بھی پتہ نہیں تھا۔ وہ سیدھا اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔ میرا چاچا (باپ) اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ گھوڑے کی ایک رکاب میں پاؤں جما کر اس نے چاچا کی طرف دیکھا اور بولا "سردار جی! میں نے مہندری اور سوہنے کی شادی پکی کر دی ہے۔ اب آپ بیاہ کا انتظام کر ڈالیں تو بہتر رہے گا"۔

سوہنا دم بخود رہ گیا۔ مہندری نے اس کی یہ کیفیت دیکھ کر پوچھا "جب تم اس سے ملے تھے تو اس نے تمھیں کچھ بتایا ہوگا؟"

سوہنا اُفق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ آکاش پر اکا دکا تارا دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ بوجھل آواز میں بولا "نہیں ۔۔۔ میں نے اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا"

جب سے کابلا سنگھ کی عورت مری تھی اس کے گھر کا کھانا ایک مہری تیار کرتی تھی۔ کابلا سنگھ کی عادت تھی کہ صبح داتون مونہہ میں ڈال کر کلہاڑے سے ایندھن کے لیے دو چار لکڑیاں پھاڑ ڈالتا تھا۔ آج صبح بھی وہ دانتوں میں داتون دبائے اور ہاتھ میں کلہاڑا اٹھائے احاطے میں پڑے ہوئے موٹے موٹے لٹھوں کی طرف بڑھا۔ اسے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سُنائی دی۔ یہ اس کے اپنے گھوڑے کی آواز نہیں تھی۔ نظر اُٹھا کر دیکھا تو سامنے سوہنا گھوڑے سے اُتر رہا تھا۔

کلبلے نے اس کی طرف حسب عادت توجہ نہیں دی۔ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر تھوک کر اس نے کلہاڑا ہوا میں اُٹھایا اور پھر کلہاڑا لٹھے میں پیوست ہو گیا۔ اس نے دستے کو ہلا جُلا کر بھاری آواز میں کہا "سوہنے معلوم ہوتا ہے کہ تم ایک رات ہی میں پورے جوان ہو گئے ہو۔ مجھے چار پانچ سال تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔

چند لمحوں تک سکوت طاری رہا۔

ایک دم سوہنے کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولا، "ہاں کابلا سنگھ! میں ایک رات ہی میں پورا جوان ہو گیا ہوں"۔		(بشکریہ "شمع" دہلی)

● ۳۰ جولائی کو ڈاکٹر عندلیب شادمانی کا بعمر ۶۵ سال، ڈھاکہ میڈیکل کالج کے ہسپتال میں انتقال ہو گیا۔ شادمانی صاحب ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو و فارسی کے صدر تھے اور ان کا تعلق اردو نثر نگاروں کی اس نسل سے تھا جس نے رومانی اسلوب کو فروغ دیا۔ ادبی تنقید و تاریخ اور تحقیق کے دائرے میں بھی ان کی خدمات ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائیں گی۔

اندر جیت لال

فضائی سفر اور چاند کی دُنیا

شروع شروع میں انسان نے دریاؤں کے پاٹوں اور پہاڑوں کی بلندیوں کو سر کیا۔ آہستہ آہستہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنے کا کام مہم کی شکل اختیار کرتا گیا۔ پھر پربت کی چوٹی سر کرنے کی بات عام ہوگئی اور دنیا کے مختلف پہاڑوں مثلاً ایلپس، ہمالیہ وغیرہ کی چوٹیوں پر جتھے بنا بنا کر لوگ چڑھنے لگے۔ ایسی مہمیں کچھ ناکام ہوئیں اور کچھ کامیاب۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنے کے کام میں جن مشکلوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا اس کی ایک الگ داستان ہے۔ مگر ایک بات ظاہر ہے کہ فضا میں اوپر سے اوپر تک پہنچنے کا انسانی جذبہ روز بروز بڑھتا گیا۔ اس طرح ہُوا یا خلا کو پار کرنے اور فضائی سفر میں آگے بڑھنے کا کام کئی برسوں سے بڑھتا جارہا ہے۔

فضائی سفر راکٹ کی ایجاد سے شروع ہوا۔ پہلی بڑی لڑائی کے دنوں میں ایک امریکی نوجوان نے رابرٹ ایچ گوڈارڈ' کا نام قابلِ ذکر ہے جس نے راکٹ پر زیادہ کام کیا۔ پچھلے کئی برسوں سے راکٹ تیز سے تیز تر بنتے جارہے ہیں۔ دوسرے ان کی رفتار اور فضائی اڑان میں بڑی ترقی ہوئی ہے۔ دوسری بڑی لڑائی میں جرمنی نے اپنے دشمنوں کو ڈرانے کے لیے راکٹوں کا استعمال کیا لیکن جنگی مصروفیتوں کی وجہ سے فضائی سفر کا کام کچھ سالوں کے لیے لگ بھگ بند ہوگیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب حالات کچھ ٹھیک ہوگئے تو دنیا کے سب سے بڑے ملکوں نے زمین سے اوپر اڑنے اور چاند کی طرف سفر کرنے کے پروگرام بنانے شروع کیے۔ اس طرح راکٹ کے ذریعے اوپری فضا کے متعلق زیادہ سے زیادہ سمجھنے کے لیے زور شور سے کام شروع ہوگیا۔

زمین سے اوپری فضا کی طرف سفر کرنے میں سب سے بڑی مشکل زمین کی کشش ثقل کی ہے۔ پہلے اس کشش ثقل کو سمجھیے۔ دُنیا کی ہر چیز زمین سے ایک رشتہ رکھتی ہے اور زمین کی سطح پر ٹکی ہوئی ہے۔ مٹی کا ڈھیلا، گیند، پھل، کتاب، کچھ بھی اوپر کی طرف پھینکیے۔ خود بخود واپس زمین پر آجائے گی۔ آپ کوئی چیز کتنی ہی زور سے اوپر کی طرف کیوں نہ پھینکیں نتیجہ یہ ہوگا کہ دھم سے زمین پر آپڑے گی۔ زمین کی اس کشش کو کشش ثقل کہتے ہیں۔ اس کشش کو اگر آپ توڑنا چاہیں تو ایسی چیزیں آپ کو پچیس ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پھینکنا ہوگی۔ اب

مشکل یہ ہے کہ آپ کتنا ہی زور ان چیزوں کے پھینکنے میں لگائیں یہ اس فضا تک نہیں پہنچ سکتیں
جہاں کشش ثقل بھی کام ذکرتی ہو۔ گیند کو زیادہ سے زیادہ سو میل کی رفتار سے پھینک سکتے ہیں اور
رائفل کی گولی کوئی اٹھارہ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے۔ ظاہر ہے کہ کشش ثقل کے دائرے
سے اوپر صرف راکٹ ہی جا سکتا ہے۔

ایک سوال راکٹ میں ایندھن رکھنے کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی ایسا راکٹ ہو جس
میں نو حصے ایندھن ہو اور صرف ایک حصے میں مشین رکھنے کا ساز و سامان ہو تو ایسا راکٹ
بھی اس رفتار سے آدھی سے زیادہ فضا تک نہیں پہنچ سکتا۔ چنانچہ انسان نے اپنی کامیابی
کے لیے ایک اور طریقہ اختیار کیا ہے کہ بیک وقت دو راکٹوں یعنی ایک 'کارپول' اور 'دی لا'
کو ایک دوسرے کے اوپر رکھ دیا جائے۔ سب سے پہلے راکٹ 'دی لا' کو اڑایا جاتا ہے۔ جب
یہ دونوں ایک سو میل کے قریب پہنچ جاتے ہیں تو 'دی لا' کا ایندھن ختم ہو جاتا ہے اور وزن
کے علاوہ کچھ نہیں رہ جاتا۔ جب اس نے ایک کارپول کو سفر کی پہلی منزل تک پہنچا دیا اس کا کام
ختم ہو گیا۔ چنانچہ اب 'بیک کارپول' کا انجن راکٹ میں کام شروع کر دیتا ہے۔ اس وقت 'دی۔لا'
اس راکٹ سے الگ ہو جاتا ہے اور زمین کی طرف گرنا شروع ہو جاتا ہے۔ ایک 'کارپول' تو ابھی
صرف چلنا ہی شروع ہوا ہے۔ چنانچہ یہ راکٹ لگ بھگ ڈھائی سو میل کی اونچائی تک چلا
جاتا ہے۔ اس کے بعد اسے بھی کشش ثقل کی وجہ سے زمین کی طرف لڑھکنا پڑتا ہے۔

فضائی سفر کے ماہرین کا خیال ہے کہ اس طرح سے اگر کئی راکٹ ایک ایک منزل تک
چلتے رہیں تو آخری راکٹ اس منزل یا مقام یا فضا کی اس منزل تک پہنچ جائے گا جہاں زمین کی کشش
ثقل راکٹ پر اپنا اثر نہیں رکھتی ہو گی۔ ایک خیال یہ ہے کہ اگر انسان نقلی یا بناوٹی چاند فضا میں فٹ
کر کے اس کے سہارے کام کرے تو فضائی سفر میں کچھ دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ بناوٹی یا
مصنوعی چاند صرف ایک فٹ یا اس سے زیادہ قطر کا ہو سکتا ہے جن میں چھوٹے چھوٹے آلات
بھرے ہوں گے۔ یہ آلے فضا کی حالت کا پتہ دے سکیں گے۔ اس بناوٹی چاند کو دو سو میل تک
فضا میں لے جانے کے لیے تین منزل راکٹ کو کام میں لایا جائے گا۔ اس اونچائی پر یہ دنیا کے
گرد اٹھارہ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چکر لگائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ رفتار اس رفتار سے کم
ہے جسے ہم کشش ثقل سے آزاد رفتار کہہ سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ چند دنوں تک یہ چاند آہستہ
آہستہ کشش ثقل کی وجہ سے زمین پر واپس آ جائے گا اور جونہی یہ بھاری ہوا سے ٹکرائے گا

یہ بالکل گرم ہو جائے گا۔ اور سفید ہو جائے گا لیکن اس وقت تک یہ انسان کو بتا چکا ہوگا کہ آسمان میں دو سو میل اوپر کی فضائی حالت کیا ہوتی ہے۔

کچھ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ مصنوعی چاند کے ساتھ ساتھ کچھ فضائی اڈّے بھی بنائے جائیں۔ یہ اڈّے زمین سے ایک ہزار میل اوپر بنائے جائیں گے۔ اس بلندی پر اڈّے کو کسی جگہ پر ٹکانے کے لیے سولہ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار کی ضرورت ہوگی۔ فضائی اڈّہ بالکل بند ہوگا تاکہ اس کے اندر جو لوگ رہیں ان کے لیے یہ جگہ سانس لینے کے قابل ہو۔ فضائی اڈّہ بنانے کے لیے تین منزلہ راکٹوں کے استعمال کا خیال ہے یہ باری باری انسان اور سامان کے ساتھ اڑا دئے جائیں گے۔ جب سامان فضا میں جمع ہو جائے گا تو وہ لوگ جو فضائی لباس پہنے ہوں گے اس سامان کو فضائی اڈّے کی صورت میں جوڑ دیں گے۔ خالی راکٹ پھر زمین پر واپس آئیں گے جہاں سے وہ پھر سامان لاد کر اوپر فضا میں واپس جائیں گے۔ یہ بڑی دل چسپ بات ہے کہ فضائی اڈّے میں انسانوں کو کشش ثقل کا کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ بہت سے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ فضائی اڈّے کو گھومنا چاہیے تاکہ انسان کشش کے خیال سے نہ گھبرائیں اور آرام سے سو سکیں۔

جب ایسا اڈّا مکمل ہو جائے گا تو راکٹ فضائی جہاز بنانے کے لیے سامان لانا شروع کر دیں گے جو انسان کو دو لاکھ چالیس ہزار میل دور چاند پر لے جائے گا۔ اس کے لیے تین راکٹوں کا جہاز بنے گا جس میں چاند سے واپسی کی ضرورت بھی ہوگی۔ اب اس جہاز کو مستقل گھر کی طرح چاند پر چھوڑ دیا جائے گا۔ فضائی جہاز تیزی سے چلتا ہوا فضائی اڈّے سے دور سے دور تر ہوتا جائیگا اس کے بعد فضا کے اندھیروں میں غائب ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ چند دنوں کے سفر کے بعد چاند میں آنا شروع ہو جائے گا۔

ایک دو برسوں میں خاص خاص تجربے چاند کی طرف اڑنے کے ہوئے ہیں۔ جن سے چاند کی طرف قدم بڑھانے کے امکانات بڑھتے جا رہے ہیں۔ دو سال پہلے ایک رپورٹ ماسکو سے ملی تھی کہ زمین پر جو طوفان پیدا ہوتے ہیں چاند پر سے ہم ان کی شدت اور رفتار کا بخوبی جائزہ لے سکیں گے۔ ایک ماہر کے قول کے مطابق چاند پر فضا اتنی گنجان نہیں ہے۔ دوسرے سورج اور ستاروں کی نقل و حرکت وغیرہ کو بمقابل زمین کے چاند پر سے زیادہ ٹھیک ڈھنگ سے جانچا جا سکتا ہے۔ یقین ہے کہ چاند دستا سے پر جو کھوج ان دنوں جاری ہے اس سے قدرت کی کئی نامعلوم باتیں سامنے آئیں گی۔ ایک روسی ماہر کا کہنا ہے کہ چاند کی سطح کھردری ضرور ہے۔

اور ناہموار بھی لیکن سائنس دان اس سطح کو انسان کے استعمال میں لاسکتے ہیں۔ ایک خیال ہے کہ سورج گرہن کے وقت جو حصہ زمین پر نظر نہیں آسکتا وہ حصہ چاند کی سطح سے زیادہ روشن دکھائی دے گا۔ چاند پر ستارے دن کو بھی رات ہی کی طرح چمکتے ہیں۔ چاند پر سے زمین زرد رنگ کی ٹکی دکھائی دے گی۔ اور یہ بھی ممکن ہوگا کہ ہم یہ بھی دیکھ سکیں کہ زمین کس طرح اپنے محور کے گرد گھومتی ہے، کس طرح بادل اس کی سطح پر منڈلاتے ہیں اور سمندر بڑے سمندر میں جا گرتے ہیں۔ کچھ چاند کی حرکت کے متعلق بھی جان لیجیے۔ ایک دفعہ پورا ہو جانے کے بعد دوبارہ پورا ہونے میں چاند کو تقریباً ساڑھے انتیس دن کی مدت درکار ہے۔ زمین سے چاند تقریباً ڈھائی لاکھ میل دور ہے۔ چنانچہ اس کو ہمارے طرف گھومنے میں بہت کافی عرصہ لگ جاتا ہے۔ چاند کو ہلال (ایک رات کا چاند) پورا چاند، اور پھر سے ہلال ہونے میں اپنے راستے پر تقریباً آدھے میل فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑنا پڑتا ہے۔

یاد رہے کہ چاند کو شروع ہی سے ایک الگ درجہ حاصل رہا ہے۔ چاند ایسی فضا میں واقع ہے اور اس کی رفتار اتنی زیادہ رہی ہے کہ وہ آج تک زمین پر نہ گر سکا۔ حالانکہ چھوٹے بڑے سیارے آپس میں ٹکراتے ہیں۔ کبھی ایک دوسرے کے نزدیک ہو جاتے ہیں اور کبھی دور کبھی اس زور سے ٹکراتے ہیں کہ آپس میں جڑ جاتے ہیں اور اس طرح زیادہ بڑے ہوتے رہتے ہیں۔ چاند کسی اور سیارے میں سما نہ سکا جیسے جیسے زمین بڑھتی گئی وہ بھی بڑھتا رہا۔ ہاں ہر حالت میں زمین کے گرد گھومتا رہا۔ اس کے باوجود اس کی سطح پر کوئی فضا قائم نہ ہو سکی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ آج بھی چاند ایک ویران کرہ ہے۔ جس پر فضا نہ ہونے کی وجہ سے خلا کا براہ راست اثر پڑتا ہے۔

کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ چاند پرانے وقتوں میں زمین کا ہی حصہ ہوگا۔ ان کے کہنے کے مطابق اس زمانے میں جب زمین اپنی سالانہ گردش میں سورج کے قریب آتی تھی تو دونوں طاقتیں اس پر کام کر رہی تھیں۔ ایک تو زمین کا لٹو کی طرح اپنے محور کے گرد گھومنے کی اور دوسرے سورج کی کشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ناشپاتی کی طرح پچک گئی۔ اس میں ایک ابھار پیدا ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد اس کی شکل ڈمبل جیسی ہو گئی۔ جس کا ایک حصہ دوسرے سے بڑا تھا۔ پھر یہ چھوٹا حصہ اس کا ساتھ نہ دے سکا اور اس سے الگ ہو کر فضا میں تیرتا ہوا دور نکل گیا جسے بعد میں چاند کا نام دے دیا گیا۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ کسی زمانے میں چاند زمین کا حصہ نہ رہا ہوگا کسی وقت میں ایک

اسیارے سے سورج کا ٹکراؤ ہوا اور بہت سے کرّہ وجود میں آگئے۔ چاند ان میں سے
تھا۔ وہ ہماری زمین کا حصہ کبھی نہیں رہا۔ یہ دونوں نظریے آج تک قائم ہیں۔
چاند پر زندگی کیا ہوگی اس کے متعلق ایک نظریہ اور بھی ہے۔ حال ہی میں ایک امریکی
۔ کے ذریعے چاند کی تصویریں لی گئیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ چاند کی سطح پر واقع پہاڑ،
ٹیاں، درّے اور دوسرے جغرافیائی حالات اس طرح ہیں جس طرح زمین پر۔ اونچی چاند کی
پر ایک خاص قسم کی گول پہاڑیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک سائنس دان کے قول کے مطابق چاند کی سطح
ں برف ہی برف ہے۔ ایک اور سائنس دان کا خیال ہے کہ چاند کی سطح صرف ہموار میدان ہے
دوربین سے دیکھنے میں جو دھبے پہاڑیاں اور گھاٹیوں کی شکل میں نظر آتے ہیں وہ اصل میں
۔ھیاں ہیں جو چاند کی سطح پر ڈراؤنی شکل دھارن کر لیتی ہیں۔ سب سے دلچسپ رائے حال ہی
اسپین کے ایک انجنیئر نے دی ہے کہ کسی وقت چاند کی سطح پر بڑی گنجان آبادی تھی۔ ایک
ت میں چاند پر رہنے والے لوگوں میں جنگ ہوگئی جس میں ایٹم بم کا خوب استعمال کیا گیا۔ اور
ج کل جو بے شمار شگاف سوراخ، چاند کی سطح پر نظر آتے ہیں وہ اسی ایٹمی تباہی کی یاد دلاتے ہیں۔
اتنی عجیب و غریب خبروں کے باوجود چاند پر زندگی اور اس کرّہ کو آباد کرنے کے امکانات
ت ہیں۔ ایک امریکی سائنس دان کا قول ہے کہ چاند پر انسان کا مستقبل زیادہ سکھ چین سے بھرا
ہ گا۔ ۱۹۷۵ء تک چاند پر رہنے کے لیے جگہیں بن چکی ہوں گی۔ تب تک کچھ کارخانے اور بجلی
مر بھی بن جائیں گے اور ۱۹۸۰ء تک چاند پر کافی مقدار میں آکسیجن اور پانی سپلائی کرنے کا انتظام
مل ہو جائے گا۔

ماخوذ از "آج کی سائنس۔ نئی روشنی نئی باتیں" (یونیسکو سے اعزاز یافتہ سائنسی کتاب)
صفحات ۱۹۴ مع بارہ تصاویر۔ قیمت پانچ روپے چالیس پیسے۔
(نوٹ: یہ کتاب امریکی خلا بازوں کے چاند پر پہنچنے سے پہلے شائع ہوئی ہے۔ مدیر)

(بقیہ صفحہ ۲۶)

کتاب کی قیمت بھی کچھ زیادہ ہے۔ گٹ اپ بھی اچھا نہیں ہے۔ اس طرف اگر توجہ
کی جاتی تو مجموعہ اور وقیع بن جاتا۔ اس کے باوجود کلام اس قابل ہے کہ اس کی قدر کی جائے۔
یقین ہے کہ اہل نظر اس کی قدر افزائی سے گریز نہ کریں گے۔

سید منیر الحسن

دیناناتھ مست

تسخیرِ قمر

مبارک اہلِ امریکہ، مبارک اے جہاں والو
مبارک اے مہ و انجم، مبارک آسماں والو

بشر نے آج رکھا ہے قدم ماہِ درخشاں پر
ہوا وارد یہ خاکی کرّۂ تنویرِ ساماں پر

وقارِ نوعِ انساں اے خلا بازانِ امریکہ
بڑھائی عالمِ امکاں میں تم نے شانِ امریکہ

کرشمہ وہ دکھایا ہے کہ خود قدرت بھی حیراں ہے
کیا ہے معجزہ ایسا کہ خود حیرت بھی حیراں ہے

نئے کولمبسوں نے کھوج لی ہے اِک نئی دُنیا
کہ لاکھوں میل جا کر فتح کی ہے چاند کی دُنیا

یہ تسخیرِ قمر اوجِ کمالِ نوعِ انساں ہے
ہوا ثابت کہ مٹھی میں بشر کی بزمِ امکاں ہے

ہوئی ہے بارور آخر یہ سعیِ کوششِ پیہم
وہ دیکھو چاند پر ہے اُڑ رہا "تاروں بھرا پرچم"

یہی روزِ ازل سے آرزو تھی نوعِ انساں کی
کہ جا پہنچے قمر پر جستجو تھی نوعِ انساں کی

نیل و ایلڈرن، کولن رہیں گے تا ابد زندہ
رہیں گے صفحۂ تاریخ پر نام ان کے تابندہ

نے گی چھاؤں اب انساں کی اک اک تارے پر
چلے گی گردشِ ہفت آسماں اس کے اشارے پر

کی سطحِ قمر پر جا کے پروازِ عقاب آخر
خلا کی کھوج کی مہمیں ہوئی ہیں کامیاب آخر

ائے دورِ نو رکھی ہے امریکہ نے دنیا میں
نئے امروز و فردا ہوں گے ہر امروز و فردا میں

ک والوں کو دھرتی کا پیامِ امن پہنچایا
نویدِ راحت و بہجت، سلامِ امن پہنچایا

ہلِ عزم و دانش ہیں کرشمے کر دکھاتے ہیں
بڑھا کر ہاتھ اپنا چاند تارے توڑ لاتے ہیں

چڑھیں گے چاند پر اب مستؔ بھی جام و سبو لے کر
نگارِ ماہ رو لے کر، بہارِ رنگ و بُو لے کر

نئی مطبوعات

کتاب	مصنف	مقام و ناشر	قیمت
پیاس کا موسم (ناول)	مہندر ناتھ	نئی دہلی ۲۵، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ	۳/۵۰
عیارِ غالب (ادبی)	مالک رام	دہلی، علمی مجلس	۷/۰۰
مثنوی زہرِ عشق (ڈی لکس اڈیشن)	امیر حسن نورانی	" مکتبہ شاہراہ	۲/۵۰
متاعِ نظر	مرتبہ، نظر برنی	نئی دہلی ۲۵، جامعہ نگر	۳/-
فکر و نشاط (شعری مجموعہ)	جوش ملیح آبادی	دہلی، بھارتی پبلیکشنز	۹/-
یلغار (ناول)	نسیم حجازی	" تاج پبلشرز	۱۵/-
غالب (ادبی)	غلام رسول مہر	" " "	۱۰/-
لکھنؤ کی زبان (ادبی)	باقر شمس لکھنوی	" صائقہ بکڈپو	۵/-
شرحِ دیوانِ غالب "	حسرت موہانی	" " "	۴/-
شیشے میں بال آگیا (ناول)	ضیا عظیم آبادی	" " "	۶/-
آندھیاں "	انیس مرزا	" آفاق بکڈپو	۳/۵۰
عاشی "	رضیہ بٹ	لکھنؤ، نسیم بکڈپو	۸/-
زخم اور ناخون "	فاطمہ انیس	" مکتبہ دین و ادب	۵/-
غالب سرائی (ادبی)	لطیف الرحمٰن	کلکتہ، عثمانیہ بکڈپو	۴/-
جوئے کہکشاں (شعری مجموعہ)	امجد نجمی	کٹک، اردو پبلشرز	۴/-
پیکرِ غالب (ادبی)	محمد عبداللطیف	حیدرآباد	۲/۷۵
غالب اور حیدرآباد "	ضیاء الدین احمد شکیب	" ادبی ٹرسٹ	۷/-
فانی بدایونی بحیثیت اردو شاعر	مغنی تبسم	" " "	۱۵/-
ڈاک بنگلہ (ناولٹ)	اے۔ حمید	دہلی، ہند پاکٹ بکس	۲/-
باسٹھ دن "	دت بھارتی	" " "	۲/-
وہ کون تھا "	کرنل رنجیت سنگھ	" " "	۲/-
آپ بیتی	خان عبدالغفار خاں	" " "	۲/-

جامِ نو

(تبصرے کے لیے کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

سبزۂ بیگانہ

مجموعۂ کلام جناب شیش چندر سکسینہ طالب دہلوی
قیمت: چار روپے

دہلی میں یہاں کے جن لوگوں کی وضع داری، شرافت اور سادگی سے میں متاثر ہوا ہوں، اُن میں ایک نام جناب طالب دہلوی کا بھی ہے۔ وضع داری اور رکھ رکھاؤ کی باتیں اور اِس زمانے میں! جی ہاں، ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں ہیں۔ وہ گلزار دہلوی ہوں یا طالب دہلوی۔ اپنے اپنے انداز سے ان تہذیبی اقدار پر اِن لوگوں کا ایمان ہے۔ وضع داری اور رکھ رکھاؤ، اکثر تصنع سے آمیز ہو جایا کرتے ہیں، لیکن طالب صاحب سے مل کر ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ بناوٹ کے بغیر بھی وضع داری کو نباہا جا سکتا ہے۔ یہ تکلف سے بری انداز! اب اِس کے دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔

اب جو اُن کے کلام کو دیکھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ سادگی، واقعتہً اُن کے فکر و خیال کا حصہ اور اُن کے مزاج کا جزو ہے، کیونکہ اُن کے کلام میں بھی ان کے مزاج کی طرح سادہ بیانی کا رنگ غالب ہے۔ طالب صاحب، برق مرحوم کے شاگرد ہیں اور سائل و بیخود کی آنکھیں دیکھے ہوتے ہیں، اِس لیے اندازِ بیان کی طرف ان کی توجہ زیادہ مبذول رہنا چاہیے تھی، لیکن مسرت کی بات یہ ہے کہ وہ صرف اُسی کے نہیں ہو رہے ہیں۔ اِس مجموعے میں ایسے شعر بھی نظر آتے ہیں جن میں زبان کی چاشنی اور روزمرہ کے حُسن کا حصہ غالب ہے، مثلاً:

تو اور بدگمان ہو کہنے سے غیر کے	شکوے کا ہے مقام شکایت کی بات ہے
یہ ہندو، یہ مسلماں، یہ مسیحی	مگر ان میں کوئی انسان بھی ہے
موسمِ گل میں ہمیں رکھنا تھا دل صیاد کا	ہو گئے ہم خود اسیرِ دام ہنستے بولتے

اور ایسے شعر بھی ملتے ہیں جن میں زیادہ سے زیادہ، فکر و خیال کی چمک نظر آتی ہے اور کہیں کہیں جذباتی خلش کا احساس بھی ہوتا ہے۔ مثلاً:

کسی صورت قرار آ جائے	اور مقصودِ بندگی کیا ہے
آنکھ میں شکل تری، نور ترا سینے میں	عکس آئینے کا پڑتا رہا آئینے میں
دل میں رہ رہ کے خلش ہوتی ہے	کون یہ بارِ دگر یاد آیا

اُسے محفل میں بھی تنہا سمجھو جسے احساس ہو تنہائی کا
عجیب چیز ہے دنیا میں بیش وکم کا طلسم کسی کے نقص کو اپنا کمال کہتے ہیں
یہ رنج اسیری، یہ قفس، اور یہ ماحول آشفتہ نوائی کی سزا ہم کو ملی ہے
جگر کے چاک سلامت رہیں قیامت تک کبھی یہ چاک مچلتے نہیں رفو کے لیے
ہم سمجھتے رہے اسے اک کھیل زندگی امتحان ہو کے رہی

غزل کی یہ روایت رہی ہے کہ وہ ہر قسم کے پست و بلند اشعار کا مجموعہ ہوتی ہے، اس طرح اس میں مختلف مزاج رکھنے والے افراد کی تسکین کا سروسامان بھی یکجا ہوجاتا ہے۔ کسی کو ایک رنگ کا شعر پسند آتا ہے، کسی کو دوسرے انداز کا۔ اور اس کی وجہ سے، کبھی کبھی بے رنگی کو بھی، رنگینی کا مرادف سمجھ لیا جاتا ہے۔ اسے صنفِ غزل کا حسن کہا جائے، یا خامی، بہرصورت ایسا ہے، اور کم وبیش غزل کے اکثر مجموعے اس کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ طالب صاحب کے اس مجموعے میں بھی یہی صورت ہے۔

اس زمانے میں، جب کہ ٹکنالوجی نے، ادبیات کو ثانوی سے بھی کم تر درجے کی چیز بنا دیا ہے، اور ان حالات میں جب کہ اردو کی ایسی کتابیں بکتی کم ہیں، کسی مجموعۂ کلام کا شائع کرنا، اس بات کی دلیل ہے کہ شاعر کو اپنے اوپر اعتماد ہے اور اُس کے دل میں زبان وادب کی سچی لگن بھی موجود ہے۔

رشید حسن خاں

روزمرّہ ومحاورۂ غالب

پریم پال اشک
ناشر: قصرِ اردو، اردو بازار، دہلی ۶
صفحات ۳۲۰ ۔ قیمت ۲ روپے

غالب صدی کے سلسلے میں بہت سی کتابیں چھپی ہیں، لیکن ایسی کوئی کتاب ابھی تک سامنے نہیں آئی، جس میں غالب کی زبان پر روشنی ڈالی گئی ہو۔ حالانکہ غالب کا دعویٰ تھا کہ جو بھی لفظ میرے شعر میں آتا ہے، اس میں کتنی ہی گہرائیاں چھپی ہوتی ہیں۔

اس کتاب میں مصنف نے بقول خود اُن سارے محاوروں کو جمع کر دیا ہے، جن کا غالب نے استعمال کیا ہے۔ اردو میں مانے ہوئے طریقے سے جن لفظوں کو خاص طور سے استعمال کیا جاتا ہے، اور جسے 'روزمرّہ' کہتے ہیں، اُن کو بھی شامل کر لیا ہے۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ غالب محاوروں کے شاعر نہیں تھے، وہ 'مفرد' لفظوں اور ترکیبوں کے شاعر تھے، اور انھیں میں اُن کا

سارا کمال چھپا ہوا ہے۔ اگر ان کے یہاں تھوڑے بہت محاورے نہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ محاورے اس قدر عام ہیں کہ کسی خاص اہتمام کے بغیر استعمال ہوتے رہتے ہیں۔

اس کتاب کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ مصنف نے بس ایک کتاب لکھنی چاہی ہے اور بنیادی چیزوں کی کمی پڑتی دیکھ کر ادھر اُدھر سے بھرتی کا مسالا ڈال دیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کام بہت جلدی میں کیا گیا ہے۔ اس سے یہ ہوا ہے کہ کہیں شعر غلط ہے، کہیں ایسا ہے کہ لفظ آیا ہے کسی اور معنی میں، اور لکھا ہے کسی اور معنی میں۔ جن لفظوں کا محاورے یا روز مرّہ سے تعلق نہیں، وہ سب بھی شامل ہو گئے ہیں۔ کسی بڑے شاعر کے یہاں لفظوں کی جانچ بہت اچھا کام ہے، لیکن اس کے لیے بہت وقت اور احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر ایسے کام اچھی طرح نہیں کیے جا سکتے۔ مصنف نے محاوروں کے کچھ ایسے انداز میں معنی پیش کیے ہیں، گویا غالب نے ایک محاورہ بس ایک ہی جگہ باندھا ہے۔ ہر بڑا شاعر کچھ لفظوں کو بار بار استعمال کرتا ہے تو اس کو نئے نئے طریقے سے باندھتا ہے، مصنف کو اس کا دھیان رکھنا چاہیے تھا۔

اس کمی کی وجہ سے یہ کتاب ایک معمولی لغت بن کر رہ گئی ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ایک ایسی کتاب لکھی جائے، جس میں یہ بتایا جائے کہ وہ کون سے لفظ، ترکیبیں اور محاورے ہیں جن کو غالب نے کسی خاص ڈھنگ سے برتا ہے، اور کس کس طرح ان کا استعمال کیا ہے اور اس سے اُن کی شاعری میں کیا پہلو پیدا ہوئے ہیں۔

(ڈاکٹر) ذکیہ انجم

سلیمان خطیب اور ان کا کلام

صفحات: ۲۱۶
مرتبہ اعجاز الدین رفعت
ناشر: اردو لائبریری سینٹر بنگلور
قیمت: ۳/۵۰

سلیمان خطیب آج کل دکنی زبان کے مشہور عوامی شاعر ہیں۔ اُن کے ہاں معیاری اُردو کے ساتھ ساتھ بول چال کی علاقائی زبان بھی ملتی ہے۔ انھوں نے کچھ نظمیں خالص بول چال کی دکنی زبان میں کہی ہیں۔ علاقائی ادب و زبان کی جلوہ گری کئی اعتبارات سے ضروری ہے اور خطیب کا

لام اس ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ خطیب نے زندگی کے دکھ سکھ کو بہت قریب سے دیکھا ہے یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہاں محنت کش طبقے کی نمائندگی زیادہ ہے۔ وہ شہر سے زیادہ دیہات کو پسند کرتے ہیں۔ فطرت کی وہ معصومیت جو شہروں میں عنقا ہے وہ ابھی دیہات میں نظر آجاتی ہے۔ "پگڈنڈی" اور "ندی" اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ "پگڈنڈی" کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

میں کنواری چھوریوں کی ایک لمبی سانس ہوں
دو دلوں میں چبھنے والی ایک بنگی پھانس ہوں
ہاتھ میں جنگل کے ہوں تقدیر کی ٹیڑھی لکیر
کچا پکا وعدہ ہوں، مٹتی مٹتی آس ہوں

مون اندھارے آ کو دیکھو طور بن جاتی ہوں میں
طور بن جاتی ہوں میں جی طور بن جاتی ہوں میں

خطیب نے تشبیہوں کو نہایت چابک دستی سے استعمال کیا ہے۔ اُن کی تشبیہیں ایک انوکھا پن لیے ہوتی ہیں۔ اُن کی نظم "ندی" کے تین شعر ملاحظہ ہوں ؎

جنگلے، جنگل، جھاڑ، پہاڑاں، ہور بے نارک بند
جیسے سیتا پھر رہی ہے رام کی لے کو لگن

تیرے چکراں میں تو کتے کا کلیجہ خاک ہے ایک دیوانے کا دامن سو جگاں سے چاک ہے

پیاسے کھیتاں واسطے تو ایشور کا پیار ہے
ماں کی چھاتی سے جو پھوٹے دودھ کی وہ دھار ہے

خطیب کی انفرادیت مقامی رنگ سے ہے۔ لیکن اُن کی متعدد نظموں میں یہ رنگ بالکل نہیں۔ اچھا ہوتا کہ پورا مجموعہ ایک رنگ آہنگ کا نمائندہ ہوتا۔

مبارز الدین رفعت صاحب ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں کہ موصوف نے حیدرآباد کے ایک معروف عوامی شاعر کو اس سلیقے کے ساتھ روشناس کرایا۔ ایک بات البتہ کھٹکتی ہے کہ اس مجموعے میں، شاعر کے کلام سے زیادہ صفحے مقدموں کی نذر ہو گئے ہیں۔ خطیب کا

کلام، خود کافی تعارف و تحسین کے لیے۔ اس لیے ایک مقدمہ ہی کافی ہوتا۔
کتاب کے آخر میں فرہنگ بھی شامل ہے۔ جو لوگ دکنی سے آشنا نہیں اُن کے لیے یہ بہت فائدہ مند ثابت ہوگی۔

نورجہاں

نواب صاحب

از ڈاکٹر ریاض الحسن
صفحات ۱۲۰۔ سائز ۳۰×۲۰/۱۶
ناشر مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی ۶
قیمت: ۲/۵۰
اشاعت ۱۹۶۸ء

فرانس کے شہرۂ آفاق تمثیل نگار مولیر کی شہرت اور مقبولیت کا باعث اس کا یہ ڈراما BOURGEOIS GENTLEMAN بھی ہے، فرانس کے اُس دور انحطاط کی اس سے بہتر عکاسی اور ترجمانی ہو نہیں سکتی۔ اسی بنا پر مولیر کا یہ شاہکار ہر متمدن زبان اور ہر ترقی یافتہ ملک کے لوگوں کی دل چسپی اور سبق آموزی کا سبب بنتا چلا آرہا ہے۔

ڈاکٹر ریاض الحسن کے اس "ہندوستانی روپ" سے پہلے بھی اس مشہور ڈرامے کو اردو میں مختلف حیثیتوں اور اسلوب سے پیش کیا جا چکا ہے۔

سید سجاد ظہیر کا براہ راست فرانسیسی زبان سے ترجمہ اور حبیب تنویر کا اس کو حیدرآبادی رنگ و آہنگ میں اسٹیج پر لے آنے کی کوشش بھی بڑی قابل لحاظ ہیں۔

ڈاکٹر ریاض الحسن نے اس زبردست طنزیے اور کامیاب ترین کامیڈی کو لکھنوی ماحول اور معاشرت میں منتقل کرکے ایک تنوع اور جدت طرازی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مولیر کے بعض کردار اور ڈرامے کے بعض مناظر اس طرح سے ابھر کر سامنے نہ آسکے جس طرح سے فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں سامنے آچکے ہیں۔

ماحول کی عکاسی اور معاشرت کی ہو بہو مصوری یوں بھی کوئی آسان کام نہیں۔ پھر بھی اخذ و مطابقت کی یہ کوشش اور حوصلہ قابل ستائش ضرور ہے۔ اردو زبان سے انس اور شغف رکھنے والوں کو اس نہج اور نوعیت کی کوششیں پسند آنا چاہئیں۔ کتاب کا گرد پوش خوب صورت، جلد مضبوط اور لکھائی چھپائی صاف ستھری ہے۔

شبینے

ابر احسنی گنوری ۔۔۔۔ موضوع: حمد و نعت و منقبت

سائز: ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات: ۱۲۸

ملنے کا پتہ: ابر احسنی گنوری ضلع بدایوں (یو۔پی)

قیمت: تین روپے

نعت گوئی ایک بڑا مشکل فن ہے۔ اس صنف سخن میں شاعر کا امتحان ہوتا ہے۔ اس میں بڑے بڑے کٹھن مقام آتے ہیں، جس میں بڑی سلامت روی اور احتیاط کی ضرورت پیش آتی ہے اس لیے کہ اس کا سرا ادب و احترام اور محبت و عقیدت سے ملا ہوا ہے۔ دراصل نعت کا دربار، مدنی سرکار کا دربار ہے جہاں پر اچھے اچھوں کے پَر جلتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اردو میں بلند پایہ نعت گو شعراء بہت کم ہوتے ہیں، جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ یہاں نعت گوئی کی تاریخ بیان کرنے کا موقع نہیں مقصد اس کی اہمیت واضح کرنا تھی۔ اس لیے کہ نعت گوئی بڑی دیدہ وری چاہتی ہے تب کہیں جا کر نعت کا یہ میدان سر ہوتا ہے۔

اس وقت تبصرے کے لیے جو کتاب پیش نظر ہے اس کا موضوع بھی حمد و نعت و منقبت ہے اور اس کے مصنف ہیں ابر احسنی گنوری۔ جو ادبی دنیا میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ نہایت قادر الکلام۔ پختہ کار اور نغز گو شاعر ہیں۔ غزل اور نظم خوب کہتے ہیں۔ چنانچہ غزل کے دو مجموعے اور نظم کا ایک مجموعہ کلام اب تک شائع ہو چکے ہیں۔

اب آپ نے حمد و نعت و منقبت پر قلم اٹھایا ہے۔ زبان نہایت پاکیزہ شستہ اور شاعرانہ استعمال کی ہے۔ جو مضامین بیان کیے ہیں ان میں ندرت اور جدت طبع سے بھی کام لیا ہے۔ ان کا یہ مجموعہ حمد و نعت و منقبت بھی فنی شاعری کا اچھا نمونہ ہے۔ جس میں بڑی جانکاہی اور کاوش سے کام لیا گیا ہے اور جو کچھ کہا ہے ڈوب کر کہا ہے۔ اس طرح بارگاہ رسالت میں عقیدت کا جو تحفہ ابر صاحب نے پیش کیا ہے وہ اس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے اور ان کے فن کی جتنی بھی داد دی جائے وہ کم ہے۔

البتہ اس مجموعے کے دیباچہ کے جو کچھ کہا گیا ہے اس میں اس امر کو فراموش کر دیا گیا ہے کہ "لوگوں کو نیکی کی طرف حکمت سے بلاؤ"۔ وعظ و نصیحت کرنے اور اختلافی مسائل بیان کرنے کا یہ موقع و محل نہ تھا، اس سے گریز ضروری تھا۔ اس لیے کہ اس سے شعر کی زبان مجروح ہوتی ہے اور شاعر جو اثر اپنے کلام سے پیدا کرنا چاہتا ہے وہ بھی متاثر ہوتا ہے۔

۱

ادبی خبریں

● علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۷۰ء میں اپنا جشن جبلی منانے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ اس موقعے پر منجملہ دیگر تجاویز کے سر سید کے مکان کی تعمیر نو، سرسید اکاڈمی کے افتتاح، سائنس میوزیم کے قیام اور ہماری درس گاہ اور اس کی تاریخ سے متعلق چند اہم کتابوں کی اشاعت کا پروگرام پروفیسر عبد العلیم صاحب وائس چانسلر نے تیار کیا ہے۔ علاوہ ازیں جبلی کے موقع پر پرانے طلبا، اور اساتذہ کی ایک مکمل "ڈائرکٹری" کی ترتیب کی جا رہی ہے۔ تمام پرانے طلبا، اور درس گاہ سے تعلق رکھنے والے حضرات سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ اپنے مختصر سوانحی حالات جبلی آفس کو بھیج دیں اور جن پرانے طلبا، کے پتے ان کو معلوم ہوں اس سے بھی مطلع کریں تاکہ ان سے رابطہ قائم کیا جا سکے امید ہے کہ درس گاہ کے پرانے طلبا، اور بہی خواہ اس "ڈائرکٹری" کی تکمیل میں پوری مدد دیں گے "ڈائرکٹری" کے لیے جو معلومات درکار ہیں اس کا فارم جبلی آفس وکٹوریہ گیٹ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

● ایک روسی رسالے کے بیان کے مطابق دنیا میں اس وقت ۲۷۹۶ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں لاطینی اور قدیم یونانی جیسی مردہ زبانیں بھی شامل ہیں۔ بڑی زبانیں یہی ہیں: چینی، اردو، ہندی، انگریزی، اسپینی، روسی، جرمنی، جاپانی، پرتگالی، فرانسیسی، عربی، بنگالی اور اطالوی۔ یہ ۶۵ ملکوں کی سرکاری زبانیں ہیں اور جو شخص ان میں سے چھ زبانوں سے واقف ہے وہ گویا دنیا کی دو تہائی آبادی سے گفتگو کر سکتا ہے۔ (ہماری زبان)

● مرکزی بزم شفا بھوپال کی جانب سے واحد پریمی اور مظفر نیس کے زیر اہتمام ۲۶ جولائی ۱۹۶۹ء کی شب، سیفیہ کالج ہال میں ملک کے مشہور شاعر حضرت شفا گوالیاری کی پہلی برسی نہایت شاندار طریقے پر منائی گئی۔ سب سے پہلے واحد پریمی نے (مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی، پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب، ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب اور علی جواد زیدی صاحب کے) پیغامات پڑھ کر سنائے۔ اس کے بعد مشہور طنز نگار حضرت تخلص بھوپالی کی صدارت میں "بزم مقالات و تقاریر" کا آغاز ہوا جس میں تخلص بھوپالی، ڈاکٹر حامد حسین، پروفیسر آفاق احمد، سید محمود الحسینی، ایم۔ عرفان، حنور لطیف اور اختر سعید نے اپنے اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور شفا مرحوم کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالی۔ آخر میں "محفل مشاعرہ" منعقد ہوئی جس میں مقامی شعرا نے حصہ لیا۔

ایک خط

پیامِ تعلیم

پیامِ تعلیم کا تازہ شمارہ ہاتھ میں لیتے ہی مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین مجسم آپ کے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کو ہندوستان کی ساری سیاسی جماعتوں، سماجی اور علمی اداروں اور ادبی رسایل نے اپنے طور پر خراجِ عقیدت پیش کیا لیکن پیامِ تعلیم کے تازہ شمارے میں مرحوم کی ذات سے متعلق جو مضامین شایع ہوتے ہیں ان کی نوعیت کچھ اور ہے ان مضامین میں جو شخصیت ابھرتی ہے وہ ایک شریف انسان درس گاہ کے ایک خادم، اس کے معمار اور مکمل معلم کی تصویر ہے۔ ان مضامین کے ذاکر حسین صدر جمہوریہ نہیں بلکہ بچوں کے شفیق استاد اور اپنے ساتھیوں کے بااعتماد اور بہترین دوست ہیں۔ یہ خراجِ عقیدت ان لوگوں نے پیش کیا ہے جو مرحوم کے رفیق رہے ہیں اور جنھیں "ہمارے ذاکر صاحب" کہنے کا حق حاصل ہے۔

ان سارے مضامین کے ایک ایک لفظ سے محبت ٹپکتی ہے، قربت کا احساس ہوتا ہے اور پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ ارے یہ ذاکر صاحب تو اپنوں میں سے ہیں۔

ان مضامین کو پڑھ کر دل بے اختیار بھر آتا ہے اور آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

آصفہ مجیب اور صالحہ عابد حسین تو اہلِ قلم خواتین ہیں ہی لیکن سب سے زیادہ جو مضمون پڑھنے والے کو متاثر کرتا ہے وہ ہے حفیظ الدین صاحب کا مضمون "کیمیا گر" یہ اونچے درجے کا بھی ہے اور پیامِ تعلیم کے معیار کا بھی۔ یہ بات ان سے نبھی کیسے اور ایسا دردناک مضمون وہ لکھ کیسے سکے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "تجھے زندگی میں ہم نے بہت جھنجھوڑا، تیری راتوں کی نیندیں حرام کر دیں، دن کا چین چھین لیا۔ تجھے ہم نے بہت ستایا — اب تو قیامت تک آرام سے سو، اب نہ کوئی بے ادب ہاتھ تیرے دامن کی طرف بڑھے گا۔ اور نہ کوئی گستاخ آواز تیرے کانوں تک پہنچ سکے گی۔"

یہی تاثر اور جذبہ جناب سید محمد ٹونکی کے مضمون میں ہے، جناب عبداللہ ولی بخش قادری نے

مرحوم کی وفات کے دن کا تو سماں کھینچ دیا ۔ مضمون پڑھیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ راشٹرپتی بھون میں مرحوم کے جنازے کے قریب کھڑے ہوئے ہیں ۔

اپنوں کی بات ہی اور ہوتی ہے ، یہی رنگ دوسرے مضامین میں ہے ۔ حسین حسان صاحب کے انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے ، جنھوں نے خلوص اور محبت کی روشنائی سے لکھے ہوئے اتنے اچھے مضامین لکھوائے ۔ پیام تعلیم کے اس شمارے کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کو صدر تو مل جائے گا لیکن جامعہ ملیہ کو ذاکر حسین نہیں مل سکیں گے ۔ مرحوم کو اپنے ادارے سے جو محبت تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ مرحوم دفن ہوئے تو جامعہ ملیہ ہی میں ۔

پیام تعلیم کا یہ شمارہ عام نمبر ہے لیکن کئی خاص نمبروں سے بہتر ہے ۔

(یوسف ناظم)

معیاری کتابیں

ردو کے ادبی معرکے (سوداؔ کے عہد سے حکمت تک) امیر حسن نورانی

ُردو ادب کی تاریخ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہر زمانہ میں دو بلند پایہ شاعر ایسے ضرور ہوتے رہے ہیں جو حریف
قابل بنے اور ان کی باہمی چشمکوں نے کسی نہ کسی ادبی معرکہ کو جنم دیا۔ اس کتاب میں ایسے ہی ادبی معرکوں کو یکجا کیا گیا ہے۔

قیمت : ۲/۵۰

الب غلام رسول مہر

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی ایک مستند ترین سوانح عمری جو خود میرزائے ممدوح کے کلام نظم و نثر
ے ماخوذ ہے۔

قیمت : ۱۰/۰

ٹ نوٹ یوسف ناظم

یوسف ناظم اختصار کے فن میں پطرس کے قریب ہیں اور اسلوب کے مزاج کے اعتبار سے رشید احمد صدیقی کے طرفدار۔
پ کا مزاج گراں بار قہقہوں کا متحمل نہیں۔ آپ کی ظرافت کا معیار متین، شائستہ اور مہذب ہے۔ "فٹ نوٹ" آپ کے طنزیہ
راحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔

قیمت : ۳/۵۰

فظ و معنیٰ شمس الرحمٰن فاروقی

لفظ و معنیٰ جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے تنقیدی ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین میں ادب کے مختلف موضوعات پر
سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

قیمت : ۶/۵۰

سرکش روحیں خلیل جبران

اگر کوئی فرد اپنے سماج اور قانون سے علیحدہ ہو جائے تو لوگ اسے سرکش کہتے ہیں۔ کیا اپنی روح کو سماجی پابندیوں سے
زاد کرا لینا سرکشی ہے؟ اس کا جواب آپ کو "سرکش روحیں" پڑھنے کے بعد ملے گا۔

قیمت : ۳/۰

ہنگ ادب ناظر انصاری

زیر نظر مجموعۂ مضامین میں سراج اورنگ آبادی، انیسؔ، تلوک چند محروم اور علامہ محویؔ کا مطالعہ بھی ہے۔ حالیؔ، اقبالؔ اور
ر کے کلام پر تبصرہ بھی۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ مجازؔ اور اختر الایمان جیسے جدید شاعروں کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

قیمت : ۳/۵۰

رزا غالب (اُردو ڈرامہ) مبخو قمر

ڈرامہ "مرزا غالبؔ" کے متعلق اتنا کہنا کافی ہے کہ اسے دنیائے ادب کے بہترین نقادوں نے ایک کامیاب ڈرامہ قرار
دیا ہے اور اب تک غالبؔ پر اس سے بہتر کوئی دوسرا ڈرامہ نہیں لکھا گیا۔

قیمت : ۵/۰

دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم (افسانے)
سریندر پرکاش

سریندر پرکاش نے اپنے افسانوں کے ذریعہ شعور و احساس کی اس نیم بیدار منزل کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے جہاں تجزیہ "پیرایۂ لفظ" کے قیود و بند میں محبوس نہیں ہوتا بلکہ آزاد تلازمۂ خیال کے سہارے سے نئی شکلیں بناتا ہے۔

قیمت: ۳/۷۵

رسائی (افسانے)
جوگندر پال

جوگندر پال آپ کے جانے پہچانے افسانہ نگار ہیں۔ "رسائی" آپ کے افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔

قیمت: ۴/۰

ماہِ نور (ناول)
زبیدہ خاتون (صدیقی)

اس ناول میں مشرق کی ان روایات کا ذکر ہے جو اب ہم سے رخصت ہو رہی ہیں۔ ایک نہایت رومانی ناول۔

قیمت: ۹/۰

جگمگاتے اندھیرے
وسیم بانو قدوائی

وسیم بانو قدوائی ناول نگار کی حیثیت سے خاصی شہرت رکھتی ہیں۔ "جگمگاتے اندھیرے" آپ کا تازہ ترین ناول ہے۔

قیمت: ۳/۰

گفتگو (سہ ماہی رسالہ) شمارہ نمبر ۵، ۶، ۷، ۸۔
مدیر: سردار جعفری

"گفتگو" کا یہ تازہ شمارہ اپنی پچھلی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے نہایت اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ اس شمارے کا اردو والوں کو نہایت بے چینی سے انتظار تھا۔

قیمت: ۹/۰

دستاویز (شمارہ نمبر ۱)
ترتیب: مین را

اس شمارے کے لکھنے والے ہیں۔ افتخار جالب، انور سجاد، بلراج کومل، شہزاد احمد، عمیق حنفی، شاذ تمکنت اور بہت سے دوسرے نئے ادیب۔

قیمت: ۲/۵۰

تاریخ صحافت
مولانا امداد صابری

بشر کا زبانِ انسانی سے قریب قریب وہی تعلق ہے جو قوتِ گویائی کا سماعت سے ہے۔ اردو اخبارات و رسائل کا آغاز کب ہوا؟ ان کی نوعیت کیا تھی؟ اس کا مفصل جواب آپ کو اس کتاب میں ملے گا۔

قیمت: ۷/۰

سلیمان خطیب اور ان کا کلام
مرتبہ سید مبارز الدین رفعت

دکنی اردو کے عظیم شاعر سلیمان خطیب پر لکھے ہوئے بلند پایہ مضامین کا مجموعہ۔ آخر میں سلیمان خطیب کے کلام کا انتخاب۔

قیمت: ۴/۵۰

آشی (ناول)
رضیہ بٹ

نائلہ، بانو، نورین، انیلا، صاعقہ اور وحشی کے بعد رضیہ بٹ کا تازہ ترین ناول "آشی" شائع ہو گیا ہے۔ یہ ناول فنِ ناول نگاری کے لحاظ سے بہترین ناول قرار دیا جا سکتا ہے۔

قیمت: ۸/۰

[illegible]
مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا آزاد نے [illegible] میں بمقام دہلی ایک ایجوکیشنل کانفرنس طلبہ کی تھی جس میں آپ نے فلسفہ کے علاوہ [illegible] پر بھی تبصرہ کیا تھا۔ یہ کتاب اسی تبصرہ کا نچوڑ ہے۔

قیمت: ۲/۵۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ ـــــ بمبئی ۳

REGD. No. D58

AUGUST 1969

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR. NEW DELHI. 25

پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے کوہ نور پریس دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

ماہنامہ
اکتوبر ۱۹۶۹ء
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دھلی

سلسلۂ اشتہار نمبر ۴

بھارتی بھون پٹنہ کی مطبوعات

جلد ۱۰
شمارہ ۹

ایڈیٹر:
ولی شاہجہانپوری

اشاریہ

لیجئے، حسب وعدہ اکتوبر کا شمارہ وقت پر حاضر ہوگیا، اس دوران قارئین کے بے شمار شکایتی خطوط آئے۔ بعض کو رسالہ کی کاپی دوبارہ بھیج کر اُن کی شکایت رفع کی۔ بعض کو خط کا جواب دیا گیا لیکن بہت سے خطوط ایسے لب ولہجہ میں لکھے گئے تھے جس میں جواب دینے کی ہمت ہم میں نہیں تھی۔ اس لیے خاموش رہنے میں عافیت نظر آئی۔ بہرحال یہ تسلیم کرلینے میں ہمیں ذرا بھی تکلف نہیں کہ پچھلے چار ماہ ہمارے نقطۂ نظر سے بڑی افراتفری کے تھے اور ہماری ہی کوتاہی کے سبب قارئین کرام کو انتظار کی اتنی طویل زحمت اُٹھانی پڑی۔ اس کا ہمیں افسوس ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب حالات پر قابو اور مشکلات پر عبور حاصل کرلیا گیا ہے۔ آئندہ انشاء اللہ کتاب نما کی اشاعت میں بے قاعدگی راہ پا سکے گی۔

اگست کی بائیسویں تاریخ کو مکتبہ جامعہ کے ڈائرکٹر اور جامعہ کالج کے پرنسپل جناب ضیاء الحسن صاحب فاروقی پر دل کا شدید دورہ پڑا۔ اس اچانک حادثے نے موصوف کو دفتر سے، جہاں وہ کام میں مصروف تھے ہسپتال کے بستر پہ پہنچا دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ تین ہفتے کے بعد فاروقی صاحب گھر واپس آگئے، لیکن ابھی طبی ہدایت کے مطابق دفتر کے کاموں سے محترز رہیں گے۔ خدا انہیں جلد شفائے کلی عطا فرمائے۔

فاروقی صاحب کی یہ بے وقت علالت جامعہ کے جشن زریں کے کاموں

میں بڑی طرح مبتلا ہو گئے۔ مگر ان کے مخلص ساتھی ان کی عیادت کے ساتھ ہی جوبلی کے کام کو بھی اسی انہماک اور لگن کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ چنانچہ جوبلی کا کام زور شور سے جاری ہے۔

۲۸ر اکتوبر کو جوبلی کی تقریبات کا افتتاح جناب گوپال سروپ پاٹھک صاحب نائب صدر جمہوریۂ ہند فرمائیں گے۔ ۲۹ر اکتوبر کو جامعہ کے یوم تاسیس کے جلسے میں وزیر اعظم ہند، شریمتی اندرا گاندھی نے بہ طور مہمان خصوصی شرکت کا وعدہ فرمایا ہے اسی روز جلسۂ تقسیم اسناد میں صدر جمہوریۂ ہند جناب وی۔وی گری صاحب طلبا سے خطاب فرمائیں گے۔

اس کے علاوہ اس پنج روزہ پروگرام میں سمپوزیم، تعلیمی نمائشیں، جامعہ کے مختلف شعبوں کی طرف سے ڈرامے اور دوسرے تفریحی پروگرام بھی پیش کیے جائیں گے۔ غرض یہ پانچ دن جامعہ میں بڑی ہماہمی کے ہوں گے یقین ہے کہ یہ تقریب اپنی روایت کے مطابق خیر وخوبی کے ساتھ اختتام پذیر ہو گی۔

دسمبر ۱۹۷۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی گولڈن جوبلی ہونے والی تھی۔ افسوس کہ اب یہ ملتوی ہو گئی۔

کہتے ہیں "ہر خیر میں شر اور ہر شر میں خیر کا پہلو ضرور ہوتا ہے۔ ثانی الذکر کا تجربہ اس وقت ہوا جب ستمبر کا شمارہ شائع ہونے کے بعد جناب جگر بریلوی کے متعلق ہماری تحریر ایک ایسی قیمتی کتاب سے متعارف ہونے کا خوشگوار سبب بنی جو اگر ہمارے مطالعہ میں نہ آتی تو ہمیں بڑا قلق ہوتا۔ یہ کتاب علمی مجلس دہلی نے شائع کی ہے اور جناب نالک رام اور ڈاکٹر سیفی پریمی اس کے مرتب ہیں:۔

کتاب کا نام ہے "جگر بریلوی"، بڑی بے چینی سے پڑھنا شروع کیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جن جگر صاحب کا ذکر اس کتاب میں اس تفصیل کے ساتھ ہے ان کے قلم سے وہ خیالات کیوں کر حیطۂ تحریر میں آئے ہوں گے جن کا ہم نے ستمبر کے کتابنما میں ذکر کیا تھا۔ پوری کتاب ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ خیالات میں بعد المشرقین دیکھ کر اپنی جلد بازی پر تاسف ہوا۔ لیکن ۱۹۲ صفحات پر محیط کتاب میں کہیں بھی اس رسالہ کا ذکر نہ دیکھ کر بھی تعجب ہو رہا تھا کہ آخر میں ظل عباس عباسی صاحب

کے مضمون پر نظر پڑی۔ اور آخر میں جناب جگر کے "اظہارِ حقیقت" نے شک و شبہ کی ساری عمارت منہدم کر دی، بڑی خوشی ہوئی ان چند سطور کو پڑھ کر۔

سچ تو یہ ہے کہ "جگر بریلوی" کے مطالعہ کے بعد ہماری معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ البتہ ذہن میں جو تصویری خاکہ موصوف کی سیرت، ان کے اخلاق، شرافتِ نفس اور خلوص و محبت کے ہلکے خطوط کی صورت میں موجود تھا۔ اس نے بہت واضح ہو کر مکمل تصویر کی صورت اختیار کر لی۔ بچپن سے جگر صاحب کا کلام پڑھا کیے، ان پر مقالات دیکھا کیے۔ ان کے فنی محاسن اور شاعرانہ اجتہاد سے مستفید ہوتے رہے۔ یہی وجہ تھی رسالۂ مذکور کو دیکھ کر صدمہ بھی شدید ہوا۔ دراصل یہ ردِ عمل تھا اس احترام کا جو جگر صاحب کے لیے ہمہ وقت رہا اور ہے۔

بہر حال بڑی خوشی ہے اس بات سے کہ یہ معاملہ آگے نہیں بڑھا بلاشبہ ستمبر کا کتاب نما پڑھ کر جناب جگر، ان کے احباب اور مداحین کو جو صحیح صورتِ حال سے واقف تھے یا ہیں، ہماری تحریر سے کوفت ہوئی ہوگی۔ ہونا بھی چاہیئے لیکن ہماری نیت صاف تھی۔ ہمیں اپنی جلد بازی پر افسوس ہے۔ اس کی تلافی کی بہترین صورت ہمارے نزدیک یہی ہے کہ جناب جگر کے "اظہارِ حقیقت" کو من و عن یہاں نقل کر دیں۔

اظہارِ حقیقت

میں نے اردو زبان کی جو خدمت کی ہے، کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ مدت کے اعتبار سے اگر کہا جائے کہ تمام عمر اسی میں گزری، تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ہاں ایک وقت تھا جب میں اردو کا مخالف تھا اور کچھ اوراق اس کے خلاف لکھے تھے۔ اسے کم و بیش تیس سال ہو گئے اور اس کے بعد میرے خیالات نے پلٹا کھایا۔ میں نے اردو ادب کے مطالعہ کے ساتھ اس زبان سے میری گرویدگی بھی بڑھتی گئی اور تالیف و تصنیف بھی ہوتی رہی۔ اب تک متعدد کتابیں میرے قلم سے نکل چکی ہیں۔ اہلِ بصیرت نے جن کی جی کھول کر داد دی ہے، افسوس و

زاہدہ زیدی

غزل

تم ہی بتلاؤ خلاؤں کے سوا کیا ہوگا
سب نظاروں سے اگر دُور نظر جائیگی

تارِ امید میں ڈالو نہ تمنا کے گہر
یہ لڑی ہاتھ لگایا تو بکھر جائے گی

فکرِ بے باک کی پھر ہم نے بچھائی ہے بساط
شہر در شہر سنا ہے کہ خبر جائے گی

ان کو چڑھتی ہوئی موجوں سے بہل جانے دو
یہ تو برسات کی ندی ہے اتر جائے گی

ذہن کی دھوپ تو ہے، درد کے بادل بھی سہی
بارشِ غم ہے تو یہ اور نکھر جائے گی

شدتِ شوق سے پیچیدگیِ شوق بڑھی
تم نے سمجھا تھا کوئی بزم سنور جائیگی

ایک زندانِ حوادث میں ہے پابستہ حیات
فکرِ آوارہ سے پوچھو تو کدھر جائے گی

(انتخاب از "زہر حیات" قیمت ۔/۵)

غالب کون تھے؟

ہمارا تعلیمی معیار کس حد تک رو بہ انحطاط ہو گیا ہے، اس کا اندازہ مولانا جمیل اختر نعمانی کے اس مضمون سے لگائیے جو الجمیعۃ دہلی میں شایع ہوا ہے۔ ضرورت کے تحت ہم نے تھوڑی سی تلخیص کر دی ہے مگر اس طرح کہ نہ اصل مقصد فوت ہوا ہے نہ غالب کی "شخصیت" اس سے اثر انداز ہوئی ہے۔ (مدیر)

مرزا غالبؔ کا نام کون نہیں جانتا۔ ابھی پچھلے ہی دنوں کی تو بات ہے جب ہندوستان میں غالبؔ کی صد سالہ برسی بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منائی گئی تھی۔ ماہرانِ غالبؔ اور ادب نواز حلقوں نے غالبؔ کی زندگی، اس کی ادبی و شعری خدمات کا صرف جائزہ ہی نہیں لیا بلکہ بڑے ہی ناقدانہ مضامین بھی نظروں کے سامنے آئے اور ہندوستان و پاکستان کے اخبارات و رسائل نے بھی ضخیم اور معیاری غالب نمبر شایع کر کے غالب نوازی کا ثبوت ہی نہیں دیا بلکہ بے شمار انگریزی اور غیر ملکی زبانوں کے ادبی جرائد نے بھی اردو کے اس عظیم شاعر کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

لیکن ہمارے اسی ملک بھارت کے طلبا نے (جن میں جونیر کلاسز سے لے کر ایم۔ اے، مولوی فاضل، منشی فاضل اور عربی و فارسی کے آنرز بھی شامل ہیں) غالبؔ کے سلسلے میں جو نئی ریسرچ کی ہے یعنی اپنے اردو کے امتحانات میں غالبؔ کے حالاتِ زندگی اور ان کے اندازِ نگارش کے بارے میں پوچھے گئے سوالات پر لرزہ خیز جوابات دیے ہیں۔۔۔۔ انھیں آپ ملاحظہ فرمائیے اور ہر ادب نواز تک پہنچانے میں ان طلبا کا ساتھ دیجیے۔۔۔۔

نام :۔ مرزا غالبؔ کا اصلی نام محمد حسین تھا ــــ مرزا غالبؔ کا نام۔۔۔۔ سر سید احمد خاں تھا ــــ باپ کا نام منظفر علی تھا ــــ والد کا نام اسد اللہ تھا۔

تاریخِ پیدائش :۔ غالب کے والد یا کوئی اور شاہجہاں بادشاہ کے ساتھ

دہلی آئے تھے اور وہیں ولادت پائی۔ ہندوستان کے رہنے والے تھے۔
میرٹھ کے ایک مسافر خانہ کی پیدائش ہے۔ شاید سترہ صدی کے اختتام میں مرزا غالب
خاندان میں آپ کا تولد ہوا۔ ان کے والد فیملی پلاننگ کے بڑے معتقد تھے اس لیے
کہ وہ اپنے باپ کے اکیلے بیٹے تھے۔ مرزا غالب رقاصہ کے بیٹے تھے۔

بچپن۔ تعلیم:۔ دہلی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور پھر کراچی سے میٹرک کرکے
لندن سے بیرسٹری کی سند بھی حاصل کی۔ بچپن میں گھر سے بھاگ گئے تھے، در بدر
کی ٹھوکریں کھاتے رہے، ایک نواب نے ان کی پرورش کی۔ بچپن میں ہر
کلاس میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے لیکن میٹرک کے بعد ان کو عشق نے نکما کر دیا۔
ہندوستان میں بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی، اس کے بعد انگلینڈ گئے وہاں سے
آئے تو حیدرآباد ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے جہاں ایک غلط فیصلہ میں ان کو
سزا ہوئی۔

بچپن میں اپنے ہم جماعتوں سے بہت محبت کرتے تھے اور عشق کا مادہ بھی
جسم میں کافی مقدار میں موجود تھا۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی ویسے ویسے عشق بھی سارے
جسم میں سرایت کرتا گیا۔ آپ محبت کو پسند کرتے تھے خاص کر عشق نسواں کے
بہت شوقین تھے۔ ایک بار بیشی دستی کر دینے پر سر راہ خوب پٹائی ہوئی تھی۔
جنگلوں میں جاتے اور خدا کی قدرت دیکھ کر فی البدیہہ شعر کہہ دیتے تھے گویا کہ
بدیہہ گو تھے۔

زندگی کی جھلکیاں:۔ لاہور اور دہلی آپ کے ہیڈ کوارٹر تھے۔ آپ بڑے
عابد تھے حتیٰ کہ مولوی معلوم ہوتے تھے۔ بڑے ہی نازک مزاج تھے۔ ایک دن
دہلی کے بازار چاندنی چوک میں ایک چارپائی ٹیڑھی بچھی دیکھ کر سر میں درد ہو گیا۔
مرزا غالب کوئی آدمی تھے؟ وہ تو جن تھے جن۔ آم کھانا ان کی سرشت میں لکھا
تھا چنانچہ ملیح آباد، لکھنؤ میں وفات پائی۔ مہاتما گاندھی کے ساتھ کافی دنوں
تک جیل میں رہے۔ مولانا آزاد کا غالب سے یارانہ تھا جب بھی مصر سے وہ اپنے
لیے سگریٹ منگاتے غالب کو بھیجنا نہ بھولتے۔ غالب کی محبوبہ کا نام امراؤ جان
ادا تھا۔ مرزا غالب کی بے انتہا بادہ نوشی کی وجہ سے ہی شراب بندی کا

قانون بنا اور نافذ ہوا۔

ابھی حال میں حکومتِ ہند نے ان کو پدم شری کا خطاب دیا اور سالانہ وظیفہ بھی مقرر کیا ہے ـــ پچھلے دنوں ان کی دسویں سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی گئی تھی ان کو کافی انعام اور خطابات بھی ملے ہیں۔ اللہ ان کو اچھا رکھے ـــ آج کل غالب صاحب بہت بیمار اور لاغر ہو گئے ہیں اور ادبی انجمنوں کو چاہیے کہ وہ چندہ اکٹھا کر کے ان کے پاس بھیجیں تاکہ وہ اپنا علاج کرا سکیں۔

غالب کی شاگردی اور استادی:۔ بڑے ہو کر مرزا داغ کے شاگرد ہوئے ـــ مرزا غالب نے مولانا حالی کی شاگردی میں اپنی شاعری کو بہت فروغ دیا ـــ اکبر الہ آبادی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ـــ مومن، انشا، جگر، مجاز، ریاض، آپ کے شاگرد تھے ـــ آپ محمد شاہ رنگیلے کے درباری شاعر تھے۔ پھر آپ دکن میں چند شہزادوں کے استاد مقرر ہوئے ـــ علامہ اقبال اور مرزا غالب سے کبھی نہیں بنتی تھی۔

اندازِ نگارش:۔ ان کی طرزِ نگارش مختلف سہل نگاری پر مشتمل ہے۔ مرزا غالب کافی اعلیٰ پیمانے کے طرز نگار تھے ـــ مرزا غالب کے اندازِ نگارش پر بحث کی کوئی ضرورت نہیں کیوں کہ سورج اپنی روشنی سے پہچانا جاتا ہے۔ ـــ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟" (بشکریہ الجمعیۃ)

باقی صفحہ ۵ کا

افسوس حیرت ہے کہ بعض حضرات نے اس ادبی کائنات سے صرف وہ حصہ لیا ہے جو اردو کی مخالفت میں تھا۔ مثلاً ایک رسالہ "اردو زبان پر ایک تحقیقاتی نظر" کیپٹن سوریہ پرتاب سنگھ حق پرست حیدرآبادی کا میری نظر سے گذرا، مجھے اس سے بڑی تکلیف ہوئی کیونکہ یہ میری اردو دشمنی کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ ایک سیلابی رَو میں لکھا گیا تھا، جو آئی اور نکل گئی۔ اسے ایک دو نہیں دس بیس نہیں، پورے تیس سال ہو گئے اس کے بعد کا تمام زمانہ اردو کی خدمات سے روشن ہے۔ پھر دوسری بات یہ کہ اس میں کیپٹن سوریہ پرتاب صاحب نے بہت کچھ قطع و برید کی ہے جس کا انہوں نے اس کے دیباچہ میں خود اعتراف کیا ہے۔ لہٰذا اس تحریر کے ذریعہ مجھے اعلان کرنا لازمی ہو گیا کہ اس رسالہ سے میرا کوئی تعلق نہیں۔

جگر بریلوی ۵ ر مئی ۱۹۷۰ء میرٹھ

فضا جالندھری مرحوم

جلیل کی اصلاحیں

عہد ماضی میں حضرت جلیل غزل کے امام تھے۔ زمانہ آپ کو جانشین حضرت امیر مینائی کہتا ہے۔ میں حضرت کو جانشین میر و امیر مینائی کہتا ہوں۔ حضرت جلیل کے کلام فصاحت نظام میں جدت طرازی، بداعت اسلوب، سہل ممتنع، سادگی و پرکاری، عذوبت و ملاوت، شستگی و برجستگی، سوز و گداز، رعنائی و زیبائی، رنگین اور نازک تشبیہات کے محاسن پائے جاتے ہیں۔ جلیل کے تغزل کا رنگ انوکھا اور پیارا ہے۔ پھر ایسا قادر الکلام اُستاد جن کی شاخ طبع وہ وہ گل افشانیاں کرتی ہے جن سے مشام جاں معطر ہو جاتا ہے۔ پُرگوئی کا یہ عالم ہے کہ شعروں کی بارش ہو رہی ہے۔ لطافت و نظافت خیال ہر شعر سے نمایاں ہے۔ کلام میں کہیں ابہام و اشکال نہیں۔ پھر جلیل کا اسلوب بیان بھی انہیں کا حصہ ہے۔ اس موقع پر ان کے صرف دو شعر لکھے دیتا ہوں ؎

رنگت یہ رُخ کی اور یہ عالم نقاب کا — دامن میں تم تو پھول لئے ہو گلاب کا

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں — وہ آدمی ہیں مگر دیکھنے کی تاب نہیں

زمانہ لاکھ کروٹیں بدلے، حضرت جلیل پیدا نہیں ہو سکتے۔ غزل اور منصب اُستادی ان پر ختم ہو گیا۔ حضرت جلیل فن شعر میں اپنے اُستاد حضرت امیر مینائی کی عکسی تصویر تھے اور اپنے جملہ استاد بھائیوں میں ممتاز و منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ لسان الملک ریاض خیر آبادی اور اعتبار الملک حضرت دل شاہجہانپوری بسا اوقات آپ سے زبان و فن کے متعلق مشورہ لیا کرتے۔ اور آپ کے فیصلہ کو حکم مانتے تھے۔ حضرت داغ کے انتقال کے بعد ان کے بکثرت تلامذہ حضرت جلیل کے دامن سے وابستہ ہو گئے اور اپنے کلام پر اصلاح لی۔ میں حضرت جلیل کا کفش بردار ہوں۔ میں نے حضرت سے بارہ سال کلام پر اصلاح لی تھی۔ حضرت کے ادبی خطوط اور اصلاحوں کا پلندہ تو

شرقی پنجاب کے دستبرد، ہنگامہ کی نذر ہوا، کچھ اصلاحیں میرے ذہن میں محفوظ
نہیں آج انہیں ناظرین کے افادے کے لیے پیش کر رہا ہوں۔

موجودہ دور میں غزل نے ایک اور کروٹ بدلی ہے۔ نئے نئے استعارے اور
تشبیہات دیکھنے میں آتے ہیں۔ اسلوب بیان میں بھی تغیر پیدا ہو چلا ہے۔ چونکہ مستند
ساتذۂ وقت یکے بعد دیگرے اٹھتے جاتے ہیں بلکہ اس وقت کوئی نظر نہیں آتا۔ پرانے اساتذہ
نے تلامذہ پر برسوں ریاضت کرتے تھے تب کہیں جا کر فنِ عروض کے رموز سے آگاہی
دی تھی۔ آج کل فن کاری کا فقدان ہے اور کثیر التعداد شعرا بے اصلاح کلام بے تکلف
لکھتے پڑھتے ہیں۔ میں اب بھی محسوس کرتا ہوں کہ شعراء کے کلام پر اصلاح کا ہونا ضروری
ہے تاکہ معائب سے پاک ہو کر منظرِ عام پر آئے۔ حضرت جلیل کی اصلاحیں اُن کے لیے
سرمۂ بصیرت کا کام دیں گی۔ میں انشاء اللہ یہ سلسلہ کچھ عرصے تک جاری رکھوں گا۔ کیونکہ
یہ ایک چشمۂ فیض ہے جس سے تشنہ کامانِ ادب اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔
وما توفیقی الا باللہ۔

برق حیدرآبادی

۵ چارہ گر راہ تیری دیکھتی ہیں کب سے — چشم بیدار ہے یہ دیدۂ ناسور نہیں
اصلاح: " " " " — چشمِ مشتاق " " " "

راہ دیکھنے کے لیے "چشمِ بیدار" کی بجائے "چشمِ مشتاق" انتظار کو ظاہر کرتی ہے۔

برق: جلوہ دکھلانے میں اس کو ہے تمہیں کیوں تکرار — برقِ موسیٰ نہیں تم برقِ سرِ طور نہیں
اصلاح: جلوہ دکھلانے میں اس کو تمہیں کیا حجت ہے

استادِ عالی مقام نے ایک تو تعقید کے عیب کو دور کر دیا اور "حجت" کا بلیغ لفظ ڈال کر
مصرع کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا۔

برق: جس کو دیکھا تری مست آنکھوں کا ہے متوالا — ساقیا دور میں تیرے کوئی مخمور نہیں
اصلاح: " " " " — ساقیا کون ترے دَور میں مخمور نہیں

اصلاح سے بندش چست ہو گئی اور شعری لطافت بھی پیدا ہو گئی۔

برق: آئے دن سے ہے سیہ خانے میں گھر جہاں — کیا کچھ اور ٹھکانا شبِ دیجور نہیں
اصلاح: آئے دن رہتی ہے جہاں مرے ہی گھر میں " " "

اصلاح سے شعر میں صفائی اور حسن پیدا ہوگیا۔ تعقید اور بندش کی سستی کا عیب بھی رفع ہوگیا۔

سید دل محمد فضاؔ جالندھری

فضا: آتے آتے آئے گی گلزار میں فصلِ بہار — کیوں خزاں سے دل ہے مضطر بلبلِ ناشاد کا

اصلاح: " " — جاتے جاتے جائے گا غم بلبلِ ناشاد کا

حضرت امام الفن نے آتے آتے کے مقابل "جاتے جاتے" رکھ کر مصرع کو جواہر نگار بنادیا اور ساتھ ہی لطافتِ خیال سے شعر بیت الغزل بن گیا۔

فضا: ہے نزاکت حریفِ جوشِ وفا — وعدۂ قتل بھی وفا نہ ہوا

اصلاح: ہے نزاکت حریفِ جوشِ نیاز — " " " " "

"جوشِ وفا" کو تقابل ردیفین کا عیب رفع کرنے کے لیے بدلا گیا۔ ساتھ ہی "جوشِ نیاز" کا ٹکڑا فصاحت و بلاغت سے مملو ہے۔

فضا: یہی پست ہمتی ہے، یہی موت ہے خودی کی — کہ جب آدمی کا ڈھونڈے کوئی آدمی سہارا

اصلاح: " " " — کہ محیطِ غم میں ڈھونڈوں کسی غیر کا سہارا

استادِ کامل کی اصلاح سے مصرع فصاحت و بلاغت کے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔ حسنِ تخیل کی بے اختیار داد دینی پڑتی ہے۔ اب دونوں مصرعے زنجیر کی کڑیوں کی طرح پیوست ہو گئے۔

فضا: یہ پردے میں بھی کام کر جائے گی — نظر اُن کی دل میں اُتر جائے گی

اصلاح: بڑی شوخ ہے کام کر جائے گی — " " " " "

اب اصلاح سے مطلع آبدار ہوگیا۔ سبحان اللہ استادی اسی کا نام ہے۔

فضا: دکھاؤ نہ بلبل کو تصویرِ باغ — قفس ہی میں گھٹ گھٹ کے مر جائے گی

اصلاح: نہ بلبل سے صیاد کر ذکرِ گل — " " " " "

اب بات پیدا ہوگئی۔ استادِ یگانۂ روزگار نے شعر کو فرش سے عرش پر پہنچا دیا۔ روانی، برجستگی، شگفتگی تمام محاسنِ شعری پیدا ہو گئے۔

فضاؔ: نہ کارِ جہاں ختم ہوگا کبھی — قضا آپ کا کام کر جائے گی
اصلاح: نہ کارِ جہاں ختم ہوگا فضاؔ — 〃 〃 〃 〃

واقعی اُستادی اسی کا نام ہے۔ اصلاح نے مصرع کو مقطع بنا دیا اور مقطع بھی ایسا لاجواب کہ باید و شاید۔ فصاحت جس قدر ناز کرے بجا ہے فضا کے ساتھ قضا (ایک نقطے کا فرق) لاکر مقطع کو مرصع بنا دیا ہے۔ سبحان اللہ!

فضاؔ: خون اِس طرح سے عاشق کا بہایا تونے — قطرہ قطرہ ترے خنجر کو دُعا دیتا ہے
اصلاح: خون اِس رنگ سے 〃 〃 — 〃 〃 〃 〃 〃

لفظ رنگ سے مصرع رنگین بن گیا بارک اللہ ایک لفظ نے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ استادِ کامل کی قادر الکلامی کی داد دینی پڑتی ہے۔ خون کے ساتھ لفظِ رنگ ہی زیبا دیتا ہے۔

فضاؔ: عبرت انگیز ہے ہر گل کی نوائے بلبل — اُن کا ہر خندہ تجھے درسِ فنا دیتا ہے
اصلاح: عبرت انگیز ہے پھولوں کی بہار اے بلبل — 〃 〃 〃 〃 〃

حشو و زوائد دُور ہو گئے اور مصرع غیرت بہارستان بن گیا۔

فضاؔ: دل نہ لوٹے مرا کس واسطے انگاروں پر — شعلۂ حسن ترا آگ لگا دیتا ہے
اصلاح: جلوۂ عارضِ پُر نور سے تسکین کیا ہو — شعلۂ حسن تو اور آگ لگا دیتا ہے

اصلاح سے شعر میں جدّت اور حسن پیدا ہو گیا حضرت استاد کے قلم لالہ کار نے کیا کیا گل افشانی کی ہے۔ اب شعر پڑھیے اور وجد کیجیے۔

فضاؔ: سر تہِ دار ہے منصور انا الحق گو کا — راز افشا ہو تو یوں عشق سزا دیتا ہے
اصلاح: سر سرِ دار ہے 〃 〃 — 〃 〃 〃 〃 〃

حضرت جلیل القدر نے لفظ تہ دار کے بجائے سر دار بنا دیا۔ کمالِ استادی اسی کا نام ہے حالانکہ بادی النظر میں یہ مصرع قابلِ اصلاح نہیں کس قدر نازک اصلاح ہے

فضاؔ: شورِ جنوں سے عرش کی زنجیر ہل گئی — زنداں کو میرے نالے ہیں زنداں کیے ہوئے
اصلاح: جوشِ فغاں سے 〃 〃 — 〃 〃 〃 〃 〃

عرش کی زنجیر صرف جوشِ فغاں سے ہل سکتی ہے حضرت اُستاد کی یہ اصلاح بھی قابلِ دادِ صاد ہے۔

فضاؔ: نگاہوں میں جلوے سمانے لگے ہیں — نقاب اُن کے رُخ سے اٹھا چاہتا ہے
اصلاح: پسِ پردہ جلوے مچلنے لگے ہیں

اصلاح سے شعر نشتر بن گیا۔ سبحان اللہ کیا بے ساختگی ہے! (بہ شکریہ صبح امید بمبئی)

چند اچھی کتابیں

دہلی ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی قیمت:- ۱/۵۰

دلّی سات دفعہ بسی، سات دفعہ اُجڑی، آٹھویں بار بسی تو نئی دہلی کہلائی۔
اس کتاب کو پڑھکر آپ آٹھوں دِلیوں کی سَیر کا لُطف گھر بیٹھے اُٹھا سکتے ہیں۔ کتاب میں نقشے بھی ہیں اور تصویریں بھی۔

دِلی کی شام احمد علی مترجم:- بلقیس جہاں

دلّی کی شام ایک اجتماعی ناول ہے جس کا ہیرو نہ صرف دِلّی شہر ہے، جس میں مسلمانوں کی مٹتی ہوئی تہذیب کے خصوصی دَور کی کہانی روزمرہ کی زندگی کے آئینے میں پیش کی گئی ہے۔ بلکہ عام انسانی زندگی کی ایک نہایت دلچسپ کہانی بھی ہے۔
محمد حسن عسکری نے اس ناول کے بارے میں لکھا ہے کہ:۔ اُردو ناول کا تو ذکر ہی کیا، مغربی ناولوں میں بھی اس کے مقابلے کا ناول آسانی سے میسّر نہیں آسکتا۔
بلقیس جہاں نے ترجمے میں جو کمالِ فن دکھایا ہے اور جو ٹکسالی زبان لکھی ہے اُس نے تصنیف کی اصل زبان اور رُوح کی پوری ترجمانی کی ہے۔ قیمت:- ۷/۵۰

دِلّی جو ایک شہر تھا مصنف: راجندر لال ہانڈہ مترجم: سلیم احمد

سنہ ۱۹۴۰ء سے سنہ ۱۹۵۰ء تک۔ ان دس برسوں میں گردشِ ایام کا پہیا بڑی تیزی سے گھومتا ہے۔ دِلّی بھی اس کی لپیٹ میں آئی۔ اس طرح آئی کہ کچھ سے کچھ ہوکر رہ گئی۔ کیا رہا؟ کیا گیا؟ اس کا آنکھوں دیکھا حال ہانڈا صاحب کی اس قابلِ قدر تصنیف میں ملاحظہ فرمائیے۔

قیمت:- ۶/-

بڑی حویلی مرزا محمود بیگ کے ۱۴ مضامین کا مجموعہ ہمارے دیکھتے دیکھتے دِلّی بدلی تہذیب ثقافت کی بدلی، دِلی والوں کا مذاق بدلا، وضع بدلی، طور طریق بدلے۔
بدلتی ہوئی اس دہلی کا حال مرزا محمود بیگ صاحب نے دِلّی کی ٹکسالی ستھری زبان میں لکھا ہے اور اتنے پیارے اور فنکارانہ انداز میں لکھا ہے کہ بدلتی ہوئی دِلّی کا ہو بہو نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔

پریم چند کے خطوط مرتبہ :۔ مدن گوپال قیمت ۶/۵۰

کسی شخص کے خطوط اُس کی سیرت، کردار اور شخصیت کا حقیقی آئینہ ہوتے ہیں اُردو کے مایۂ ناز منفرد افسانہ نگار، ناول نویس اور انشاء پرداز، منشی پریم چند کے ۲۴۳ خطوط کو مدن گوپال صاحب نے ۲۵ برس کی مسلسل جستجو اور محنت شاقہ کے بعد ترتیب کیا۔ ان کی نجی کاروباری خطوط کے مطالعے کے بعد منشی پریم چند کی سیرت و شخصیت کو سمجھنے کے لیے کسی حوالے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

قلم کا مزدور مرتبہ :۔ مدن گوپال قیمت ۴/-

یہ کتاب منشی پریم چند کی داستانِ حیات ہے جس کو مدن گوپال صاحب نے برسہا برس کی طویل محنت کے بعد منشی جی کے خطوط، ان کی تحریروں اور ان کی شریک حیات کی لکھی ہوئی یادداشتوں کی مدد سے مرتب فرمایا ہے کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تلخ ہو یا شیریں جو صحیح بات تھی اُس کو من وعن پیش کر دیا گیا ہے۔

شہر آشوب ڈاکٹر نعیم احمد قیمت ۷/۲۵

اردو کی کلاسیکی صنفِ سخن "شہر آشوب" کے تحت جو نظمیں لکھی گئی ہیں وہ محض خیال آرائی یا مضمون آفرینی کا نتیجہ نہیں بلکہ اپنے اپنے دور کے حالات کی تخلیق ہیں۔ اسی لیے یہ صنفِ سخن زندگی پر بے لاگ تبصرہ بھی ہے اور تنقید بھی۔ ڈاکٹر نعیم احمد نے اُردو کے ۸۲ شعراء کے مشہور شہر آشوبوں کو معہ مقدمہ و حواشی مرتب کر کے اُردو ادب کی بے مثال خدمت کی ہے۔ اس صنف پر اُردو میں یہ واحد کتاب ہے۔

اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ ..... سے آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے ہمیں امید ہے کہ ۲۵ دسمبر مبلغ دس روپے بھیج کر آئندہ بھی پرچہ کی سرپرستی جاری رکھیں گے۔ آپ کا خریداری نمبر ..... ہے منیجر

عصمت چغتائی

اُردو کا رسم الخط بدل دیا جائے

اُردو مر جائے گی!
اُردو مر رہی ہے!!
اُردو مر گئی!!!

بائیس برس سے جس زبان پر نزع کا عالم طاری ہے، لب دم ہچکیاں لے رہی ہے، مگر مر نہیں چکتی، اللہ کے واسطے کوئی "مرسی کلنگ" پر ہی دھیان دے کیا یہ ضروری ہے کہ ممی بنا کر کاندھوں پر اُٹھائے پھریں۔

لیکن یہ عجیب چکلس ہے۔ اُردو کالجوں میں مر گئی۔ اسکولوں میں دفن ہو گئی رسالوں میں رنجھ رہی ہے مگر پھر بھی زبانوں پر ڈٹی ہوئی ہے۔ بولی جاتی ہے اور ملک کے کونے کونے میں سمجھی بھی جاتی ہے اور اُردو کو یہ ہمہ گیری بخشنے کا الزام یا انعام ہندوستانی فلموں اور قوالیوں کو ملنا چاہیے فلم اور قوالی کسی فن کی ترقی کے خیال سے یا خدمتِ خلق کے ارادے سے رائج نہیں، صرف دولت کمانے کی غرض سے انہیں اتنی ترقی نصیب ہوئی ہے۔ ہندی سرکاری زبان ہوتے ہوئے بھی اتنی ہر دل عزیز نہیں جتنی اُردو ہے۔ سرکار کی ہزار کوشش اور ٹھونس ٹھانس کے باوجود تفریح کے میدان میں ہندی ہاری ہوئی ہے۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہو جائے گا کہ اُردو کے ہر خوبصورت محاورے اور تشبیہہ کو فلمی مکالموں اور گیتوں میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ فارسی کی ترکیبیں کامیاب ترین لکھنے والے اُردو والے ہی ہیں۔ قوالی میں لطیف سے لطیف شعر پر واہ واہ ہو رہی ہے اور وہ بھی گجراتی اور مراٹھی سامعین کے مُنہ سے۔

اب محرم کی طرح اُردو کا تہوار منانے سے کیا ہوگا۔ جب رسم الخط مٹ رہا ہے تو اس چلنے میں سے اگر اُردو ترکیبیں بچالی جائیں تو کیا ہرج ہے۔ اس میں ہندی کا بھی نقصان نہیں۔ الفاظ ایک ملک کی دولت ہوتے ہیں۔ وہ کسی بھی زبان میں سمو دیے جائیں فائدہ ہی ہوگا۔

اُردو کا رسم الخط مٹ رہا ہے تو اس کی لطافتوں کو مٹنے سے روک لیجیے۔ ہندی کے ادیب اس بات کو مان رہے ہیں۔ اور ان کی تحریروں میں بے تکان اُردو کے الفاظ جگہ پا رہے ہیں۔

آپ یہ جانے دیجیے کہ ہندی کے رسالوں نے مجھے خریدا ہے یا نہیں۔ آپ نے مجھے خریدا ہے یا نہیں۔ آپ بھی تو کچھ نہ کچھ بیچتے ہی ہوں گے۔ میں اپنی تحریریں بیچتی ہوں۔ دنیا میں ہر شخص کچھ نہ کچھ بیچ کر زندہ رہتا ہے تو میں کس شمار و قطار میں ہوں لیکن اگر کسی کو یہ غلط فہمی ہے کہ میرے مضمون سے ہندی والے خوش ہوں گے تو میں ان کی عقل کی داد دیے بغیر نہیں سکتی۔ ہندی والے اُردو کے الفاظ کا وجود ہندی کے لیے قابل ہضم نہیں سمجھیں گے شاید مانگ کی گئی تو ہندی کو اُشدھ کرنے کی دھمکی سمجھیں گے مگر سنجیدہ مزاج لوگ اگر ڈھنگ سے بات چیت ہو تو اس پر غور ضرور کریں گے۔

یہ شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ میری کہانیاں اُردو سے ترجمہ ہو کر ہندی میں چھپی ہیں۔ ایک حصہ مترجم لے جاتا ہے اس لیے میرے حصے میں اتنا نہیں آتا جتنا بیسویں صدی اور شمع سے آتا ہے۔ لیکن فرض کیجیے کہ ہندی سے مجھے اُردو سے زیادہ ملنے لگیں تو میں ہندی لکھ کر اُردو سے غداری کروں گی؟ مجھے زبان سے کوئی بغض نہیں وہ خواہ کسی زبان میں چھپے میرے خیالات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ جائیں بس اتنی ہی میری خواہش ہے۔ میں اُردو کے لیے نہیں لوگوں کے لیے لکھتی ہوں۔ گجراتی یا مراٹھی میں اگر چھپ جائے تو اور خوشی ہوتی ہے۔

اگر اُردو کا رسم الخط بدل دیا گیا تو اردو ختم ہو جائے گی، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ تو اتفاق ہے کہ اُردو عربی رسم الخط میں لکھی گئی باہر سے آنے والوں کے میل جول سے جو زبان بنی وہ ہندی لپی میں بھی لکھی جا سکتی تھی۔ فارسی ختم ہو گئی لیکن اسکے بہت سے الفاظ اب بھی مراٹھی، گجراتی۔ اور دکن کی زبانوں میں زندہ ہیں۔ اگر

فارسی کو زیادہ سے زیادہ دیوناگری لپی میں سمجھا جاتا تو اور زیادہ زندہ رہ جاتی۔
وہی حشر اردو کا ہو رہا ہے نئے پود کے بچے اُردو کے الفاظ بھی بھولتے جا رہے ہیں
گالیاں دینا کوئی کمال کی بات نہیں۔ ویسے اگر میں یہ کہوں کہ ہندی کی
مخالفت کرنے والوں کو سی، آئی، اے، نے خرید رکھا ہے امریکہ کے ٹکڑے کھا کر ہندی کی
مخالفت میں بول رہے ہیں۔ اگر اُردو اور ہندی مل گئیں تو انگریزی زبان کے لیے
خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ ہندوستان کی اپنی زبان اتنی مضبوط ہو جائے گی کہ بغیر انگریزی
کے کام چل جائے گا اور پھر شاید انگریزی بھی فارسی کی طرح کچھ الفاظ چھوڑ کر
اُڑ جائے گی انگریزی کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ اُردو ہندی والے ہمیشہ ایک
دوسرے کو کھسوٹتے رہیں، کسی معقول نتیجہ پر نہ پہونچ پائیں۔ انہی ہتھکنڈوں سے
ہندو مسلمانوں کو لڑا کر انگریز نے حکومت کی۔ اور جب سے انگریز گیا ہے ہندی اُردو
کو لڑا یا گیا ہے۔ حالانکہ انگریزی سے ہندوستان کی زیادہ تر آبادی کو کوئی فائدہ نہیں
مگر سب زبانوں کے اوپر انگریزی ڈٹی ہوئی ہے۔ اور اُردو، ہندی کے مخالفین
سامراجی طاقتوں کے زرخرید غلام ہیں جو ان کا ڈھول پیٹتے ہیں۔ اور ان کی پالیسی
کو ہندوستان پر لاگو کئے ہوئے ہیں۔ اسی لیے تو وہ اس نکتہ پر ٹھنڈے دل سے
بات کرتے ڈرتے ہیں کہ خدانخواستہ اگر اردو ہندی کا سمجھوتہ ہو گیا تو انگریزی کو گزند پہونچے گی۔

اُردو مرتی ہے مرنے دو، ہندی سے نفرت اور بڑھے گی، ضد بڑھے گی۔
ہندی اور سنسکرت کی طرف رجوع ہوگی۔ عام انسان کے ذہن پر زیادہ بوجھ
پڑے گا۔ وہ انگریزی کی گود میں پناہ لے گا۔ انگریزی فلموں کی مارکیٹ قائم
رہے گی۔ امریکن، ڈے آف لائف کے جھنڈے گڑے رہیں گے۔ کسی ملک کو اپنے
موافق بنانے کے لیے وہاں اپنی زبان سمجھنے والے ہونے چاہییں۔

اگر بائیس برس پہلے ہی ہندی اُردو کی جنگ شروع کرنے کی بجائے
کوئی سمجھوتہ ہو جاتا تو انگریزی بیکار ہو جاتی۔ انگریزی کا دبدبہ کم ہو جاتا، نئی پود
انگریزی کلچر سے متاثر نہ ہوتی۔

گالیوں کی ہے تو ترقی پسند روس کے ڈھنڈورچی ہیں اور جدیدیت
پرست امریکہ کے بھاڑے کے ٹٹو ہیں۔ وہ اشتراکیت پھیلانے پر تلے ہوئے ہیں

یہ امریکی زہر دماغوں میں ٹھونس رہے ہیں تاکہ انسان کا بھیجہ مفلوج ہو جائے۔ فرد کی تنہائی کا شوشہ چھوڑ کر دماغوں کو اس میں الجھا دو کہ سوچنا چھوڑ کر فرد کا ماتم چھوڑ کر سوچنے والے دماغ امریکی پالیسی کے لیے قاتل ہیں۔

اُردو کے ساتھ تو جو ظلم ہوا وہ ظاہر ہے لیکن جو ہندی کے ساتھ ہوا اس کا کوئی ذکر بھی نہیں کرتا۔ ہندوستانی حکمراں سب طریقے وہی سنبھال کر گدیوں پر بیٹھ گئے جو انگریز استعمال کرتا تھا۔ باریکیوں پر غور کرنے کی فرصت کسے تھی، انگریز کی چھوڑی گدی سنبھالی تھی، ہاتھ پیر پھولے ہوئے تھے جن ہتھکنڈوں سے وہ گدی پر جما ہوا تھا وہی چلتے رہے بلکہ زیادہ مفید ثابت ہوئے۔ انگریز عوام کو تعلیم کے حق میں نہیں تھا کہ پڑھ لکھ کر سمجھ آجائے گی تو اُلٹے سیدھے سوال کریں گے۔ جنھوں کو انگریزی تعلیم دیدی وہی مصیبت بن گئے اور سلطنت ہاتھ سے گئی۔ محدود طبقہ تک تعلیم دی جائے اس لیے انگریزی زبان ٹھونسی گئی۔ ہماری اپنی حکومت آئی تو اس کا پروگرام بھی انگریز سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ اس لیے زبان کے معاملہ میں وہی پالیسی بنائی کہ ہندی کو اسٹیٹ لنگویج کا بھاری بھرکم عہدہ دیکر دوسرے صوبوں کی زبانوں کو اس کا دشمن بنا دیا اور اس کے سر پر اصل مالکن یعنی انگریزی ویسے ہی قائم رکھی۔ آج دفتروں کچہریوں اور کالجوں میں ہم انگریزی کے ویسے ہی محتاج ہیں جیسے انگریز راج میں تھے۔ انگریزی تک عام انسان نہیں جا سکتا۔ انگریزی داں طبقہ ہی حاکم بنا ہوا ہے۔ انہی کی اصل اولاد انگریزی پر عبور حاصل کرنے کی حیثیت رکھتی ہے۔ عام انسان اس اجارہ داری پر حملہ کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔ انگریزی اخبار نہیں پڑھ سکتا جو کچھ اس کے کان تک پہونچانا ہوتا ہے وہ اس کی زبان میں پہونچا دیا جاتا ہے۔ حاکموں کے معاملہ میں اسے پوچھ گچھ کی اجازت نہیں۔ کام کی باتیں سب انگریزی میں ہوتی ہیں۔ ہاں قصے کہانیاں ہندی، اُردو یا کسی بھی زبان میں چاہو پڑھ لو۔

چونکہ انگریزی نہیں جانتا اس لئے عام گاؤں کا باشندہ اور مزدور اعلیٰ تعلیم بہ آسانی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے بڑی رعایتیں دے رکھی ہیں بالکل انگریز حاکم کی طرح، مگر یہ معلوم ہے کہ وہ کبھی ان سے مکمل فائدہ اٹھانے کے قابل نہ ہوگا۔ حکومت انگریزی داں طبقہ کے ہاتھوں میں رہے گی۔ سرمایہ داری

نظام کبھی عوام کا عمل دخل برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی کی ایک شاخ یہ اُردو ہندی جھگڑا ہے۔

جس طرح ہندو مسلمان کی لڑائی سیاسی گورکھ دھندہ ہے اسی کی ایک شاخ اُردو ہندی کی چپقلش ہے۔ سیاسی پارٹیاں اپنے مطلب کے لئے انہیں استعمال کرتی رہیں گی۔

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

جائزے

"گرد کا درد"
(مطبوعہ جنوری ۱۹۷۰)

شاعر:- کیف احمد صدیقی
سائز:- ۲۰×۳۰/۱۶ ، صفحات:- ۹۶
قیمت:- ۳/-
ملنے کا پتہ:- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۲۵

"گرد کا درد" کیف احمد صدیقی کے کلام کا پہلا مجموعہ ہے۔ کیف صاحب گزشتہ دس بارہ برسوں سے فکرِ سخن کر رہے ہیں۔ اور اس عرصہ میں ان کا کلام ہند و پاک کے تمام ممتاز ادبی جرائد میں شائع ہوتا رہا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اُن کا نام غیر مانوس نہ ہوگا۔ "گرد کا درد" میں انہوں نے جو انتخاب پیش کیا ہے اس سے مجموعی طور پر چند نکات کی خاصی وضاحت ہوتی ہے۔ مثلاً نئی پود کے بیشتر شاعروں کے مقابلے میں ان کا کلام غیر ضروری ابہام سے پاک اور واضح ہے۔ کچھ لوگوں کو واضح شاعری سے الجھن ہوتی ہے۔ اور کچھ نقاد اصل شاعری سے دلچسپی نہ لے کر شاعری کے سفر میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں یعنی شاعری کا سفر داخل سے خارج کی طرف ہونا چاہیے یا خارج سے داخل کی طرف۔ لیکن میرا خیال ہے کہ کچھ خلاق ذہن اس حد تک (UNSOFISTICATED) ہوتے ہیں کہ وہ ان مباحث کی طرف شعوری توجہ نہیں دیتے۔ اور کیف احمد صدیقی انہیں لوگوں میں سے ایک ہیں۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ نئے تجربوں کو اسی حد تک قابلِ قبول سمجھتے ہیں جو اُن کی سادہ لوحی اور منکسر مزاجی پر گراں نہ گزریں۔

مجموعہ کے شروع میں نظمیں ہیں جس میں شاعر اور نقاد "گرد کا درد" "جینے کے سہارے" "سوچ کا آتش کدہ" "سورج کی آنکھ" "ضعیف وقت" "اور مشورہ"

قابل مطالعہ ہیں۔ ان کی نظموں کا مطالعہ بھلے ہی آج کے انتہا پسندانہ رویہ رکھنے والے شاعروں کو مطمئن نہ کر سکے، لیکن اُن کی غزلیں یقیناً آج کی بہترین شاعری کی نمائندگی کرتی ہیں۔

کیف احمد صدیقی کی غزلوں کے مطالعہ سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ آج کی غزل نے جہاں نئے نئے مضامین سمیٹنے میں فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے وہاں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ غزل آج بھی اپنے لہجے اور غنائیت میں اپنی ترمی اور تاثر میں کسی طرح بھی اپنی روایت سے بے نیاز نہیں رہی ہے

کیف کی غزلوں میں عصر حاضر کے تمام مسائل انتہائی خوش اسلوبی سے سمٹ آئے ہیں۔ ان کے کلام میں نئے شہر کی مشینوں کا شور بھی ہے اور بھیڑ میں کھوئے ہوئے وجود کا سناٹا بھی۔ فرد کی ذات کا کرب بھی ہے اور اقدار کی شکست و ریخت کا المیہ بھی۔ نادر استعارے اور اچھوتی تشبیہات بھی ہیں اور تہذیب نو کی علامتوں کا ذکر بھی۔ مشین، ریل، بس، کار، ریڈیو، بجلی، سگریٹ، اخبار اور فائیل وغیرہ کا استعمال اس لیے نہیں ہے کہ ان کا ذکر کسی شعر کو نیا بنا دینے کی ضمانت ہے بلکہ ان الفاظ کا استعمال صرف اس لیے کیا گیا کہ کسی تجربہ، احساس، اور خیال کی عکاسی اس سچائی کے ساتھ نہیں ہو سکتی تھی جسے شاعرانہ سچائی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر:-

گھبرا کے شہرِ نو کی مشینوں کے شور سے
میں خود کو دے رہا ہوں صدا زور زور سے

یہ زندگی ہے صبح کے اخبار کی طرح
دن بھر کے بعد جس کی ضرورت نہیں مجھے

جب سے نصیب ہو گئی بجلی کی روشنی
گھر کے چراغ سے بھی محبت نہیں مجھے

رات میرے ذہن میں کیا جانے کیا الجھن رہی
دیر تک میں سگریٹوں پر سگریٹیں پیتا رہا

کتنی سبک سی آج مرے گھر کی شام تھی
میں فائلوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے گیا

یوں گردِ غم میں گم نہیں امیدوں کے قافلے
جیسے غبارِ راہ میں کھوئی ہوئی بسیں

کیف احمد صدیقی نے اپنے اس انتخاب میں اپنے ذہنی سفر کو قارئین کے سامنے پیش کرنے میں انتہائی دیانت داری کا ثبوت دیا ہے انھوں نے اپنے ابتدائی دور کی بہت سی روائتی غزلوں کو رد کر کے ان میں سے صرف چند غزلیں ہی اس انتخاب میں شامل کی ہیں۔ مگر اُن کی نئی غزلوں کے ساتھ ان غزلوں کا مطالعہ گراں نہیں گزرتا کیونکہ انکے لہجے اور اسلوب میں بھی کچھ نہ کچھ نیا پن ضرور ہے۔ جیسے

پہلے رخسار کے پھولوں کی طرح نازک تھیں
اب ترے دل کی طرح بن گئیں پتھر یادیں
اوراقِ یادداشت پلٹ کر تو دیکھیے
شاید کسی ورق پہ مرا تذکرہ ملے۔
کاش ہم تم نہ بچھڑیں پسِ مرگ بھی
مر کے بھی دفن ہوں ایک ہی قبر میں

لیکن کیف احمد صدیقی بہ تدریج اپنے ادبی سفر میں آگے بڑھتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں کیونکہ ان کے اس انتخاب میں ایسے بے شمار اشعار مل جائیں گے جو نئی شاعری کے لیے گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سوکھے پڑے درخت میں سویا ہوا تھا دن
سورج کی آنکھ کھل گئی پتوں کے شور سے
اک سانپ مجھکو چوم کے تریاق دے گیا
لیکن وہ اپنے ساتھ مرا زہر لے گیا
دنیا کا ہر لباس پہننا پڑا اُسے
اک شخص جب نکل کے مرے جسم سے گیا
ہر فرد آج ٹوٹتے لمحوں کے شور میں
عصرِ رواں کی جاگتی آنکھوں کا خواب ہے

اب کوئی نصف دام پہ بھی پوچھتا نہیں
یہ زندگی نصاب سے خارج کتاب ہے۔
یہ کائنات مری ذات پر ہے اک تہمت
یہ زندگی مرے دامن پہ ایک دھبّہ ہے
میں آفتاب ہوں سائے سمیٹتا ہوں مگر
اُسی کو پا نہ سکا جو کہ اپنا سایہ ہے۔
ہم ایک ڈھلتی ہوئی دھوپ کے تعاقب میں
ہیں تیز گام مگر سائے سائے جاتے ہیں
اکثر میں ایک زہر بجھے تیر کی طرح
نکلا ہوں حادثات کی ترچھی کمان سے
سُورج کی دُھوپ برف کی تحلیل ہو گئی
صحرا کی ریت پیاس کی اک جھیل ہو گئی
ہاتھ پیلے کر کے وہ خود بھی تو پیلی ہو گئی
حادثوں کا زہر پی کر روح نیلی ہو گئی
آتشِ گل میں پیہم سلگتی ہوئی نکہتِ مضطرب آ ابھرتی رہی
اور موجِ نسیمِ سحر قطرتاً شعلۂ رنگ سے چھیڑ کرتی رہی

مجموعی طور پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کیف احمد صدیقی کا یہ پہلا مجموعہ ایک ایسا شعری مواد فراہم کرتا ہے، جو نئی غزل کے اُبھرتے ہوئے نئے مزاج اور آہنگ کو سمجھنے کے لیے کافی معاون اور مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

کتابت اور طباعت صاف ستھری ہے کچھ غزلوں کی بہت گھنی کتابت کی گئی ہے انہیں اور پھیلایا جا سکتا تھا۔ صادقین کا سرورق خوبصورت ہے۔ مگر رنگوں کا انتخاب ان کی کمپوزیشن کے خطوط کو جاذبِ نظر نہیں بنا سکے ہیں۔ سرورق کے آخری صفحہ پر کیف احمد صدیقی کی تصویر ہے۔

(اقبال مجید)

مکتبہ جامعہ کی نئی اور اہم کتابیں

انتخاب نظیر اکبر آبادی

مرتبہ:- رشید حسن خاں

دورِ قدیم کے جدید الخیال، شاعرِ بے مثال نظیر اکبر آبادی کے کلام کا یہ انتخاب اس انداز سے مرتب کیا ہے کہ ان کی تقریباً ساری اہم نظمیں مکمل یا ضروری انتخاب کے ساتھ یکجا ہو جائیں۔ آخر میں غزلوں کا انتخاب ہے اور ضروری الفاظ کی فرہنگ بھی شامل کر دی گئی ہے۔

(فوٹو آفسٹ کے ذریعے شائع کی گئی)

قیمت لائبریری اڈیشن ۴/۴۰

عام ۳/۴۵

نیرنگِ خیال (اوّل و دوم)

محمد حسین آزاد

مرتب ——— مالک رام

معتبر ترین نسخے پر مبنی "نیرنگِ خیال" کا یہ اڈیشن نہایت اہتمام، صحتِ متن اور حُسنِ طباعت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ طلبہ اس سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

(فوٹو آفسٹ کے ذریعے شائع کی گئی) قیمت لائبریری اڈیشن۔ ۲/۳۰

عام ۱/۹۰

اردو اسینر ——— (نیا اڈیشن) ——— سید ظہیر الدین مدنی

یہ کتاب ہمیں مضمون نگاری کے فن کی ابتدا، اس کی تدریجی ترقی اور پھر ناول نگاری میں اس کے ضم ہو جانے سے متعلق ضروری باتوں سے روشناس کراتی ہے۔ اس کتاب میں مختلف دور کے ادیبوں کے اسینز و مضامین کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔

قیمت: ۳/۵۰

تازہ مطبوعات

"ابراہیم نامہ" (قدیم اردو جلد سوم) از: عبدل دہلوی مرتبہ: ڈاکٹر مسعود حسین خاں

"ابراہیم نامہ" دبستان بیجاپور کا پہلا ادبی نقش ہے۔ اس کا مصنف ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۶ء) کا درباری شاعر اور دبستان گولکنڈہ کے ملا وجہی کا ہم عصر تھا۔ اس کے اسلوب شعری کی سب سے بڑی کشش اس کی قوت بیان، نادر تشبیہات اور ہندو دیومالائی تلمیحات کے استعمال میں مضمر ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں قابل مبارکباد ہیں۔ جنھوں نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اس نسخے کو مرتب کیا۔ قیمت: دس روپے

غالب کے ڈرامے شوکت تھانوی

مرزا غالب کے منتخب اشعار پر لکھے گئے مزاحیہ ڈرامے۔ پلاٹ غالب کا اور اس پر تانا بانا بننے والے شوکت تھانوی۔ ایک نہایت دلچسپ کتاب۔ قیمت: ۴/۵۰

ذرا مسکرا دو (لطیفے) ڈاکٹر۔ آر۔ طاہر قریشی

۵۵ عنوانات کے تحت تقریباً ۱۵ سو نئے اور پرانے لطیفوں پر عمل جراحی کرکے نئی شکل میں پیش کئے گئے ہیں۔ بعض مردہ لطیفوں کو ڈاکٹر صاحب نے آکسیجن دیکر ان میں نئی روح پھونکی ہے۔ قیمت: ۵/۰

پندار (ناول) عفت موہانی

عفت موہانی نے ناول نگاروں کی صف میں اپنا مقام بنا لیا ہے۔ "پندار" آپ کا تازہ ترین گھریلو ناول ہے۔ قیمت: ۸/۰

پیاسا ساون (ناول) گلشن نندا

گلشن نندا آپ کے جانے پہچانے ناول نگار ہیں۔ "پیاسا ساون" آپ کا نہایت دلچسپ سماجی ناول ہے۔ قیمت: ۵/۵۰

کسک (ناول) عظمت رضا

"کسک" محبت میں قربان ہو جانے والی ایک ہندوستانی لڑکی کی داستان ہے۔ نہایت پاکیزہ۔ قیمت: ۹/۰

سرفروش (ناول) سرت چندر

انسانیت کے ترجمان سرت چندر کا رومانی اور سبق آموز ناول۔ ایثار و قربانی کی داستان شاید ہی اس سے اچھی کسی ناول میں ہو۔ قیمت: ۸/۸۰

روح غالب ڈاکٹر زور

مرزا غالب کی حیات اور کارناموں کی ایک مجمل سرگزشت اور ان کے اردو خطوط کے دلچسپ ٹکڑوں کا انتخاب مع پیش لفظ ڈاکٹر سر سید مہدی حسین بلگرامی نواب مہدی یار جنگ مرحوم۔ قیمت: ۳/۰

مٹتی بنتی تصویریں — بھگوتی چرن ورما — ترجمہ: رضیہ سجاد ظہیر

اس ناول کے چار مخصوص موضوعات ہیں۔ مشترکہ خاندان کا ٹوٹنا۔ متوسط درجے کے لوگوں کا آگے بڑھنا۔ نئی ابھرتی سرمایہ داری کے آگے جاگیرداروں کی شکست اور قومی آزادی کی شروعات۔ ناول کا پلاٹ ان ہی چاروں پر منحصر ہے اور ان ہی چاروں کے باہمی عمل اور ردعمل سے ناول کی پوری کہانی جڑتی ہے۔

قیمت: ۵/۰

گلِ رعنا — مرتب: مالک رام

غالب کے اردو اور فارسی کلام کا اولین انتخاب۔ اس انتخاب کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ یہ خود غالب نے کیا تھا۔

قیمت: ۷/۵۰

رفیع احمد قدوائی — اجیت پرشاد جین — ترجمہ: طیبہ سہیل

رفیع احمد قدوائی ہندوستان کے ایک سچے شہری تھے۔ وہ ایک وسیع القلب انسان تھے کہ کوئی بھی حادثہ ان کی حب الوطنی کے راسخ عقیدے کو رش سے مس نہ کر سکا۔ اپنے محبوب ترین لیڈر کی سوانح کا مطالعہ آپ کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

قیمت: ۱۰/۰

سو بڑے آدمی — سیموئیل نسنس و ولیم اے ڈی ورٹے — ترجمہ: عبدالمجید سالک

ابتدائے تہذیب سے دورِ حاضر تک سو عظیم شخصیات کے سوانحی مرقعے ان صفحات کی زینت ہیں۔ اس میں مہاتماؤں میں انبیائے کرام سے لے کر عظیم سیاسی رہبروں تک اور فاتحین میں سکندر سے لیکر آئزن ہاور تک بہت سے عظماء کے حالات یکجا کر دئے گئے ہیں۔

قیمت: ۳/۵۰

محمد علی جناح — کانجی دوارکا داس۔ ترجمہ اور ترتیب۔ سید شہاب الدین دسنوی

کانجی دوارکا داس کو ۲۲ سال تک قائدِ اعظم کی گہری دوستی اور رفاقت کا فخر حاصل رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔
"میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جناح ہرگز فرقہ پرست نہیں تھے ..... وہ ایک عظیم نیشنلسٹ تھے۔"
قائدِ اعظم کی نجی زندگی اور ملکی سیاسیات کے بعض ایسے پہلو جو اب تک منظرِ عام پر نہیں آئے تھے۔ اس دستاویز میں ملاحظہ فرمائیے۔ (نہایت عمدہ طباعت، گرد پوش اور جلد)

قیمت: ۴/۵۰

ذوقِ سفر — (شعری مجموعہ) — غلام ربانی تاباں

اپنی تمام تر صوری و معنوی خوبیوں کے ساتھ جناب غلام ربانی تاباں کی غزلیات کا تازہ ترین مجموعہ جسے غزل کی کلاسکی روایت و جدت کا حسین سنگم کہنا بے جا نہ ہوگا۔ عمدہ کاغذ، آفسٹ کی طباعت اور سلک اسکرین پر چھپے ہوئے سرورق اور گرد پوش کے ساتھ۔

قیمت: ۵/۰

۴۲ نظمیں — (شعری مجموعہ) — کلیم الدین احمد

زبانِ اردو کے منفرد شاعر کلیم الدین احمد کی ۴۲ نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں۔ ہر نظم میں ایک لطیف تجربہ کیا گیا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ گلچین بہار کو دامانِ تنگ کا گلہ کرنے کا موقع نہ رہا۔ قیمت: ۵/۷۵

ہجویاتِ میر — مرتب: احمد جلال پاشا

ان ہجویات میں ایسی ظرافت ملتی ہے جس کو زہر خند سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ میر تقی میر کی بے باکی اور صاف گوئی نے ان میں طنز کی شان پیدا کر دی ہے۔

قیمت: ۳/۵۰

جگر بریلوی شخصیت اور فن مرتبہ: مالک رام و سیفی پریمی

پرانے اساتذہ کی آخری نشانیوں میں سے ایک نشانی جناب شیام موہن لال جگر بریلوی کی ذات والا صفات ہے۔ ان کی مہارتِ فن، قدرتِ زبان و بیان اور بہ حیثیت انسان بلند پایگی کا سب ہی نے اعتراف کیا ہے۔ اس کتاب کے تمام مضامین حضرت جگر بریلوی کی شخصیت و فن پر بڑی گہری روشنی ڈالتے ہیں۔
قیمت: ۶/۰

دیدۂ حیراں (افسانے) مظفر حنفی

مظفر حنفی کے سوچنے کا طریقہ انفرادی اور جداگانہ ہے۔ انھیں اپنی سماجی ذمہ داری کا بھرپور احساس ہے، وہ پرانی قدروں پر نہایت لطیف اور چابکدستانہ انداز میں طنز کرنے کے فن میں مشاق ہیں۔ نہایت جاندار افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت: ۴/۰

زہرِ حیات (شعری مجموعہ) زاہدہ زیدی

زاہدہ زیدی کا پہلا شعری مجموعہ، جو شدتِ احساس، تخیل، تفکر، ذوقِ آگہی، احساسِ حسن، دردِ دل، بیتی اور زندگی کے گوناگوں اور تہہ دار تجربات سے بھرپور ہے قیمت: ۵/۰

پرچھائیوں کی وادی (ناول) انور عظیم

ایسے انسان جو خود زہریلوں کے جنگل میں پرچھائیوں کی طرح جیتے ہیں۔ "پرچھائیوں کی وادی" ان ہی کی داستان ہے۔ دیکھئے تو سہی زندگی اپنے سینے میں کتنے زخم چھپائے ہوئے ہے۔ ایک نہایت معیاری ناول۔ قیمت: ۵/۰

اردو کی دو قدیم مثنویاں اسمٰعیل امروہوی۔ ترتیب و تحقیق۔ نائب نقوی

شاہ جہاں اور عالمگیر کے عہد کے شاعر حضرت اسمٰعیل امروہوی کی سوانح اور فن پر سیر حاصل بحث اور ان کی مثنویاں۔ وفات نامہ بی بی فاطمہ (تصنیف ۱۱۰۵ھ) اور مثنوی معجزۂ انار (یا وشاہ خیبر و بلقیس شاہ) سنہ ۱۱۲۰ھ۔ اس کتاب میں شامل ہیں۔ نہایت اہم کتاب۔ قیمت: ۶/۰

آرٹ (فنِ مصوری) سید مجید اللہ

آرٹ ایک جامع اور وسیع المعانی لفظ ہے۔ اس کے اظہار کے بے شمار اسلوب اور تشریح کے جدا جدا انداز ہیں۔ یہ کتاب آرٹ کی مختلف قسموں کی اجمالی سیر کراتی ہے۔ طلبہ کے لئے نہایت مفید کتاب ہے۔ قیمت: ۳/۰

غالب اور مطالعۂ غالب ڈاکٹر عبادت بریلوی

ڈاکٹر عبادت گزشتہ تیس سال سے غالب کی شخصیت اور شاعری کے تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ میں مصروف ہیں۔ یہ کتاب اس مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ قیمت: ۳۰/۰

کچھوا اور خرگوش ڈاکٹر ذاکر حسین

یہ کہانی بہت پرانی ہے اور اس سے یہ سبق سکھانا مقصود رہا ہے کہ اگر راستہ چلنے والے میں عزم و حوصلہ اور صبر و استقامت ہے۔ دھن اور لگن ہے۔ محنت و مشقت کی عادت اور انکسار و مسکنت ہے تو ہزار دشواریوں کے باوجود راستہ طے ہو ہی جاتا ہے۔
قیمت عام اڈیشن ۱/۰
" لائبریری " ۲/۰

نذر نانک (منظوم سوانح) مہدی نظمی

گورونانک صاحب کی شخصیت نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی ممتاز ہستیوں میں سے ہے۔ آپ نے عشق الٰہی، باہمی محبت بلند اخلاق اور باطل شکنی کا جو پیغام دیا وہ رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔ مہدی نظمی نے بڑی عقیدت کے ساتھ آپ کی سوانح حیات کو نظم کیا ہے۔ قیمت ۔/۸

پیغمبرانِ سخن علی سردار جعفری

ہندی کے مایۂ ناز شاعر کبیر اور پیغمبرانِ سخن میر و غالب کی شاعرانہ حیثیتوں اور ان کے ادبی کارناموں پر مختصر مگر سیر حاصل بحث۔ قیمت : ۵/۰

تلخیاں ساحر لدھیانوی

ساحر لدھیانوی کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ جو رنگین بھی ہے اور سنگین بھی۔ قیمت : ۳/۷۵

مسلمان مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

یہ کتاب حضرت امام مالکؒ کے اس رسالے سے ماخوذ ہے جسے آپ نے خلیفہ ہارون رشید عباسیؒ کے نام لکھا تھا۔ تاکہ وہ اپنی زندگی کو اس معیار پر گزارے۔ اور اس پر عمل کر کے اسلامی اخلاق و کردار کا مظاہرہ کرے۔ قیمت : ۱/۲۵

رسائل

رسالہ	قیمت
اسلام اور عصر جدید ۱؍ مدیر ڈاکٹر عابد حسین	۴/۰
؍؍ ۲؍ ؍؍ ؍؍	۴/۰
؍؍ ۳؍ ؍؍ ؍؍	۴/۰
؍؍ جلد ۲ شمارہ ۱؍ ؍؍ ؍؍	۴/۰
؍؍ جلد ۲ شمارہ ۲؍ ؍؍	۴/۰
؍؍ جلد ۲ شمارہ ۳؍ ؍؍	۴/۰
عصری ادب ۱؍ مدیر ڈاکٹر محمد حسن	۵/۰
؍؍ ۲؍ ؍؍ ؍؍	۵/۰
گفتگو ۲؍ علی سردار جعفری	۶/۰
؍؍ ۳؍ ؍؍ ؍؍	۶/۰
؍؍ ۴؍ ؍؍ ؍؍	۶/۰
؍؍ ۵؍ تا ۸؍ (ایک جلد میں) ؍؍	۶/۰
تحریر ۱؍ مدیر مالک رام	۳/۵۰
؍؍ ۲؍ ؍؍ ؍؍	۳/۵۰
؍؍ ۳-۴؍ ؍؍ ؍؍	۶/۰
؍؍ ۵؍ ؍؍ ؍؍	۵/۰
؍؍ ۶؍ ؍؍ ؍؍	۶/۰
؍؍ ۷؍ ؍؍ ؍؍	۵/۰
؍؍ ۸؍ ؍؍ ؍؍	۵/۰
؍؍ ۹؍ ؍؍ ؍؍	۳/۵۰
؍؍ ۱۰؍ ؍؍ ؍؍	۳/۵۰
؍؍ ۱۱؍ ؍؍ ؍؍	۴/۰
ہندستانی زبان ۵ - مدیر ڈاکٹر مسعود عبدالستار دلوی	۳/۰

REGD-NO-D58 OCT-1970

KITAB NUMA

NEWDELHI-25

پیام تعلیم
جوبلی نمبر

جامعہ ملیہ کی گولڈن جوبلی کے موقع پر نومبر ۱۹۷۰ء میں پیام تعلیم بھی اپنا ایک خاص نمبر نکالے گا۔ اس میں جامعہ کی دلچسپ کہانی ہوگی چند لوگوں کا حال ہوگا جن کے ایثار و قربانی مسلسل جد وجہد اور مستقل مزاجی کی بدولت جامعہ اب اس مرتبہ کو پہنچی ۔

بہت سے اور دلچسپ مضمون ہوں گے، نظمیں ہوں گی، بلاک کی تصویریں ہوں گی بہت خوبصورت ٹائیٹل ہوگا۔ عام پرچے سے صفحے زیادہ ہوں گے، اس کی قیمت بھی زیادہ ہوگی یہ زائد قیمت مستقل خریداروں سے نہ لی جائیگی یہ نمبر مفت حاصل کرنے کے لیے آج ہی سالانہ خریداروں میں اپنا نام درج کرا یئے چندہ سالانہ صرف چھ روپے ہے ۔

قاعدہ
یسّرنا القرآن

مکتبہ جامعہ نے تعلیمی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے قاعدہ یسرنا القران کو نئی ترتیب، آسان و عام فہم ہدایتوں کے ساتھ شایع کیا تھا اس قاعدہ کو بحمد اللہ والدین اور معلمین دونوں نے بہت پسند کیا۔ اظہار پسندیدگی کے ساتھ ہی ہمارے بعض کرم فرماؤں نے قاعدہ کو اور بہتر بنانے کے سلسلے میں اپنی گراں قدر تجویزوں سے بھی نوازا ۔

ان تجویزوں کی روشنی میں قاعدہ یسرنا القران کا دوسرا اڈیشن شایع ہو کر آ گیا ہے ۔

سائز $\frac{20\times26}{8}$ سفید گلیز کاغذ، آفسیٹ کی چھپائی ۔

(پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے کوہ نور پریس دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر دہلی سے شایع کیا)

15(12)

ماہنامہ

نومبر ۱۹۶۹ء

مکتبہ جامعہ ملیہ نئی دہلی

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے کلاسیکی ادب کا سرمایہ عام قاری کی دسترس سے باہر ہوتا جارہا ہے۔ پرانی کتابیں یا تو نایاب ہوگئی ہیں یا غیر ذمہ دار ہاتھوں نے انہیں اس قدر مسخ کردیا ہے کہ اُن کی صحت مشکوک ہوگئی ہے اور افادیت معدوم۔

مکتبہ جامعہ نے اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ایسی کتابوں کی اشاعت کی ایک اسکیم مرتب کی ہے جس کے تحت ایسی کتابیں ایک بار پھر منظرِ عام پر لائی جاسکیں۔ خوشی کی بات ہے کہ حکومتِ جموّں و کشمیر نے اِس اسکیم کو پسند کرکے اپنے تعاون سے نوازا۔ چنانچہ دونوں کے اشتراک سے یہ کام شروع کردیا گیا ہے۔ اس سلسلے کی مندرجہ ذیل دو کتابیں اب تیار ہوگئی ہیں۔

مقدمہ شعر و شاعری: خواجہ الطاف حسین حالی مرتبہ: رشید حسن خاں
صفحات ۲۳۶، سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، قیمت ۲/۶۰ (لائبریری اڈیشن ۴/۴۰)

انتخاب سراج اورنگ آبادی مرتبہ: ڈاکٹر محمد حسن

فوٹو آفسٹ کے ذریعے نہایت خوب صورتی کے ساتھ چھاپی گئی یہ کتابیں زیادہ سے زیادہ صحتِ متن کے ساتھ شائع کی گئی ہیں تاکہ عوام، طلبا اور تحقیقی کام کرنے والے پورے اعتماد کے ساتھ ان سے فائدہ اٹھا سکیں، ہمیں یہ اعلان کرتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ حکومت جموّں و کشمیر کے تعاون کے باعث ان کتابوں کی قیمتیں بھی عام بازاری شرح کے مقابلے میں کم رکھی گئی ہیں۔ تاکہ عوام زیادہ سے زیادہ استفادہ کرسکیں۔

اس سلسلے کی تیسری کتاب

مُوازنہ انیس و دبیر بھی بہت جلد منظرِ عام پر آرہی ہے

ماہنامہ **کتاب نما** دہلی

لائبریریوں اور بک کلب کے ممبروں کے لیے

سالانہ چندہ ایک روپیہ

مینجنگ اڈیٹر: غلام ربانی تاباں

اڈیٹر: ریحان احمد عباسی

نومبر ۱۹۶۹

جلد ۹ شمارہ ۱۱

سالانہ چندہ ۲ روپے

فی پرچہ ۲۰ پیسے

اشاریہ

سن ۶۹ء زندہ باد

ہندوستان کے لئے واقعی یہ سال ایک طویل مدت کے بعد ہر طرح بڑا ہی یادگار سال ثابت ہوا ہے۔ یہ "غالب صدی" والا سال ہے۔ یہ بات بھلا ہم بھول سکتے ہیں کہ اس سال ہم نے کس کس طرح اور کیسے کیسے جوش و خروش سے اس کے جشن منائے ہیں۔

گرونانک جی جیسے عظیم دینی رہنما، امن و آشتی کے پیامبر اور ایک مثالی انسان کا پانچ سو واں یوم پیدائش بھی اسی سال نومبر میں منایا جا رہا ہے۔

گاندھی جی اگر زندہ رہتے تو اسی سال پورے سو سال کے ہو جاتے۔ ہندوستان کو غلامی سے نجات دلانے والے اس دیوتا، مثالی قومی رہنما اور ہماری شکستہ کشتی کے اس ناخدا کے صد سالہ جشن بھی اسی سال منائے جا رہے ہیں۔

گاندھی جی نے اپنی زندگی میں کبھی ذات برادری مذہب و ملت اور رنگ و نسل میں امتیاز نہیں برتا۔ وہ زندگی بھر اسی کی تبلیغ بھی کرتے رہے یہاں تک کہ اپنی جان کی بھی بازی لگا دی۔ شاید اسی رعایت سے ان کے نام لیواؤں نے "یادگار صدیوں" کے اس یادگار سال میں وہ "قابلِ ذکر" فساد رونما کرائے ہیں جن کے ہنگامے دوسرے جشنوں کے مقابلے میں کسی طرح بھی کم نہیں اور جو برسہا برس تک کوشش کے باوجود بھلائے نہ جا سکیں گے۔

ہندوستانی بڑے روادار ہوتے ہیں، بڑے ہی ملنسار، بڑے ہی خلیق، بڑے ہی مہمان نواز، بڑے ہی نرم دل، غرض کون سی خوبی نہ ہوگی جن کا ہم ذکر نہ کرتے ہوں۔ ہماری کہانیوں میں ہمارے گیتوں میں جگہ جگہ اس کا ذکر ملتا ہے۔ کیا ہم واقعی ایسے ہیں؟ کیا ہماری آج کی زندگی کی صحیح اور سچی تصویر ایسا ہی عکس پیش کرتی ہے؟ کاش اس کا جواب اثبات میں مل سکتا

کتاب نما کا پچھلا شمارہ ۸۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ موجودہ شمارے میں بھی اتنے ہی صفحات ہیں۔ دسمبر کے کتاب نما میں بھی معمول سے زیادہ صفحات شائع کئے جائیں گے۔ اس طرح ایک شمارے کی کمی جو گذشتہ دو تین مہینے سے چل رہی تھی، پوری ہو جائے گی۔

کتاب نما کی سالانہ قیمت صرف دو روپے ہے۔ مکتبہ جامعہ بک کلب کے ممبروں اور اسکول لائبریریز وغیرہ سے صرف ایک ہی روپیہ لیا جاتا ہے، اس کے باوجود ہمیں افسوس ہے کہ بہت سے خریداروں نے باوجود یاد دہانیوں کے ابھی تک اپنی خریداری کی تجدید نہیں فرمائی۔ ہم ان سطور کے ذریعے ایک بار پھر درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنا چندہ جلد بھجوا دیں۔ شکریہ

صفحہ ۲۹ کی بقیہ خبریں

بے حد اہتمام سے آفسیٹ کے ذریعے ادارۂ یادگار غالب رام پور کی جانب سے طبع کیا گیا ہے۔ اور اپنے معیار ترتیب و طباعت کے لحاظ سے اردو کی اشاعتی دنیا میں ایک ناقابل فراموش کارنامہ اور یادگار اضافہ ہے

یہ دیوان جس کی قیمت ۷۵/- مقرر ہوئی ہے، مرتب کی رعایت سے "نسخۂ عرشی زادہ" نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کی رسم اجراء جلد ہی نئی دہلی میں ایک خاص تقریب کے ذریعے عمل میں آرہی ہے۔

● جناب خلیل الرحمٰن صاحب سیفی پریمی استاد جامعہ ہائر سکنڈری اسکول کو ان کے مقالے "مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی: حیات اور خدمات" پر دہلی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا ہوئی ہے۔

● مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر بمبئی ۲ سے اردو ہندی کا ریسرچ جرنل "ہندستانی زبان" (قیمت ۳/-) شائع ہو گیا ہے۔ اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر عبدالستار دلوی ہیں اور اس میں ڈاکٹر بھولا ناتھ تیواری، ڈاکٹر یونس نائرو، حامد اللہ ندوی، اقبال احمد، ڈاکٹر نورالسعید اختر، امیر اللہ شاہین اور ڈاکٹر عبدالستار دلوی کے نگارشات شامل ہیں۔

● ۲۷ ستمبر ۷۹ء کو لکھنؤ میں سید علی عباس حسینی کا ۷۳ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا انا للہ وانا الیہ راجعون مرحوم صف اول کے ادیبوں میں شمار ہوتے تھے۔ افسانہ، ناول اور تنقیدی ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ انہوں نے افسانوں کے متعدد مجموعوں اور ناولوں کے علاوہ متعدد تاریخ پر قابل قدر سرمایہ یادگار کے طور پر چھوڑا ہے

تعارف

صلاح الدین ایوّبی

فرماں روایان اسلام میں سلطان صلاح الدین ایوبی کی جنگی مہیں جرأت و جسارت کے کارنامے، اس کا عزم و کردار اور توسیع سلطنت کی کوششیں نہ اب تک فراموش کی جا سکی ہیں اور نہ آئندہ فراموش ہوں گی۔ مورخوں کے علاوہ ہمارے ناول نویسوں نے بھی اس کی ذات اور مہات کو اپنا موضوع بنائے رکھا ہے لیکن عقیدت کی رو نیز رومانیت کے پرتو میں اس کے صحیح خد و خال کو انصاف اور ادبی دیانت کے ساتھ پیش کرنے میں کامیاب نہیں رہ سکے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ہر بات پر آنکھ بند کر کے آمنا و صدقنا کہہ دیا جائے۔ اور واقعات کی صحت اور معقولیت پر غور نہ کیا جائے۔ باوجود اس کے کہ تاریخی یا رومانی قسم کے ناولوں کا دور گزر چکا ہے لیکن اب بھی اس سلسلے کی اگر کوئی معقول چیز سامنے آتی ہے تو لوگوں کو وہ اپنی طرف متوجہ کر ہی لیتی ہے۔

قاضی عبدالستار جو دورِ حاضر کے ایک با شعور اور خوش تحریر ناول نویس ہیں انہوں نے معاشرتی ناولوں کے ساتھ ساتھ بعض تاریخی شخصیتوں کو بھی ناول کے رنگ میں سامنے لانے کی اک خوشگوار اور کامیاب کوشش شروع کی ہے۔ دارا شکوہ کے بعد ان کا ایک نیا ناول (صلاح ایوبی) بھی، دورِ حاضر کی اکثر خصوصیات کا حامل اور پسندیدگی کا مستحق ہے۔ ہیرو پرستی کی دھن میں اکثر قلم کار صحت و انصاف سے تجاوز کر جاتے ہیں اور پھر ان کی ادبی کاوش نقادوں اور حقیقت پسندوں کی نظر میں بے وقعت بن جاتی ہے۔ اس ناول میں بلا وجہ کی لفاظی، خواہ مخواہ کی افسانہ طرازی اور بے لطف منظر کشی کے بجائے مہات، جد و جہد، مجاہدانہ کردار، فرماں روائی کے مسلمات اور خصوصیت کے ساتھ

اسلامی شعار رکھنے والے سپاہی کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ اس کی شجاعت اور سیرت و کردار کے سبھی اہم پہلو اُجاگر ہو جاتے ہیں اور یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس میں افراط و تفریط اور مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ ایک با مقصد اور رومانی گفتگو کے کہیں کہیں سے چند جملے ملاحظہ ہوں۔

"..... محبت ایک لفظ ہے جسے زبان کی ایک حقیر سی لغزش ادا کر دیتی ہے لیکن اس پر ثابت قدم رہنا بڑے بڑے بادشاہوں کے لئے بھی دشوار ہے۔" صفہ ۱۲

یوسف..... اگر تم مشرق میں ایک سلطنت پیدا کر سکو اور ہم کو مذہب کی ذاتی آزادی دینے کا وعدہ کرو تو ہم مغرب کا ایک جلیل المرتبت تاج اتار کر ایشیائی گورنر کے چھوٹے سے ولی عہد کی سوتی پگڑی قبول کر سکتے ہیں۔" صفہ ۱۲

"..... لیکن اس وقت انکشاف ہوا کہ ہم نے چاندنی سے قبا تراشنے کی کوشش کی تھی، ہم نے سنگین مجسموں سے رقص کی فرمائش کی تھی، ہم نے ایشیائی افسانوں کو حقیقت میں بدل دینے کا خواب دیکھا تھا۔

ملکہ عالم... تاج بادشاہوں کے لئے اتارے گئے ہیں۔ اگر کوئی بے خوف سپاہی اپنے سر پر رکھ لیتا ہے تو تاج کا کچھ نہیں بگڑتا ہے، سپاہی کی گردن تاج کا غلاف ہو جاتی ہے۔"

"تمہاری صورت کی طرح تمہاری زبان میں بھی جادو ہے، کاش..." صفہ ۴۲

داد و دہش کا ایک واقعہ

تین صدیوں کی خلافت ختم ہو گئی اور اتنی آواز بھی نہ ہوئی جتنی دو جانوروں کے ٹکرانے میں ہوتی ہے۔ تیسرے دن اس انقلاب سے لاعلم عاضد کا انتقال ہو گیا اور قراطو نے اس کے سامنے شہنشاہیت کی جمع کی ہوئی دولت ڈھیر کر دی، جس میں ایک زمرد بارہ انگشت کا تھا اور ایک یاقوت جبل نور، دو ہزار چار سو کیرات کے وزن کا تھا، موتی اور ہیرے اور نیلم اور پکھراج اسی طرح ڈھیر تھے جیسے منڈی میں اناج کے انبار لگے ہوتے ہیں۔ سونے کے تخت، پلنگ، کرسیاں، تپائیاں، شیر، چیتے، مرغ، طاؤس، گھوڑے، مینڈھے سب سامنے لائے گئے۔ سونے اور چاندی کے

ستونوں سے ان گنت شامیانے اور پچاس ہزار مرصع قبضوں کی تلواریں، مشک و عنبر کی ہزار ہا چیزیں، ہاتھی دانت، صندل اور آبنوس کو موم کی طرح ڈھال کر محیر العقول صناعی سے بنایا ہوا سامان اس کے سامنے سے گزارا گیا۔ وہ قالینوں دیوار پوشوں اور فانوسوں کی چھوٹی سی پہاڑی کے پاس کھڑا تھا کہ اگر ایلینور نے اس مال کا دسواں حصہ بھی دیکھ لیا ہوتا تو.... اور اس سے زیادہ سوچنے پر رضا مند نہ ہو سکا اور خلیفۂ راشد کی تقلید میں یہ تمام سامان سپاہ اور عوام کو کھڑے کھڑے تقسیم کر دیا۔ اور عجائبات سے سجے ہوئے قصر الکبیر کی سکونت اپنے امیروں کو عطا کر دی۔" صفحہ

کیفیت و کردار کی ایک مثال

"... تمہاری فتوحات کا راز تمہاری شمشیر زنی میں نہیں، تمہارے جوش ایمانی میں پوشیدہ ہے... کشورکشائی اور جہانبانی کی ہوس، جوش ایمانی کو غارت کر دیتی ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ دین کے نام پر غلاف کی جانے والی تلوار کو دنیا کے نام پر نیام سے نکالیں اور ایمان کی حرارت کو چند فتوحات کے جشن و جلوس کے ہاتھ بیچ دیں۔ صفحہ ۱۵۶

سلطان عادل کی علالت میں جاں نثار رعایا کی دعا۔

پروردگار اس اُمت کی نیکیوں کی نیکیوں کے صدقے میں سلطان المسلمین کو صحت دے۔ بارالٰہا! بیت المقدس کی بازیابی کے تصدق میں سلطان المعظم کی عمر مبارک میں برکت دے
"رب العالمین! یہ شوکت و صولت جو تو نے اپنی امت کو سلطان المعظم کی تلوار کے واسطے سے عطا کی ہے۔ اس کے طفیل میں سلطان المعظم پر رحم کر
اے گناہوں کے بخشنے والے! ہمارے جوان بیٹوں کی عمریں کاٹ لے۔ اور محافظ اسلام کی زندگی میں پیوند لگا دے۔"

حیرت انگیز وصیت

"... لوگو ہم نے تم کو طلب کیا، اس اعلان کے لئے کہ ہمارے تم پر جو حقوق ہیں وہ معاف ہوئے! اگر ہم پر تمہارے کچھ حقوق باقی ہیں تو ہم تسلیم کرتے ہیں.....
اور وصیت کرتے ہیں کہ ہمارے بھائی اور بیٹے اور بھتیجے اس شفقت اور محبت کے صلے میں، جو ہم نے ہمیشہ ان پر روا رکھی ہے...... ہمارے سامنے یا ہمارے بعد

تم کو ادا کردیں ۔

"ہم نے خدا کی رحمت سے ایک سلطنت پیدا کی اور سلطان کہلائے۔ لیکن درحقیقت ہم خدا کی امانت اور تمہاری خدمت کے امین تھے۔ آج یہ امانت اپنے پروردگار کو سونپتے ہیں، اور وصیت کرتے ہیں کہ ہم اپنی طرف سے کسی کو اس سلطنت کا وارث قرار نہیں دیتے۔ جس پر تمہیں اتفاق ہو اسے بادشاہ بنالو۔"

"وصیت ہے کہ جنازے کے ساتھ کوئی بین نہیں کرے گا۔
کسی خطیب کو تقریر کی اجازت نہیں دی جائے گی۔
کسی شاعر کو مرثیہ پڑھنے کا حکم نہ ہوگا۔
قبر پکی اور کچی بنائی جائے۔"

ہونٹ کانپ کر رہ گئے اور تکیوں پر سر ڈال دیا۔ طبیب خاص نے لپک کر نبض پر انگلیاں رکھ دیں۔ آنکھیں کھولیں اور صاف الفاظ میں فرمایا۔
"دوا نہیں دعا کرو ... کلام الٰہی سناؤ" صفحہ ۱۹۰-۱۸۹

یہ ہیں ناول کے بعض ٹکڑوں سے وہ اقتباسات جن سے قلم کار کی خوبیٔ تحریر اور ہیرو کی سچی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ داستان خواہ کتنی ہی پرانی ہو مگر اسلوب نگارش اور زبان و بیان پر دسترس، اس میں لطف اور مقصدیت پیدا کردیتا ہے — اس دور میں ایسے ناول اور اس نوعیت کے ناول نگار یقیناً توصیف اور قدر افزائی کے مستحق ہیں — مکتبہ جامعہ بھی اپنی اس اشاعت پر اگر فخر کرے تو نامناسب نہیں۔
صلاح الدین ایوبی کی قیمت ۳/۷۵ ہے اور یہ ناول مکتبہ کے صدر دفتر اور اس کی تینوں شاخوں سے مل سکتا ہے۔

صفحہ ۱۳ کا بقیہ

محبت بھی ہوگئی، اور ایک امر واقعہ کی طرح انھوں نے اسے محل میں بھی ڈال لیا!
اب میں زونو کے قول یا اصول کی تصدیق کرسکتا ہوں کیونکہ اس کے دل میں اگر راجہ صاحب کا ذرا سا بھی خیال ہوتا، اس نے راجہ صاحب کو کچھ بھی اہمیت دی ہوتی، تو وہ ان کی بڑی رانی بننا بھی قبول نہ کرتی! بہرحال اب میں دوبارہ سری نگر جاؤں گا۔ یہ زونو کا حکم ہے!

فہرست اور کتابیں ملنے کے پتے :-

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
شمشاد مارکیٹ	اردو بازار	پرنسس بلڈنگ
علی گڑھ	دہلی ۶	بمبئی ۳

مہاتما گاندھی

ہندو مسلم اتحاد

اتحاد ایک طاقت ہے۔ یہ صرف کتابی کہاوت نہیں بلکہ زندگی کا ایک اصول ہے جو سب سے واضح طور پر ہندو مسلم اتحاد کے سوال پر صادق آتا ہے۔ اگر ہم میں پھوٹ ہوگی تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ اگر ہم ہندو مسلمان ایک دوسرے کے گلے کاٹنے پر تیار رہیں گے تو کوئی بھی تیسری طاقت آسانی سے ہندوستان کو غلام بنالے گی۔ ہندو مسلم اتحاد کا مطلب صرف ہندوؤں اور مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ ان سب جماعتوں کا اتحاد ہے جو ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتی ہیں چاہے وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتی ہوں۔ . . . .

تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے جب ایک فریق غلطی پر ہو تو دوسرے کو برداشت سے کام لینا چاہیے۔ صرف اسی صورت میں ہندو مسلم اتحاد باقی رہ سکتا ہے۔ ایک فریق اچھا سلوک کرے بشرطیکہ دوسرا بھی ایسا ہی کرے، یہ نہ تو دوستی کا اصول ہے اور نہ جنگ کا۔ یہ تو سودا بازی ہوئی۔ دوستی میں سودا بازی کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ دوستی ہمیشہ بہادر فریقوں میں ہوتی ہے۔ اور سودا بازی کمزوروں میں۔ ہم طاقتور بھی ہیں اور کمزور بھی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندو مسلمانوں میں دوستی بھی ہے اور سودا بازی بھی ہوتی ہے۔ ہمیں یہ امید رکھنی چاہیے کہ روز بروز سودا بازی کا جُز غائب ہوتا جائے گا اور دوستی بڑھتی جائے گی۔ اگر ایک فریق برابر اپنے دل کو پاک کرتا رہے اور مضبوط ہوتا جائے تو دوستی مستقل ہو جائے گی۔

بہادری کے معنی دوسروں کو ڈرا دھمکا کر دبا لینا نہیں ہے۔ وہ بہادر آدمی نہیں ہے جو اپنی طاقت کے بل پر دوسروں کو خوفزدہ کرے۔ بہادر وہ ہے جو طاقت رکھتے ہوئے بھی اس سے دوسروں کو دھمکانے کا نہیں بلکہ کمزوروں کی حفاظت کا کام لے۔ بھلا بہادر بھی ڈرنا جانتا ہے؟ مسلمان جسمانی طور پر طاقتور ہے۔ اگر انھیں ساری دنیا کی حمایت بھی حاصل ہو تب بھی ہندوؤں سے ہرگز نہ ڈریں بلکہ خدا پر بھروسہ رکھیں اور انصاف کی راہ سے بال برابر بھی نہ ہٹیں۔ مسلمانوں کو بھی شرم آنی چاہیے کہ وہ باہر سے مدد لیں۔ اور انھیں ہندوؤں پر بھروسہ رکھنا چاہیے باوجود اس کے کہ وہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ بہرحال اگر دونوں

فریق اس مہذب طریقے پر عمل نہیں کرتے، صرف ایک ہی ایسا کرتا ہے تب بھی ہندو مسلم اتحاد میں خلل پڑنے کی کوئی وجہ نہیں۔ یعنی اگر ایک فریق بھی اپنے فرض پر ثابت قدم رہے تو دونوں میں دشمنی باقی نہیں رہے گی۔ اپنے فرض پر ثابت قدم صرف وہی کہلائے گا جو اپنی حفاظت کے لیے خدا پر بھروسہ کرتا ہے اور نیکی کی راہ پر چلتا ہے۔ اگر ہندو اسی اصول سے مولیوں کے معاملے میں کام لیں تو مولیوں کی زیادتیوں کو دیکھنے کے باوجود سب مسلمانوں کو ملزم نہیں ٹھہرائیں گے۔ وہ ان ہندوؤں کی جن کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے، مدد کریں گے۔ اور اس قابل کریں گے کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔

سوراج کا مطلب یہ ہے کہ اگر آدمی اقلیت میں ہو اور تن تنہا ہو، تب بھی وہ بے خوفی کے ساتھ دوسروں سے اختلاف کر سکتا ہے۔ ہندوؤں کو محض اس بھروسے پر نہیں رہنا چاہیے کہ سب مسلمان سمجھداری سے کام لیں گے اور مسلمانوں کو کچھ ہندوؤں کے کمینہ پن کی حرکتوں سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہر فرقہ کو اپنی طاقت پر بھروسہ ہونا اور دوسروں کی مدد کرنا چاہیے۔ کیا وجہ تھی کہ کوئی ایک ہندو بھی مولپوں کے مظالم سے ڈر کر بھاگ جائے۔ کیا وجہ تھی کہ کوئی ایک ہندو بھی برطانوی سپاہیوں کے ڈر سے ان کو مولپوں کا پتہ بتا دے۔ آخر کیوں کسی ایک ہندو نے بھی ظاہری طور پر مسلمان کی مذہبی رسمیں مولپوں کے ڈر سے ادا کیں۔ وہی اصول جو ہم برطانوی حکومت سے مقابلہ کرنے میں برتتے ہیں یعنی اپنی جان دیتے ہیں، ہر قسم کے مقابلے میں برتنا چاہیے۔ اگر ہم اس کے لیے تیار ہیں کہ ظالم کا کہنا نہیں مانیں گے چاہے ہم اس کے ہاتھ سے مارے جائیں، تو ہم شیر سے زیادہ طاقتور بن جائیں گے۔ جو شخص کسی ظالم کو اس طرح مغلوب کرے کہ اسے مار ڈالے، اس کو ایک دن یہ ہوس ہوگی کہ خود ظالم بن جائے۔ اس لیے کہ اس کی یہ عادت بن جائے گی کہ خدا پر بھروسہ کرنے کے بجائے اپنی حیوانی طاقت پر بھروسہ کرے۔ جو شخص اپنے کو خدا کی جگہ سمجھ لیتا ہے وہ ایک دن ضرور برباد ہو جاتا ہے۔ اسے کبھی آزادی نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ اس نے خدا کی جگہ غصب کرلی ہے اور اس کی وجہ سے وہ اپنا صحیح مقام کھو بیٹھا ہے۔ ......

حال کے واقعات میرے لیے سخت تکلیف دہ ثابت ہو رہے ہیں۔ میری بے بسی اور بھی زیادہ ناقابل برداشت ہے۔ میرا مذہب مجھے یہ سکھاتا ہے کہ جب کبھی کوئی ایسی مصیبت پڑے جسے انسان دور نہیں کر سکتا تو اسے برت رکھنا اور دعا کرنی چاہیے۔ میں نے اپنے قریب ترین عزیزوں

کے سلسلے میں بھی یہی کیا ہے۔ بظاہر میں جو کچھ بھی لکھتا یا کہتا ہوں اس سے دونوں فریقوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں مدد نہیں مل سکی۔ اس لیے میں نے اکیس دن کا برت رکھنے کا فیصلہ کیا ہے جو آج سے شروع ہو کر بدھ کے دن ۸ اکتوبر کو ختم ہو گا۔ میں یہ حق محفوظ رکھتا ہوں کہ نمک ڈال کر یا خالی، پانی پیتا رہوں یہ برت کفارہ بھی ہے اور دعا بھی۔

کفارہ کی حیثیت سے اس کی ضرورت نہ تھی کہ عام لوگوں کو اس کی اطلاع دوں۔ مگر میں اس برت کا اعلان اس امید پر کر رہا ہوں کہ یہ ایک پر اثر التجا ہو گی ہندوؤں اور مسلمانوں سے جو اب تک مل کر کام کرتے رہے ہیں، کہ وہ خودکشی نہ کریں۔

میں ادب کے ساتھ ان تمام فرقوں کے لیڈروں کو، جن میں انگریز بھی شامل ہیں مدعو کرتا ہوں کہ وہ اس جھگڑے کو جو مذہب کے لیے اور انسانیت کے لیے باعث شرم ہے مل بیٹھ کر چکا دیں۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے خدا کو اس کے تختِ عظمت سے اتار دیا گیا ہے۔ آیئے ہم اس کو اپنے دلوں کے سنگھاسن پر پھر سے بٹھا دیں۔ . . . .

میں پڑھنے والوں کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں نے یہ برت بغیر سوچے سمجھے نہیں رکھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عدم تشدد کے آغاز سے اب تک میری زندگی داؤں پر لگی رہی ہے۔ میں نے یہ قدم آنکھیں بند کر کے نہیں اٹھایا۔ مجھے اچھی طرح آگاہ کر دیا گیا تھا کہ اس میں کیا کیا خطرے ہیں۔ میں کوئی کام بغیر دعا کے نہیں کرتا۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ وہ جو قدم اٹھاتا ہے اس کے بارے میں اسے کبھی پورا یقین نہیں ہو سکتا کہ وہ صحیح ہے۔ جس آواز کو وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ اس کی دعا کا جواب ہے، بہت ممکن ہے کہ وہ خود اس کے غرور کی آوازِ بازگشت ہو۔ ایسی رہنمائی کے لیے جس میں خطا کا امکان نہ ہو انسان کے پاس ایسا معصوم دل ہونا چاہیے، جس سے کبھی برائی سرزد ہی نہ ہو۔ میں اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا میری روح توکش کش میں مبتلا، جدوجہد میں مصروف، خطاکار اور ناقص ہے۔ لیکن میں صرف اپنے پر اور دوسروں پر تجربے کرنے ہی سے روحانی ترقی کر سکتا ہوں۔ میں ایک خدا کی وحدت پر اور اس لیے انسان کی وحدت پر کامل عقیدہ رکھتا ہوں۔ اس سے کیا ہوتا ہے کہ ہمارے جسم بہت سے ہیں۔ ہماری روح تو ایک ہے۔ سورج کی کرنیں بکھر کر بہت سی ہو جاتی ہیں لیکن ان کا سرچشمہ تو ایک ہی ہوتا ہے۔ میں اپنے آپ کو برے سے برے آدمی سے الگ نہیں کر سکتا (اور نہ کسی کو اس پر اعتراض ہونا چاہیے کہ میں اپنے کو اچھے سے اچھے آدمی کے ساتھ ایک سمجھوں) اس لیے میں چاہوں یا نہ چاہوں مجھے مجبوراً اپنے سارے ہم جنسوں کو اپنے تجربوں میں شریک کرنا پڑتا ہے! اور تجربوں کے بغیر میں رہ

نہیں سکتا۔ زندگی تجربوں کا کبھی ختم ہونے والا ایک سلسلہ ہے۔

ایٹھی، سنبھل ور گل برگہ میں جو کچھ ہوا اس سے مجھے بہت سخت دھچکہ لگا ہے۔ میں نے ایٹھی اور سنبھل کے بارے میں وہ رپورٹیں پڑھیں جو ہندو اور مسلمان دوستوں نے مرتب کی ہیں۔ جو ہندو اور مسلمان دوست گل برگہ گئے تھے ان کی مشترک تحقیقات کا نتیجہ بھی میرے علم میں تھا۔ میں سخت کرب کی حالت میں یہ لکھ رہا تھا اور کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کوہاٹ کے فساد کی خبر سے میرے دل میں سلگتی ہوئی آگ بھڑک اٹھی کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا۔ دو راتیں میں نے سخت تکلیف اور بے قراری کی حالت میں کاٹیں تھیں۔ بدھ کے دن تدبیر سمجھ میں آگئی۔ مجھے کفارہ ادا کرنا چاہیے ستیہ گرہ آشرم میں صبح کی پرارتھنا کے وقت ہم رحم کے دیوتا شیو سے یہ دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ان سب گناہوں کو بخش دے جو جان بوجھ کر یا انجانے میں ہم سے ہوئے ہیں۔ میرا کفارہ ایک زخمی دل کی دعا ہے کہ وہ ان گناہوں کو بخش دے جو انجانے میں ہوئے۔

یہ ہندو اور مسلمانوں کے لیے جو مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں، ایک تنبیہ ہے اگر وہ مجھ سے سچی محبت کرتے ہیں اور اگر میں اس محبت کا اہل ہوں، تو میرے ساتھ وہ بھی کفارہ ادا کریں گے اس گناہ کا کہ ان کے دل خدا سے پھر گئے ہیں۔ ایک دوسرے کے مذہب کو بُرا کہنا، وغیرہ ذمہ دارانہ بیانات دینا، جھوٹ بولنا، معصوم لوگوں کے سر توڑنا، مندروں اور مسجدوں کی بے حرمتی کرنا، خدا سے منکر ہونا نہیں تو اور کیا ہے؟ دنیا دیکھ رہی ہے ـــــ کچھ خوش ہو کر اور کچھ رنج کے ساتھ۔ ان کتوں کی لڑائی کو جو ہمارے درمیان ہو رہی ہے۔ ہم شیطان کے کہنے میں آگئے۔ مذہب ـــ چاہے اسے آپ کسی نام سے پکاریں ـــــ اس سے زیادہ پختہ عقیدہ چاہتا ہے۔ ہندو اور مسلمانوں کا کفارہ یہ نہیں کہ وہ برت رکھیں، بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنے کیے ہوئے کی تلافی کریں۔ مسلمان کا سچا کفارہ یہ ہے کہ وہ اپنے ہندو بھائی کی طرف سے دل میں برائی نہ رکھے اور ہندو کے لیے سچا کفارہ یہ ہے کہ وہ مسلمان بھائی کی طرف سے دل میں برائی نہ رکھے۔

میں کسی ہندو یا مسلمان سے یہ نہیں چاہتا کہ وہ اپنے مذہبی اصولوں سے ذرّہ برابر بھی ہٹے۔ البتہ اسے یہ یقین کر لینا چاہیے کہ وہ سچ مچ مذہبی اصول ہیں۔ مگر میں ہر ہندو اور مسلمان سے یہ درخواست ضرور کروں گا کہ وہ کسی مادی فائدے کی خاطر آپس میں نہ لڑیں۔ مجھے سخت تکلیف ہوگی اگر میرے برت کی وجہ سے دونوں میں سے ایک فرقے کو بھی کسی اصولی معاملے میں جھکنا پڑا۔ میرا برت کا معاملہ تو میرے اور خدا کے درمیان ہے۔

چپکے چپکے یہ کہا جا رہا ہے کہ چونکہ میں مسلمان دوستوں کے ساتھ رہا کرتا ہوں، میں اس قابل نہیں رہا کہ ہندوؤں کے ذہن کو سمجھ سکوں۔ ہندو ذہن تو میں خود ہوں۔ ظاہر ہے کہ ہندو ذہن کو سمجھنے کے لیے مجھے ہندوؤں کے درمیان رہنے کی ضرورت نہیں، جبکہ میرا رواں رواں ہندو ہے۔ میرا ہندو دھرم ہی بودا ہوگا اگر وہ مخالف اثرات میں پنپ نہ سکے۔ ہندو دھرم کے لیے کیا چیز ضروری ہے یہ تو میں جبلی طور پر جانتا ہوں۔ البتہ مسلمان کے ذہن کو سمجھنے کے لیے مجھے کوشش کرنی پڑتی ہے۔ جتنا میں بہترین قسم کے مسلمانوں سے قریب رہتا ہوں اتنا ہی زیادہ اس کا امکان ہوتا ہے کہ میں انھیں اور ان کے کاموں کو انصاف کے ساتھ جانچ سکوں۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ دونوں فرقوں کے درمیان اتحاد کی مضبوط کڑی بن جاؤں۔ میری آرزو یہ ہے کہ ضرورت پڑے تو ان کے دلوں کو اپنے خون کے گارے سے جوڑ دوں۔ لیکن یہ میں تبھی کر سکتا ہوں جب مسلمانوں پر یہ ثابت کر دوں کہ میں ان سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی ہندوؤں سے۔ میرا مذہب یہ سکھاتا ہے کہ سب سے یکساں محبت کرو۔ خدا مجھے یہ توفیق دے کہ میں اس پر عمل کر سکوں۔ میرے برت کا مقصد منجملہ اور چیزوں کے یہ بھی ہے کہ میں دونوں سے برابر بے غرض محبت کر سکوں . . . .

میرے لیے ہندو مسلم اتحاد سے دلچسپی کوئی نئی بات نہیں۔ مجھے پچھلے تیس سال سے سب سے زیادہ اسی کی فکر رہی ہے۔ مگر میں ابھی تک اس میں کامیاب نہیں ہوا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ خدا کی مشیت کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اصل میں میرے عہد کے دو حصے تھے۔ ان میں سے ایک پورا ہو گیا ہے۔ دوسرے حصے کو میں نے ملتوی کر دیا ہے، ان دوستوں کے اصرار پر جو اس رات محمد علی صاحب کے گھر پر موجود تھے۔ اگر میں دوسرے حصے پر قائم بھی رہتا تب بھی میرا برت اب ٹوٹ ہی جاتا اس کامیابی کے پیش نظر جو اتحاد کانفرنس کو ہوئی ہے۔

آج میں آپ سے یہ التجا کرتا ہوں کہ اگر ضرورت پڑے تو آپ اپنی جان ہندو مسلم اتحاد کے لیے قربان کر دیں۔ میرے نزدیک ہندو دھرم بے معنی ہے اگر یہ اتحاد حاصل نہ ہو سکے اور یہی بات میں اسلام کے بارے میں کہنے کی جرأت کرتا ہوں۔ ہمیں اس قابل بننا ہی ہوگا کہ امن و آشتی سے ساتھ ساتھ رہ سکیں۔ ہندوؤں کو پوری آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے مندروں میں پوجا کر سکیں۔ اور اسی طرح مسلمانوں کو اپنی مسجدوں میں اذان اور نماز کی پوری آزادی ہونی چاہیے۔ اگر ہم عبادت کی اس بنیادی آزادی کی حفاظت نہ کر سکیں تو ہندو دھرم اور اسلام کے کوئی معنی نہیں

رہ جاتے ۔ میں آپ سے وعدہ چاہتا ہوں کہ اس مذہبی آزادی کی پوری حفاظت ہوگی ۔ میں یہ جانتا ہوں کہ آپ یہ وعدہ کر چکے ہیں، مگر اس وقت اپنا برت توڑتے ہوئے میں، ذمہ داری کا بوجھ اس قدر زیادہ محسوس کر رہا ہوں کہ آپ سے اس عہد کی تجدید چاہتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں آپ سے بہ اصرار کہتا ہوں کہ خطرے کی گھنٹا سنئے اور پہچانیے ۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ایک ایسی قوم کے صبر کو نہ آزمائیے جس کا صبر ضرب المثل ہے ۔ ہندو تو نرم مزاج کہا ہی جاتا ہے مسلمان بھی خوش قسمتی یا بدقسمتی سے ہندو کے ساتھ رہتے رہتے نرم مزاج ہو گیا ہے ۔ اور مسلمان کے ذکر سے مجھے اقلیتوں کا پیچیدہ مسئلہ یاد آ گیا ۔ آپ یقین کیجیے کہ مسئلہ یہاں موجود ہے ۔ اور میں جو ہندوستان میں کہا کرتا ہوں، اسی کو پھر دہراتا ہوں ـــــ میں ان الفاظ کو بھولا نہیں ہوں ـــ کہ اقلیتوں کے مسئلے کو حل کیے بغیر ہندوستان ہرگز سوراج نہیں مل سکتا ۔ میں جانتا ہوں، اچھی طرح جانتا ہوں، پھر بھی اس امید پر یہاں آیا ہوں کہ شاید میں اس کا کوئی نہ کوئی حل یہاں نکال لوں ۔ لیکن مجھے اس سے مایوسی نہیں ہے کہ کسی دن میں حقیقی اور پائیدار حل پا لوں گا ۔ میں اس بات کو کسی اور جگہ کہہ چکا ہوں، پھر دہراتا ہوں کہ جب تک بدیسی حکومت کی پچر ایک فرقے کو دوسرے فرقے سے، ایک طبقے کو دوسرے طبقے سے الگ رکھے گی تب تک اس مسئلے کا کوئی حقیقی حل اور ان اقلیتوں کو کوئی سچی خوشی نہیں ہوگی ۔

بہر حال یہ زیادہ سے زیادہ ایک کاغذی حل ہوگا لیکن جیسے کہ آپ نے یہ پچر ہٹائی کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایک گھرانے کے لوگوں میں آپس کے رشتے، آپس کی محبت، ایک ہی نسل سے ہونے کے احساس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا؟ جب یہاں انگریز کی حکومت نہیں تھی، جب کسی انگریز کی صورت بھی نظر نہیں آتی تھی، تب کیا ہندو، مسلمان، سکھ آپس میں لڑتے رہتے تھے ۔

ہندو مورخوں اور مسلمان مورخوں دونوں نے واقعات کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہم اس وقت مقابلتاً زیادہ امن سے رہتے تھے ۔ اور دیہات میں تو ہندو مسلمان آج بھی آپس میں نہیں لڑتے اور ان دنوں تو ان میں کبھی لڑائی نہیں ہوتی تھی ۔ مولانا محمد علی مرحوم مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے، اور وہ خود تھوڑے بہت مورخ تھے "اگر اللہ نے مجھے اتنی عمر دی میرا خیال ہے کہ میں ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ لکھوں ـــــ اور پھر دکھاؤں گا ـــــ انھیں دستاویزوں کی بنیاد پر جو انگریزوں نے محفوظ کی ہیں ـــــ کہ اورنگ زیب اتنا برا نہ تھا جیسا انگریز مورخوں نے دکھایا ہے اور مغل حکومت ایسی گئی گزری نہ تھی جیسی انگریزوں کی لکھی تاریخ ہمیں بتاتی ہے ۔ ۔ ۔"

وغیرہ وغیرہ اور ہندو مورخوں نے بھی یہی لکھا ہے۔ یہ لڑائی زیادہ پرانی نہیں ہے۔ یہ لڑائی اس وقت سے ہے جب سے اس ذلت کا سامنا ہوا۔ میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ یہ اس وقت سے ہے جب سے انگریز آئے۔ جیسے ہی یہ موجودہ افسوس ناک مصنوعی غیر فطری تعلق جو برطانیہ اور ہندوستان میں ہے ختم ہوگا اور اس کی جگہ ایک قدرتی رابطہ قائم ہوگا، جب دونوں اپنی مرضی سے ایک دوسرے کے شریک بنیں گے، اس شرط پر جب دونوں میں سے ایک فریق بھی چاہے یہ شرکت ختم ہو جائے گی، جب وہ وقت آیا تو آپ دیکھیں گے کہ ہندو، مسلمان، سکھ، یورپین، انگلو انڈین، عیسائی اور اچھوت سب متحد ہو کر رہیں گے۔ . . . . . .

میں نے کئی بار یہ شکایت سنی ہے کہ ہندو مسلم اتحاد میں دیر اس لیے ہو رہی ہے کہ میں اس کے لیے کافی کوشش نہیں کرتا یعنی اگر میں سب کام چھوڑ اسی میں لگ جاؤں تو یہ اتحاد آج ہو سکتا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اس کے لیے پوری طرح کام نہیں کر رہا ہوں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہندو مسلم اتحاد کی جو لگن میرے دل میں تھی وہ کم ہو گئی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مجھے یہ محسوس ہوا جو اس حد تک پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ میں اس اعلیٰ مشن کے لیے کام کرنے کی پوری صلاحیت نہیں رکھتا۔ اور محض خارجی ذرائع اس بلند مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ناکافی ہیں۔ رفتہ رفتہ میرے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا ہے کہ میں سراسر خدا کی رحمتِ کاملہ پر بھروسہ کروں۔ اگر آپ میرے دل کی گہرائی میں دیکھ سکتے تو آپ کو یہ نظر آتا کہ وہاں ہندو مسلم اتحاد کے لیے دعا اور روحانی سعی کا سلسلہ دن رات ہوتے جاگتے، جاری رہتا ہے، ایک پل کے لیے بھی نہیں ٹوٹتا۔ آپ یہ سمجھ لیجیے کہ اگر اور کسی وجہ سے نہیں تو محض اس وجہ سے ہندو مسلم اتحاد چاہتا ہوں کہ اس کے بغیر سوراج کے ملنے کا کوئی امکان نہیں۔ کوئی اس وہم میں نہ رہے کہ چونکہ ہندو بہت بڑی اکثریت میں ہیں۔ وہ بغیر دوسرے فرقوں کی تائید اور مدد کے، سول نافرمانی کے ذریعے، ہندوستان کے لیے یا صرف اپنے لیے سوراج حاصل کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ میں بار بار کہہ چکا ہوں، خلوصِ نیت کے ساتھ سچی سول نافرمانی اگر گنتی کے چند آدمیوں تک بھی محدود ہو تو موثر ثابت ہو سکتی ہے۔ مگر یہ شرط ہے کہ چند لوگ نمائندگی کرتے ہوں ساری قوم کے متحدہ عزم اور قوت کی۔ کیا ہتھیاروں کی جنگ میں بھی یہی صورت نہیں ہوتی؟ مسلح فوجوں کو بھی پوری سول آبادی کی تائید اور تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر ان کے ہاتھ پاؤں شل ہو کر رہ جائیں گے۔ کیوں کہ میں سوراج کے لیے بے قرار ہوں اس لیے مجھے ہندو مسلم اتحاد کے لیے بے قرار ہونا ہی چاہیے اور مجھے پورا یقین ہے کہ ہندو اور

مسلمانوں میں اچھی اور پائیدار قلبی دوستی جو محض ایک سیاسی کام چلاؤ سمجھوتہ نہ ہو، دیر سویر ہو کر رہے گی۔ اور شاید دیر میں نہیں بلکہ جلدی ہی ہوجائے۔ یہ خواب میرے بچپن سے میرے سارے وجود پر چھایا ہوا ہے۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ میرے باپ کی زندگی میں راجکوٹ میں کس طرح ہندو اور مسلمان آپس میں میل جول رکھتے تھے۔ اور ایک دوسرے کے تہواروں اور تقریبوں میں سگے بھائیوں کی طرح شریک ہوتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ دن پھر ہمارے دیس میں لوٹ آئیں گے، اس وقت جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر دونوں فرقوں کے لوگ لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں یہ ہماری معمولی زندگی نہیں بلکہ اس سے ایک غیر فطری انحراف ہے۔ یہ ہمیشہ نہیں رہ سکتا۔

دنیا کے بڑے بڑے کام محض انسان کی کوشش سے انجام نہیں پاتے۔ وہ اپنے مقررہ وقت پر پورے ہوتے ہیں۔ خدا اپنی مصلحت کے مطابق ان لوگوں کو چنتا ہے جن سے اسے کام لینا ہے۔ کیا خبر کہ باوجود میری مسلسل دعاؤں کے اس نے مجھے اس عظیم کام کے قابل نہ سمجھا ہو۔ ہم سب کو ہر وقت کمر باندھے چراغ روشن کیے تیار رہنا چاہیے۔ کیا خبر کب اور کس پر اس کی انتخاب کی نظر پڑ جائے۔ آپ ساری ذمہ داری مجھ پر ڈال کر خود اس سے نہیں بچ سکتے۔ میرے لیے دعا کیجیے کہ میرا یہ خواب میری زندگی میں پورا ہو جائے۔ ہمیں کبھی مایوسی اور قنوطیت کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ خدا کی کارسازیاں انسان کے شمار سے باہر ہیں ....

"... کہا گیا ہے کہ ہندوستانی سوراج میں اکثریت کے فرقے یعنی ہندوؤں کی حکومت ہوگی۔ اس سے بڑھ کر کوئی غلط بات نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسا ہو تو کم سے کم میں اس کو سوراج نہیں کہوں گا بلکہ ساری قوت کے ساتھ اس کے خلاف لڑوں گا کہ میرے نزدیک ہند سوراج سب لوگوں کی حکومت کا یعنی انصاف کی حکومت کا نام ہے۔ چاہے اس میں وزیر ہندو ہوں یا مسلمان یا سکھ اور چاہے آئین ساز مجلس تمام تر ہندوؤں یا مسلمانوں یا سکھوں یا کسی اور فرقے کے لوگوں پر مشتمل ہو۔ مگر ان کو سب کے ساتھ یکساں انصاف کرنا پڑے گا..."

اقتباس

(از کتاب "گاندھی کا ہندوستان کثرت میں وحدت" قیمت ۲/۲۵)

اور گرو نانک نے کہا.......

رب

اے رب! تو ایک ہے۔ واحد اور یکتا ہے۔ وجودِ کل ہے۔ ہر لحاظ سے موزوں ہے،
اے رب! تو صداقت ہے، ہمہ جائی ہے۔ خالق ہے۔ ایک ہستی ہے۔ بے خوف ہے۔ نفرت کے بغیر ہے، زماں و مکاں سے بالاتر ہے۔ تیری کوئی تجسیم نہیں۔ تو روشنی اور آگہی عطا کرنے والا ہے۔ رحیم و کریم ہے۔ (مُول منتر۔ محلہ I)

ربِ کریم کو کوئی مقرر نہیں کرتا اور نہ ہی اسے تخلیق کیا جا سکتا ہے۔ وہ تو واجب الوجود ہے بے عیب اور پاک! (جپ جی محلہ I-۵)

نیک اعمال سے زندگی کا اچھا روپ میسر آسکتا ہے لیکن نجات صرف رب کے رحم و کرم اور رحمت سے ہی ملتی ہے۔ (جپ جی۔ محلہ I-۵)

اے خدا۔ تیری ہزاروں آنکھیں ہیں مگر کیا تو آنکھیں رکھتا ہے؟
اے خدا۔ تیرے ہزاروں روپ ہیں مگر کیا تیرا کوئی روپ ہے؟
اے خدا۔ تیرے کنول جیسے ہزاروں پاؤں ہیں مگر کیا تیرے پاؤں ہے؟
اے خدا۔ سونگھنے کے لیے تری ہزاروں ناکیں ہیں مگر کیا تیرے کوئی ناک ہے؟
اے خدا۔ اے خدا تو عجوبوں کا عجوبہ ہے۔ تو روح ہے اور ہر چیز میں مضمر ہے!
اے خدا! جب تو ہی مسبب الاسباب ہے تو پھر میں دنیا کا سہارا کیوں اور کس کے لیے لوں؟ آسا محلہ ۲۱ : ۴)

تیری عظمت بے پایاں ہے کیونکہ تیرا نام ہی عظیم ہے۔ تیری عظمت بے پایاں ہے کیوں کہ صداقت ہی تیرا انصاف ہے۔ تیری عظمت بے پناہ ہے کیونکہ تیرا مقام لافانی ہے۔ تیری عظمت بے پایاں ہے کیونکہ تو ہی ہماری زبان کو جانتا ہے۔ تیری عظمت بے پایاں ہے کیونکہ تو ہی ہمارے باطن کو مقدس بناتا ہے۔ تیری عظمت لامحدود ہے کیونکہ تو بن مانگے عطا کرتا ہے تیری عظمت بے پناہ ہے کیونکہ تو ہی خالقِ کل ہے۔ نانک تیری تمام کارکردگیوں کو کوئی بیان نہیں کر سکتا۔ کیا ہے۔ کیا

ہوگا۔ سب کچھ تیری رضا سے ہوگا۔ (آسا محلہ ۱ وار)

اگر ڈھونڈنے والا اسے پکارتا ہے اور مالک کے دروازے پر جاکر ہاتھ پھیلاتا ہے تو مالک اس کی بات سنتا ہے اور خدا اس پر رحم و کرم کرے یا اس پر قہر و غضب ڈھائے تو بھی اسے اس کی عظمت میں سرمست و بے خود رہنا چاہیے۔ (آسا محلہ ۱۔ ۲۱)

خدا کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ صرف وہی ہے۔ اس کے سوا نہ کبھی کوئی تھا اور نہ کبھی کوئی ہوگا۔ (آسا محلہ۔ ۱)

ہمارے خدا کی نہ کوئی ماں ہے نہ کوئی باپ ہے۔ نہ بیٹا ہے نہ رشتے دار ہیں۔ نہ اس میں حرص ہوس ہے۔ نہ اس کی کوئی بیوی ہے۔ اس کی کوئی ذات پات نہیں ہے۔ اس کا کوئی سلسلۂ نسب نہیں ہے۔ وہ بے عیب ہے۔ پاک وصاف ہے۔ بلند سے بلند تر ہے۔ اور ایسا نور ہے جو سب میں موجود ہے۔ (سورٹھ محلہ ۱)

بہار آئی تو رونق و تازگی لائی مگر خدا پہلے ہی تر و تازہ تھا۔ اے خدا تیری وساطت سے ہی سب پھلتے پھولتے ہیں۔ مجھے کسی کی ضرورت نہیں جو تجھے ترو تازہ رکھ سکے۔

(راگ سوہی کی وار محلہ ۱ شوک محلہ ۱)

وہ قادرِ مطلق اور بے نیاز ہے۔ لافانی ہے۔ وہ کوکھ سے پیدا نہیں ہوا۔ اس کی کوئی ذات نہیں۔ بے لوث ہے۔ اس کی کوئی صورت نہیں۔ کوئی علامت نہیں۔ اس کی کوئی تھاہ نہیں وہ کسی کو نظر نہیں آتا۔ (بلاول محلہ آٹھ)

دنیا

لاکھوں کروڑوں سالوں تک افراتفری کا عالم تھا اور لامحدود اور بے پایاں خدا تنہا اپنے اندر بیٹھا تھا۔ اور اس افراتفری کے عالم میں بھی بے نیاز تھا اور ابھی اشیار کی دنیا پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس طرح چھتیس یُگ گزر گئے۔ ہاں کروڑوں سال۔ اور پھر قادرِ مطلق نے اپنی رضا کے مطابق کرم کیا۔ اس کا کوئی حریف نہیں تھا اور وہ خود لامحدود اور بے پایاں تھا۔ اور جب اس نے چار یُگ پیدا کیے تو وہ ان سب میں پوشیدہ رہا۔ وہ سب کے دل میں جلوہ گر تھا۔ اور تمام یُگوں میں وہی تنہا موجود تھا۔ (مارو محلہ ۱۔۷)

نامِ خدا

اے خدا۔ جتنے بھی تیرے نام ہیں میں ان سب پر قربان ہوں۔ (بسنت محلہ ۱)

خدا کا نام دھیان ہے جو مجھے دن رات منور رکھتا ہے ۔　　محلہ ۱
اسے کسی نے دیکھا نہیں ۔ وہ حواس کی سمجھ سے بالاتر ہے ۔ خدا کا نام بے حد میٹھا اور پیارا ہے
مارو محلہ ۱

میں نے اپنے دل میں اپنے مالک کے نام کا سرمایہ سمیٹ لیا ہے ۔ اے خدا تو جس پر اپنا فضل و کرم کرتا ہے اسے نجات حاصل ہو جاتی ہے ۔ یہ وہ خزانہ ہے جو جلتا نہیں جسے چرایا نہیں جا سکتا ۔ جو ڈوبتا نہیں ہے اور جو تباہ و برباد نہیں ہوتا ہے ۔　　مارو محلہ ۱

خدا کے نام کی یاد میں تمام زہد و تقویٰ اور ریاضت کا نچوڑ موجود ہے ۔　　دھنا سری محلہ ۱۔ ۸
نانک کہتا ہے : خدا کے نام کا عظیم جوہر بہت ہی شیریں ہے ۔ خدا کے نام سے انسان کی آرزوؤں کی تسکین ہو جاتی ہے ۔　　دھنا سری محلہ ۱۔ ۲

جب خدا کے نام کا سہارا مل جاتا ہے تو چنچل من صداقت میں محصور اور موجود رہتا ہے ۔ جو اس کا اصل مقام ہے ۔　　رام کلی محلہ ۱ سدھ گوشٹی

اگر کوئی سچے نام (خدا) کا سہارا لیتا ہے تو اس کے احباب بھی سچے ہوتے ہیں ۔ اس کا گھر بھی سچا ہوتا ہے ۔ اس کی خوراک بھی سچی ہوتی ہے ۔ اور اس کی محبت بھی سچی ہوتی ہے ۔
(راگ مارو اشٹ پدی ۱)

گورو

جب کوئی گرو کی ہدایت پر عمل کرنے لگتا ہے تو وہ خدا سے ڈرنے لگتا ہے ۔　　(سری راگ محلہ ۱۔ ۱۱)
جب ہماری ملاقات سچے گرو سے ہوتی ہے تو ہم خدا کے ادراک کے گوہر سے فیضیاب ہوتے ہیں ہم اپنا دل و دماغ گرو کے سپرد کر دیتے ہیں ۔ اور ہر دلعزیز خدا کو پا لیتے ہیں ۔ ہمیں نجات کا تحفہ میسر آتا ہے اور ہمارے گناہ دھل جاتے ہیں ۔　　(سری راگ محلہ ۱ اشٹ پدی ۱۰)
جب کوئی کامل گرو سے ملتا ہے تو اس کے شکوک کے پرخچے اڑ جاتے ہیں اور اس کا من بھٹکنا بند کر دیتا ہے ۔ پھر من کے سرچشمہ سے امرت نکلتا ہے اور وہ نغمۂ مسرت سنتا ہے اور وہ اپنے گھر میں ہی خدا کو دیکھنے لگتا ہے ۔　　(سوہی محلہ ۱۔ ۸)
جب کوئی حقیقی گرو کا آسرا لیتا ہے تو پھر وہ دوئی سے نجات حاصل کر لیتا ہے ۔ اس کے تمام نقائص دور ہو جاتے ہیں ۔ اس کا گناہ آلود دل پاکیزہ ہو جاتا ہے ۔ اور اس کا بدن سونے کی طرح دمکنے لگتا ہے ۔ اس کی روح بلند و بالا روح میں مدغم ہو جاتی ہے ۔　　(بلاول محلہ ۱۔ ۳)

زنگ آلود لوہا بھی جب گرو کے پارس پتھر سے مس ہوتا ہے تو سونے میں تبدیل ہو جاتا ہے ۔
(مارو محلہ ۱ - ۲)

نیکی اور بدی

نیک وہ ہیں جن کو خدا کے در پر نیک مانا جاتا ہے (سری راگ محلہ ۱ ۴۴، ۴۴)

اے دوست! وہ خوراک اور وہ تفریح بے کار ہے جو دل و دماغ کو بدی سے بھر دیتی ہے اور جو جسم کو کرب اور اضطراب سے تڑپنے پر مجبور کر دیتی ہے ۔ (سری راگ محلہ ۱ - ۲ : ۷)

جب مجھے خدا پر اعتقاد حاصل ہو گیا تو میرے اندر جو بدی تھی نیکی میں تبدیل ہو گئی
(سری راگ محلہ ۱ - ۱۱)

جو لوگ اپنی مرضی سے کام لیتے ہیں اور من مانی کرتے ہیں ان کو کبھی سکون میسر نہیں آتا لیکن جو لوگ خدا کی رضا پر چلتے ہیں اور وہ اس کی تجربہ کاریوں سے آگاہ ہو جاتے ہیں ۔ (سری راگ محلہ ۱ - ۲ - ۱۹)

میں جتنا ہوشیار اور چالاک بنوں گا اتنا ہی زیادہ بوجھ مجھے اٹھانا پڑے گا ۔ (سری راگ محلہ ۱ - ۳ : ۲۷)

جس کے اعمال نیک ہوں اس کا ذہن بھی کامل ہوتا ہے ۔ (سری راگ محلہ ۱ - ۳ : ۲۰)

دکھ سکھ

اگر ڈھونڈنے والا پکارتا ہے اور خدا کے در پر جا کر ہاتھ پھیلاتا ہے تو خدا اس کی صدا سنتا ہے ۔ خدا رحم و کرم کرے یا عتاب نازل کرے اس کی عظمت کے گیت گاتے رہنا چاہیے ۔ (آسا محلہ ۱ : ۳)

خدا کی رضا

جسم کھیت ہے، اعمال بیج ہیں ۔ خدا کا نام اس کی سینچائی کرتا ہے جس کے ہاتھ میں تمام دنیا کی باگ ڈور ہے ۔ من کسان ہے اور جب روح میں پیڑ پھلتا پھولتا ہے تو اسے انسان تو نروان حاصل کر لیتا ہے ۔ (سری راگ محلہ ۱ - ۱ : ۲۷)

میں اپنے گرو سے یہ پوچھتا ہوں : براہِ کرم مجھے یہ بتائیے کہ میں آپکے راستے پر کیسے چلوں ؟"
گرو کہتا ہے ۔ خدا کی حمد و ثنا سے اپنا دل معمور رکھو ۔ انا کے کرب و اضطراب کو پھونک ڈالو ۔ اس طرح تم دیار محبت میں اپنے خدا سے ملو گے ۔ سچا خدا سچ کے ذریعے ہی ملتا ہے "
(سری راگ محلہ ۱ اشٹ پدہ ۴ : ۸)

جب ہم حق وصداقت کو عزیز رکھتے ہیں تو ہم حق وصداقت سے آشنا ہوتے ہیں۔
(ایضاً)

اگر خدا کے خوف میں تن کا خام کپڑا اُبالا جائے اور انکسار کے رنگ میں اسے رنگا جائے اور عقیدت کا رنگ اس میں جاذب کیا جائے تو وہ خدا کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔
(آسا محلہ ۱ ۔ وار)

اپنی آنکھوں میں خدا کے خوف کا سرمہ ڈال لے اور محبت کا بناؤ سنگار کر لے بس اسی طرح تو اپنے مالک سے محبت کرنے پر سچی دلہن بن سکے گی۔ (ملنگ محلہ ۱ : ۴)

یوگیوں کا راستہ علم کا راستہ ہے۔ برہمنوں کا راستہ ویدوں کا راستہ ہے۔ کشتریوں کا راستہ شجاعت کا راستہ ہے۔ اور شودروں کا راستہ خدمت کا راستہ ہے لیکن اصل راستہ خدا کا راستہ ہے۔ جو اس راستے کے بھید سے واقف ہے نانک اس کا خادم ہے۔ وہی انسان پاک ومقدس خدا کا عکس ہے۔ (آسا محلہ ۱ وار شلوک محلہ ۲)

رحم وکرم سوت ہو، قناعت دھاگہ ہو، پرہیزگاری گانٹھ ہو۔ صداقت بل ہو تو یہ روح کا مقدس جنیو ہے۔ کیونکہ یہ ٹوٹتا نہیں ہے۔ میلا نہیں ہوتا ہے۔ ضائع نہیں ہوتا ہے اور جلتا نہیں ہے۔ (آسا محلہ ۱ وار شلوک محلہ ۱)

میری بیوی، میرا بیٹا، میرا باپ، میرا بھائی۔ کون میرا ہاتھ تھامے گا؟ جب میں قبر میں جا پڑوں گا اور فاتحہ پڑھا جائے گا تو کوئی بھی مجھے بچانے کے لیے نہیں آئے گا۔ (راگ تلنگ محلہ ۱ ۔ ۱)

اگر دلہن اپنے حقیقی مالک میں سما جاتی ہے تو وہ کبھی بیوہ نہیں ہوتی۔
(سری راگ محلہ ۱ ۔ اشٹ پدہ ۲:۵)

بے نیازی

جس طرح پانی میں کنول بے نیاز رہتا ہے۔ اور جس طرح ہنس ندی میں لاپروائی سے تیرتا ہے اسی طرح خدا کے نام سے آہنگ ہو کر انسان ہستی کے سمندر کو پار کر لیتا ہے۔ وہ شخص جو بے نیاز ہو کر زندگی بسر کرتا ہے اور واحد و یکتا خدا کو اپنے من میں بسا لیتا ہے اور امیدوں کے جھرمٹ میں رہتے ہوئے امید ترک کر دیتا ہے اور جو اُسے دیکھتا ہے جو دکھائی نہیں دیتا اور جس کی کوئی تھاہ نہیں ہے نانک اس کا بندہ ہے۔

(رام کلی محلہ ۱ سدھ گوشٹی)

رسم و رواج

وہ مقدس کتابیں پڑھتے ہیں اور بھر لڑتے ہیں۔ وہ زر و مال اور پتھروں کی پرستش کرتے ہیں اور پھر بگلوں کی طرح جھوٹی سرمستی میں مگن ہو جاتے ہیں۔ ان کا جسم پارسائی سے آراستہ ہوتا ہے مگر ان کے منہ میں جھوٹ ہوتا ہے۔ وہ دن میں تین مرتبہ گائتری منتر کی لائینوں کا جاپ کرتے ہیں۔ ان کی گردن میں مالا ہوتی ہے۔ ان کے ماتھے پر کیسر کا ٹیکہ ہوتا ہے۔ ان کی کمر میں ان سلی لنگوٹی ہوتی ہے لیکن اگر وہ اپنے بھگوان کی نوعیت اور فطرت سے واقف ہوتے تو وہ ان رسوم کو جھوٹی رسوم سمجھتے۔ (ایضاً)

خدا کی حمد و ثنا ہی مقدس زنار ہے۔ (ایضاً)

ہم سالوں تک بڑی بڑی وزنی اور مقدس کتابیں پڑھتے رہتے ہیں اور زندگی بھر پڑھتے رہتے ہیں لیکن ہمارا خدا صرف ایک ہی چیز کو قابلِ توجہ سمجھتا ہے۔ اور وہ ہے ہمارا دل۔ باقی سب کچھ بے سود باتیں ہیں۔ (آسا محلہ ۱ وار)

اگر کوئی اپنے لباس ہلکے بادامی رنگ میں رنگتا ہے اور پرہیزگار کا امتیازی چغہ پہنتا ہے اور اپنا اصل لباس پھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ اور چغہ پہن لیتا ہے اور اسے سکے بٹورنے کے لیے پھیلا دیتا ہے۔ گھر گھر جا کر بھیک مانگتا ہے مگر دوسروں کو عقل و دانش سکھاتا ہے۔ اس کا من اندھا ہوتا ہے وہ اس طرح اپنی تمام عزت کھو بیٹھتا ہے۔ اس کا دل زنگ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کے نام پر غور نہیں کرتا! اور اس طرح اپنی زندگی جوئے میں ہار جاتا ہے۔ (مارو محلہ ۱ - ۷)

کلیہ

دنیا آنی جانی مایا ہے۔ اے میرے من! اس حقیقت کو اپنی گرہ میں باندھ لے۔ (راگ تلنگ۔ محلہ ۱۔۱)

دنیا سمندر کی لہروں اور بجلی کے چشکوں کی طرح ہے۔ یہ آکر چلی جاتی ہے۔ (آسا محلہ ۱ ۵)

جدھر بھی میں دیکھتا ہوں روح اور مادے کا اتحاد دیکھتا ہوں جس کی تخلیق میں ہمارا خدا موجود ہے۔ (سری راگ محلہ ۱۔۴ : ۸)

دنیا ایک تماشا ہے۔ ایک خواب ہے۔ ایک لمحہ میں یہ سارا تماشا ختم ہو جاتا ہے۔ (سری راگ محلہ ۱۔۲ : ۱۱)

یہ دنیا کیسا مقام ہے۔ اگر یہ پائیدار ہو تو رہنے کے لیے حقیقی مقام ثابت ہو۔
(سری راگ محلہ ۱ اشٹ پر ۱:۳)

آسمان اور زمین فنا ہو جائیں گے صرف واحد و یکتا خدا رہے گا۔ سورج اور دن، چاند اور رات اور اربوں ستارے فنا ہو جائیں گے لیکن واحد و یکتا خدا کی اقامت گاہ ہمیشہ کے لیے اور دائمی طور پر قائم رہے گی۔ (ایضاً ۸:۱۰۰۷)

خانہ داری

دنیا کی آلائشوں کے درمیان جو انسان خدائے پاک و مقدس میں رہتا ہے وہ یوگ کا سچا راستہ حاصل کرتا ہے۔ (سوہی محلہ ۱)

دنیا میں انسان کو اس طرح رہنا چاہیے جس طرح بے نیازی کے ساتھ کنول پانی میں رہتا ہے یا ہنس ندی میں رہتا ہے۔ (رام کلی محلہ ۱ سدھ گوشٹی)

عالم آخرت

جس کا محافظ گرو خدا ہو اس سے عالم آخرت میں حساب نہیں مانگا جاتا۔
(سری راگ محلہ ۱ اشٹ پد ۵:۲)

دوسری دنیا میں صرف نیک اعمال ہی شمار کیے جاتے ہیں۔ بدی کرنے والے کو زدوکوب کیا جاتا ہے اور وہ آہ و زاری کرتا ہے لیکن اس کے نالے سننے والا کون ہوتا ہے؟ اندھے من نے اپنی زندگی بے کار گنوادی ہے۔ (آسا محلہ ۱ وار پوڑی ۳)

آدمی یہاں اپنی مرضی کے مطابق حکم دیتا ہے لیکن وہاں وہ ایک تنگ راستے سے گزرتا ہے اور اسے جہنم میں ننگا لے جایا جاتا ہے اور وہ خوف سے لرز اٹھتا ہے۔ (ایضاً)

عالم آخرت میں انسان کو آگ کا دریا پار کرنا پڑتا ہے جس کے شعلے بڑے زہریلے ہوتے ہیں۔ کسی کا کوئی رفیق سفر نہیں ہوتا آگ کا سمندر شعلہ ریز رہتا ہے اور اس کے شعلے آسمان کو چھوتے ہیں۔ انانیت پسند کو اس میں ڈال دیا جاتا ہے اور وہ اس میں جل بھن کر رہ جاتا ہے۔ (مارو محلہ ۱-۶)

اقتباس

(از کتاب "گرو نانک دیو" مصنف گوپال سنگھ، مترجم مخمور جالندھری قیمت ۲/۲۵)

ل۔ احمد

سری نگر کی ایک شام

وادیٔ مسرور، منظرِ جنت، کشمیر کی ناکافی و حرص انگیز سیر کے بعد ،میں اور جمالی لاہور ٹھہرے۔ شام کے وقت ہوٹل سے نکلے، ولیز یو کے یہاں چائے پی، اور پھر چڑیا خانے" میں پہنچ کر ادھر اُدھر پھرنے لگے۔ گل گشت چمن نے نشاط باغ کی نشاط انگیزیاں یاد دلا دیں ـــــ پھر آپ سمجھ لیجئے کہ نظارۂ گلستاں اور یادِ گلزار کے تاثر کی نوعیت کیا ہو سکتی اور وہ جن موضوعاتِ کلام کی محرک ہو سکتی ہے۔ ہمارا موضوعِ گفتگو بس وہی تھا۔ لیکن جب گفتگو کے پہلو نکلے تو جمالی ہماری سیرِ کشمیر کا جائزہ لینے لگا۔

اس نے ہماری جماعت کی نقل و حرکت، مصروفیات و تفریحات کے طور و طریق پر تنقید شروع کر دی۔ اس کے خیال میں ہم لوگوں کا ایک ساتھ ہونا تو اس کے خلاف مزاج نہ تھا لیکن اس میں ندرت بھی کیا تھی ـــــ یہ لطفِ صحبت تو کشمیر گئے بغیر بھی حاصل تھا۔"

"اصل بات یہ ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ سیرِ کشمیر کا کچھ لطف نہیں تھا!" اس نے کہا: "میں جتنی دیر تم سے الگ رہا وہی وقت یادگار گزارا۔ تم لوگوں نے اصلی کشمیر دیکھا ہی نہیں۔ اگر تمھاری الپنزر گلمرگ کی سیر مجھ بیمار کو سری نگر میں پڑا نہ رہنے دیتی تو میں بھی تم سب کی طرح کو دن ہی گھر کو پلٹتا!"

"لیکن ہم نے کشمیر کے تمام قابلِ دید مقامات کی سیر کی، تمام حسین مناظر دیکھ ڈالے، جتنی فرصت تھی اس کا ایک ایک منٹ کارآمد طور پر صرف کیا؟" میں نے اپنے بھدّے طریق پر جواب دینا چاہا۔

"جی، کشمیر کی سیر صرف اسی کا نام نہیں ہے! کشمیر کی سیر کے معنی ہیں کہ انسان کے کپڑے تک پک جائیں! اس کے برخلاف آپ لوگ جو نپا تلا خرچ گھر سے لے کر چلے تھے اس میں سے بھی بچا کر واپس ہوئے!" اس نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

"تو کیا روپیہ بکھیرتے پھرنے کا نام سیر ہے؟ ہم نے کس موقع پر جزرسی سے کام لیا؟ ہر چیز بکفایت مہیا تھی!" میں نے اس کے مفہوم سے تجاہل برتا اور اس کے جواب میں کہا۔

"جی ہاں، آپنے کشمیر کے میوے بکریوں کی طرح چرے، آپنے حسنِ منظر پر سبحان اللہ بھی پکارا

پکار کر کہا اور اسے فردوسِ بریں بھی باور کیا۔ لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں کہ یہاں کے پھول، پھل، رنگ و نکہت کے علاوہ بھی کسی مستور پیغام کے حامل ہیں! آپ نے جس رہگزر پر فتبارک اللہ بھی چپکے چپکے کہہ لیا۔ مگر آپ واقف نہیں کہ یہ جوازی اشیاء کی دلکشی کو زائل کر دیتا ہے! کشمیر کی سیر اس کا راز دار ہوئے بغیر نہیں ہو سکتی۔ آپ کو کیا معلوم ہے دوگانہ ہیں۔ وہ جن مناظر کو برملا پیش کرتا ہے ان کی اصل اس کے سینہ چشموں کی خلوتوں میں مستور ہوتی ہیں ——— یہی کشمیر کا راز ہے!

"تم نے بس کشمیر کی صورت دیکھی، اس کی جان و روح کا نظارہ تمہارا مقدر نہیں تھا میں خوش بخت تھا کہ تم سے علیحدگی کا ایک ہفتہ مل گیا۔

سید اسرار پرجاآلی نے اپنے ہفتہ "واردات کا خاکہ اس طرح کھینچا:-

محبت کے موضوع پر غور وفکر کرتے وقت عافیت تو اسی میں ہے کہ تیشۂ فرہاد کی خاراشگافیوں کو یاد رکھا جائے۔ اور شیکسپیئر کے ترکیب دیئے ہوئے چار لفظوں کو بھلا نہ دیا جائے جنھیں اس نے ایک ڈرامے کا سرنامہ وعنوان قرار دیا یعنی "عشق کی محنت برباد" لیکن ایک بھلے آدمی کو یہ حق پھر بھی حاصل رہتا ہے کہ وہ اس سہولت کے خیال کو مسترد کر دے، اور اپنا سر پھوڑ کر اور غم وغصہ کھانے کے لئے سعی وجستجو کرے! ہو سکتا ہے کہ ایک بھلے آدمی کو یہ حق حاصل نہ ہو، مجھے اس پر اصرار بھی نہیں ہے!

بہرحال، تم اندازہ نہ کر سکو گے وہ کیسی رنگین وعدہ "تھی جو میرے اس ایک حسین و منور تجربے کی خصوصیت تھی! انھیں یاد ہوگا کہ میری طبیعت ناساز ہونے اور تم لوگوں کے گلمرگ جانے سے ایک دن پہلے، تیسرے پہر کے وقت میں اپنی غیر وارداتی ہاؤس بوٹ اور تم جیسے غیر وارداتی ساتھیوں کو چھوڑ کر نکل گیا تھا؟ میں تم سب کو چھوڑ کر ٹہلتا ہوا چنار باغ جا پہنچا، اور نہر کے کنارے درختوں کے سائے میں سبزے کے اوپر، تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ سورج ہولے ہولے ڈوب رہا تھا اور آس پاس کو ایک رمزناک تاثر میں ڈبو رہا تھا۔ میرے سامنے، نہر کے دوسرے کنارے پر ایک پرانا شکارا پڑا تھا جس کی زخم خوردہ لکڑی اور تختوں کی دراڑیں بہت بری معلوم ہو رہی تھیں۔ میں نے خیال کیا کہ یہ شکارا کس قدر ناکارہ ہے!

اس خیال کے ساتھ میری آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ اور میں ایک خواب دیکھنے لگا۔ میں دیکھتا ہوں کہ کسی کے ریشمی لباس کی فرفر ہوا میں ملتی محسوس ہو رہی ہے اور کوئی نرم،

نازک اور خرد سوز ہستی موجود مگر نگاہوں سے مخفی ہے۔ میں محسوس کرتا معلوم ہوتا ہوں کہ شامہ فریب اور سحر روح وجاں خوشبو میرے حواس پر چھا گئی ہے! کیا یہ بالکل وہمہ ہوسکتا تھا؟ نہیں! میں آنکھیں کھول دیتا ہوں اور جانتے ہو، میں نے آنکھیں کھول کر کیا دیکھا؟ ایک نازنین، نہیں ایک پری کو دیکھا۔ سب پریاں نازنین ہوتی ہیں مگر سب نازنینیں پریاں نہیں ہوتیں! اب میں نے دیکھا کہ وہ شکارا خالی نہیں تھا ــــ اس کے سارے عیب دور ہو گئے۔

بندش کی رنگائی کا پیک لگا دوپٹہ، دو مالہ مارنے سے اس کے شانوں پر اس طرح اکھٹا ہو گیا تھا کہ وہ مجھے اس کے قزحی رنگ کے پر معلوم ہوا۔ میں نے نگاہیں اٹھائیں مگر ایسی دلیری کے ساتھ جس میں شرم کا رکھ رکھاؤ بھی تھا۔ اور ان آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ جن کی رقیق کرنیں میری آنکھوں کو چوندھیا رہی تھیں۔ آہ وہ ان آنکھوں کے سیاہ فتنے! اس وقت میں بے بات سر در میں تھا۔

ایک شکارا جس میں مخملی تکیے لگے تھے اور ایک حریر اندام دیرنیاں پوش ان تکیوں میں بیٹھی تھی، عین اس شکارے سے بڑا کر کھڑا کر دیا گیا تھا جو مجھے اتنا برا معلوم ہوا تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ شکارا وہاں کیوں کھڑا کیا گیا، میں اس کی توجیہہ نہیں کر سکتا؛ میں صرف قیاس سے کام لے سکتا ہوں، تم بھی عقل کے گھوڑے دوڑاؤ۔ سنو، ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ وہ لوگ ڈل میں جانا چاہتے ہوں، اور چونکہ نہر کی سطح نیچی ہونے کے باعث ڈل کے دروازے میں داخل نہ ہوسکتے تھے، پانی کی سطح برابر ہو جانے کا انتظار کر رہے ہوں۔ دوسری بات یہ ہوسکتی ہے کہ کسی دوسرے شکارے میں اپنے ساتھیوں کے آجانے کا انتظار کر رہے ہوں۔ تیسرا سبب خود چنار باغ کے منظر سے لطف اٹھانا بھی ہوسکتا ہے۔ اور چوتھی شکل میں بہت سی صورتیں داخل کی جاسکتی ہیں، ان میں ایک صورت میری بھی ہوسکتی ہے! اس پر تمہیں یا کسی کو اعتراض بھی کیوں ہو؟ اور اعتراض نہیں ہوسکتا تو پھر رشک بھی کیوں ہو؟

داغ کا یہ شعر مجھے ذرا دیر سے ملا تھا کہ :-

جرأت وشوق اب کہاں وقت ہی جب نکل گیا
اب تو ہیں یہ ندامتیں، صبر کیا تھا ہائے کیوں!

داغ کے تجربے کے بعد میں نے اس کی طرح وقت کی نوحہ خوانی نہیں کرنا چاہی، پھر بھلا ایسے موقعے پر میں کیوں کر طرح دے سکتا تھا! یقین کرو کہ میرے "ذوقِ حصول" نے میری "جرأتِ رندانہ"

کو زندہ و بیدار کر رہا تھا۔ چنانچہ موقع مناسب یا غیر مناسب کا ذرا خیال نہ کرتے ہوئے میں نے بلا تمہید گفتگو شروع کر دی۔ اگر کوئی مجھے بدتہذیب کہنا چاہے، اوباش سمجھے، تو ضرور اپنا دل خوش کرے لیکن ختم داستاں پر خفت اٹھانا پڑے گی۔

سنو، جب میری اس کی نگاہیں چار ہوئیں، اور سچ پوچھو تو چار نہیں ہوئیں —— دو کی دو ہی رہیں۔ کیونکہ اس نے نگاہیں ملائیں نہیں بلکہ لڑائیں —— تو پہلی ادا جو اس نے صرف کی وہ یہ تھی کہ اس نے اپنے صنوبری قامت کی نمائش کی۔ تم جانتے ہو کہ کشمیر کی عورتوں میں قد رسا ایک نادر چیز ہے۔ مگر مجھے آج تک حیرت ہے کہ اس کو میری اس کمزوری کا علم کیونکر ہو گیا کہ میرے یہاں طوبئ قامتی کو پہلا درجہ حاصل ہے؟ اس کے کھڑے ہونے کا انداز نیرکا نہ جوں کانوں میرے دل میں اتر گیا۔ شلوار کی اس رعنائی و زیبائی کا میں کبھی تصور بھی نہ کر سکا تھا جو زہرہ کے جسم پر نظر آئی —!

یہ صحیح ہے کہ میں خشکی پر تھا اور وہ پانی پر، مگر ہمارے درمیان فاصلہ بہت ہی کم تھا۔ اگر سن لئے جانے کا اندیشہ نہ ہو تو سب گفتگو میں ہو سکتی تھیں۔ مختصر یہ کہ اس نے میری طرف سے نظر ہٹا کر اپنے خادم کی طرف دیکھا اور وہ کچھ مسکرا کر میری جانب متوجہ ہوا اور کہنے لگا۔

"جناب بابو صاحب اکیلے ہیں؟ آیئے سیر کر آئیے!"

اب تم ہی کہو کہ ایک گالی اور ایک غلط بیانی! اگر میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو کیا ہوتا؟ اور مجھ پر تو یہ مزید قیامت گزر گئی کہ اس سے مجھے جو تکدر ہوا اس نے میرے تمام خوش آئند خیالات کو درہم برہم کر دیا۔ خیر جس طرح بھی ہو سکا میں نے اپنے آپ کو بہلایا۔ اس بابو صاحب کی گالی کو بھی پی گیا اور اس جھوٹ کو بھی کہ میں "اکیلا" تھا —— کیونکہ میرے ساتھ تو تم کراماً کاتبین کے دو "سیٹ" تھے اور انھیں جیسے پیوست آپ بھی! غرض میں نے اسے جواب دیا، کیونکہ بہر حال میں چپ نہ رہ سکتا تھا۔

"میں نہ تو "بابو صاحب" ہوں، اور نہ "اکیلا"! آگے بڑھ کر، وہ جو ہاؤس بوٹ کھڑی ہے، وہاں چار نفر پڑے خراٹے لے رہے ہیں جن کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ میں نے اپنے آپ کو "اکیلا" کہا یا اس الزام کو سنا بھی ہے تو ابھی تمھیں اور مجھے دونوں کو "دست بدست دگرے" کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔ ہاں تم نے جو سیر کی دعوت دی ہے، سو یہ ممکن ہے، کیونکہ یہاں پڑا ہوا بھی میں سیر ہی کر رہا تھا۔ اب خاکی نہ سہی آبی سیر ہو جائے گی۔" میں نے اپنے نزدیک انشا رکو بھی

چین بلوادی تھی۔ مگر معلوم یہ ہوا کہ یہ پریاں اردو نہیں سمجھتیں۔

وہ حیرت سے اپنے نوکر کا منہ دیکھنے لگی؛ اور اس نے کشمیری میں اسے جو کچھ سمجھایا ہو مگر مجھے یہ دیکھ کر صدمہ ہوا کہ میری بذلہ سنجی اور ذہن ظرافت اکارت ہی گئی۔ وہ کم بخت خود ہی کچھ نہ سمجھا ہو گا۔ ترجمانی کیا خاک کر سکتا تھا! ایک ہی منٹ کے اندر میری کوفت کا یہ دوسرا موقعہ تھا۔

میں نے اٹھنے کے لئے حرکت تو کی مگر مجھے یہ خیال ستا رہا تھا کہ اگر وہ اردو نہیں سمجھتی تو میرا اٹھنا بیکار ہے۔ ظاہر ہے کہ اس خیال کا پیدا ہونا میرے ذہن و تعقل کا تقاضا تھا، لیکن کوئی مجھے بتائے کہ ایسے وقت میں کہیں عقل کی سنی جاتی ہے؟ چنانچہ اس احساس کے باوجود میں اٹھ کھڑا ہوا اور وہ شکارا بھی حرکت میں آکر کنارے لگ گیا اب تم ہی کہو کہ کیا میں اس میں سوار نہ ہو جاتا؟ میں نے شکارے پر پہنچ کر تسلیم عرض کی، وہ منہ پھیر کر بیٹھ گئی کہتے ہے سبحان اللہ کوئی کہے یا نہ کہے، مگر بار بار میں نے اس جملے کی کئی بار تکرار کی اور بلند آواز سے۔ خیر اس کے آدمی نے اس کی بغل میں تکیے وغیرہ درست کر دئے! اور میں بیٹھ گیا اس جملے کی کئی بار تکرار کی اور بلند آواز

"آپکے مزاج اچھے ہیں۔" میں نے بیٹھتے بیٹھتے کہا۔

"رمضان جو . . . . اس نے جو کچھ کہا کشمیری میں کہا۔

جناب آپ پنجابی بولتے ہیں؟ رمضان جو نے مجھ سے دریافت کیا۔

میں سیدھی سادی پنجابی سمجھ ضرور لیتا ہوں لیکن بولنے کی کوشش کبھی نہ کی تھی مگر یہ دیکھ کر کہ ایک موقع ہاتھ آتا ہے، میں نے اقرار کر لیا لیکن معلوم یہ ہوا کہ میں جتنی پنجابی بول سکتا تھا وہ اتنی ہی ہندوستانی سمجھ سکتی تھی، تاہم میرے لئے اپنی زبان کو بدل دینا اور ایسے الفاظ میں گفتگو کرنا جن کو وہ سمجھ سکتی دشوار تھا، اس لئے میں نے پنجابی ہی کو ترجیح دی۔

میں شاید بتا چکا ہوں کہ اس کا نام زون تو تھا، لیکن ضرورتاً لفظ "جان" کا بھی اضافہ کر دیا گیا تھا۔ ایک ہفتہ قبل وہ اپنے وطن پرستان سے سری نگر کا پہلا سیزن کرنے آئی تھی۔ مقدرات کو دیکھیے کہ کیا کیا ستم ظریفیاں کی جاتی ہیں۔ وہ نقل مکان انھیں دنوں میں کرے جب میں اپنے مختصر پانچ ہفتے کشمیر کے طلسم مناظر میں بسر کرنا چاہوں، اور میں اپنے دوگانہ کرایا کا تبین کو چکا بھی اسی روز دوں جس روز وہ پرستان کی پری مجھے اڑا لے جانے کے ارادے سے نکلی ہو۔

اب تم بے چین ہو گئے کہ میں تمھیں اس خیرہ ناک اور پرستانی ہستی کے متعلق کچھ تفصیلات سناؤں ــــــ وہ تفصیلات جن کو میں کبھی بھلا نہیں سکتا۔ بہت خوب، لیکن یہ میں تمھاری خاطر سے نہیں بلکہ اس لئے بیان کرتا ہوں کہ اس کے ذکر میں اس کی یاد میں خود میرے لئے عیش و لذت پنہاں ہے ــــ اور "ذکر عیش بہ از عیش" تم نے سنا ہی ہوگا!"

میں نے اس کی آنکھوں کا ذکر تو کیا مگر شاید ان کی کیفیت آفرینی کا بیان نہیں کیا۔ اس کی "سیہ چشمانِ کشمیر" جب مجھے دیکھتی تھیں تو میری روح کو ان کے اندر بے شمار روشنیاں منعکس ہوتی دکھائی دیتی تھیں، جن کے مقابلہ میں سورج اتنا خیرہ کن نہیں ہو سکتا اور ستارے اس قدر پُر رمز نہیں ہو سکتے! اس کی پلکیں جب جھکتیں، اور میری موجودگی میں بار بار جھکتی تھیں، تو پپوٹے ان کا بار نہیں سنبھال سکتے اور رخساروں پر آگرتی تھیں! اس کا بدن کشمیر کی خوبانیوں سے زیادہ گداز تھا اور نمودِ سحر کی نازک گلابی رنگت کے مقابلے میں اس کا رنگ زیادہ دل کش رنگینی رکھتا تھا! اس کے عنابی ہونٹ شبنم معطر کی طرح تازہ تھے! اس کے سیاہ بالوں کی لٹیں رونق جذب سحر کی تصویر تھی! اس کی پیشانی زیادہ فراخ نہ تھی مگر لوح بلور کی طرح شفاف تھی! اس کے رخسارے سیوتی کے پھولوں اور کشمیر کے سیبوں سے بنائے گئے تھے۔

مختصر یہ کہ اگر میں اس کی خوبیٔ جمال کو بالتفصیل بیان کروں تو سننے والوں کو نیند آجائے گی یا پھر وہ سری نگر پہنچ کر دم لیں گے۔ بہرحال زونو دنیا اور زندگی کے متعلق کیا کیا باتیں جانتی تھی، مجھے معلوم نہ ہو سکا، لیکن میں اتنا اندازہ ضرور کر سکا کہ محبت کے موضوع پر اس کے خیالات میں گہرائی تھی، اور شاید ذہنی طور پر اسے اس جذبے کی اہمیت کا احساس بھی تھا۔ تین چار روز کی ملاقاتوں کے بعد خود میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے مجھے بتایا اور اپنے سیدھے سادے لفظوں میں بتایا کہ مجھ سے محبت ہو گئی ہے اور اب وہ اس محبت کو میری خاطر سے بھی تباہ نہ کرے گی! وہ جو کچھ بھی تھی تقدیر سے تھی! لیکن وہ محبت کی تجارت نہیں کر سکتی تھی، اور محبت کو جسم سے کوئی علاقہ نہیں ہے! اس جواب کو سن کر میری مایوسی کی کوئی انتہا نہ ہونی چاہئے تھی، لیکن یقین کرو کہ اس وقت میں ایسا محسوس کر رہا تھا گویا اس کے منہ میں زبان نہیں میرا دل ہے! مجھے اس وقت ایک خفیف سا احساسِ ناکامی تو ہوا لیکن تھوڑی دیر بعد میں اور زیادہ خوش اور مسرور تھا کیونکہ مجھے زونو کی محبت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ موضوعِ محبت کے علاوہ اسے جس

چیز کا علم تھا وہ سری نگر کا جغرافیہ تھا۔ کشمیر کی اس بے صدا موسیقی کی سنگت میں جب سوائے آسمانی قندیلوں کے سارے چراغ ٹھنڈے ہو جاتے ہیں اور اس کے ارغوانی سایوں میں جب سکون و خموشی کا دریا بہتا ہوتا ہے، ہم دونوں شکارے میں بیٹھے ہوئے نہروں، ندی اور ڈل کی سطح پر بہتے ہوتے تو وہ اگر کوئی کشمیری گیت گنگناتی نہ ہوتی تو مجھے ہر ہر مکان و مقام کے متعلق کچھ نہ کچھ بتاتی جاتی تھی۔ اس کی صحبت کا اثر مجھ پر ایک تو یہ ہوا کہ میں شکارے کی سواری کا حد درجہ شوقین ہو گیا! اور میں حیران تھا کہ پھر میں اپنے پاؤں سے چلنا کیسے سیکھ لیا۔ اور دوسرا اثر یہ ہوا کہ میں نے غالب کے شعر سے سبق لینے کا خیال ترک کر دیا۔

شاید میں نے یہ نہیں بتایا کہ دوسرے روز سے میں نے اپنے ایک پنجابی ملاقاتی سے پنجابی زبان سیکھنا شروع کر دیا تھا لیکن زرد لو خود بہتر معلم ثابت ہوئی اور یہ بھی کہ مجھے تار دے کر گھر سے روپیہ منگانا پڑا کیونکہ ہمارے مشترکہ خزانے میں نہ تو اس قدر روپیہ تھا اور نہ مجھے اپنے خزانچی صاحب سے کچھ ملنے کی توقع ہو سکتی تھی۔!

ایک اور بات بھی باقی رہ گئی اور وہ یہ کہ پہلی ملاقات میں ہمارا شکارا جب ڈل کے سناٹے میں داخل ہوا اور پانچویں کا چاند ڈوبنے لگا تو میں نے ماحول کے پیدا کردہ اضطرار سے بے قابو ہو کر اس کا بوسہ لے لیا۔ اس کا جواب زرد لو کی طرف سے بھی ایک عدد بوسے کی شکل میں ملا۔ لیکن مجھے بعد میں علم ہوا کہ میں اگر ایسا نہ کرتا تو زرد لو مجھے کبھی معاف نہ کرتی۔ اور صرف وہی نہیں بلکہ میں بھی اپنے آپ کو معاف نہ کرتا، کیونکہ اس بوسے نے تو میرے اندر شوق کا وہ شعلہ بھڑکا دیا جسے ڈل کا تمام پانی بھی نہ بجھا سکتا تھا۔ اس کے بعد ہر روز جب میں اس کے پاس جاتا تو محسوس کرتا کہ اس کی ہنسی زیادہ شیریں، اس کا تبسم زیادہ دلنشیں ہو گیا ہے۔

کہانی کا باقی حصہ تقریباً ہر فسانے میں پڑھا جا سکتا ہے، مجھ سے پہلے اسے کسی سے محبت نہ ہوئی تھی۔ اپنی عمر رفتہ کو وہ ضائع شدہ سمجھتی تھی مگر باقی عمر کے صحیح مصرف کے خیال سے خوش تھی۔ ہم دونوں پاس ہوں یا دور، اس کی محبت میں فرق نہیں آسکتا! ہم دونوں انتہائی سرور میں تھے! آخر زرد لو کو مجھ سے واقعی محبت تھی!

میں تمہارے ہونٹوں پر اب یہ سوال لرزتا دیکھ رہا ہوں کہ زرد لو ہے کہاں؟

غلط فہمی میں نہ پڑو، میں نے اسے براہ راست گھر نہیں پہنچا دیا۔ یہ ہی اس کی ملاقات ایک ہفتہ پرانی تھی کہ کوئی راجہ صاحب وارد ہو گئے اور ایک طے شدہ بات کی طرح زرد لو سے

نئی مطبوعات

مقدمہ شعر و شاعری : الطاف حسین حالیؔ مرتبہ رشید حسن خاں نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
عام اڈیشن ۲/۶۰ لائبریری اڈیشن ۳/۴۰

انتخاب سراج اورنگ آبادی مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
عام اڈیشن ۲/۲۰ لائبریری اڈیشن ۱/۷۰

بڑی حویلی (مضامین) مرزا محمود بیگ نئی دہلی مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۲/-

آلپس کے گیت (ناول) مصنف: واسل بانی کوٹ ترجمہ : قرۃ العین حیدر ۲/۷۵

دلی جو ایک شہر تھا (" ") راجندر لال ہانڈا ملنے کا پتہ نئی دہلی مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۵/-

اردو کی مزاحیہ شاعری مرتبہ: عرش ملسیانی " " " " " " " " " ۸/-

اندرا گاندھی (سوانح) ضیاء عظیم آبادی " " لکھنؤ اندرا پرکاشن ۳/-

مہاتما گاندھی " " " " " " " " " " ۲/-

مچلتے ارمان (ناول) فصاحت نقوی " " " " " "

اردو کے بہترین افسانے مرتبہ: سید فضل اللہ " " بنگلور اردو لائبریری کانسیٹر ۳/۵۰

جھومر (افسانے) " نجمہ سلطانہ " " " " " ۲/۵۰

چند تصویر بتاں (ادبی) { سید مبارز الدین رفعت " " " " " ۳/۵۰

ادبی مضامین { محمد عبدالقادر، میر محمود حسین " " " " ۴/۵۰

زعفران زار (لطائف) مرتبہ سید ابوتراب خطائی " " " " " " ۱/۵۰

جواہر پارے (اقوال بزرگان) " ضیاء جعفر " " " " " " ۲/-

بچوں کا ادب (کہانیاں) " " " " " " " " ۱/۵۰

لہو کے پھول (پانچ جلدیں ناول) حیات اللہ انصاری " " لکھنؤ ۲۰/-

نگار غالب (ادبی) علی عباس امید " " بھوپال، آدرش ڈگری کالج ۱/-

گناہ کی رات (افسانے) ڈاکٹر سلیم الدین طالب " " بریلی، نیما بکڈپو /۷۵

نگارشات ادب (ادبی) مسعود حسین رضوی " " لکھنؤ، کتاب نگر ۶/-

ہلچل (ناول) عارف مارہروی " " دہلی، پنجابی پستک بھنڈار ۳/۵۰

جائزے

فسانۂ عجائب

مصنف : میر امن
مرتب : اطہر پرویز
صفحات : ۴۱۶　سائز $\frac{22\times18}{8}$ مجلد
قیمت : 12/50
(سن اشاعت : ۶۹ء)　ناشر : سنگم پبلشرز، الہ آباد

فسانۂ عجائب کی ایک عجیب بات یہ ہے کہ مقفیٰ اور مسجع عبارت سے مرصع اور نہایت ہی پُر تکلف طرز تحریر کا نمونہ ہونے کے باوجود اس کی پذیرائی برابر ہوتی رہی ہے۔ اردو ادب کے شیدائی ہوں یا طالب علم سب ہی نے اس کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کی ہے۔ جب سے مدراس میں اردو ادب کی تعلیم کا آغاز ہوتا ہے اس کے اقتباسات سے روشناس کرایا جاتا ہے اور تحقیق و تنقید کے اعلیٰ مدارج تک اُس کا برابر ساتھ رہتا ہے۔ کیونکہ "فسانۂ عجائب" محض ایک کتاب ہی نہیں ہے بلکہ اپنے مخصوص طرز نگارش کا بہترین نمونہ بھی ہے۔ یہ اسلوب اپنے زمانے میں مقبول تھا اور آج سو برس سے زائد عرصہ گذر جانے کے باوجود، معروف ہے۔ فسانۂ عجائب کا شمار اردو کی اہم ترین داستانوں میں ہوتا ہے۔ اور اردو ادب کی تاریخ میں اُس کا اپنا مقام ہے۔

اطہر پرویز صاحب نے فسانۂ عجائب، کا ایک صحیح اور مستند اڈیشن تیار کر کے بڑی اَدبی خدمت انجام دی ہے۔ وہ جس لگن کے آدمی ہیں، اس کا اظہار یہاں بخوبی ہوتا ہے انہوں نے متن کی تیاری میں فسانۂ عجائب کے سب ہی دستیاب نسخوں کا مطالعہ کیا ہے، اور ایک مدلّل و مفصّل مقدمہ بھی تصنیف فرمایا ہے۔ مزید برآں انہوں نے کتاب کے آخر میں لکھنؤ کے ان تمام ہنرمندوں اور فن کاروں کا تذکرہ بھی پیش کر دیا ہے جن کا

ذکر سرور نے کیا ہے۔ اس کے بعد "فرہنگ فسانۂ عجائب" "فرہنگ محاورات وامثال فسانۂ عجائب" فرہنگ آیات و فقرے عربی فسانۂ عجائب" اور اُن نسخوں کی فہرست دے دی گئی ہے۔ جو اس نسخے کی ترتیب و تدوین میں مرتب کے پیش نظر رہے ہیں۔ ان سب مفید اضافوں کی بدولت یہ اڈیشن کچھ اور دقیع ہو گیا ہے۔

پروفیسر صاحب نے اس ایڈیشن کو صرف ادبی محاسن کے لحاظ سے ہی ممتاز نہیں بنایا ہے بلکہ کتابت و طباعت کے اہتمام کے اعتبار سے بھی وہ ایک امتیازی شان رکھتا ہے

ادبِ عالیہ کو جس طور پیش کرنے کی ضرورت ہے، اس کا ایک نمونہ پروفیسر صاحب کا ترتیب کردہ فسانۂ عجائب کا یہ اڈیشن ہے۔ ایسے کام کی افادیت مسلّم ہے۔ سب اردو دوستوں کو خواہ وہ ادب کے طالب علم ہوں یا عام قاری، ادیب و ناقد ہوں یا طابع و ناشر اپنے اپنے منصب کے مطابق ایسی کوششوں کو سراہنے کی ذمہ داری نبھانے کی ضرورت ہے۔

عبداللہ ولی بخش قادری

خزاں کے بعد

(سن اشاعت ۶۸ء)

مصنفہ : زبیدہ خاتون صدیقی
قیمت : 5/50 سائز $\frac{20\times30}{16}$
ناشر : نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ

خزاں کے بعد ـــــ بہار۔ اس ناول کا یہی قدرتی ماحصل ہے۔ ایک متوسط درجے کے خاندان میں سماجی اور اخلاقی اقدار کے اعتبار سے دو گھرانے ہیں۔ ایک جگہ شائستگی اور خوش سلیقگی پائی جاتی ہے اور دوسری جگہ ایک نوجوان کی بدولت نقشہ بالکل الٹ کر رہ گیا ہے۔ لیکن ایک حادثہ پیش آتا ہے اور یہی کھلنڈرا لڑکا عزم استقلال کا پیکر بن جاتا ہے پھر تھوڑے سے اتفاقات کے تانے بانے کے ساتھ حالات تبدیل ہوتے ہیں اور "بہار" آجاتی ہے۔

ناول کے پلاٹ، میں کوئی ایسا الجھاؤ نہیں ہے جو ایک عام قاری کے لئے کسی دشواری کا باعث ہو اور نہ زبان میں کسی قسم کی گراں باری پائی جاتی ہے۔ سیدھی سادی اور

صاف ستھری زبان میں واقعات اور معاملات کا اظہار کیا گیا ہے۔ جا بجا سماجی زندگی کی جھلکیاں دلکش طریقے پر پیش کی گئی ہیں جن میں حقیقت نگاری بھی ہے اور حق گوئی بھی۔ اس ناول میں کسی طرح کی کوئی عریانی یا فحاشی بھی نظر نہیں آتی۔ آج کل کے حالات میں اس بات کا بیان ضروری ہے کیونکہ یہ خوش گوار حادثہ وقت کی خوش مذاقی سے بعید ہو گیا ہے۔ اردو کی معمولی استعداد رکھنے والے اس ناول کو آسانی کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔

عبداللہ ولی بخش قادری

شائع کردہ: پبلیکیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات و نشریات

گنجینۂ غالب

(سن اشاعت ۱۹۶۹ء)

صفحات :- ۱۸۶ سائز ۲۰×۲۶/۸ مجلد

قیمت :- ۵۰/۴

ناشر :- پبلیکیشنز ڈویژن، دہلی

زیر نظر مجموعے میں غالب کے فکر و فن، مزاج اور ماحول کو مختلف حیثیتوں سے جاننے اور سمجھنے کے لئے چودہ مضامین کا انتخاب ہے، جو وقتاً فوقتاً رسالہ "آج کل" میں چھپتے رہے ہیں۔ غالب سے متعلق اسی رسالے کے ۲۲ مضامین بلکہ مقالے اب سے پانچ برس پہلے "آئینۂ غالب" کے نام سے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

"گنجینۂ غالب" کو ادارے نے جشن غالب کے موقع پر پیش کر کے اس سلسلے کی قابل لحاظ مطبوعات میں ایک معقول اضافہ کیا ہے۔

"آج کل" ایک مفید ادبی اور معیاری ماہ نامہ ہے، اس میں اردو کے بیشتر بلند پایہ ادیب اور محقق لکھتے رہتے ہیں، چنانچہ غالب پر اس وقت جتنے مستند اور ممتاز صاحبان قلم ہیں ان کی تحقیقات اس مجموعے میں موجود ہیں۔ مولانا امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود، جناب مالک رام، مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر مختار الدین احمد، خواجہ احمد فاروقی، سید احتشام حسین ان میں سے ہر ایک کی تحریر سند حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔ باقی مضامین بھی خاصی فکر و کاوش اور بسیط مطالعے کا نتیجہ ہیں۔ غالب کی نظم و نثر اور ان کی ذات اور خصوصیات میں ندرت و طرفگی تلاش کرنے والوں کو اس خوب صورت مجموعے میں بہت کچھ مل جائے گا۔ ایسے

مفید مضامین کو یک جا کر کے ادارے نے ایک گراں قدر ادبی خدمت انجام دی ہے۔

ریحان احمد عباسی

مکھی

از: احمد ہمیش

صفحات: ۷۸ سائز: $\frac{20 \times 30}{16}$

قیمت: -/۲

ناشر: سلمیٰ سلطانیہ حمیدی، شکر گنج، حیدرآباد ۲

احمد ہمیش صاحب کی سات کہانیوں کے اس مجموعے میں سماج میں مکھی کی بھنبھناہٹ اور گندگی کو بے پردا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ سات کہانیاں 'خارش کی حکایت' سے شروع ہو کر 'مکھی' پر ختم ہوتی ہیں اور جدّت پیدا کرنے کا احساس اور ڈگر سے ہٹ کر بات کہنے کا حوصلہ اتنا شدید دکھائی دیتا ہے کہ چھٹی کہانی کا عنوان "ساتویں کہانی" قائم کیا گیا ہے۔ کتابت اور طباعت عمدہ ہے۔
شمس الرحمٰن صاحب فاروقی کے بقول احمد ہمیش کے یہاں عریانیت کی اخلاق سوزی کے گھناؤنے پن اور بدصورتی کی گہرائیوں میں اترنے کا جو گہرا شوق و شغف ملتا ہے وہ انیسویں صدی کے فرانسیسی عریاں مصور مانے جیسے فن کار کی ذہنی اور روحانی بلند ہمتی اور جرأت انگیزی اور اخلاص مندی کی یاد دلاتا ہے۔

محمد رفیق شاستری

فضائل شعبان المعظم

از: محمد شمس الضحیٰ

صفحات: ۶۴ سائز: $\frac{20 \times 30}{16}$

قیمت: ۶۰ پیسے

ناشر: کتب خانہ شمسیہ، مدرسہ اسلامیہ گھنٹی، دبہار

صوبۂ بہار کے ضلع سنتھال پرگنہ میں گھنٹی ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں کے مدرسہ

اسلامیہ میں درس و تدریس کی ذمہ داریاں مولانا محمد شمس الضحیٰ صاحب نے سنبھال رکھی ہیں، اس مدرسہ سے متعلق ایک کتب خانہ بھی ہے جہاں سے فضائل شعبان المعظم نام کا ایک چھوٹا سا رسالہ شائع ہو کر ہمیں موصول ہوا ہے۔

رسالہ میں اس مبارک مہینہ کی عبادات کا ذکر ہے جو مستند احادیث کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے افکار ہیں جس سے مسلمان استفادہ کر سکتے ہیں، آخر میں اسی احادیث نقل کی گئی ہیں جن میں سے کچھ پر بھی مسلمان صدق دل سے عمل کریں تو ان کی دنیا اور دین دونوں کے سدھرنے میں بڑی مدد ملے گی۔

یہ رسالہ ۶۵ء میں شائع ہوا تھا پتہ نہیں کہ اب تک اس کی تشہیر کی طرف توجہ کیوں نہیں کی گئی۔ بہرحال رسالہ خوش سلیقگی سے مرتب کیا گیا ہے۔ اور اس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے۔

سید احمد دلی

فارسی کتب

گلستاں	(مترجم)	شیخ سعدیؒ	۳/-
بوستاں	(مترجم)	" "	۳/۵۰
پیراہن یوسفی		(مثنوی مولانا روم، مترجم) مکمل ۶ جلدیں	۲۴/-
کلیات غالب فارسی		مرتبہ: امیر حسن نورانی	۱۵/-
دیوان امیر خسروؒ		" انوار الحسن	۲۸/-

ادبی خبریں

● نئی دہلی۔ تعلیم اور نوجوانوں کی خدمت کی وزارت نے بچوں کے خیال سے لکھی جانے والی کتابوں کے پندرھویں انعامی مقابلے کے لئے کتابیں اور مسودے طلب کئے ہیں ہر کتاب کے مسودے کے لئے ایک ہزار روپے کا انعام دیا جائے گا۔ کل پندرہ انعامات ہوں گے، ان میں سے دو انعام ہندی کی کتابوں پر اور ایک ایک آسامی، بنگالی، مراٹھی، کنڑ، کشمیری، ملیالم، اڑیہ، پنجابی، سندھی، تامل، تیلگو اور اردو زبانوں کی کتابوں کے لئے ہے۔

اس مقابلے میں صرف وہ کتابیں اور مسودے شامل ہو سکتے ہیں جو ۶۷، ۶۸ء اور ۶۹ء کے دوران شائع کئے گئے ہوں۔ درسی کتب مقابلے میں شامل نہیں ہوں گی جن کتابوں پر کاپی رائٹ ہے۔ ان کے تراجم، تلخیص وغیرہ اس صورت میں مقابلے میں شامل ہو سکیں گے۔ جبکہ متعلقہ شخص سے اس کی اجازت لے لی گئی ہو۔ اس سے قبل مقابلے میں بھیجی گئی کتب اس مقابلے میں شامل نہیں ہوں گی۔

ہندی، سندھی اور اردو کی کتابیں مرکزی وزارت تعلیم کو بھیجی جائیں گی اور دیگر زبانوں کی کتابیں متعلقہ ریاستی سرکاروں کو۔ مصنفین کو داخلے کے لئے تین روپے اور ناشرین کو پانچ روپیہ فیس دینا ہوگی۔ آخری تاریخ ۲ ردسمبر ۱۹۶۹ء ہے۔ مزید تفصیلات کے لئے اس پتہ پر رابطہ قائم کرنا چاہیئے:

اسسٹنٹ ایجوکیشنل ایڈوائزر گورنمنٹ آف انڈیا وزارت تعلیم سیکشن
بی۔ ایس۔ ای ۲، کمرہ ۵۳۱ سی، ونگ، شاستری بھون، نئی دہلی

● آل انڈیا میرا کاڈمی لکھنؤ نے ۱۹۶۷ء کی حسب ذیل کتابوں پر میر ادارڈ دیا ہے۔ برائے اشاعت

۱۔ ڈاکٹر نیر مسعود لکھنؤ یونیورسٹی کی کتاب — رجب علی بیگ سرور — پر چھ سو روپے۔
۲۔ ڈاکٹر مختار الدین آرزو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی کتاب — گلشن ہند۔ پر دو سو پچاس روپے
۴۔ پنڈت بال مکند عرش ملسیانی کے شعری مجموعہ — شرار و سنگ۔ پر دو سو پچاس روپے

آل انڈیا میر اکاڈمی کی طرف سے ہر سال اردو کی بہترین علمی، ادبی، تاریخی، تنقیدی، تخلیقی اور شعری مطبوعات پر میر ایوارڈ پندرہ سو روپے کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

۱۹۶۸ء کی مطبوعات جو ایوارڈ میں شامل کرنے کے لئے بھیجی جائیں۔ اُن کی پانچ پانچ جلدیں جناب مظفر احمد لاوی صاحب جنرل سکریٹری آل انڈیا میر اکاڈمی۔ اقبال منزل وزیر گنج لکھنؤ کے پتے پر ۱ دسمبر ۱۹۶۹ء تک پہنچ جانی چاہئیں۔

اکاڈمی کی طرف سے ہر سال ساڑھے تین تین سو روپے کے چھ ادبی وظیفے بھی دیے جاتے ہیں۔ ۶۸-۱۹۶۷ء کے لئے یہ وظیفے اکاڈمی نے اصحاب ذیل کو پیش کئے جانے کا اعلان کیا ہے

۱۔ محمد اعجاز صدیقی ایڈیٹر شاعر بمبئی، ۲۔ رضا ملک پوری ایڈیٹر صبح نو پٹنہ، ۳۔ سید حرمت الاکرام۔ مرزا پور، ۴۔ سکھدیو پرشاد بسمل۔ الہ آباد، ۵۔ نازش پرتاب گڑھی پرتاب گڑھ ۶۔ مائل ملیح آبادی۔ ملیح آباد

یہ وظیفے ایسے ادبا اور شعراء کو دیے جاتے ہیں جنہوں نے اردو زبان اور ادب کی خدمت میں نمایاں حصہ لیا ہے اور جن کے افکار سے قومی یکجہتی کو تقویت پہنچی ہے۔

آل انڈیا میر اکاڈمی لکھنؤ　　　　سکریٹری

۱۰ اکتوبر ۱۹۶۹ء　　　　نشر و اشاعت

● دہلی اپریل کے مہینے میں مرزا غالب کے قلم کا نقل کیا ہوا جو دیوان بھوپال سے امروہے کے کتب فروش توفیق احمد صاحب نے خریدا تھا اس کا فوٹو شائع ہو گیا ہے۔ ہندوستان کے مشہور عالم اور ماہر غالبیات مولانا امتیاز علی عرشی کے فرزند جناب اکبر علی خاں نے اس دیوان کا عکسی اڈیشن دیباچے اور حواشی کے ساتھ مرتب اور شائع کر دیا ہے۔ اس کا پیش لفظ پروفیسر آل احمد سرور نے تحریر فرمایا ہے۔

یہ دیوان مرزا غالب نے سہ شنبہ ۱۴ رجب ۱۲۳۱ھ مطابق ۱۰ جون ۱۸۱۶ء کو جب ان کی عمر انیس برس کی تھی اپنے ہاتھ سے نقل کرکے تمام کیا تھا۔ اس لحاظ سے یہ غالب کے کلام کا سب سے پرانا نسخہ ہے۔ جس کی بڑی تاریخی اہمیت ہے اس کے علاوہ اس میں اردو کی ۲۵ غزلیں فارسی کی ۱۲ رباعیاں اور اردو کی ۲ رباعیاں پہلی بار دریافت ہوئی ہیں۔

اسی اہمیت کے پیش نظر اس دیوان کا مکمل فوٹو بہترین کاغذ پر تین رنگوں میں

REGD NO 3... NOVEMBER 1969.

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR, NEW DELHI No 25.

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے کوہ نور پریس میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لئے جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا

ماہنامہ

دسمبر ۱۹۶۹ء

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

منیجنگ اڈیٹر:۔
غلام ربانی تاباں
اڈیٹر:۔
ریحان احمد عباسی

ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی

(لائبریریوں اور بک کلب کے ممبروں کے لئے سالانہ چندہ ایک روپیہ)

دسمبر ۱۹۶۹ء
جلد ۹ شمارہ ۱۲
سالانہ چندہ ۲ روپے
فی پرچہ ۲۰ پیسے

اشاریہ

کتاب نما کے پچھلے شمارے ہم نے مکتبہ جامعہ کی شائع کی ہوئی کلاسیکل لٹریچر کی تین کتابوں کا ایک اشتہار شائع کیا تھا۔ امید ہے یہ اشتہار قارئین کتاب نما کی نظروں سے ضرور گزرا ہوگا۔ اس سے پہلے بھی اگست کے کتاب نما میں ہم ان کتابوں کی افادیت اور اہمیت پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ اب اس بار ہم اس سلسلے کی پہلی کتاب

"مقدمہ شعر و شاعری" کا تعارف پیش کر رہے ہیں۔ امید ہے اسے پڑھ کر اس کتاب اور خاص طور سے اس اسکیم کے بارے میں ادب کے شائقین جان سکیں گے کہ یہ کتنی خصوصیتوں کی حامل ہیں اور دوسرے اڈیشنوں سے کیوں اور کس طرح افضل ہیں۔ چونکہ ان کتابوں کی تیاری میں زیادہ سے زیادہ صحت متن کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس لئے یقین ہے کہ طلباء اور تحقیقی کام کرنے والے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ ان سے استفادہ کر سکیں گے۔ قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ چونکہ ان کتابوں کی اشاعت میں حکومت جموں و کشمیر کا تعاون حاصل رہا ہے اس لئے ان کی قیمتیں بھی عام بازاری شرح کے مقابلے میں بہت کم رکھی گئی ہیں ان تمام خوبیوں کو دیکھتے ہوئے امید ہے یہ کتابیں ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لی جائیں گی اور ان کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی تاکہ ہم اسی لگن اور اعتماد کے ساتھ اس طرح کی دوسری کتابیں برابر پیش کرتے رہیں۔

نومبر کے کتاب نما میں "جائزے" کے تحت "فسانۂ عجائب" کے مصنف کا نام بجائے رجب علی بیگ سرور کے میرامن شائع ہو گیا تھا۔ ہمیں اس غلطی کا افسوس ہے۔ قارئین کتاب نما سے درخواست ہے کہ وہ اس کی تصحیح فرمالیں۔

فہرست اور کتابیں ملنے کے پتے:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
شمشاد مارکیٹ
علی گڑھ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار
دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ
بمبئی ۳

تعارف

مقدمہ شعر و شاعری

مکتبہ جامعہ نے حکومتِ جموں و کشمیر کے تعاون سے معیاری ادب کی اشاعت کا ایک پروگرام مرتب کیا ہے۔

اس سلسلے میں صحت متن اور حسنِ طباعت کے ساتھ ادبِ عالیہ کم قیمت پر پیش کیا جائے گا۔ مقدمہ شعر و شاعری سے اس کام کا آغاز ہوا ہے۔ اس نسخے کو جناب رشید حسن خاں صاحب نے ترتیب دیا ہے جو سیدانِ نقد و نظر میں اپنا مقام رکھتے ہیں اور اپنی دقیقہ ریزی کے لئے مشہور رہیں۔ اپنے مختصر تعارف میں وہ فرماتے ہیں کہ:

یہ بات پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ پہلی بار یہ مقدمہ ۱۸۹۳ء میں اردو دیوان کے ساتھ شائع ہوا تھا گویا واقعتہً یہ اُن کے مجموعۂ کلام کا مقدمہ تھا۔ مقدمے کی تصنیف کے وقت حالی اصلاح کے قائل ہی نہیں، مبلّغ بن چکے تھے۔ غدر کے اثرات، قومی سطح پر معاشی مسائل، قدیم تہذیبی نظام کی شکست اور جدید تہذیبی واردات کا آغاز، یہ باتیں اُن کے حساس دل کو بے طرح متاثر کر رہی تھیں۔ دوسری طرف سر سیّد کی تحریک نے خدمتِ قوم کا ایک ایسا تصوّر ان کے ذہن میں پیدا کر دیا تھا۔ جس کے دائرے میں اس زندگی کے سارے عوامل گویا شامل تھے لاہور کے جدید طرز کے مشاعروں نے سونے میں سہاگے کا کام کیا اور اب شاعری اُن کو قومی اصلاح کا بہت کارگر ذریعہ معلوم ہونے لگی۔ ایک زمانے میں انہوں نے تغزّل سے بھرپور غزلیں کہی تھیں۔ اب اُس کا کفّارہ ادا کرنے کے لئے ایسی مسلسل غزلیں لکھنا شروع کیں جن میں شعریت کے سوا اور سب کچھ تھا، پیغام، اصلاح، نصیحت [illegible]

بھی اسی راستہ پر چلیں۔ اُن کے مجموعہ کلام میں قدیم و جدید دونوں رنگ کا کلام شامل تھا، وہ خود بھی اچھے غزل گو رہ چکے تھے۔ اسی لئے دیوان کے اس طویل مقدمے میں ان کی سب سے زیادہ توجہ غزل کے معائب کی طرف مبذول رہی۔ اور عام شاعری، خصوصاً مثنویوں میں ان کو غیر اخلاقی عناصر زیادہ شدت کے ساتھ کھٹکنے لگے انہوں نے مقدمے میں ایسے مقامات پر شاعر کے دل اور ناقد کی نظر سے گویا بے تعلقی اختیار کرلی ہے اور محض مصلحِ قوم و مصلحِ ادب کی آنکھ سے کام لیا ہے۔

مقدمہ اردو ادب میں پہلی آواز تھی جسنے جذبے کی جگہ فکر کو عطا کی اور لوگوں کی توجہ شاعری کے ساتھ ساتھ شاعری کے بعض اہم مسائل کی طرف منتقل ہوئی حالی مغربی ادب سے براہِ راست واقف نہیں تھے۔ بالواسطہ واقفیت ہمیشہ ناتمام سی رہتی ہے۔ مقدمے میں بھی اس کے اثرات محسوس کئے گئے ہیں لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کی وجہ سے اس کتاب کی اصل قدر و قیمت پر حرف آسکے۔ آج جب کہ اردو میں تنقید کا سرمایہ بہت بڑھ چکا ہے اور مغربی ادب سے براہِ راست واقفیت نے فکر و نظر کی بے کرانیوں سے روشناس کرایا ہے اس کتاب کی اہمیت آج بھی باقی ہے۔ تاریخی حیثیت کے علاوہ آج بھی اس کے بعض مباحث فکر انگیز معلوم ہوتے ہیں

مقدمہ 'شعر و شاعری' اپنے عہد کے لحاظ سے ایک انقلابی تصنیف اور ایک کارنامہ تھا، اگرچہ آج وہ ہم کو محض ایک اصلاحی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ حالی نے اردو شاعری خاص طور سے غزلیہ شاعری کی جن روایتوں کا ذکر کیا ہے۔ اور جن کے متعلق ان کا خیال یہ تھا کہ ان کے اثر سے ہماری شاعری سچائی اور تاثیر سے محروم ہوکر رہ گئی ہے، اُن کے ہمہ گیر اثرات کا آج صحیح طور سے اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اُس زمانے میں حالی پر جس شدت کے ساتھ اعتراض کیے گئے، آوازے کسے گئے اور اُن کے خیالات کا مذاق اڑایا گیا۔ اُن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس عہد میں یہ کیسی انقلابی آواز تھی۔

مقدمۂ شعر و شاعری کا شمار اُردو کی اُن اہم اور معیاری کتابوں میں ہے، جن کی اہمیت، افادیت اور مقبولیت پر شاید ہی کبھی آنچ آسکے۔ اِس کو اردو میں تنقید کی پہلی کتاب کہا جاسکتا ہے۔ اسی وجہ سے کلاسکی ادب کے اس سلسلۂ کتب میں اس کتاب کا انتخاب کیا گیا ہے۔ مقدمۂ شعر و شاعری [illegible] ۱۸۹۳ء میں مطبع انصاری دہلی [illegible]

میں طبع ہوا تھا۔ اُس کا سرورق رحمت اللہ رعد کے نامی پریس کان پور میں چھپا تھا۔ نسخۂ جامعہ کی بنیاد اسی اڈیشن پر رکھی گئی ہے اس اولیں مطبوعہ نسخے میں بعض الفاظ کا ایسا املا ملتا ہے جو اب بالاتفاق متروک ہے۔ مثلاً دونوں، اس میں ہر جگہ "دو نو" ملتا ہے۔ یا تیار کو طیار، لکھا گیا ہے ایسے مقامات پر جدید املا کو اختیار کیا گیا ہے مجموعی طور پر املا میں ان اصولوں کی پابندی کی گئی ہے جن کو ایک زمانے میں انجمن ترقی اردو ہند نے تسلیم کیا تھا۔ بعض جگہ پیراگراف کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور توقیف نگاری کا اہتمام بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اضافت کے زیر التزام کے ساتھ لگائے گئے ہیں۔

متن میں بعض مقامات پر واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے ایسے مقامات پر قیاسی تصحیح سے کام لیا گیا ہے اور وضاحت و امتیاز کی خاطر یہ اضافہ قوسین میں کیا گیا ہے۔ لیکن ایسے مقامات بہت کم ہیں

اس کتاب میں جہاں جہاں "مصالح" آیا ہے، اُسے "مسالا" لکھا گیا ہے، دلی والے ایک زمانے میں اس لفظ کا یہی املا لکھا کرتے تھے لیکن اب مسالا مستعمل ہے۔ چاہئیں "کو ہر جگہ" چاہیے" لکھا گیا ہے اور اسمائے اعلام کے علاوہ، جن الفاظ کے آخر میں الفِ مقصورہ بہ صورتِ ی ہے جیسے دعویٰ، اعلیٰ، ان الفاظ کو الف سے لکھا گیا ہے ص ۲۱۵ پر ایک جگہ مطبوعہ نسخے میں "پھوڑپن" آیا ہے، "قصہ نگار کا پھوڑپن ثابت ہوتا ہے؟ مجھے یہ لفظ کسی لغت میں نہیں ملا اسے "پھوہڑپن" بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ سختی کے ساتھ اصل متن کی پابندی کی گئی ہے اور حتی الامکان اس کی کوشش کی گئی ہے کہ متن اغلاطِ کتابت سے محفوظ رہے۔ یہاں، ایک بات کا اظہار ضروری ہے کہ اصل مطبوعہ نسخے میں فہرست عنوانات کی صورت یہ ہے کہ فہرست میں درج کچھ عنوانات تو متن میں اُسی طرح ملتے ہیں، کچھ عنوانات اختصار کے ساتھ ہیں اور فہرست کے کچھ عنوانات متن میں سرے سے موجود نہیں، اگرچہ متن کی عبارتیں، فہرست کے عنوانات کے مطابق ہیں اس میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔

رشید حسن خاں

دہلی یونیورسٹی ۱۵ ستمبر ۱۹۶۹ء

رشید صاحب کے اس بیان سے پیشِ نظر نسخے کی خصوصیات سامنے آجاتی ہیں۔ اس اعتبار سے موجودہ اشاعت [illegible]

مکتبہ جامعہ اپنی روایتی کتابت و طباعت کا ثبوت بھی فراہم کرنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔
اردو کی ترویج و اشاعت کے بہت سے کام ہیں۔ اُن میں تحفظِ ادب کا مسئلہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ روز بروز ادبی ورثہ کم یاب ہوتا جاتا ہے۔ اوّل تو بہت سی معیاری کتابیں ملتی ہی نہیں اور جو نظر بھی آتی ہیں ان کی کتابت و طباعت عموماً ناقص اور قیمت زائد ہوا کرتی ہے۔ ایسی کتابیں بازار کا مال، نہ ہونے کی وجہ سے نفع خوروں کے لئے کوئی جاذبیت بھی نہیں رکھتی ہیں۔ لہٰذا جو صاحبان ذوق ہیں یا ادبی رجحان رکھتے ہیں تشنہ لب اور مایوس ہو کر رہ جاتے ہیں۔ زبان کو اپنے ادب سے ہی تقویت پہنچتی ہے۔ اردو کی بقا کے لئے اُس کے ادب کا تحفظ ضروری ہے اور مذاق کی درستی کے لئے اس سے آشنائی، لازمی شرط ہے۔

یہ اَمر باعثِ تسکین ہے کہ حکومت جموں و کشمیر کی مالی اعانت کی بدولت مکتبہ جامعہ معیاری ادب پبلش کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ یہ بڑی خدمت ہے۔ اس ابتداء سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقاصد میں خاطر خواہ طور پر کامیاب ہوگا۔ اس طور اردو ادب کے فروغ کا ایک باب کھل گیا ہے جس کے لئے حکومت جموں و کشمیر اور مکتبہ جامعہ دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں۔

مقدمہ شعر و شاعری $\frac{20 \times 30}{16}$ سائز کے ۲۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے عام اڈیشن کی قیمت ۲/۶۰ اور لائبریری اڈیشن کی قیمت ۳/۴۰ مقرر کی گئی ہے

معیاری اور سستی کتابیں

"مکتبہ جامعہ نے یہ کتابیں بھی انتہائی صحت متن، ضروری اعراب اور فرہنگ کے ساتھ شائع کی ہیں

باغ و بہار:۔	میر امن دہلوی	مرتبہ: رشید حسن خاں	۲/-
مثنوی گلزار نسیم:۔	دیا شنکر نسیم	" رشید حسن خاں	۱/۵۰
مثنوی سحرالبیان:۔	میر حسن دہلوی	" رشید حسن خاں	۱/۷۵

مصنف: بسودھا چکرورتی

مترجم: عرش ملسیانی

قاضی نذرالاسلام

انیسویں صدی ختم ہو رہی تھی۔ ہندوستان میں سیاسی بیداری کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ چند ہی سال میں بنگال میں، تقسیم بنگال کے خلاف تحریک شروع ہوئی۔ برطانوی حکومت نے یہ تقسیم ۱۹۰۵ء میں نافذ کی تھی۔ لیکن تقسیم کی منسوخی کی یہ تحریک از خود قومی آزادی کی صورت اختیار کر گئی۔ بنکم چندر چٹرجی کی کتاب آنند مٹھ اور کچھ تاریخی کتابوں نے جو عوام کی جنگ آزادی کی روایت کی آئینہ دار تھیں اس کے بیج پہلے ہی بو دئے تھے۔ رُوح کو گرمانے والا بندے ماترم کا گیت لوگوں کے دلوں میں ہلچل مچا چکا تھا۔ سوامی ودیکا نندا دران سے پہلے رام موہن رائے نے عوام کے سامنے ایک ایسے سماج کی تصویر پیش کی تھی جس سے ان کے دلوں میں سرگرمی پیدا ہوئی اور قومی زندگی کا احساس تیز تر ہو گیا۔ یہ اور ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ اپنی تکمیل کی انتظار میں تھے جب قاضی نذرالاسلام بنگالی سن ۱۳۰۶ میں جیٹھ گیارہ مطابق ۲۴ مئی ۱۸۹۹ء کو موجودہ مغربی بنگال کے ضلع بردوان کے گاؤں چرُلیا میں پیدا ہوئے۔ نذرل کے دو اور بھائی اور ایک بہن تھے اور ان چاروں میں یہ دوسرے تھے۔

قاضی کے لقب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسلم قاضیوں کے خاندان میں پیدا ہوئے۔ جن کے متعلق فرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ خوش حال تھے مغل بادشاہوں نے ان کو ایک جاگیر بھی عطا کی تھی۔ عام یقین یہ ہے کہ یہ خاندان پٹنے سے نقل مکان کر کے ادھر آیا تھا۔ اس کا بھی پورا ثبوت ملتا ہے کہ نذرل کے والد قاضی فقیر محمد مفلس و قلاش ہو گئے تھے۔ نذرل کے والد کا انتقال اس وقت ہوا جب نذرل صرف پندرہ سال کے تھے

کنبے کا معاشی بوجھ اٹھانے کے لئے انہیں طرح طرح کی ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ انہوں نے گاؤں کے مکتب سے لور پرائمری کا امتحان پاس کیا تھا اور وہیں مدرس بھی رہے تھے اس کے بعد وہ بتدریج دیہاتی لوک گیت پارٹی کے لئے گیت لکھتے رہے پھر ایک ریلوے گارڈ کے کوارٹر میں گھریلو ملازم ہوئے اور پھر روٹی کی ایک دوکان پر کام کیا۔ یہ ان کی تقدیر میں نہ تھا کہ وہ اس زمانے میں اسکول میں تعلیم حاصل کریں۔ بچپن میں انہوں نے صرف یہی حاصل کیا کہ وہ قرآن پڑھ سکیں۔ قاضی بذل کریم سے جو رشتے میں ان کے چچا تھے انہوں نے تھوڑی سی فارسی بھی پڑھی لیکن گاؤں کی پارٹیوں کے لئے گانے چھوٹے اور بڑے ڈرامے لکھنے کے لئے وہ مشہور ہو گئے تھے اور انہوں نے ڈھولک بجانا بھی سیکھ لیا تھا۔ جب وہ روٹی کی دکان پر کام کرتے تھے تو اس علاقے کے ایک پولیس افسر قاضی رافذاللہ کی فن شناس آنکھوں نے انہیں دیکھا۔ یہ صاحب انہیں اپنے ضلع میمن سنگھ لے گئے جو اب مشرقی پاکستان میں ہے انہوں نے ان کو داری رام پور حامی گاؤں کے ایک ہائی اسکول میں داخل کر دیا۔ نذرل نے وہاں زیادہ دیر تک قیام نہیں کیا اور وہ جلد بردوان واپس آ گئے اور متھرن میں نوین چندر انسٹی ٹیوشن میں داخل ہو گئے جہاں کملا رنجن ملک جو ایک مشہور شاعر تھے ان کے اساتذہ میں شامل تھے۔ اس کے بعد جلد ہی وہ سرسول راج ہائی اسکول میں آ گئے، جہاں ایک مقامی زمیندار کی عنایت سے ان کو مفت تعلیم ملنے لگی مسلم ہوسٹل کے اخراجات بھی معاف تھے۔ اور ان رعائیتوں کے علاوہ سات روپے ماہانہ وظیفہ بھی ملتا تھا۔ وہ اپنی جماعت میں سب سے لائق طالب علم تھے۔ ایک ہی سال میں انہیں آٹھویں سے دسویں جماعت کی ڈبل ترقی ملی۔ اسی اسکول میں وہ نوارن چندر گھٹک کے زیر اثر آ گئے، وہ انقلابی جگانتر پارٹی سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی چچی دکری بالا دیوی پہلی بنگالی عورت تھیں جنہیں قانون اسلحہ کے تحت سزائے قید ملی۔

نذرل پر نوارن چندر گھٹک کا بہت اثر پڑا۔ اسی کے زیر اثر وہ بنگالی ڈبل کمپنی میں بھرتی ہو گئے۔ بعد میں اس کا نام ۴۹ بنگالی رجمنٹ ہو گیا۔ یہ کام انہوں نے حب الوطنی کے جذبے سے کیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ فوجی ٹریننگ کسی دن ملک کو آزاد کرانے کی جنگ میں کام آئے گی۔ یہ رجمنٹ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں قائم ہوئی۔ عوام کا تقاضا تھا کہ بنگال کے نوجوانوں کو فوجی ملازمت کا موقع ملے۔ اس کا صدر مقام کراچی تھا۔ اس جذبے

سے سوانڈل کے لئے اسکول چھوڑنے کی کوئی وجہ نہ تھی جہاں یہ اپنے ہم جماعتوں میں سب سے لائق تھے۔ ذہنی اور سیاسی اثرات کو زندگی کا صحیح راستہ اختیار کرنے میں بڑا دخل تھا۔ اس وقت ان کی عمر مشکل سے اٹھارہ برس کی تھی۔

نذرالاسلام طبع خداداد کے مالک تھے ان کی پہلی نظم جو انہوں نے کراچی سے بھیجی تھی۔ بنگیہ مسلمان ساہتیہ پترکا بنگالی سن کے سراون ۱۳۲۵ مطابق جولائی اگست ۱۹۱۹ء کے شمارے میں چھپی تھی۔ یہ رسالہ بنگیہ مسلمان ساہتیہ سمتی کے زیر اہتمام شائع ہوتا تھا۔ جسے مسلمان ادیبوں نے قائم کیا تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ بنگیہ ساہتیہ پریشد (بنگالی لٹریری اکاڈمی) جس کے وہ رکن تھے ان کو نظرانداز کرتا تھا۔ لیکن ایک علیحدہ ادارہ بنانے سے ان کا یہ مقصد نہیں تھا کہ اسے فرقہ وارانہ اقدام سمجھا جائے۔ اس سمتی کے اسسٹنٹ سکرٹری مسٹر مظفر احمد تھے۔ جو ایک بہت بڑے کمیونسٹ لیڈر بن گئے ہیں مسٹر احمد کو رسالے کے تمام انتظامی معاملات کو سرانجام دینے پڑتے تھے انہوں نے اپنی ضخیم بنگالی تصنیف "قاضی نذرالاسلام سوانح" میں لکھا ہے کہ نذرل کی پہلی مطبوعہ نظم کا عنوان کستما (معافی) تھا لیکن ایڈیٹر نے اسے تبدیل کر کے مکتی (نجات) کر دیا اور نذرل نے مظفر احمد کو ایک خط میں اس تبدیلی پر صاد کیا۔ اس نظم کا بنیادی خیال یہ تھا کہ ایک فقیر کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور اس نے اس زندگی سے حیرت انگیز طریقے سے نجات حاصل کی۔ اس نظم کو دیکھ کر کچھ لوگ یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ نذرل بچپن ہی سے روحانیت کی طرف مائل تھے۔ ایک فقیر حاجی پہلوان کی قبر پر جھاڑو دیتے تھے اور شام کو وہاں دیا جلاتے تھے۔ ان باتوں سے ان کا روحانیت کی طرف رجحان طبع ظاہر ہوتا ہے جو بعد میں، یوگ کی طرف رغبت میں تبدیل ہوا اور وہ یوگ آسن کرنے لگے۔ مکتی کے بعد وہ کہانیاں لکھنے لگے جن میں بلبلا تھا دان (تحفۂ غم) ایک غم انگیز کہانی ہے جس کے کردار سرخ فوج میں بھرتی ہو جاتے ہیں یقین کیا جاتا ہے کہ اس کہانی کی بنیاد حقیقت ہے کہ کچھ ہندوستانی سپاہی اور سیاسی آدمی سرخ فوج میں شامل ہو گئے تھے۔ لیکن اس کہانی میں حب الوطنی کے جذبے کی بھی فراوانی ہے۔ ۱۹۲۰ء کے آغاز میں نذرل سات دن کی چھٹی پر کلکتے آئے اور اس رسالے کے دفتر میں بھی گئے اس وقت نذرل نے دو اور نظمیں شائع کیں ایک ساؤگات میں جس کا ایڈیٹر مسلمان تھا اور حافظ

سے کچھ اشعار کا ترجمہ 'پرداسی' میں جو بنگالی زبان کا ممتاز ماہ نامہ تھا اور رانند چٹرجی کی ادارت میں شایع ہوتا تھا اور جس میں رابندرناتھ ٹیگور کی تازہ نظمیں بھی شایع ہوتی تھیں۔ نذرل نے فارسی سرسول راج ہائی اسکول میں اپنے استاذ نورالنبی سے پڑھی تھی۔ اس کے بعد ایک مولوی سے جو اس کی رجمنٹ کے ساتھ تھا اس کی آئندہ زندگی میں فارسی سے بہت سے ترجمے کرنے کی صلاحیت ان میں پیدا ہوئی۔

مارچ ۱۹۲۰ء میں ۴۹ بنگالی رجمنٹ توڑ دی گئی اور نذرل کلکتہ واپس آگئے پہلے وہ اپنے بچپن کے دوست سیلا جانند مکرجی کے پاس ٹھہرے جو اس وقت بہت بڑے افسانہ و ناول نگار بن چکے تھے لیکن جلد ہی بنگیہ مسلمان ساہتیہ پتر کا کے دفتر میں پہنچ گئے جہاں مظفر احمد بھی ٹھہرے ہوئے تھے سابق فوجی کی حیثیت سے نذرل کے لئے سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے بڑے مواقع تھے۔ انہوں نے سب رجسٹرار کی اسامی کے لئے درخواست دی لیکن انٹرویو کے وقت ان کے دوستوں نے اس موقعے کو کھو دینے کی ترغیب دی۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اپنی ادبی صلاحیتوں کی بناء پر انہیں کلکتے سے باہر جانا چاہیے۔ نذرل نے اس مشورے کو قبول کر لیا اور یہاں سے ان کی قابل رشک ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس وقت ان کی عمر اکیس برس کی تھی وہ حولدار قاضی نذرالسلام کے نام سے موسوم تو ہوئے لیکن جلد ہی ایک پُرتحریر ادیب بن گئے نہایت تیز رفتار سے ان کے قلم سے شہ کار نظموں، گیتوں، بیلے، کہانیوں اور مقالات کی صورت میں منظرِ عام پر آنے لگے۔ نذرل کی تخلیقات زیادہ تر 'مسلم بھارت' میں شائع ہونے لگیں۔ اسے مسلم ادیبوں نے اپریل ۱۹۲۰ء میں جاری کیا تھا اُن کے علاوہ نذرل دوسرے جرائد میں بھی لکھتے تھے 'مسلم بھارت' کے مدیر مسٹر محمد حق نے جو خود بھی شاعر تھے اور شانتی پور کے رہنے والے تھے جو ضلع نادیا میں ایک غیر معروف قصبہ تھا۔ کام چلا ڈ ایڈیٹر ان کے فرزند مسٹر فضل الحق تھے جو پبلشر بھی تھے۔ مسلم بھارت میں نذرل کی پہلی تخلیق شائع ہوئی۔ وہ ایک ناول تھا۔ اس کا نام تھا، بادھن ہراد روہ خطوط کی صورت میں تھا۔ مسلم بھارت میں پہلے سال نذرل کی کچھ معرکتہ الآرا نظمیں شائع ہوئیں جو مثلاً شطّ العرب اسی نام کے دریا کی تعریف میں، محرم، قربانی فاتحہ دوازدہم۔ بادل پراتیر شراب (برسات کی صبح کے لئے شراب) بادل برکا شے

رہی بارش ہورہی تھی)، اس کے علاوہ متفرق نظمیں اور گیت۔ کھیا پار پہ تری (کشتی) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اس میں سادگی اور آہنگ کا عجیب امتزاج ہے ڈھاکہ کی ایک خاتون کی بنائی ہوئی کشتی کی ایک تصویر اس نظم کی خالق ہے۔ دوسرے ماہناموں کے لئے نذرل لکھتے تھے، رسالوں اور اپنا سنا ہیں اسی زمانہ میں نذرل نے سیاسی صحافت کا پیشہ بھی اختیار کیا، یہ کوئی حیرت کا مقام نہیں تھا کیونکہ نذرل نے اسکول کو خیرباد کہا تھا اور فوجی ملازمت کی تھی، تاکہ وہ ملک کی خدمت کرسکیں۔

وہ اپنی صلاحیتوں کو سیاسی مصلحے کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے، حالانکہ وہ بنیادی طور پر ایک شاعر اور ادیب تھے انہوں نے اپنے زمانے کے کئی ادوار میں صحافت کی طرف رُخ کیا ۱۹۲۰ء کا سال بڑے دباؤ اور تناؤ کا سال تھا اسی سال میں انہوں نے پہلے پہل اپنا رُخ بدلا۔ جلیاں والا باغ کا قتلِ عام اور ۱۹۱۹ء میں پنجاب میں زبردست مظالم، خلافت کے ٹوٹنے، ترکی کی سلطنت کے ٹکڑے ہونے سے مسلمانوں میں غم و غصہ کا اظہار ۱۹۱۹ء کی مانٹیگو چیمسفورڈ ریفارمز سے عام مایوسی ایسے وجوہ تھے کہ ملک نے مہاتما گاندھی کی قیادت میں عدم تعاون کی تحریک شروع کی۔ انڈین نیشنل کانگریس کے ایک خاص اجلاس میں جو کلکتے میں منعقد ہوا اس تحریک پر مہر توثیق ثبت کی گئی اور ملک میں ایک جوش و خروش پیدا ہوگیا۔ اسی پس منظر میں نذرل بنگالی کے روزانہ اخبار نوئیگ کے ادارے میں شامل ہوگئے اسے مسٹر اے۔ کے۔ فضل الحق نے قائم کیا تھا، جو بنیادی طور پر قوم پرست تھے لیکن کبھی کبھی اپنے مزاج کی اضطرابی کیفیت سے فرقہ وارانہ سیاست رَو میں بہ جاتے تھے، مسٹر مظفر احمد کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے فضل الحق کو یہ اخبار جاری کرنے کی ترغیب دی اور خود اس کی اشاعت کے تمام انتظامات کئے۔ نذرل اداریہ لکھنے والوں کے سرخیل تھے ان کی تحریریں بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئیں، اس مجموعے کا نام ہے "یُگ بانی" لیکن اس کتاب کو حکومت نے فوراً ضبط کرلیا، یہ تحریریں نہ یہ کہ محض وقتی سیاست سے متعلق تھیں بلکہ مزدوروں اور کسانوں کی ابھرتی ہوئی تحریک کی بھی حامی تھیں، حکومت نے کئی بار اخبار کو تنبیہہ کی اور آخر کار اس کی ایک ہزار روپے کی ضمانت ضبط کرلی۔ اخبار کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور بالآخر دو ہزار روپے کی ضمانت جمع کرنے کے بعد دوبارہ شائع ہونا شروع ہوا

مسٹر فضل الحق اپنے چند سیاسی احباب کے مشورے سے اخبار کے لہجے کو نرم کرنے پر رضامند ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نذرل اس اخبار سے الگ ہو گئے اور ان کے بعد مظفر احمد بھی یہ واقعہ دسمبر ۱۹۲۱ء کا ہے نذرل اس کے بعد سنتھال پرگنہ بہار کے قصبہ دیوگڑھ میں آرام فرما ہو گئے۔

جب نذرل نو یگ میں کام کر رہے تھے اور سیاسی اداریے لکھنے میں مصروف تھے انہوں نے متعدد معرکتہ آلارا نظمیں لکھیں۔ ان میں ایک نظم ترکی کے احیائے نو کے معمار کمال پاشا پر تھی۔ یہ دور بہت سے ملکوں میں نئی بیداری کا دور تھا۔ اور نذرل اس سے بہت متاثر ہوئے۔ اس دور میں ان کے دوستوں کا دائرہ بھی وسیع ہو گیا۔ ان کے معاصر بلکہ ان کے پیشرووں میں اکثر ان سے ملنے کے لئے آتے تھے۔ ان میں سے بعض نے ان سے کچھ اس طرح قطع تعلق کیا کہ جسے بھی یہ معلوم ہوا وہ آزردہ ہوا۔ ان میں سے ایک مرحوم موہت لال موزمدار تھے جو کہ ایک مشہور شاعر اور مقالہ نگار تھے۔ شروع شروع میں مرحوم نذرل کی پہلے پہل کی مطبوعہ نظموں کے بڑے دلدادہ تھے چونکہ یہ عمر میں نذرل سے بہت بڑے تھے انہوں نے محسوس کیا کہ نذرل کی شاعری پر انہیں کا سایہ ہے لیکن بعد میں ان سے کچھ اس طرح الگ ہوئے کہ مخالفت پر اتر آئے۔ یہاں تک کہ نظم میں ان پر ناخوش گوار حملے کرنے لگے۔ نذرل نے ان باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیا اور وہ اپنے تمام ہمعصروں کے دوست بنے رہے وہ ایک اور بزرگ شاعر ستیندر ناتھ دت کا احترام کرتے تھے۔ ستیندر ناتھ کو شعری موسیقی اور آہنگ پر بڑی قدرت تھی۔ اور وہ پہلے بنگالی شاعر تھے جنہوں نے سماجی مساوات اور مزدوروں کی تحریک کے حق میں نظمیں لکھیں۔ نذرل نے دت کی زندگی میں اور ان کے بعد نظموں میں ان کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اگر نذرل اور کسی ادیب و شاعر میں کوئی غلط فہمی بھی پیدا ہو جاتی، نذرل کے دل میں کوئی نفرت یا دشمنی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا تھا وہ اپنے ہمعصروں میں بے حد مقبول تھے۔

دیوگڑھ سے واپسی پر نذرل نے تھوڑی مدت کے لئے دوبارہ نو یگ میں کام کیا۔ لیکن پرچے کی پالیسی میں تبدیلی کے باعث اس کی مقبولیت کم ہو گئی، اور تھوڑا

کی راہ سے گزر رہے تھے جس سے ان میں ہیجانی کیفیت پیدا ہوگئی۔ شادی کا ایک پیام جسے انہوں نے خوشی سے قبول کیا تھا ایک دھوکا ثابت ہوا۔ یہ ایک گہرا صدمہ تھا۔ لیکن اس سے ان کے ملکۂ شعرگوئی کو جلا ملی اور انہوں نے بہت نظمیں کہیں۔ عدم تعاون کی تحریک جاری تھی۔ نذرل نے مہاتما گاندھی کی تاریخی آمد کلیوں استقبال کیا۔

قید خانے کے صحن میں یہ کون دیوانہ مسافر در آیا ہے۔
جہاں ماں زنجیروں میں جکڑی پڑی ہے۔
میرے تیس کروڑ ہم وطن موت کی مخالفت کا گیت گا رہے ہیں۔
اور اس کے ساتھ چل رہے ہیں
غلام ملک کی زنجیروں کو توڑنے والا یہ کون آیا ہے۔
زنجیروں کی دیوی کے سامنے یہ کس نے آزادی کا سنکھ بجایا ہے غم زدہ اور آزردہ برادران وطن اپنی ماں کی لاش اٹھائے ہوئے ہیں
اور اپنے دلوں کی پکار کے ساتھ اُسے موت کے اس پار سے واپس لا رہے ہیں
اب ان سب نے قسم کھالی ہے؛ ہم کبھی دشمنوں کے دروازے پر نہیں جائیں گے
آزادی خود اپنی ذات سے حاصل کی جاتی ہے بھیک مانگ کر نہیں۔
ابدی سچائی اور فتح مندی کا نقارہ تمام دنیا میں بج رہا ہے
جھوٹ آج خود اپنے زہر سے مر رہا ہے۔ اس کی موت کو دیر نہیں لگے گی وقت کے پر تیز ہیں، مستقل مزاجی نہ کہ ہچکچاہٹ کے ساتھ آؤ۔
موت سے ڈرنا کیوں۔ وہ کہتے ہیں جن کو وہ موت نصیب ہوتی ہے جو بہادر کی موت ہے
شمال اور مغرب سے آتی ہوئی ہوا صُورِ اسرافیل پھونک رہی ہے
اس آواز میں عالم گیر تخریب کی دھن نہیں بلکہ وہ بھیر دیں سے ملک کو بیدار کر رہا ہے اپنے پاؤں کے نیچے تمام بندھنوں اور محنت کے جالوں کو توڑ ڈالو اور ان کو پاؤں کے نیچے کچل ڈالو اور آگے بڑھو۔
یہ آنسو کیوں۔ یہ وقت ایک نیا دَور لانے کا وقت ہے۔ رنگیں ہجاؤ جھنڈے کو بلند کرو اور آگے بڑھو؟

ایک گیت کی ٹیپ یہ تھی :۔

گاندھی قیدی ہو سکتا ہے مگر سچائی نہیں ۔

ہزاروں آدمیوں کا جیل جانا ایک غیر معمولی بات تھی ۔ نذرل نے ان جیل جانے والوں کی تعریف اس طرح کی :۔

شفق شام کے ہنگام میں یہ کیا سن رہا ہوں ۔
قیدیوں کی گونجتی ہوئی زنجیروں میں میں آزادی کا شور سن رہا ہوں
آزادی کی ہنسی ہنسنے والے یہ قیدی کون ہیں ۔
ان کے آزاد دلوں میں خوف کا نام ونشان نہیں ۔

پوری نظم کا آہنگ ایسا ہے جیسے ملک کی آزادی کی طرف ہم قدم چلنے والوں قیدیوں کے قدموں کی خوش آہنگ چاپ ۔

اس کے بعد جلد ہی نذرل کے متعدد نظموں اور گیتوں نے وقت کے ابھرتے ہوئے جذبات کی ترجمانی کی ۔

نذرل کو سماجی مکروفریب اور تعصب کا خود اپنی زندگی کے واقعات سے تجربہ ہوا تھا ۔ اس کے نتیجے کے طور پر اس نے بہت سی نظمیں لکھیں جن میں سب سے زیادہ مشہور "ذات پات کی حرام زدگی ہے"۔

یہ سب ذات پات کے نام پر بدمعاشی ہے ۔ تم ذات پات کے تاجر یہ جوا کھیل رہے ہو ۔ تم کہتے ہو کہ اگر میں تمہیں چھولوں تو تم نیست ہو جاؤ گے ۔
لیکن ذات بچے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا نہیں جو کھو جائے گا ۔

یہ نظم اسی طرح چلتی ہے ۔ ذرا سنجیدگی کے ساتھ نذرل نے ایک نظم کہی جس کا عنوان ہے ستیہ منتر یعنی سچائی کا منتر ۔

تمہاری کتابوں کے ممنوعات (احکام) جل جائیں ۔ صرف خدا کے حکم جاری رہیں

اس طویل نظم کا اختتام یوں ہے

چلیے ، بدھ ، کرشن ، محمد ، اور رام سمجھتے تھے کہ انسان کیا اور اس کی قیمت کیا ہے ۔ انہوں نے ان کو اپنے دل میں جگہ دی جس سے انسان نفرت کرتے تھے ۔ اب گاندھی وہی گیت گا رہا ہے ۔ تم انسان کے دشمن ہو تمہاری آنکھوں نے ابھی اس

دانائی کو نہیں دیکھا
اس خدائے مطلق کے احکام جاری ہونے در

یہ نظمیں اور ان کے ساتھ ایک لمبی مذہبی نظم فاتحہ دواز دہم اور دوسری لمبی نظم طوفان ایک کتاب وش بنسی (زہر کی بنسی) میں چھپی تھیں۔ اسے حکومت نے ضبط کر لیا تھا۔ نذرل نے اس زمانے میں اپنے محبوب اور نزدیکی ہستیوں کی محبت میں سرشار ہو کر کچھ غزلیں بھی کہی تھیں

ادبی زندگی میں اپنا مقام بنانے کے بعد نازل نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ اور سیاسی صحافت کے ساتھ رشتہ قائم کیا۔ اس نے مظفر احمد کا ایک اور روزنامہ قائم کرنے میں مدد کی۔ انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے اردو اخبار الہلال اور البلاغ کے منیجر مسٹر قطب الدین کی مدد حاصل کی لیکن ان کے مشورے پر چلنے میں ناکام رہے کہ ابتدا میں ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا جائے۔ اس کے برعکس انہوں نے یک روزنامہ جاری کرنے کے لئے ایک کمپنی قائم کی۔ لیکن اسکے بہت تھوڑے حصے بک سکے در یہ پلان انہیں ترک کرنا پڑا۔

نذرل کی پہلی کتاب ۱۹۲۲ء کے آغاز میں شائع ہوئی یہ نظموں کا مجموعہ نہیں تھا بلکہ کہانیوں ی شکل میں شاعرانہ نثر کا مجموعہ تھا۔ بیا تھار دان (بحقہ غم) نامی کہانی جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ بنگیہ مسلمان ساہتیہ پترکا میں شائع ہوئی تھی یہی نام ان کی پہلی کتاب کا تھا۔ رکیتر بیدنا ظلوموں کا دکھ درد) بھی کہانیوں کا ایک مجموعہ تھا جو بعد میں شائع ہوا۔ اس وقت نذرل کا م موجودہ مشرقی پاکستان کے مقام کومیلا میں دیر تک رہا یہاں انہوں نے اور نظموں کے علاوہ ، پرالا لاش، ایک سیلاب کی آمد تحریک عدم تعاون کے جوش وخروش سے متعلق لکھی لیکن بعض ں کا خیال ہے کہ یہ روسی انقلاب سے متعلق ہے۔ کومیلا سے نذرل کو بنگالی روزنامہ سیوک میں لکھنے لئے واپس بلایا گیا۔ اس اخبار کو مولانا محمد اکرم خاں چلاتے تھے جو ایک ادیب بھی تھے اور کانگریسی بھی مگر بی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔ جس وقت نذرل سیوک کے لئے لکھ رہے تھے۔ انہوں نے ہفتہ وار اخبار دھوم کیتو (دمدار ستارہ) قائم کیا اس کا پہلا شمارہ ۱۲ راگست ۱۹۲۲ء کو ئع ہوا۔ پہلے شمارے میں رابندر ناتھ ٹیگور کی آشیرواد شائع ہوئی تھی۔ (اقتباس)

(قاضی نذر الاسلام۔ ناشر: نیشنل بک ٹرسٹ ۱۹۶۱ء)

محمد مجیب

جس راہ پر چلتے ہم سب ڈرتے ہیں

ہر سرکار کا بنیادی کام یہ ہے کہ قانون اور امن کو بحال رکھے۔ بدقسمتی ہے کہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے اس ملک میں اس کا شدید احساس نہیں ہے سرکاری افسر تشدد کو روکنے کے لئے مضبوط قدم نہیں اٹھاتے اس لئے کہ ان کو یقین نہیں کہ سیاستداں اور وزیروں پر اس کا کیا ردعمل ہوگا، نیز میری رائے میں کوئی بھی وزیر مضبوط فیصلہ لینے کو تیار نہیں، کیونکہ اس کو خوف ہے کہ وہ دوبارہ چنا جائے گا یا نہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ وہ اپنے عقیدے کے مطابق جراءت مندانہ اقدام کرنے میں قاصر ہیں۔

عوام کے اندر قانون کی رقعت کم ہو جاتی ہے جب اس پر عمل نہ کیا جائے۔ مثال کے طور پر دلی میں کافی تعداد میں ایسی موٹریں ہیں جن کے موٹر پلیٹ ہندی میں ہیں۔ اگر قانون کے مطابق صرف بین الاقوامی ہندسے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن سرکار کو قانون پر عمل درآمد کرانے کی جراءت نہیں۔

فرقہ وارانہ دنگوں کی بابت میں جے پرکاش نارائن سے اتفاق کرتا ہوں کہ اقلیتی فرقہ میں کوئی ایک ایسا گروہ ہوتا ہے جو فرقہ وارانہ جھگڑوں کا احساس نہیں رکھتا ہو لیکن میں یہ ثابت نہیں کر سکتا۔ اگر جے پرکاش نارائن یہ کہتے ہیں تو اس میں کچھ اصلیت ضرور ہوگی۔ فرقہ وارانہ منافرت کی صرف یہ ایک وجہ نہیں ہے۔ سیدھی اور سادہ حقیقت یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان اس احساس سے اوپر نہیں اٹھ سکتے ہیں کہ وہ ہندو اور مسلمان نہیں ہیں۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم سیکولر ریاست ہیں۔ اس کو ثابت کرنے کے لئے اور ہر

عرب میں گائے ذبح نہیں ہوتی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ ہندوستان میں گاؤکشی کب آئی لیکن یہ مصیبت گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے ہے۔

فرقہ کے تحفظ کے لئے ہمارے لیڈر سب فرقوں کے تہواروں میں شریک ہوتے ہیں لیکن اس سے فرقہ وارانہ مفاہمت نہیں بڑھتی۔ آج تو یہ ہے کہ فرد کی پہلی وفاداری اپنے فرقہ سے ہے اور پھر ریاست سے۔ ہر مسلمان اپنے فرقہ کا ممبر ہے، قومی ہم آہنگی افراد کے درمیان ممکن ہے فرقوں کے درمیان نہیں۔ پھر بھی اگر کوئی رجحان کے درمیان دیوار گرانے کی کوشش کرتا ہے تو سرکار خود اور فرقے اس کی مخالفت کرتے ہیں تب یہ کون کہنے کو تیار کہ ہم محض افراد ہیں اور مختلف فرقوں کا مفاد صرف ایک بہانہ ہے۔

لیکن اکثریتی فرقہ کو یہ فائدہ ہے کہ ان کے فرقہ کی وفاداری غلط روش سے بھی ریاست کی وفاداری سے تصور ہوتی ہے۔ اگر یہی بات اقلیتی فرقہ کے افراد کریں۔

اس معنے میں کہ وہ ایک فرقہ ہیں تو یہ تصور کیا جاتا ہے کہ یہ ریاست کا غیر وفادار ہے۔ اس صورت میں یہ خواہش کی جاتی ہے کہ بغیر فرقہ کے ریاست سے وفاداری کی جائے۔ ہم ایک ساتھ یکجہتی اور اس کے برعکس عمل کیسے کر سکتے ہیں!

میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ فضا میں خوشگوار تبدیلی لانے کی ذمہ داری اکثریتی فرقہ کی ہے۔ لیکن ذاتی مفاد راہ میں رکاوٹ ہے۔ راج دھانی میں کئی کالج ہیں جو اقلیتی فرقہ کے استادوں کو ملازم نہیں رکھتے۔ مہاراشٹر میں مسلم آبادی ۸ فیصدی ہے لیکن سرکاری ملازمت میں صرف ڈیڑھ فیصد ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اکثریتی فرقہ عمل سے اقلیتی فرقہ میں اعتماد بحال نہ کرے اگر ضرورت ہو تو تھوڑا سا اپنا مفاد قربان کرے۔

میرے خیال میں ہندو مسلمانوں کی تفریق کی سب سے بڑی وجہ گائے ہے۔ میں جب یہ سمجھ سکتا اگر گایوں کا ایک خاص نمبر ہوتا . . . .

. . . . — یعنی ۱۵ یا ۲۰ یا سو جو مقدس ہوتیں۔ لیکن جب میں سڑک پر کمزور نحیف گایوں کو آوارہ غیر محفوظ چلتے پھرتے دیکھتا ہوں تو ان کی تقدیس کتنے ہندو دلوں میں شک ہوتا ہے۔

اسی طرح مسلمانوں نے بھی گاؤکشی پر اسی لئے ضد کی کہ اس سے ہندو ناراض ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ گائے کشی اسلام میں ضروری نہیں۔ اس لئے کہ

حفیظ بنارسی

غزل

بے نیازی دلِ عاشق کا جو کردار بنے
حُسن خود عشق کی بانہوں کا طلبگار بنے

منزلِ دار و رسن آئی تو رو پوش ہوئے
لوگ پھرتے تھے حقیقت کے پرستار بنے

لٹ گئی آبروئے فصلِ بہاراں اے دوست
بوالہوس جب سے گلستاں کے نگہدار بنے

شرط ہے جذبِ براہیم کا پیدا ہونا
شعلہ زار آج بھی رشکِ گل و گلزار بنے

پھر گلستاں کی حفاظت کا سوال اُٹھا ہے
پھر ہر اک شاخ کو لازم ہے کہ تلوار بنے

دیکھنا جرم نہیں ہاں مگر اس شرط کے ساتھ
تیرا اندازِ نظر حُسن کا معیار بنے

ابرِ باراں بھی ہے ساقی کا اشارہ بھی حفیظ
کون ایسے میں تقدس کا گنہگار بنے

[illegible] صفحہ ۳۹)

دیویندر ستیارتھی

جوت سے جوت جلے

کروٹ بدل کر وہ کھڑکی کے باہر جھانکنے لگا جہاں پورنماشی کے چاند نے اپنی باہیں پھیلا رکھی تھی جیسے اس سے پوچھ رہا ہو —— ہاں جناب اتنا تو بتا دیجیے اگر آپ کے ہاتھوں میں تھوڑا دام آ جائے تو کون سی تصویر بناؤ گے ؛ —— آج وہ کہنا چاہتا ہے کہ یہ کیسا سوال ہے ؟ جب تک تصویر بن نہیں جاتی اس بارے میں کچھ بھی کہنا بے کار ہے

اُسے یہ چاندنی بھی آج کیوں نہیں اچھی لگی۔ درد کے مارے آج اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ پھر بھی جیسے کوئی اس کے کان کے قریب منہ لگا کر کہہ رہا ہو —— "تصویر کا موضوع تو پہلے سے بتانا ہوگا ۔جناب! آخر ہمیں بھی تو علم ہو کہ اتنی تصویریں بنانے کے بعد وہ کون سی تصویر ہے ، جسے تیار کرنے کی خواہش ابھی تک کلاکار کے دل میں انگڑائیاں لے رہی ہے ۔" قدرے گھبرا کر وہ پھر کروٹ بدل لیتا ہے جیسے وہ کہنا چاہتا ہو کہ اب مجھے پورنماشی کے چاند سے کچھ غرض نہیں رہی جیسے پورنماشی کی چاندنی بھی اس کے منہ پر سوئیاں سی چبھو رہی ہو۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اپنی تصویروں میں پورنماشی کے چاند کو تو ہرگز نہیں آنے دیگا

اس کے دل کے کسی کونے سے جیسے تنہائی کی کوئی لے ابھر کر کہتی ہے " کہیے جی ! میری تصویر بناؤ گے ؟"

سر اٹھا کر وہ ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کرتا ہے ۔ —— کوئی نہیں ، کمرے میں تو کوئی بھی نہیں —— پھر بھی اس کے دل میں متواتر یہی خیال آ رہا ہے کہ یہ سوال ضرور کسی کے ہونٹوں سے ابھر کر اس کے کانوں تک پہنچا ہے

کتنا درد ہے اس لے میں ارے یہ تو شہنائی پوچھ رہی ہے کہیئے جی! میری تصویر بناؤ گے ـــ شہنائی کو یہ سوال کرنے کی کیوں کر جرأت ہوئی، اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے اُسے یاد آیا کہ بچپن ہی سے اُسے شہنائی کے سروں سے محبت رہی ہے۔ اس لئے تو آج شہنائی میں یہ جرأت پیدا ہوئی کہ کلاکار کے کانوں کے قریب منہ لگا کر وہ سوال پوچھ سکے۔

شہنائی کے سُر ـــ عنوان تو بُرا نہیں، وہ سوچتا ہے۔ کیونکر نقش کیا جائے ان سروں کو سچ مچ یہ تصویر بہت اعلیٰ ہوگی، آج کے دور کی مکمل جھلک، شہنائی کے سروں میں دکھائی جا سکتی ہے بس ایک بار تو دیکھنے والے کا دل رُو اٹھے۔ یہ کیسا چہرہ ہے جو اس کے سامنے آرہا ہے، ارے یہ تو ایک لڑکی کا چہرہ ہے جسے زبردستی کسی کے ساتھ باندھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ارے کیا، یہی مثال مل سکتی تھی آج کے پورے دور کو ظاہر کرنے کے لئے شہنائی بولو ـــ اب تم چپ کیوں ہو بس تم یہی ہو، بس اتنا ہی ہے تمہارا اثر، یہی ہے تمہاری ٹیس، یہی ہے تمہارے درد کی گہرائی ؟ ـــ اور وہ اسی سوچ میں کھو جاتا ہے۔ اچانک شہنائی کے سروں کا دھیان آتے ہی آج اس لڑکی کا چہرہ آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے ساری دنیا کا ڈر بھی اس لڑکی کے چہرے میں آکر سمٹ گیا ہو۔ یہ کیسا درد ہے ایسے خوبصورت چہرے پر، یہ الم کی لکیریں کہاں سے آگئیں اور پھر ادھر سے اپنا دھیان ہٹا کر مریض سوچنے لگتا ہے کہ وہ اس سے کہیں اعلیٰ تصویر بنا چکا ہے اس کی تصویریں کتنی ہی نمائشوں میں رکھی گئیں، تصویری مجموعوں میں شامل کی گئیں آئندہ نسلیں میرے برش کو نہیں بھلا سکیں گی اور لوگ سوچا کریں گے، کہ کیسا تھا وہ کلاکار، جس نے یہ سب تصویریں بنائیں اس کی بائیں پسلی میں ایک بھیانک درد اٹھتا ہے۔ مریض چاہتا ہے کہ ذرا کروٹ بدل کر درد کو دبانے کی کوشش کرے لیکن یہ درد تو ایک لہر کی طرح اٹھ رہا ہے جیسے آج ہی اس کی زندگی کو ختم کر کے چھوڑے گا۔ یہ درد؟ آہ! کوئی ہے جو اس درد کو پل کی پل روک دے۔ کوئی نہیں یہاں کوئی نہیں۔ اندر آتے نہیں دیا جائے گا باہر کے آدمیوں کو کیونکہ ڈاکٹر کا یہی حکم ہے اور اندر کے آدمیوں کو یہ فکر نہیں، کہ مریض کے پاس رہیں

پھر اس ہر گھڑی کی پرانی بیماری سے اندر آنے والے تنگ تو آہی جاتے ہیں نہ جانے یہ بیماری کب ختم ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب تو یہ جان کے ساتھ ہی ختم ہوگی۔

اب تو سونا چاہیئے مریض کروٹ بدلنے کی کوشش کرتا ہے، چاند کی طرف سے منہ پھیر لینا ہی ٹھیک رہے گا۔ چاند کا تو کام ہے بے کار چمکے چلے جانا، جیسے کلاکار ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری اور پھر چوتھی تصویر بناتا چلا جاتا ہے ــــ آخر یہ سب کچھ کس لئے؟ ـــــــــــــــ سرجن کا یہ لالچ کبھی ختم بھی ہوگا۔ کیا (سرجن) کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے ہوئے انسان کو کبھی چین بھی مل سکے گا۔ چین تو دور کی چیز ہے۔ کاش تھوڑی دیر کے لئے نیند ہی آجاتی۔ یہ چاند کی کرنیں تو آج سوئیوں کی طرح چبھ رہی ہیں۔ کہتے ہیں جب موت نزدیک آجاتی ہے تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ چاند کو مخاطب کرتے ہوئے مریض کہنا چاہتا ہے:" چاند میاں! تجھے بھی آج ہی یہ بات سوجھی، کہ مریض کو ستایا جائے اتنا ہی سوچ لیا ہوتا کہ میں نے ان گنت تصویروں میں تیری شکل اتاری ہے۔ تجھے چین اور سکھ کا مجسمہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور آج تو مجھ کو ہی ستا رہا ہے"

مریض چاہتا ہے کہ کسی کے پیروں کی آہٹ ہی سنائی دے جائے۔ اٹھ کر وہ چھوٹی میز کی طرف ہی دیکھتا ہے جس پر پانی سے بھرا ہوا شیشے کا جگ چینی کی پلیٹ سے ڈھکا رکھا ہے۔ اونہہ اتنا بڑا جگ، اتنا پانی جیسے کوئی بیمار رات کی رات میں اتنا پانی پی ہی تو جائے گا۔

اب کوئی نہیں آئے گا۔ وہ دیکھتا ہے کہ شیشے کے جگ کے قریب ہی دوائی کی شیشی بھی رکھی ہے۔ بڑی ہمت سے اٹھ کر وہ شیشی کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے اور نزدیک پڑی ہوئی پیالی میں شیشی سے دوا انڈیل کر حلق میں اتار لیتا ہے کڑوی کسیلی ہوئی ـــــ اب تو سونے کے سوائے کوئی کام نہیں رہ گیا۔ اب کوئی نہیں آئے گا، کوئی دروازے پر دستک نہیں دے گا۔ فوراً ہی اُسے خیال آتا ہے کہ کوئی بھی نئی تصویر بنانے سے پہلے اسے ہمیشہ یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کوئی اس کے دماغ پر دستک دے رہا ہو ــــ اب تو رنگوں کو چھوئے ہوئے بھی بہت دن ہوگئے، پرشش بھی سوچتا ہوگا کہ بس ختم ہوگیا کلاکار کا فن۔ کسی نمائش میں اس کی

نئی تصویریں دیکھنے کو نہیں ملیں گی۔ جیسے اس کے دماغ پر کسی نے مکا دے مارا ہو، اے بوڑھے کلاکار جاؤ دنیا سے رخصت ہو جاؤ۔ جیسے کوئی اسے ہی مخاطب کر رہا ہو۔ بڑی دیر تک چلا چکے۔ اپنی انا کی تسلی کر چکے۔ اب جاؤ اب تو نیا زمانہ آ گیا ہے۔ نئے نئے کلاکار میدان میں آ چکے ہیں، اب نمائشوں میں لوگ نئے اسلوب کی تصویریں ہی زیادہ پسند کرتے ہیں۔۔۔۔ آج تم اپنی تصویر وہاں بھیج بھی دو، تو چاہے عقیدت کے مارے اس کی تعریف کر دیں لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ ارے یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ میرے کان میں یہ تیر کون چلا رہا ہے۔ تو کیا میرا یہ طویل اور بھرپور آرٹ واقعی بے کار گیا؟ کیا واقعی آج کو میری ضرورت نہیں رہی۔۔۔۔ مریض تھوڑی دیر کے لئے مطمئن ہو کر پھر سے کچھ سننا چاہتا ہے۔ کہو کہو آرام سے تم اپنی بات کرو۔ سچی تنقید تو بہت مفید رہتی ہے۔ ہائیں کیا کہا؟ ذرا صاف صاف کہو نا؟ تمہیں پوری آزادی ہے، لیکن کوئی بھی آواز سنائی نہیں دیتی چاند کی کرنیں قدرے تسکین دینے لگی ہیں۔ پورنما کا چاند آخر مہربان ہی نکلا، تیر انداز بھی دماغ کے کسی کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ شاید اسے بھی کسی طرح خیال آ گیا ہو کہ ناحق اس بوڑھے کلاکار پر تیر چھوڑنے سے فائدہ! بس یہی سوچتے سوچتے مریض نیند کی لہروں پر بہہ گیا۔

اگلی صبح مریض کی آنکھ اس وقت کھلی جب سورج کافی اونچا اٹھ آیا تھا، سچ سچ آج اس کی آنکھ کھلی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اسے کسی نے بڑی طرح جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو۔ لیکن کمرے میں تو وہ تنہا ہی پلنگ پر پڑا تھا۔ جیسے اس کے دماغ میں کوئی بار بار کہہ کہہ رہا ہو ــــ اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ، یوں پڑے پڑے ایڑیاں رگڑنے سے کیا فائدہ؟ مرنے سے پہلے تمہیں آخری تصویر بنانے کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔

دیا سلائی جلا کر اس نے سگریٹ سلگایا، اور سوچا۔ ہاں مجھے اپنی آخری تصویر بنانے کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔ کہاں پڑے ہیں میرے رنگ، کہاں ہے میرا برش۔ پھر مریض خود ہی ان سوالوں پر ہنس دیتا ہے، وہ کہنا چاہتا ہے، کہ دوسرے انسانوں کی طرح کلاکار بھی پیدا ہوتا ہے اور مرجاتا ہے، پھر بہت جلد اسے بھلا دیا جاتا ہے، یہ اور بات ہے کہ مرنے سے پہلے وہ یہ سوچتا ہے کہ کچھ نئے

والی نسلیں اسے ہمیشہ یاد رکھیں گی۔ اس لانچ میں کیا رکھا ہے۔ سورج کی کرنوں کی طرح چمکتی رہو بس یہی کافی ہے کہ ہماری دیکھ بھال میں دم نکل جائے۔ اوہ! اب ہاتھوں میں اتنا دم کہاں کہ پھر سے برش اٹھا کر تصویر بنانے کی بات سوچوں۔

سگریٹ کا کش لگانا بھی آج آسان نہیں رہا۔ مریض کے چہرے پر سگریٹ کا دھواں گول دائرے ہو کر چکر لگاتا ہے۔ جیسے یہ دھواں بھی کہہ رہا ہو۔ اب سمجھ لو کہ آخری سگریٹ ہے۔ کیونکہ اب ایک مزے کا کش لگانا ہمارے بس کا روگ نہیں رہا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی، مریض نے خالی نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھا اور اس کے منہ سے ایک لفظ نکلا... کون؟"

"میں ریکھا" کہتے ہوئے ایک نوجوان لڑکی اندر آئی۔

"آخر تمہیں میرا خیال رہتا ہے نا؟ ریکھا!" مریض نے پلٹ کر کہا "میں جانتا ہوں کہ تم میری خدمت کرتے کرتے تنگ آگئی ہو، اس لئے میں کہتا ہوں..."

"کیا کہتے ہو بڑے دادا!" ریکھا نے پاس آکر مریض کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھ لیا۔

"یہی کہ اب میں اس دنیا سے رخصت لے لوں۔"

ریکھا کے چہرے پر پریشانی کا رنگ گہرا ہو گیا۔ بولی ایسا بول منہ سے نہ نکالو بڑے دادا! بھگوان ہم سب لوگوں کی عمروں میں سے ایک ایک گھنٹہ کاٹ کر آپ کی عمر ضرور لمبی کر سکتے ہیں اور وہ اس لئے کہ آپ اپنی آخری تصویر بنا سکیں۔ کیا میں جھوٹ کہتی ہوں؟"

مریض ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگانے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا ہے "یہ تمہارا وہم ہے ریکھا! اب وقت نہیں رہا کہ میں رنگوں سے کھیل سکوں"

ریکھا اٹھ کر کمرے سے دوائی کی شیشی اٹھا لاتی ہے۔ اور پانی میں تھوڑی سی انڈیل کر مریض کے پاس آتے ہوئے کہتی ہے "اٹھو بڑے دادا! دوائی پی لو، میرا دل کہتا ہے کہ آپ اچھے ہو جائیں گے"

مریض اٹھنا نہیں چاہتا۔ مگر یہ سوچ کر دوائی پلائے بغیر نہیں مانے گی۔

قدرے اچک کر دوا کی پیالی سے حلق میں دوائی انڈیل لیتا اور پھر سے پلنگ پر لیٹ جاتا ہے۔

"کیا کھاؤ گے بڑے دادا؟"

"کچھ بھی نہیں ریکھا۔"

"کیوں!"

"بس منہ کے ذائقہ کا یہی تقاضہ ہے ریکھا!"

"پھر بھی کچھ تو کھانا ہی ہوگا بڑے دادا۔ میں سچ کہتی ہوں کہ ایک بار تو آپ کو رنگوں کو چھونا ہی پڑے گا" یہ کہتے ہوئے ریکھا نے مریض کے سرہانے کی طرف پڑے ہوئے بسٹ کو (BAST) دیکھا اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کا غرور جھلک رہا تھا۔ وہ کہنا چاہتی تھی۔ کہ جہاں یہ ایک حقیقت ہے کہ کلاکار کو اس کے دلیش باسیوں نے پوری طرح نہیں پہچانا۔ وہاں یہ بھی سچ ہے کہ اس کی شخصیت.... آنے والے دور کے آرٹ پر اور بھی گہری ہوتی جائے گی۔

کیا سوچ رہی ہو ریکھا!" مریض نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا تھوڑا سا دودھ لے آؤ!"

ریکھا کا چہرہ کھل اٹھا۔ جیسے اسے یقین ہوگیا کہ مریض بہت جلد اچھا ہو جائے گا۔ اچھل کر اندر گئی اور دودھ لے کر آگئی۔ بولی اٹھو۔ بڑے دادا! آج تمہاری بیماری کا آخری دن ہے۔"

مریض نے اٹھ کر دودھ کی پیالی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کے چہرے پر مایوسی کی لکیریں برابر پھیل رہی تھیں۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ ہو سکتا ہے، یہ دودھ کی آخری پیالی ہو۔ جسے میں پی رہا ہوں اس کے تصور میں وہ سب ہی تصویریں گھوم گئیں۔ جنہیں اس نے وقتاً فوقتاً اپنے برش کے ذریعہ منقش کیا تھا۔ اور جیسے وہ تصویریں کہہ رہی ہوں "ہمارا اسلام قبول کرو، ہم تمہیں کبھی نہیں بھولیں گی"

دودھ پی کر مریض پھر پلنگ پر لیٹ گیا۔

ریکھا اٹھ کر الماری سے وہ تصویر نکال لائی، جسے بڑے دادا نے بیمار ہونے سے پہلے شروع کیا تھا۔ وہ دیر تک اسے دیوار گیر پر رکھ کر گھورتی رہی اسے یاد

تھا کہ کس طرح اسے بڑے دادا نے گتے پر سکیچ چڑھایا تھا اور پھر ریکھا سے کہا تھا۔ اگر تم کہو تو تمہیں اپنی اس تصویر میں لافانی کر دوں ؟" سچ مچ ریکھا نے اسے بڑے دادا کا مذاق ہی سمجھا تھا لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی تھی۔ جب بڑے دادا نے اسے سامنے بٹھا کر پنسل سے اس کے تین نقش تیار کرنے شروع کر دیئے تھے۔ پنسل سے کھینچی ہوئی اس تصویر میں ریکھا سے ملتی جلتی ایک لڑکی کو کھنڈروں میں کھڑے دیکھا گیا تھا وہ کمر سے نیچے تک لٹکتے ہوئے سر کے لمبے لمبے بال، وہی لمبوترہ سا چہرہ آنکھوں میں ایک سوال سا۔ جیسے ریکھا پورے سماج پر زہرخند بنی ہوئی ہو ـــ یہ کھنڈر کیا کہہ رہے ہیں؟ اسے یاد تھا کہ کس طرح دادا نے قسم قسم کے رنگوں سے اس تصویر میں جان ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے اس تصویر پر ہفتوں لگا دیئے۔ ہر شام تصویر کو پانی سے صاف کر دیتے۔ دوسرے دن پھر برش کے ذریعے ان دھندلی لکیروں کو ابھارنے کا جتن کیا جاتا۔ بڑے دادا نے کہا تھا کہ ابھی اس تصویر میں بہت کچھ کرنا باقی ہے، لیکن اس کی آنکھوں کو یہ تصویر موجودہ شکل میں بھی بری نہیں لگ رہی تھی

بڑے دادا کی نظر اچانک دیوار گیر پر رکھی ہوئی تصویر کی طرف اٹھ گئی، انہوں نے اٹھنا چاہا بولے "ریکھا! رنگ اٹھا لاؤ، دیکھیں شاید آج یہ تصویر مکمل ہو سکے"

ریکھا رنگ اور برش اٹھا لائی اور بولی "بڑے دادا! میں نے کہا تھا نا کہ آپ اچھے ہو جائیں گے۔ کیوں کیسے طبیعت ہے بڑے دادا!"

بڑے دادا کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ بولے "معلوم ہوتا ہے بھگوان کی یہی مرضی اسی میں ہے کہ پہلے میں اپنی آخری تصویر مکمل کر سکوں اور اس کے بعد موت میرے لیے دروازہ پر دستک دے"

ریکھا سمجھ گئی فوراً دیوار گیر سے تصویر اٹھا لائی۔ اور بڑے دادا کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولی "یہ رہے رنگ، یہ رہا برش اور یہ رہی تصویر"

بڑے دادا پلنگ پر بیٹھ گئے۔ جیسے ان کا درد، ڈربے میں گھسے ہوئے کبوتر کی طرح سمٹ گیا ہو۔

رنگ اٹھا اٹھا کر تصویر میں لگائے جا رہے تھے۔ ریکھا نے یہ منظر دیکھا۔

وہ کہنا چاہتی تھی کہ یہ تصویر مکمل ہو گئی تو دنیا اسے بڑے دادا کا ماسٹرپیس سمجھے گی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ بڑے دادا کے برش میں تو جادو ہے جادو۔ اس لئے انہوں نے اس کی کشش میں اور بھی خوبصورتی سمو دی ہے۔ نہایت عظمت کے ساتھ آنکھوں میں جیسے اس کے لہو کی بول چال انڈیل دی ہے۔ شاید بڑے دادا نے اُسے کسی کی منگیتر کے روپ میں منقش کیا ہے۔ یہ کھنڈر شاید اپنے منہ سے جنگ کے دنوں کی بربریت کا نقشہ پیش کر رہے ہیں۔ کھنڈروں کے ایک ایک گوشے میں کھڑی ہوئی دوشیزہ شاید اپنے منگیتر کی راہ دیکھ رہی ہے۔ اس کا منگیتر جنگ کے میدان میں مارا جا چکا ہے...... اس نے پلٹ کر ادھر اُدھر دیکھا۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ شاید بڑے دادا کی یہ تصویر جنگ سے پیدا ہونے والی غارتگری کی مظہر ہو۔ اور پھر اُسے دل ہی دل میں جنگ چھیڑنے والوں پر ہنسی آ گئی۔ پہلی بڑی جنگ اور اب یہ تیسری بڑی جنگ کا طوفان اٹھ رہا ہے۔ بڑے زوروں سے۔

بڑے دادا کے ہاتھوں میں نہ جانے کہاں سے طاقت آ گئی تھی۔ جیسے موت نے انہیں تھوڑی سی مہلت دینا مناسب سمجھی ہو۔ ریکھا نرے پیار سے اس تصویر کی طرف دیکھ رہی تھی جس میں دادا برش برابر رنگ بھرے جا رہا تھا۔

اچانک اس کا دل اس خیال سے کانپ اٹھا کہ بڑے دادا ہمیشہ کی طرح آج بھی اس تصویر کو پانی سے نہ دھو ڈالیں۔ اسے بڑے دادا کے اس فعل پر دل ہی دل میں بڑی جھنجلاہٹ ہوئی۔ یہ تو حماقت ہے کہ اتنی محنت سے بنائی ہوئی تصویر کو پانی سے دھو ڈالا جائے۔ یہ سوچتے ہوئے اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دماغ میں کوئی کیل ٹھونک رہا ہو۔ بڑے دادا کے ہاتھ سے تصویر لے کر ریکھا نے کرسی پر رکھ دی۔ رنگ اور برش اٹھا کر ایک اسٹول پر رکھ دیئے اور بولی ـــ تھوڑا سا آرام کر لو بڑے دادا! آج یہ تصویر پوری ہو گئی۔"

"نہیں ریکھا ابھی تو بہت سا کام باقی ہے۔ آج ایک "واش" اور دیا جائے اور کل اسے مکمل کر دیا جائے۔"

"نہیں بڑے دادا!" ریکھا نے چمک کر کہا۔ "آج میں "واش" نہ دینے دوں گی۔ رنگ کا کام آپ خوشی سے کیجئے! لیکن وہ بھی قدرے آرام کے بعد۔"

بڑے دادا پھر پلنگ پر لیٹ گئے اور جلد ہی ان کی آنکھ لگ گئی
دادا کو سوتے دیکھ کر ریکھا بھی باہر چلی گئی

اب مریض کی آنکھ اس وقت کھلی۔ جب سورج ڈھل چکا تھا اس نے تصویر کی طرف آنکھیں گھمائیں لیکن تصویر وہاں نہیں تھی۔ اس نے سوچا ریکھا تصویر لے گئی ہوگی۔ پھر اس نے اسٹول پر رکھے ہوئے رنگ اور برش پر نظر دوڑائی۔ لیکن یہ چیزیں بھی وہاں نہیں انہیں بھی ریکھا اٹھا کر لے گئی ہوگی۔ یہ سوچ کر بڑے دادا کو تھوڑا تھوڑا غصہ آنے لگا۔ وہ کہنا چاہتے تھے کہ ریکھا میں عقل کی کمی ہے۔

تصویر کا خیال ان کے دماغ میں طوفان کی طرح اٹھنے لگا کاش! اس کے ہاتھ میں برش ہوتا سچ مچ یہ تصویر آج ہی مکمل ہوگئی ہوتی۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کا برش آج اپنی منزل کو چھو لیتا۔ یہ بات بچپن ریکھا کو کون سمجھائے! ریکھا مورکھ لڑکی ہے۔ ایک دم پگلی۔ یہ ٹھیک ہے کہ ریکھا نے بڑے دادا کی خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ پڑوس کی تمام لڑکیوں میں وہی ایک لڑکی ہے۔ جس کی نظروں میں آرٹ کی کوئی قیمت ہے۔ آرٹ کی گہرائیوں میں تو خیر وہ کیا پہنچے گی، ہاں بس اسے پسند ہیں اور شاید انسانی کشش میں اسے ایک عظیم سلسلہ سنائی دینے لگتا ہے۔

رہ رہ کر اسے اپنی بھیانک حالت کا خیال آنے لگتا ہے۔ میرے لڑکے کو میری کوئی فکر نہیں ہے۔ نہ جانے کل سے کہاں چلا گیا ہے؟ اسے کچھ خیال ہی نہیں ہے۔ میرا میں یہاں پلنگ پر بڑے بڑے مر جاؤں، جب بھی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ ایسے میں لے دے کر ایک ریکھا ہی ہے جو میری خدمت کر رہی ہے۔

اسے اپنی بیوی کا خیال آیا جو پچھلے سال چل بسی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں کہ نوکر رکھ لے۔ لڑکا پچھلے تین مہینوں سے بیکار ہے۔ اس نے کبھی اچھی اچھی تصویریں بیچ ڈالیں۔ جو بچ گئیں ہیں انہیں بھی اٹھا لے جائے گا۔ یہ سوچ کر اسے قدرے تسکین دی۔ کہ ریکھا وہ تصویر اٹھا لے گئی۔ کیونکہ اس کا لڑکا اگر دیکھ لیتا تو آج ہی لے جا کر بازار میں بیچ دیتا۔

اس نے اُچک کر ریکھا کو پکارا۔ لیکن اس کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرا کر رہ گئی

اسے اپنے لڑکے پر غصہ آنے لگا۔ بدذات کہیں کا! اتنی بھی پرواہ نہیں، کہ گھر میں بیمار بوڑھا باپ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہا ہے۔ کل سے ڈاکٹر بھی تو نہیں آیا۔ سب پیسے کا کھیل ہے، شاید ڈاکٹر کو فیس ملنے کی امید نہیں ہوگی اس لئے کنی کتراتا ہے۔

اس کا جی باہر کے کسی آدمی سے ملنے کے لئے بے طرح للچا اٹھا، مگر پھر اسے خیال آیا کہ ڈاکٹر نے باہر کے آدمیوں سے ملنے کو بھی تو منع کر رکھا ہے۔

وہ کہنا چاہتا ہے کہ اب کوئی نہیں آئے گا اور یہاں پلنگ پر لیٹے لیٹے اس کی جان نکل جائے گی۔

اس نے دوبارہ اچک کر ریکھا کو آواز دی۔ لیکن اب کے بھی اس کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرا کر رہ گئی۔

ایک ایک کر کے اپنی عمر کے واقعات اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ اسے سب سے بڑا صدمہ اس بات کا تھا کہ اس کا لڑکا آرٹ کی دنیا سے کوسوں دور تھا۔ اس نے بہت چاہا کہ اس کا لڑکا برش پکڑ کر رنگوں کی مشق کرنے لگے لیکن اس نے لے دے کر بس مشق کی کہ باپ جو تصویریں بنائے وہ انہیں چوری چھپے اٹھا کر بازار میں اونے پونے بیچ آئے۔ کوئلوں کے بھاؤ اشرفیاں لٹاتے ہوئے اسے شرم نہیں آئی اور آج وہ گھر سے غائب ہے۔ جبکہ بیمار باپ موت کی راہ دیکھ رہا ہے۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ پلنگ کے نیچے کوئی گھس ہوا ہے۔ کئی طرح کی آوازیں نکال نکال اس نے کتے کو بھگانے کی کوشش کی۔ لیکن کتا پلنگ کے نیچے سے نہ نکلا۔

اس کے جسم میں کمزوری کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ کوشش کرنے پر وہ پلنگ کے نیچے نہ جھانک سکا۔

اس نے ریکھا کو آواز دی۔ ریکھا کا کہیں پتہ ہی نہیں تھا۔

بڑی ہمت سے وہ پلنگ پر اٹھ بیٹھا۔ اور پلنگ کے نیچے جھانکتے ہی اس نے جو منظر دیکھا۔ اس سے وہ دنگ رہ گیا۔

"باہر نکل، بندر کے بچے!" — وہ چلایا۔

پلنگ کے نیچے بندر کا بچہ نہیں تھا۔ خود بندر تھا۔ جو ہمیشہ اسے تصویر بناتے دیکھ کر اس کے پاس آکر بیٹھتا تھا۔ آج وہ خود تصویر بنا رہا تھا۔ نہ جانے وہ کب کمرے

میں گھس آیا تھا اور کرسی سے اٹھا کر تصویر پلنگ کے نیچے لے گیا تھا اسٹول سے ، رنگ اور برش اٹھاتے وقت ذرا بھی آہٹ نہیں ہونے دی تھی ۔

پلنگ سے اتر کر بڑے دادا نے بندو کو نکالا ، اور تصویر کو ہاتھوں میں لے کر دکھی دل سے اسے گھورنے لگے ۔ جگہ جگہ سے کئی رنگ بری طرح پوت دیئے گئے تھے ۔ ریکھا کی شکل پہچانی تک نہیں جاتی تھی ۔ بندو چپ چاپ کھڑا تھا اور اسے سچ مچ ایک بہت بھاری چپت کا انتظار تھا ۔

ایک لمحے کے لئے جیسے بڑے دادا کے دل سے برسوں کا بوجھ اتر گیا ۔ کیا ہوا اگر میرا اپنا لڑکا مجھ سے آرٹ کی رین لے کر کلاکار نہیں بن سکا ۔ کیا ہوا ۔ اگر میرے لہو میں رچا ہوا فن ہماری خاندانی روایت نہیں بن سکا ۔ ۔ ۔

بڑے دادا نے اسے گود میں اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا : " وارے بندو بلیا ! جوت سے جوت جلے ۔ ۔ ۔ "

("منتخب ادب" مرتبین : سید احتشام حسین ، غلام ربانی تاباں ، صفحات ۴۷۸ ، مجلد ، سائز $\frac{18 \times 22}{8}$ قیمت ۶/- حوالہ صفحات ۲۰۹ تا ۲۱۹)

نئی مطبوعات

موازنہ انیس و دبیر (ادبی)، مرتبہ: رشید حسن خاں نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۳/۲۵
(لائبریری اڈیشن) ۴/۲۵

لیکن کتاب اچھی ہے (طنز و مزاح) جاوید حبیب ٹونکی ٹونک، قافلہ پبلیکشنز ۱/۵۰

راستے بھی چلتے ہیں (افسانے) سلطان سبحانی مالیگاؤں مکتبۂ اردو ۲/۵۰

موجِ نشاط (شعری مجموعہ) خوشتر بھساولی بھساول، عثمانیہ بکڈپو ۲/-

تاریخِ کوکن (بچوں کے لیے) ڈاکٹر مومن محی الدین بمبئی ۹، نقش کوکن پبلیکشن ۱۰/-

چاچا نہرو (بچوں کے لئے) ریاض آفندی " " " " " ۱/-

بزنس گائیڈ مرتبہ " پرواز پبلیکشنز ۳/-

نازو (ناول) رئیس احمد جعفری دہلی، اشتقاد پبلشنگ ہاؤس ۶/-

گہرے کا چاند (ڈراما) ڈاکٹر محمد حسن " شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی ۳/-

اردو میں وہابی ادب خواجہ احمد فاروقی " " " " " ۲/-

سوویٹ روس مصنفہ: جواہر لعل نہرو مرتبہ: عتیق صدیقی نئی دہلی، نہرو انسٹی ٹیوٹ ۸/-

تذکرۂ شعراء حجاز اردو مولانا امداد صابری دہلی، مکتبہ شاہراہ ۱۲/-
(ڈی لکس اڈیشن) ۲۰/-

معمار وطن (گاندھی جی کو خراج عقیدت) مرتبہ اوج بدایونی بدایوں انجمن فوق الادب ۲/-

جہان کے دشمن (جاسوسی) اکرم الہ آبادی دہلی، سٹار پبلیکشنز ۲/-

وزیروں کا کلب (ناول) کرشن چندر دہلی، سٹار پبلیکشنز ۲/-

پتھر کے ہونٹ " گلشن نندہ " " " ۲/-

نیلما " عادل رشید " " " ۲/-

شکایت " راج ونش " " " ۲/-

تماشہ " عارف مارہروی " " " ۲/-

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

جائزے

"سائے کا سفر"

(سن اشاعت ۶۹ء)

مصنف: عوض سعید سائز: $\frac{20 \times 30}{16}$ قیمت -/۴

ناشر: نیشنل بک ڈپو
مچھلی کمان حیدر آباد

یہ مصنف کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ: "سائے کا سفر کی بیشتر کہانیوں کے کردار اسی معاشرے کی پیداوار ہیں جس میں آپ ہم سانس لے رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ زندگی لمحہ بہ لمحہ تیزی سے بدلتی جارہی ہے مادّی زندگی کی ترقیوں نے جن قباحتوں اور خوبصورتیوں کو جنم دیا ہے اور افسانہ نگار جن مشاہدات اور تجربات سے دوچار ہوا ہے، یہ کہانیاں انہیں کی تفسیر ہیں۔ خارجی عوامل اور محرکات کی تبدیلی کا عکس ان کہانیوں کے طرزِ اظہار اور تکنیک میں دیکھا جاسکتا ہے"۔

عوض سعید کردار نگاری کی طرف متوجہ نظر آتے ہیں۔ ان کے بیشتر کردار دوہری شخصیتیں ہیں۔ ان کی زندگی مختلف اور متضاد کیفیتوں کی مالک ہے، لیکن اس صورتِ حال نے انہیں ذہنی مریض بنا کر نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ وہ ایک "شخصیت" بن کر اُبھرتے ہیں۔ عوض سعید کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے کرداروں کو "انفرادیت" عطا کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں کسی ماورائی یا آفاقی تصویر کی لپیٹ میں آنے نہیں دیا ہے، وہ نہ کوئی نمونہ ہیں اور نہ کوئی معیار، لیکن پھر بھی وہ وہی کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اُن کی زندگی کا تضاد بڑا حقیقی ہے۔ عموماً وہ اپنے کردار وں

کے بالکل سرسری تعارف سے کہانی کا آغاز کرتے ہیں۔ پھر واقعات ایک بھرپور شخصیت سامنے لاتے ہیں۔

عوض سعید اپنی پہلی کہانی 'خون صد ہزار انجم' کے آغاز پر اس کہانی کے کردار بہاری سے یوں متعارف کراتے ہیں کہ یہی کیا کم تھا کہ وہ میرا دوست، جس کے ساتھ رہتے ہوئے میں نے ہمیشہ ذہنی تکلیف محسوس کی اور وہ کمینہ میری ذات سے ہمیشہ چمٹا ہی رہا۔ لیکن کہانی کے اختتام پر اندازہ ہوتا ہے کہ 'کمینہ' کہنے کا حق انہیں نہیں پہنچتا۔ دوسری کہانیوں کا بھی ہیچ کچھ ایسا ہی ہے لیکن اصلی کردار کا ابتدائی تعارف اپنی معنویت رکھتا ہے۔ اُن کی کہانی 'نانی اماں' بڑی جاندار ہے

عوض سعید کی زبان میں تصنع نہیں ہے۔ ہاں، بعض جملوں میں مقامی اثر نمایاں ہے۔ جیسے "نانیوں کے لئے رُک جاتا" ۱۱ "دواخانے میں شریک کروادو (مراد داخل کرادو)" ۱۲ "جس کے اطراف کئی جوان ہاتھ باندھے مؤدبانہ انداز میں کھڑے ہیں" ۹۲۔ پھر بھی ان کے یہاں روانی کی کمی نہیں ہے اور مکالموں میں بے ساختگی نظر آتی ہے۔

اس مجموعے کی کتابت و طباعت صاف ستھری ہے۔ آخری پانچ کہانیوں میں کاتب صاحب نے کچھ "پینترے" بھی دکھائے ہیں۔

امید ہے کہ 'سائے کا سفر' پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

عبداللہ ولی بخش قادری

صحرا صحرا

سن اشاعت ۱۹۶۹ء

شاعر: صبا جائسی (علیگ)

سائز: ۲۰×۳۰/۱۶، صفحات ۱۲۶

قیمت: دو روپے ستر پیسے

ملنے کا پتہ: کتاب گھر علی گڑھ

'صحرا صحرا' صبا جائسی کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں چند غزلیں فارسی کی بھی شامل ہیں۔ اس طرح شاعر نے اردو غزل کے شیدائیوں کے ساتھ فارسی غزل

کے دلدادہ ذہنوں کو بھی دعوتِ انبساط پیش کی ہے۔

یہ سب کچھ شاعری کی موزونیٔ طبع، شوقِ مطالعہ اور ریاضت کا نتیجہ ہے چوں کہ یہ نقشِ اوّل ہے اسی لئے بعض متروکات کا استعمال یا لفظ "نگراں" میں "گ" فارسی کو ساکن قرار دے کر مصرع موزوں کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

غزلوں میں روایت کا رنگ غالب ہے مگر شاعر نے الفاظ کے نئے پیکر تراشے ہیں۔ تراکیب کے استعمال میں تازگی پیدا کی ہے۔ تشبیہوں اور استعاروں کو دل آویز انداز میں پیش کیا ہے۔ شاعر نے جن مقامات پر غیر مرئی اشیا کو Personify کر کے مواد اور ہیئت کو مربوط کیا ہے وہاں ذہن کی انفرادیت اور آرٹ نے کلام میں اجالا پھیلا دیا ہے اور ہمارے نزدیک اس مجموعے کی یہی سب سے بڑی خوبی ہے۔ شاعر نے حیات و کائنات، دونوں کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

آ گیا بزمِ ناز میں یوں ہی جو پاسِ وضع تھا — رو دیئے پھوٹ پھوٹ کے ٹوٹے ہوئے تعلقات

گردشِ وقت خوش ہی ہیں ہم لوگ — پوچھتی کیا ہے زخمِ دل کا مزاج!

آج بے مہری ہے کانٹوں نے قدم بڑھ کے لئے — میرے پیچھے بھی کوئی آبلہ پا ہے شاید

پھر کہاں دردِ محبت، کہاں اس دل کا گداز — ہجر کی رات ڈھلی جاتی ہے آنکھیں کھولو

ہر طرح اپنے ہی احساس پہ حرف آئے گا — وقت کو زخم کہو، چاہے مداوا کہہ لو

نمی دانم نسیم نو وزیدہ از کجا آمد — ولیکن ایں قدر دانم کہ شاخِ آشیاں لرزد

کتابت و طباعت غنیمت، اور سرورق معقول ہے۔ ایک ابھرتے ہوئے فنکار کا یہ مجموعہ لائبریریوں کو ضرور حاصل کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر سیفی پریمی

نگارِ غالب

مصنف:- علی عباس اُمید
سائز:- $\frac{20\times30}{16}$ صفحات: ۹۴ قیمت -/۱
ناشر:- صد سالہ جشنِ غالب کمیٹی، حسن منزل، غازی پور
(سنِ اشاعت: فروری ۶۹ء)

یہ کتابچہ غالب صدی اڈیشن کے نام سے، صد سالہ جشنِ غالب کمیٹی غازی پور

کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ اس کا ایک حصہ مرزا صاحب کی تحریروں پر مشتمل ہے، یعنی حالاتِ زندگی، جو اُن کے مکتوبات کی مدد سے ترتیب دیے گئے ہیں اور اس کے دوسرے حصے میں مصنف نے سیدھی سادی زبان اور صاف ستھرے انداز بیان میں کلام غالب پر روشنی ڈالی ہے۔ غالب کی تصانیف اور غالب پر جو خصوصی کام اب تک ہوا ہے، اس کی فہرست بھی کتاب میں شامل کردی گئی ہے۔

اس زمانے میں غالب پر کئی اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ کتابچہ بھی اُن میں سے ایک ہے۔ فاضل مصنف نے اس کی ترتیب اور اپنے دلچسپ انداز بیان کے ذریعے خاصی ندرت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ غالبیات کے دلدادہ اسے شوق سے پڑھیں گے۔

افسوس کتابت اور طباعت اس معیار کی نہیں رہی جس طرح کی اُسے ہونا چاہیے تھا کتابت کی متعدد غلطیاں رہ گئی ہیں جو بُری طرح کھٹکتی ہیں۔

محمد شفیع الدین نیّر

•

"امراض النساء"

(سنِ اشاعت ۱۹۶۹ء)

مصنف:۔ حکیم سید محمد شجاع الدین حسین ہمدانی
موضوع: طب
سائز:۔ $\frac{20\times30}{16}$ صفحات:۔ ۱۸۵
قیمت:۔ چار روپے
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ اردو بازار، دہلی

پیشِ نظر تصنیف "امراض النساء" گائناکالاجی یعنی امراضِ نسواں پر ایک مستند کتاب ہے۔ جو جدید نقطۂ نظر کے مطابق لکھی گئی ہے۔ اردو زبان میں ایسی کتاب کی عرصہ سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔

اس کے مصنف حکیم سید محمد شجاع الدین حسین ہمدانی — بی۔ یو۔ ایم۔ ایس (علیگ) سینیر طبیب ہمدرد ریسرچ کلینک اینڈ نرسنگ ہوم آصف علی روڈ نئی دہلی ہیں۔ آپ علاج معالجہ کے علاوہ طبی لٹریچر اور ریسرچ سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ اسی باعث آپ کے تحقیقی مضامین وقتاً فوقتاً ملک کے موقر طبی

جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

چند سال پہلے آپ نے طبی اکیڈمی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے جو طبی تصانیف کے فقدان کو دور کرنے کے لئے وسائل فراہم کرنے کے علاوہ گراں قدر طبی تصانیف کو مطبوعہ شکل میں پیش کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہے یہی وجہ ہے کہ آپ اپنی انتہائی مصروفیات کے باوجود اپنے فن سے تعلق اور لگاؤ ہونے کے باعث فن کی باریکیوں سے متعلق تصنیف و تالیف جیسے اہم اور مشکل کام کو بھی نہایت دلچسپی اور شوق سے انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایسے صاحب فن کی تصنیف کتنی گراں قدر ہوگی اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ یہ طبیہ کالجوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور طبیہ کالجوں کے نصاب کے مطابق ہے۔ نیز ان میں علم حاصل کرنے والے طلباء کی ضرورت کو ہر طرح پورا کرتی ہے۔ میری رائے میں یہ کتاب معالجین، شائقین طب، عطار صاحبان اور ہر خاص و عام کے مطالعہ کے لئے یکساں مفید ہے۔ اس لئے کہ ایک تندرست اور صحت مند نسل کا دار و مدار ماؤں کی صحت اور ان کی تندرستی پر ہی منحصر ہے جسکی ضرورت اور اہمیت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔

طباعت و کتابت مناسب، سرورق سادہ۔ قیمت بھی کچھ زیادہ نہیں ہے یقین ہے کہ یہ کتاب پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جائے گی اور ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

سید منیر الحسن

ڈراکیولا کی واپسی

مصنف :۔ جون برکے

مترجم :۔ مظہر الحق علوی

صفحات :۔ ۲۵۰ ، سائز $\frac{20\times30}{16}$

قیمت :۔ ۵/-

سن طباعت :۔ اگست ۶۸ء

ناشر :۔ نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ

اس ناول کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ مصنف نے اسے اتنا زیادہ

.... ہیبت ناک بنا دیا ہے کہ کوئی کمزور دل والا تو اسے پڑھ ہی نہیں سکتا۔ اور اگر کسی ایسے آدمی نے کسی نہ کسی طرح اسے پڑھ ہی لیا تو یہ بالکل طے ہے کہ وہ یا تو اپنی انفرادیت سے محروم ہو کر بہادر بن کر جائے گا یا پھر اتنا زیادہ خوفزدہ ہو جائے گا کہ بس کچھ نہ پوچھیے۔

"ڈراکیولا کی واپسی" دراصل جون برکے کا مختصر افسانہ تھا جسے مظہرالحق علوی صاحب نے وسعت دے کر اسے ایک ضخیم ناول کی شکل دے دی ہے۔ اس لئے اگر اسے ترجمے کی بجائے علوی صاحب کی تصنیف ہی کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ یہ اس لئے بھی مناسب ہے کہ پورا ناول پڑھ جانے پر بھی اور ایک بار نہیں۔ بلکہ بار بار پڑھنے کے باوجود یہ کسی بھی طرح پتہ ہی نہیں چلتا ہے کہ اس میں ترجمہ والا حصہ کون سا ہو سکتا ہے اور اضافی کون سا۔

مظہرالحق صاحب اور نسیم بکڈپو اس بہترین آسیبی ناول کی تخلیق اور اشاعت کے لئے قابلِ مبارکباد ہیں۔ امید ہے علوی صاحب کے دوسرے ناولوں کی طرح یہ ناول بھی ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

ریحان احمد عباسی

ادبی خبریں

● جموں ۱۹ ر نومبر حکومت جموں و کشمیر نے ملک کے اردو کے دو مشہور شاعروں، نریش کمار شاد اور مخدوم محی الدین جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، کے ورثاء کے لئے پانچ پانچ ہزار نقد بطور امداد دینے کا اعلان کیا ہے

● نئی دہلی ۵ ار نومبر، نائب صدر جمہوریہ ہند شری جی۔ ایس۔ پاٹھک نے ماؤلنکر ہال میں ایک تقریب میں ہندوستان کی ممتاز ادبی شخصیتوں کو سودیت لینڈ نہرو انعامات تقسیم کئے۔ انعام کمیٹی کے صدر کے۔ پی۔ ایس مینن نے ان انعامات کی اہمیت واضح کی۔ انہوں نے کہا، جواہر لال نہرو نہ صرف ادیبوں کے دوست اور سرپرست تھے بلکہ خود بھی اعلیٰ ترین ادبی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انعام یافتگان کے بارے میں مسٹر مینن نے کہا کہ "یہ لوگ جنگ کے روکنے اور بین الاقوامی امن اور خیرسگالی کو ترقی دینے کے لئے قلم سے کام لے رہے ہیں جو تلوار سے زیادہ طاقتور ہے"

مسٹر مینن نے اردو کے ممتاز شاعر مخدوم محی الدین مرحوم کا رقت آمیز انداز میں تذکرہ کیا جنہیں انعام کمیٹی نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انعام بعد از مرگ دیا ہے انہوں نے کہا، ہم نے طے کیا تھا کہ اس سال اعلیٰ ترین ادبی انعام دینے کے لئے اُن کے نام پر غور کیا جائے لیکن ہمیں ذرا بھی شبہہ نہیں تھا کہ موت کے ظالم ہاتھ اتنا جلدی انہیں ہم سے چھین لیں گے۔ مسٹر مینن نے کہا" مخدوم جیسے لوگ امر ہوتے ہیں، جنہیں شاعرانہ صلاحیتیں قدرت سے ودیعت ہوتی ہیں اور جو ان صلاحیتوں کو ناانصافی اور استبداد کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

REGD. no D 58

Dec 1969

KITAB NUMA
Jamia Nagar New Delhi 25.

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے [illegible]